بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

مارچ 2019

پہلی شعاع، رضیہ جمیل 10
حمد، امجد اسلام امجد 11
نعت، حافظ مظہر الدین 11
نبیؐ کی باتیں، ادارہ 12

انٹرویو

بندھن، ارم کاشف 26
دستک، شاہین رشید 17
جب تجھ سے ناتا، م۔الف سخ 24
شعاع کے ساتھ، ادارہ 31
شادی مبارک ہو، کوثر خالد 22

ناول

شہر تمنا، نعیمہ ناز 36
شام کی حویلی میں، رخسانہ نگار عدنان 140

مکمل ناول

طوافِ عشق، سمیرا حمید 88
کوئی شام، مصباح علی سید 164

ناولٹ

ایسرائیل، منشا محسن علی 200

افسانے

من عرف نفسہ، نگہت سیما 69
یار دل دار، اقشین نعیم 62
مراپ، کشف بلوچ 81
بھنور، شاہین ملک 217
آئینہ، شبانہ شوکت 135
اماں تھکھی، نظیر فاطمہ 130
محبت، مونا شاہ 230

نظمیں غزلیں

غزل، عثمان شاکر 234
غزل، کامی شاہ 234
غزل، شوکت واسطی 235
نظم، سباس گل 235

انتباہ: ماہنامہ شعاع ڈائجسٹ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں، پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول، سلسلہ کو کسی بھی انداز سے نہ تو شائع کیا جاسکتا ہے، نہ کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈرامہ، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے طور پر یا کسی بھی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی عمل میں لائی جاسکتی ہے۔

https://readingpk.wordpress.net/

مستقل سلسلے

خط آپ کے	رضیہ جمیل	242	
مسکراہٹیں	ادارہ	236	
آئینہ خانے میں	واصفہ سہیل	251	
بالوں سے خوشبوئے	شگفتہ جاہ	238	
کھلتا کسی پہ	خالدہ جیلانی	241	
تاریخ کے جھروکے	امت الصبور	254	
موسم کے پیکان	خالدہ جیلانی	256	
خوبصورت بنئے	ادارہ	258	

مارچ 2019
7 تا 33
قیمت 70 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اُردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل فلورا حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

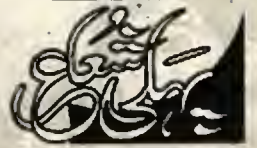

شعاع سے باتیں

شعاع مارچ کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

انسان کو اس کی غلطی کی پاداش میں جنت سے نکال کر دنیا میں بھیجا گیا۔ جنت سے نکالا ہوا انسان آج بھی اسی جنت کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ وہ اس جنت گم گشتہ کو پانے کے لیے بھٹک رہا ہے۔ ان آسائشوں کی تلاش میں ہے جو اسے جنت میں میسر تھیں۔ جنت کے حصول کا راستہ طے کر دیا گیا ہے لیکن انسان اس راستے پر چل کر جنت کو پانے کے بجائے اس دنیا کو اپنے لیے جنت بنانا چاہتا ہے۔ وہ ایک عارضی زندگی کو ابدی سمجھ کر ہمیشہ رہنے کا خواب دیکھتا ہے۔ ایک سامنے نظر آنے والی حقیقت کو بھول کر دنیا کے حصول کے لیے جتن کرتا ہے اور اس کوشش میں جانے کتنے لوگوں کی زندگی کو جہنم بنا دیتا ہے۔

پوری دنیا اس وقت تیز تر تبدیلیوں کے طوفان کی زد میں ہے۔ دنیا بڑی تیزی سے دو حصوں میں تقسیم ہو رہی ہے۔ بڑا حصہ ان لوگوں کا ہے جو تمام تر مشقت کے باوجود دو وقت کی روٹی مہیا کرنے سے قاصر ہیں۔ دوسرا حصہ چند لوگوں کا وہ گروہ ہے جو تمام وسائل پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ ان گنت مسائل سے گھری زندگی میں لوگوں کے پاس اب ان مسائل کے حل کے خواب بھی نہیں رہے ہیں کیونکہ ان مسائل کا حل بھی ان ہی کے پاس ہے جو ان مسائل کی جڑ ہیں۔

پیغمبر جو دنیا کے لیے مشعل ہدایت تھے، انہوں نے نسل، رنگ، امیر غریب کے امتیاز کو مٹا کر انسانیت پر عالم کی بنیاد رکھی۔ اطاعت، خدمت اور محبت کو انسان کا مقصد حیات قرار دیا۔ اطاعت اللہ کی اور خدمت و محبت انسان سے مخلوق کی بہتری کا خیال رکھو۔ اسی میں خالق کی رضا ہے۔ قدرت نے انسانی سرشت محبت کے خمیر سے اٹھائی ہے۔ یہ قدرتی اور دائمی جذبہ ہے جو نفرت کے جذبے سے زیادہ طاقت ور ہے۔ زندگی کے جتنے روپ ہیں، ان میں محبت حاوی نظر آتی ہے۔

یہ زمین جنت بن سکتی ہے اگر خدمت اور محبت کو مقصد حیات بنا لیا جائے۔

اس شمارے میں،

- طواف عشق۔ سمیرا حمید کے ناول کی دوسری اور آخری قسط،
- کوئی شام سی بچا رکھنا۔ مصباح علی سید کا مکمل ناول،
- رخسانہ نگار عدنان اور نعیمہ ناز کے ناول،
- منشا محسن علی کا ناولٹ۔ چاندنی کی اپسرائیں،
- نگہت سیما، افشین نعیم، کشف بلوچ، شاہین ملک، نظیر فاطمہ اور شبانہ شوکت کے افسانے،
- ارم کاشف اور کاشف بقائی کا بندھن،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ۔ دستک،
- جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے،
- شعاع کے ساتھ ساتھ۔ قارئین سے سروے،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

https://reading.caretofun.net/

حمد

باری تعالیٰ

سب ناموں کا مالک سب کے دُکھ کا چارا ہے
ہر بستی پر روشن جو بے نام ستارا ہے

ریگِ رواں کی وحشت میں بھی ایک نشانی ہے
دل کے سناٹے میں بھی ایک اشارہ ہے

حدِ ازل سے حدِ ابد تک اس تاریکی میں
بام تمہارا روشن تھا یا نام تمہارا ہے

ہر رستے کی منزل ہے وہ، ہر منزل کی رہ
اس تاریک خلا میں کیسا عجب ستارا ہے

اے آنکھیں اور آنکھوں کو یہ نیندیں دینے والے
میں نے ہر اک خواب میں چھپ کر تجھے پکارا ہے

کیسے بندے ہیں وہ امجد جو یہ سوچتے ہیں
مولا سب دنیا کا نہیں ہے، صرف ہمارا ہے

امجد اسلام امجد

نعت

رسولِ مقبولؐ

یہ دُعا ہے زندگانی حرمِ نبیؐ میں گزرے
کبھی مستیوں میں گزرے، کبھی بے خودی میں گزرے

مری زندگی کی راہوں میں ان ہی سے اُجالا
وہ خوشی کے چند لمحے جو تری گلی میں گزرے

تری یاد کے تصدق تری یاد بھی کرم ہے
مرے غم کے روز و شب بھی بڑی سرخوشی میں گزرے

اے عرب کے ماہِ تاباں، یہی اب تو آرزو ہے
کہ تمام عمر میری تیری چاندنی میں گزرے

وہ خرد سے ماورا ہیں، وہ ہیں عشق کا مقدر
جو نظر سے کچھ مناظر حرمِ نبیؐ میں گزرے

حافظ مظہر الدین

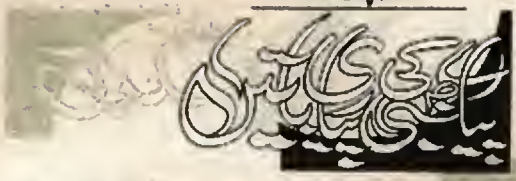

ادارہ

پیاری پیاری باتیں

بخل اور حرص کی ممانعت

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''لیکن جس نے بخل کیا اور بے پروائی اختیار کی اور اچھی بات کو جھٹلایا تو ہم اس کے لیے تنگی کا سامان مہیا کردیتے ہیں (یعنی ایسی راہ پر لگا دیتے ہیں جس کا انجام بُرا ہے) اور اس کا مال اس کے کام نہیں آئے گا جب وہ ہلاک ہوگا (یا جب جہنم میں گرے گا)۔

(اللیل :8-11)

اور فرمایا : ''اور جو اپنے نفس کے بخل اور حرص سے بچالیا گیا پس وہی کامیاب ہے۔'' (التغابن۔16)

فائدہ آیات:

بخل اور شح کا مفہوم تقریباً ایک ہی ہے، تاہم بعض کہتے ہیں کہ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرنا بخل ہے اور لوگوں کا مال ناجائز طریقے سے ہڑپ کر جانا شح ہے۔ یہ بخل سے بھی زیادہ بڑا جرم ہے۔ اسی طرح جو شخص اپنے مال میں سے زکوٰۃ ادا کرتا اور حسب ضرورت صدقہ و خیرات کرتا اور مال حاصل کرنے کے لیے کوئی ناجائز حربہ اور ذریعہ اختیار نہیں کرتا وہ گویا شح نفس سے بچالیا گیا جو اس کے عنداللہ کامیاب ہونے کی دلیل ہے اور اس کے برعکس رذیہ بخل اور شح ہے جو انسان کی تباہی و بربادی کی علامت ہے۔

ظلم

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ظلم کرنے سے بچو، اس لیے کہ ظلم، قیامت والے دن اندھیروں کا باعث ہوگا۔ اور شح (بخل و حرص) سے بچو، اس لیے کہ اسی شح نے تم سے پہلے لوگوں کو ہلاک کیا ہے۔ اس شح نے ہی انہیں اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ آپس میں خون ریزی کریں اور حرام کردہ چیزوں کو انہوں نے حلال سمجھ لیا۔'' (مسلم)

فائدہ:

انسان جب مال کا بندہ بن جائے اور اسے دنیا کی ہوس لگ جائے تو اس کے دل سے ہمدردی ختم ہو جاتی ہے اور وہ حصول دولت کے لیے سب کچھ کر گزرتا ہے، حتیٰ کہ بخیل نفس کی تسکین کے لیے خون تک بہانے سے بھی گریز نہیں کرتا بلکہ اس قدر حیوان بن جاتا ہے کہ اپنی خواہشات کو شرعی جواز دینے کے لیے حرام تک کو حلال سمجھ بیٹھتا ہے۔

ایثار و قربانی اور ہمدردی

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وہ اپنے نفسوں پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ وہ خود بھوکے ہی ہوں۔'' (الحشر۔9)

اور فرمایا: ''اور وہ طعام (دنیوی مال و متاع) کی محبت کے باوجود مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔'' (الدھر۔8)

فائدہ آیات:

ان دونوں آیات میں مومنوں کا یہ کردار بیان کیا گیا ہے کہ وہ اپنی ضرورت پر دوسروں کی ضرورت کو ترجیح دیتے ہیں اور مال کی محبت کے باوجود اللہ کی راہ میں مال خرچ کرتے ہیں۔

مہمان داری

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا: ''میں (بھوک سے) نڈھال ہوں۔''

https://readingcafe...net

پس آپ نے اپنی بعض ازواج مطہرات کی طرف پیغام بھیجا۔ انہوں نے جواب دیا۔

"قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے! میرے پاس پانی کے سوا کچھ نہیں۔"

پھر آپ نے دوسری بیوی کی طرف پیغام بھیجا۔ اس نے بھی اس کی مثل جواب دیا۔

حتیٰ کہ سب ہی نے یہی کہا:

"اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے! میرے پاس سوائے پانی کے کچھ نہیں۔"

پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"آج کی رات کون اس کی مہمانی کرے گا؟"

تو ایک انصاری آدمی نے کہا:

"یارسول اللہ! میں۔"

پس وہ اسے اپنے ساتھ اپنے گھر لے گیا اور اپنی بیوی سے کہا:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مہمان کی عزت کرنا۔" (بخاری)

اور ایک روایت میں ہے کہ اس نے اپنی بیوی سے کہا:

"کیا تیرے پاس کوئی چیز ہے؟"

اس نے کہا: "نہیں، صرف میرے بچوں کی خوراک ہے۔"

اس نے کہا: "ان بچوں کو کسی چیز کے ساتھ بہلاؤ اور جب وہ رات کا کھانا مانگیں تو انہیں (کسی طریقے سے) سُلا دینا، اور جب ہمارا مہمان گھر میں داخل ہو تو چراغ بجھا دینا، اور اس پر ظاہر کرنا کہ ہم (بھی اس کے ساتھ) کھانا کھا رہے ہیں۔"

چنانچہ وہ سب (کھانے کے لیے) بیٹھ گئے اور مہمان نے کھانا کھایا اور دونوں نے بھوکے رات گزاری۔

جب صبح ہوئی اور وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا:

"تم نے آج کی رات اپنے مہمان کے ساتھ جو سلوک کیا، اللہ تعالیٰ اس پر بڑا خوش ہوا ہے۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

1- اس میں اکرام ضیف (مہمان کی عزت اور اس کی مہمانی) اور ایثار کی ایک نادر مثال پیش کی گئی ہے جسے اللہ نے بھی پسند فرمایا۔

2- اس سے ایثار و قربانی کی ترغیب ملتی ہے۔ جس معاشرے میں یہ جذبہ عام ہو جائے وہاں لوٹ کھسوٹ کے بجائے ایک دوسرے کی ہمدردی اور ایثار سے وہ معاشرہ جنت نظیر بن جاتا ہے۔

قناعت کی برکت

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"دو آدمیوں کا کھانا تین آدمیوں کو اور تین کا کھانا چار آدمیوں کو کافی ہے۔" (بخاری و مسلم)

اور مسلم کی ایک روایت میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ایک آدمی کا کھانا دو آدمیوں کو اور دو کا کھانا چار کو اور چار کا کھانا آٹھ آدمیوں کو کافی ہے۔"

فائدہ:

اس میں مکارم اخلاق، ہمدردی اور قناعت کی تعلیم ہے کہ اگر کبھی ہنگامی طور پر ایسی ضرورت پیش آجائے کہ کھانا کم اور کھانے والے افراد زیادہ ہوں تو مذکورہ حساب سے مل جل کر کھا لینا چاہیے۔ اس میں اللہ کی طرف سے برکت ہوگی اور ثواب بھی ملے گا۔

ہمدردی

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ ہم سفر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے کہ ایک آدمی اپنی سواری پر آیا اور دائیں بائیں اپنی نظر کو گھمانے لگا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''جس کے پاس فالتو سواری ہو، اسے چاہیے کہ وہ اسے دے دے جس کے پاس سواری نہ ہو۔ اور جس کے پاس زائد توشہ ہو، وہ اسے دے دے جس کے پاس توشہ نہ ہو۔''

اس طرح آپ نے مختلف قسم کے مالوں کا ذکر فرمایا، یہاں تک کہ ہم نے خیال کیا کہ ہم میں سے کسی شخص کا زائد از ضرورت چیز میں کوئی حق نہیں ہے۔ (مسلم)

فائدہ:

مواخات اور ہمدردی کے باب میں اس حدیث کے ذکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو اجتماعی زندگی میں، خاص طور پر بحرانی دور میں ایک دوسرے کا معاون، خیر خواہ اور ہمدرد ہونا چاہیے اور اپنی ضرورت سے زائد ہر چیز دوسرے ضرورت مند مسلمانوں کو دے دینی چاہیے، تاہم یہ حکم فرض و وجوب کے دائرے میں نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو کسی کو مال جمع کر کے رکھنے کی اجازت نہ ہوتی۔ یہ حکم استحبابی ہے۔ اگر مسلمانوں میں اخلاق کریمانہ عام ہوتا تو اس حکم کے استحبابی ہونے کے باوجود اس پر عمل کثرت کے ساتھ ہوتا اور مسلمان معاشرہ اخوت و مواسات کے اعتبار سے مثالی ہوتا۔ لیکن اخلاق کریمانہ کے فقدان نے اس استحبابی حکم کی ساری اہمیت و افادیت ختم کر دی۔ اس لیے مسلمان معاشروں میں ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی و تعاون کے بجائے ایک دوسرے سے بے نیازی کے نہایت سنگ دلانہ مظاہرے عام ہیں۔

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک بُنی ہوئی چادر لے کر آئی اور کہنے لگی:

''میں نے اسے اپنے ہاتھ سے بُنی ہے تاکہ آپ کو پہناؤں۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنی ضرورت کی چیز سمجھتے ہوئے قبول فرما لیا۔ پھر آپ اسے تہ بند کے طور پر باندھ کر ہمارے درمیان تشریف لائے تو ایک صاحب نے کہا: یہ تو آپ مجھے پہنا دیں، کس قدر خوب صورت ہے یہ چادر!''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اچھا۔'' پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم مجلس میں بیٹھ گئے، پھر واپس گئے اور اس چادر کو اتار کر لپیٹا اور اس آدمی کی طرف اسے بھیج دیا۔ پس لوگوں نے اسے کہا:

''تو نے اچھا نہیں کیا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ چادر اپنی ضرورت سمجھ کر پہنی تھی لیکن تو نے آپ سے یہ مانگ لی اور تجھے یہ بھی معلوم ہے کہ آپ کسی سائل کو (خالی) واپس نہیں کرتے۔''

اس نے کہا: ''اللہ کی قسم! میں نے یہ اپنے پہننے کے لیے نہیں مانگی، میں نے تو یہ اس لیے مانگی ہے تاکہ (آپ کے جسم مبارک سے لگی ہوئی یہ بابرکت چادر) میرا کفن بن جائے۔''

راوی حدیث حضرت سہل فرماتے ہیں: پس یہ چادر اس کے کفن ہی کے کام آئی۔ (بخاری)

فوائد و مسائل:

1- اس میں ہدیہ قبول کرنے کا جواز ہے کیونکہ باہم ہدیوں کے تبادلے سے محبت بڑھتی ہے۔ اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''ایک دوسرے کو ہدیہ دیا کرو، اس سے باہم محبت پیدا ہوتی ہے۔''

2- آپ کسی سائل کو (خالی) واپس نہیں لوٹاتے تھے۔

3- قبل از وقت، ضرورت کی چیز تیار کر کے رکھنا جائز ہے۔

4- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کے پانی، آپ کے پسینے اور بال وغیرہ کو صحابہ رضی اللہ عنہم نے متبرک سمجھا اور ان سے تبرک حاصل کیا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار سے تبرک حاصل کرنا جائز ہے مگر آپ کے علاوہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کسی کے آثار سے تبرک حاصل نہیں کیا ورنہ خلفاء اور عشرہ مبشرہ کے آثار سے بھی

https://reading.sure.urdu.net

تبرک حاصل کیا جاتا۔ علاوہ ازیں صحابہ نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم مبارک سے مس کی ہوئی چیزوں ہی سے تبرک حاصل کیا۔ دیواروں، کھڑکیوں اور دروازوں وغیرہ سے نہیں کیا، جیسے آج کل بعض لوگ حرمین شریفین میں جا کر کرتے ہیں، پھر ستم بالائے ستم یہ کہ قبر کے دھوون کو بھی متبرک سمجھا جاتا ہے، حالانکہ اول تو قبر کو پختہ بنانے ہی کی اسلام میں اجازت نہیں ہے، تو پھر کسی قبر کو دھونے کا جواز کیوں کر ثابت ہو سکتا ہے؟

میں ان میں سے ہوں

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اشعری حضرات، جب جہاد (کے سفر) میں زاد راہ ختم ہو جاتا یا ختم ہونے کے قریب ہوتا ہے، یا مدینے میں (حالت قیام میں) ان کے اہل و عیال کا کھانا کم ہو جاتا ہے، تو ان کے پاس جو کچھ ہوتا ہے، سب ایک کپڑے میں جمع کر لیتے ہیں اور پھر اسے ایک برتن میں مساوی طور پر آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں، پس یہ لوگ مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں۔''
(بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

1- ''وہ مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں۔'' یہ اس بات کے اظہار کا پیرایہ بیان ہے کہ اخلاق و کردار اور اعمال خیر میں ہم ایک دوسرے کے بہت قریب بلکہ ایک جیسے ہیں۔

2- اس میں اشعری قبیلے کے افراد کی فضیلت کے علاوہ ایک دوسرے کی ہمدردی و خیر خواہی کی ترغیب ہے۔ خاص طور پر ابتلا اور بحران کے موقعوں پر لوگ اس طرح باہم تعاون کریں تو کم وسائل والوں کو کوئی تکلیف اور پریشانی نہ ہو۔ اس باب میں مذکورہ تمام احادیث کا یہی خلاصہ ہے۔

آخرت کا شوق و رغبت

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''اور اس (جنت) کے بارے میں ہی رغبت کرنے والوں کو رغبت کرنی چاہیے۔''
(المطففین-26)

فائدہ آیت:

جنت کی بعض صفات بیان کر کے اللہ نے مذکورہ بات ارشاد فرمائی، جس کا مطلب ہے کہ رغبت اور شوق کی کوئی چیز ہے تو وہ جنت ہے، اس لیے اہل ایمان کے دلوں میں اسی کی رغبت اور اس کے مطابق اسے حاصل کرنے کے لیے سعی و جہد ہونی چاہیے۔

آخرت کی رغبت

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک مشروب (پانی یا دودھ وغیرہ) لایا گیا۔ آپ نے اس میں سے کچھ پیا۔ اور آپ کی دائیں جانب ایک لڑکا اور بائیں جانب بزرگ لوگ تھے۔ پس آپ نے لڑکے سے فرمایا:

''کیا تو مجھے اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ میں (تیرے بجائے پہلے) ان بزرگوں کو دوں؟''

تو لڑکے نے کہا:

''نہیں، اللہ کی قسم! یا رسول اللہ! میں آپ کی طرف سے ملنے والے اپنے حصے میں کسی کو ترجیح نہیں دوں گا۔'' پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ پیالہ اس لڑکے کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ (بخاری و مسلم)

اور یہ لڑکا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ تھے۔

فوائد و مسائل:

1- مجلس میں تقسیم کرنے کے لیے مسئلہ یہ ہے کہ دائیں جانب سے آغاز کیا جائے۔ واقعہ مذکورہ میں دائیں جانب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ تھے جو ابھی نو عمر تھے، جبکہ بائیں جانب عمر رسیدہ حضرات تھے۔ بڑوں کی توقیر و احترام کا تقاضا تھا کہ آغاز ان سے کیا جائے لیکن مسئلے کا تقاضا یہ تھا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس کا آغاز کیا جائے کیونکہ وہ دائیں جانب تھے۔ اس لیے آپ نے ان کے اس حق

اولیت کو محض ان کے نوعمر ہونے کی وجہ سے نظر انداز نہیں کیا بلکہ ان سے اجازت طلب کر کے واضح کر دیا کہ صاحب حق ہی کو اولیت دی جائے چاہے وہ بچہ ہی ہو۔ البتہ اس سے گنجائش نکلتی ہے کہ چھوٹوں کی اجازت کے ساتھ بڑوں کو ترجیح دی جائے۔

2- دوسری طرف حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے لیے بھی ضروری تھا کہ وہ بڑوں کا ادب و احترام کرتے ہوئے اپنے حق سے دست بردار ہو جاتے لیکن ان کے سامنے اس سے بھی اہم تر مسئلہ یہ تھا کہ مشروب کا وہ پیالہ جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بچا ہوا مشروب تھا اور جسے آپ کے دہان (منہ) مبارک سے مس ہونے کا شرف حاصل ہو چکا تھا، اس تبرک سے سب سے پہلے وہ خود بہرہ ور ہوں، اس لیے انہوں نے بڑوں کے ادب و احترام کے تقاضے پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تبرک کو ترجیح دی۔ یوں بڑوں کے ادب و احترام کا مسئلہ بھی واضح ہو گیا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار سے تبرک حاصل کرنے کی اہمیت بھی اجاگر اور نمایاں ہو گئی۔ علاوہ ازیں حق دار کا استحقاق اولیت بھی ثابت ہو گیا۔

برکت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اس دوران کہ ایوب علیہ السلام کپڑے اتار کر غسل فرما رہے تھے، ان پر سونے کی ٹڈیاں گرنے لگیں۔ حضرت ایوب انہیں لپ بھر بھر کے اپنے کپڑے میں رکھنے لگے تو اللہ عزوجل نے آسمان سے انہیں پکارا:

''اے ایوب! کیا میں نے تجھے ان چیزوں سے بے نیاز نہیں کر دیا تھا جنہیں تو دیکھ رہا ہے؟''

حضرت ایوب (علیہ السلام) نے عرض کیا:

''کیوں نہیں، تیری عزت کی قسم! لیکن تیری برکت سے تو، جو مجھ پر نازل ہو، بے نیازی نہیں ہو سکتی۔'' (بخاری)

فوائد و مسائل:

اس میں بھی برکت کا مسئلہ بیان ہوا ہے۔ اسی مناسبت سے اسے اس باب میں بیان کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں اس میں مال جمع کر کے رکھنے کا اور تنہائی میں، جہاں کوئی دیکھنے والا نہ ہو، ننگے بدن غسل کرنے کا جواز ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''انہوں نے اس کا چمڑا کیوں نہ اتار لیا کہ اسے رنگ کر اس سے فائدہ اٹھاتے؟''

حاضرین نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! وہ تو مردار ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اسے صرف کھانا حرام ہے۔'' (مسلم)

فوائد و مسائل:

1- جس جانور کا گوشت کھانا حلال ہے وہ مر جائے تو اس کا چمڑا اتار کر رنگ لیا جائے، پھر استعمال کی کوئی بھی چیز بنا لی جائے تو یہ جائز ہے۔

2- بعض علما بیان کرتے ہیں کہ جس جانور کا گوشت کھانا جائز نہیں اس کا چمڑا بھی دباغت سے پاک ہو جاتا ہے۔ اور بعض علماء کے نزدیک جن جانوروں کا گوشت نہیں کھایا جاتا ان کا چمڑا دباغت سے پاک نہیں ہوتا، تاہم صحیح اور راجح موقف یہی معلوم ہوتا ہے کہ ماکول اللحم جانوروں ہی کا چمڑا دباغت سے پاک ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مردہ جانور کے چمڑے سے فائدہ اٹھانے کا حکم دیا جب اسے رنگ لیا جائے۔''

فائدہ:

مذکورہ بالا احادیث کی روشنی میں اس سے مراد وہ چمڑا ہے جس کو دباغت کے ذریعے سے پاک نہ کر لیا گیا ہو۔

☆

دستک، دستک
دستک

شاہین رشید

نائلہ جعفری

''کیا حال ہیں نائلہ؟''

''جی اللہ کا شکر ہے۔''

''علاج چل رہا ہے...... کچھ مزید افاقہ ہوا؟''

''ہاں اللہ کا شکر ہے، بتدریج بہتر ہو رہی ہوں۔ بس سب کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔''

''علاج کب تک چلے گا؟''

''یہ مرض تو ایسا ہے کہ اس کا علاج تا حیات چلتا رہتا ہے۔ بہت لمبا ہوتا ہے اور درمیان میں چھوڑا بھی نہیں جا سکتا کہ دوبارہ نہ سر اٹھائے یہ مرض۔''

''زندگی کا انداز ــــ تو یقیناً بدلا ہوگا؟''

''یقیناً کیا...... حقیقتاً بدل گیا ہے نہ پہلے جیسے دن رہے نہ رات، نہ مصروفیات نہ وہ شغل۔''

''بہت مایوس لگ رہی ہو؟''

''نہیں، مایوس تو نہیں ...... مگر جو صحت والی زندگی ہے وہ تو نہیں ہے نا...... وہ لاپروائی والی زندگی تو نہیں ہے نا...... اب تو بس اپنوں کے درمیان ہوں یہی بہت خوشی کی بات ہے۔''

''اس بیماری سے کیا سیکھا اور کیا سمجھا؟''

''بہت کچھ سیکھا بھی اور بہت کچھ سمجھا بھی...... بہت سے لوگوں کو دور جاتے دیکھا...... بہت سے لوگوں کو قریب آتے ہوئے بھی دیکھا...... مگر مجھے یہ خوشی ہے کہ میرے اپنے میرے بہت قریب رہے اور ان ہی کی خدمت خاطر کی بدولت میں چلنے پھرنے کے قابل ہوئی...... میرے بہن بھائی سب نے میری بہت خدمت خاطر کی اور کر رہے ہیں ...... بہت دعائیں نکلتی ہیں سب کے لیے...... اور میں نے اپنے کیسز میں موت کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور پھر اپنے آپ کو زندگی کی طرف لوٹتے بھی دیکھا ہے اور یہ تجربہ بہت انوکھا تھا کہ مایوسی کے بعد ایک دم سے امید پیدا ہو جانا کہ میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔''

''اللہ سے ناامید ہوئیں...... غصہ آیا اپنے رب پر کہ میں ہی کیوں اس بیماری کی زد میں آئی؟''

''نہ غصہ آیا نہ رب سے شکوہ ہوا...... بس رونا بہت آیا...... اور یہ ضرور سوچا کہ زندگی میں ایسا کیا عمل کیا تھا کہ جس کی مجھے یہ سزا ملی ہے مگر پھر سب نے سمجھایا کہ سزا نہیں ہے بلکہ اللہ کی طرف سے آزمائش ہے کہ وہ اپنے بندوں سے امتحان لیتا رہتا ہے تب اس منطق کو جانا اور اللہ کے قریب ہوئی کہ وہ جو کچھ کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔ ہم اس کی مصلحتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔''

''پھر یہ سوچ کر رونا کچھ کم ہوا؟''

''نہیں، رونا تو بہت آتا تھا اور اب بھی آتا ہے...... یہ تو دل کی بھڑاس ہے جو نکلتی رہنی چاہیے...... میں مسلسل دو سال بیڈ پر رہی تو اپنی بے بسی پر بہت رونا آتا تھا...... میں تو وہ تھی کہ جیسے گھر پر فارغ بیٹھنا آتا ہی نہیں تھا۔ ہر وقت ایکٹو رہتی تھی۔ کچھ نہ کچھ کرتی رہتی تھی۔ خیر...... اللہ جو کرتا ہے۔ بہتر ہی کرتا ہے۔''

''آپ کو تو خود کمانے کی عادت تھی...... اس چیز نے بھی آپ کو پریشان کیا ہوگا؟''

''بالکل...... جن کو خود کمانے کی عادت ہوتی ہے۔ وہ آرام سے نہیں بیٹھ سکتے۔ میرے ذہن میں بھی کچھ ایسے کام ہیں جنہیں کر کے میں اچھا خاصا کما سکتی ہوں اور بیماری کے دوران میں نے یہ بات خاص طور پر محسوس کی کہ ہمارے یہاں خالص غذا نہیں ملتی اور دوران بیماری ناقص غذاؤں کا استعمال بھی کرنا پڑا...... اس لیے میں نے سوچا کہ ذرا مزید طبیعت

ٹھیک ہو جائے تو کچھ نہ کچھ ضرور کروں گی۔“

”اور وہ آپ کی ویب سائیڈ کا کیا ہوا...... کن مراحل میں ہے؟“

”ابھی کام ہو رہا ہے اور جب یہ ویب سائیڈ مکمل ہو جائے گی تو ان شاء اللہ روزانہ دو سے ڈھائی گھنٹے کینسر کے مریضوں سے لائیو کالز پہ بات کروں گی، اور ان سے اپنا تجربہ شیئر کروں گی ایک فورم بناؤں گی اور اس فورم کے تحت سب کے مسائل سن کر ان کو جواب دوں گی۔ بس اللہ تعالیٰ میرا ساتھ دے۔“

☆☆☆

فرح محمد

معروف شیف + اداکارہ

”کیا حال ہیں؟“

”اللہ کا شکر ہے۔“

”کیا ہو رہا ہے آج کل؟“

”کچھ ذاتی مصروفیات ہیں، کچھ ٹی وی کی، کچھ ڈراموں کا بھی پروگرام ہے۔“

”جتنی اچھی شیف ہو، اتنی ہی اچھی پرفارمر بھی تمہارا ایک ڈراما میں نے دیکھا تھا؟“

”بہت شکریہ...... آپ ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔“

”آج کل تمہیں اے آر وائی پر دیکھ رہی ہوں...... دیگر چینلز پہ نہیں...... کیوں؟“

”میں دیگر چینلز پہ بھی آتی ہوں اور اے آر وائی پہ بھی، مجھے تو جس چینل سے بلاوا آتا ہے، چلی جاتی ہوں کہ میری وجہ سے کسی کا فائدہ ہو جائے تو کیا ہی بات ہے۔“

”فرح! تمہاری ایج کی لڑکیاں تو فخر سے کہتی ہیں کہ ہمیں تو انڈا بھی ابالنا نہیں آتا اور ایک تم ہو کہ سب کچھ آتا ہے تمہیں؟“

”جی...... میرا فخر یہ ہے کہ سب کہیں کہ فرح کتنی سگھڑ لڑکی ہے، اسے تو سب کچھ آتا ہے...... اور سچ میں مجھے سب کچھ آتا ہے اور جب آپ اور دیگر لوگ میری تعریف کرتے ہیں۔ میری حوصلہ افزائی کرتے ہیں تو ڈھیروں خون بڑھ جاتا ہے۔“

”شکریہ...... ایک پرانا سوال ہے کہ کیا بچپن سے ہی شوق تھا کہ اس فیلڈ میں آؤں؟“

”کچھ شوق ایسے ہوتے ہیں جو بچپن سے ہی شروع ہو جاتے ہیں۔ پھر گھر کا ماحول بھی بچوں کو بہت کچھ سکھا دیتا ہے۔ تو پڑھائی کے ساتھ ساتھ مجھے گھر داری کا بھی بہت شوق تھا اور میں گاہے بہ گاہے امی کا ہاتھ بٹاتی رہتی تھی۔ اور میرا دل چاہتا تھا کہ مجھے کوکنگ سے لے کر گھر کی ڈیکوریشن اور سلائی کڑھائی سب کچھ آتا ہو...... تو بس پھر سب کچھ آ گیا مجھے...... مطلب میں ہر کام کرنا چاہتی تھی۔“

”کہیں جا کر سیکھا یا امی نے ہی سب کچھ سکھایا؟ اور ہر کام سے کیا مراد ہے؟“

”ہر کام سے مراد یہ کہ مجھے بیوٹیشن کا کام بھی آتا ہو، فیشن ڈیزائننگ بھی آتی ہو، کوکنگ بھی کروں اور بیکنگ بھی کروں۔ اب یہ سوال کہ سیکھا کس سے...... تو امی سے تو بہت کچھ سیکھا مگر میں نے کورسز بھی بہت کیے اور سب کچھ سیکھا۔“

”شیف کی فیلڈ کے بارے میں کیا کہو گی؟“

https://reading.pakistan.net

"میں سمجھتی ہوں کہ یہ فیلڈ بہت زیادہ اچھی ہے کیونکہ یہ فیلڈ آپ کو ایک باعزت روزگار دے سکتی ہے..... اور ویسے بھی عورت کو کھانا پکانے کا ماہر ہونا چاہیے..... پتا نہیں کیوں لڑکیاں اس بات سے گھبراتی ہیں کہ اگر ہم کہہ دیں گے کہ ہمیں کھانا پکانا آتا ہے تو معلوم نہیں کون سی عزت میں کمی آجائے گی..... کوئی عزت میں کمی نہیں آتی بلکہ اضافہ ہی ہوتا ہے۔"

"فرح! جو ٹوٹکے بتاتی ہو، کیا پہلے اسے خود آزماتی ہو یا دوسروں کے تجربات سے فائدہ اٹھاتی ہو؟"

"دوسروں کے تجربات سے فائدہ نہیں اٹھاتی، بلکہ خود آزماتی ہوں۔ خود تجربہ کرتی ہوں تب آگے فارورڈ کرتی ہوں۔"

"ایسا ہوا کہ کبھی کسی کو آپ کے ٹوٹکے سے نقصان ہوا ہو؟"

"اللہ کا شکر ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہوا اور میرے ٹوٹکے ہمیشہ محفوظ ہوتے ہیں۔ کسی کو کوئی نقصان نہیں ہوتا..... کیونکہ جیسا کہ میں نے کہا کہ پہلے میں خود آزماتی ہوں۔"

"آپ ایک اچھی شیف ہیں..... لوگ بہت پسند کرتے ہیں۔ دوسروں کو کھانے کی طرف راغب کرنے والی لڑکی خود کتنی شوقین ہے کھانا کھانے کی؟"

"آپ حیران ہوں گی کہ مجھے کھانا کھانے کا کوئی بہت زیادہ شوق نہیں ہے۔ بس کھانے کے معاملے میں گزارا ہے۔"

"پسند کیا کیا ہے کھانے میں آپ کو؟"

"مجھے سبزیاں بہت پسند ہیں اور "سی فوڈ" بھی بہت شوق سے کھاتی ہوں..... سبزیوں میں مجھے بھنڈی پسند ہے اور سی فوڈ میں مچھلی بہت شوق سے کھاتی ہوں۔"

"گھر میں کھانا کھانا پسند ہے یا باہر؟"

"مجھے گھر سے باہر کھانا کھانے میں بہت مزہ آتا ہے اور گھر سے باہر میں زیادہ تر باربی کیو ہی کھاتی ہوں۔"

دعائے مغفرت

آپ کی پسندیدہ مصنفہ عالیہ بخاری کے رفیق حیات محمد ناظم الدین طویل علالت کے بعد اس دار فانی کو الوداع کہہ گئے۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

ادارہ خواتین ڈائجسٹ بہن عالیہ بخاری کے غم میں برابر کا شریک ہے۔
دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم ناظم الدین کی مغفرت فرمائے اور عالیہ بخاری اور دیگر متعلقین کو صبر جمیل سے نوازے، آمین۔
قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

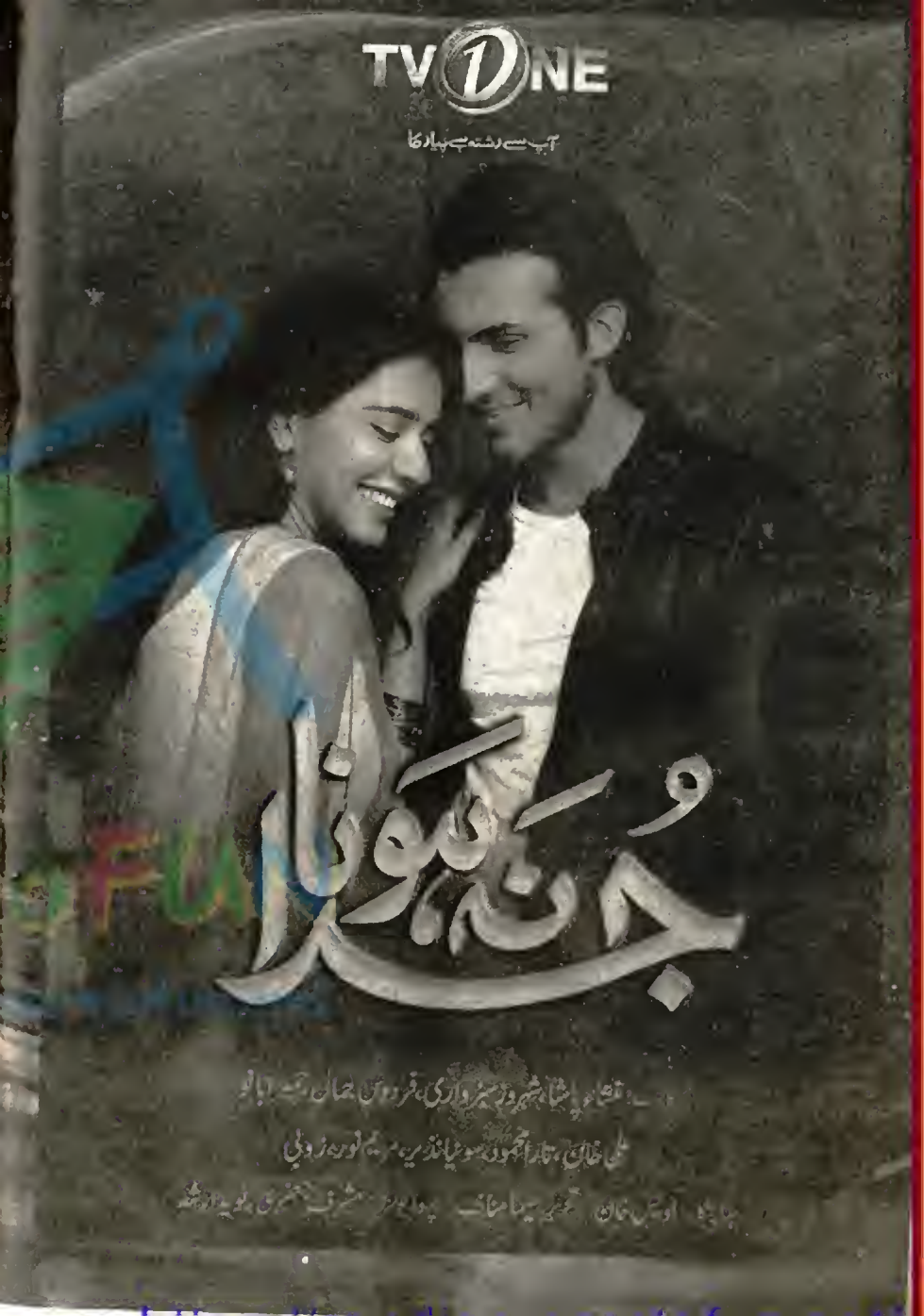

TV ONE
آپ سے رشتہ ہے پیار کا

بے جا سختی اور بے لگام آزادی کے بیچ بنتے بکھرتے رشتوں کی کہانی

ساہا کے والد ایک دینی شخص ہیں جو بہت سخت گیر ہیں، ان کی نظر میں بیٹیوں کا ہونا ہی بہت قابل اعتراض ہے، وہ اپنی بیوی اور بیٹیوں سے بہت سختی سے پیش آتے ہیں۔ ساہا جو عبدالمنان کی بڑی بیٹی ہے، وہ باپ کی بے جا روک ٹوک سے بہت اکتائی ہوئی ہے۔ وہ گھر میں باپ کے خوف سے سب کچھ برداشت کرتی ہے لیکن اس کے گھر سے جاتے ہی وہ خود کو آزاد جان کر اپنی وہ ساری خواہشات پوری کرتی ہے جو اس کے باپ کو سخت ناپسند ہیں، مثلاً سر پر دوپٹہ نہ لینا، بلند آواز میں ٹی وی دیکھنا گانے سننا وغیرہ۔ اس کی والدہ سعیدہ اور چھوٹی بہن ثانیہ اسے اس بات پر بہت ٹوکتی ہیں، لیکن وہ نہیں سنتی۔ اسے اپنے باپ سے بہت ساری شکایتیں ہیں، وہ ماں اور بہن کو بھی احساس دلاتی رہتی ہے کہ وہ کیسی زندگی گزار رہی ہیں۔ دوسری طرف سدیس کی فیملی ہے اپر کلاس سے تعلق رکھنے والی یہ فیملی اپنی اپنی مرضی کی زندگی گزار رہی ہے۔ نعمان صاحب کو اپنے بزنس سے فرصت نہیں اور صوفیہ کو اپنی این جی اوز اور پارٹیز سے۔ اُدھر ساہا کا ایک رشتہ آتا ہے جو بالکل عبدالمنان کی طرح ہے۔ ساہا کو وہ بالکل پسند نہیں آتا اور وہ ان لوگوں کے سامنے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر دیتی ہے اور ان سے صاف کہتی ہے کہ وہ ان لوگوں جیسی بالکل نہیں ہے اور اس نے جو یہ سر پر دوپٹہ لیا ہوا وہ اپنے باپ کی ڈر سے لیا ہوا ہے۔ وہ لوگ ساہا کی یہ باتیں سن کر اُٹھ کر چلے جاتے ہیں جس پر عبدالمنان بعد میں بہت خفا ہوتا ہے اور ساہا سے بات کرنا بند کر دیتا ہے۔ ساہا کو باپ کی ناراضگی کی پرواہ نہیں ہوتی۔ وہ گھر سے باپ کے ڈر سے عبایا پہن کر نکلتی ہے اور یونیورسٹی میں جاتے ہی اسے اُتار دیتی ہے۔ کجل اس کی کلاس فیلو ہے، وہ اس بات پر ساہا کا اپنے دوستوں میں کافی مذاق اُڑاتی ہے، جس پر دونوں میں کافی ٹھن جاتی ہے۔ ساہا عبایا سے نفرت کا اظہار اکثر ثانیہ کے سامنے کرتی ہے کہ ابا کی وجہ سے اسے زبردستی عبایا پہننا پڑتا ہے۔ ثانیہ اس کے جواب میں اسے سمجھاتی ہے کہ اسے ابا کی بجائے اللہ سے ڈرنا چاہیے کیونکہ یہ اللہ کا حکم ہے۔ ایک دن کسی بات پر کجل ساہا کا مذاق اُڑا رہی ہوتی ہے، تو سدیس کجل کو پک کرنے وہاں آ جاتا ہے، ساہا کجل اور اس کے دوستوں کے مذاق اڑانے پر کافی شرمندہ نظر آ رہی ہے، سدیس کو وہ بہت اچھی لگتی ہے، وہ کجل کو ڈانٹ کر ساہا کا ساتھ دیتا ہے جس پر کجل ساہا سے شدید چڑ جاتی ہے اور دل سے خواہ مخواہ کا بیر باندھ لیتی ہے۔ سدیس ساہا کو دوستی کی آفر کرتا ہے جو وہ قبول کر لیتی ہے، دونوں اکثر یونیورسٹی کے باہر بھی ملنے لگتے ہیں۔ کجل ایک دن اپنے فرینڈز کے ساتھ کسی ریسٹورنٹ میں لنچ کرنے جاتی ہے جہاں ساہا سدیس کے ہمراہ لنچ کرنے آئی ہوئی ہے کجل اپنے بھائی کو اتنی عام سی فیملی کی لڑکی کے ساتھ دیکھ کر مشتعل ہو جاتی اور ساہا کو بے نقط سناتی ہے۔ ساہا کو کجل کا یوں بار بار ذلیل کرنا اپنی ہتک محسوس ہوتی ہے، وہ بھی کجل کو اس کی بے راہ روی پر بہت طعنے دیتی ہے۔ سدیس ساہا کے لیے اپنے گھر کے دبے ہوئے ماحول سے باہر نکلنے کا راستہ ہے، لیکن اس سے صرف دوستی رکھے ہوئے ہے، ساہا جب اس سے شادی کے لیے کہتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ وہ تو اس سے صرف دوستی رکھنا چاہتا ہے شادی کا اس کا کوئی ارادہ نہیں ہے، ساہا کے اوپر یہ بات بجلی بن کر گرتی ہے اور وہ ناراضگی سے سدیس سے ہر تعلق توڑ لیتی ہے۔ سدیس کو ساہا سے دوری چند روز میں ہی محسوس ہونے لگتی ہے۔ اب ایک طرف ساہا کی شکستہ انا اور سدیس کا پچھتاوا ہے اور دوسری طرف دونوں گھرانوں کی شدید مخالفت!

کیا سدیس اور ساہا ایک ہو سکتے ہیں؟

کیا دونوں گھرانوں کی شدید مخالفت کوئی طوفان لائے گی؟

@TvOnePK

Monday 8:00pm

شمع خالد۔ ہمراہ۔ یاسر حمید

کوثر خالد

کوثر خالد سودا..... جڑانوالہ فیصل آباد

کوثر خالد سودا حاضر خدمت ہے اور آداب بجالاتی ہے۔

آدھی رات گزر چکی ہے فریج کی آواز کانوں میں مدھر مدھر ساز اتار رہی ہے۔ میں اور میری ساس نہ صرف گھر بلکہ اپنی ذات میں بھی اکیلے ہیں۔ کل ڈھیروں مشقت کرنا پڑی۔ آج پرہیزی کھانے نے کچھ سانس ہلکا کیا ہے۔ صاف کرنے والے رومال نہ تھے۔ لہٰذا اللہ نے انہیں گندگی سے بچالیا۔ ڈائپر آرام سے تبدیل کرلیا۔ اب کھانا مانگ رہی ہیں۔ میری یاددہانی پر پانی پر گزارا کرلیا کہ رات کو کھانا نہیں کھاتے ورنہ۔

پھر میں نے کہا "رویا نہ کریں میں نے اپنے خالد کو خیالوں میں بلالیا آپ اپنے (عثمار) کو بلالیں۔" اور میں نے صبر کی دعا بھی کردی اب چپ ہیں اور ہمارا قلم بول رہا ہے۔

اب یہاں کوئی نہیں۔ کوئی نہیں آئے گا۔

اردگرد کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں ہے۔

27 جنوری کو بیٹی اپنے گھر (سامنے دو گھر چھوڑ کر) جاچکی ہے۔ (آنکھ اوجھل، پہاڑ اوجھل)

ہماری ماں ماہ ڈیڑھ ماہ ادھر رہ گئی ہیں۔ وہاں وہ ٹوٹے بازو سے اپنے کپڑے خود دھوتی ہیں۔ ادھر میں نے دھوئے۔ کہا بھی ادھر پکارہ لیں۔ مگر اپنا گھر اپنا ہے۔ پنشن خود لانا بھی ایک مسئلہ ہے۔ رضا ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا۔ کافی رشتے مایوس ہوئے۔ اور ہم بھی چاہتے ہیں کہ پہلے یہ نمازی بن جائے اور برداشت کا مادہ اور زیادہ ہو لے تو پھر ہی شادی ہو۔ ورنہ وہی جھگڑے ہوں گے جو لاہور میں میری ابھی بہو اور اچھے بیٹے کے ہوتے ہیں۔

شمع کی شادی پر بھی اس نے پوتے ربیع کو بے دردی سے پیٹا۔ لہٰذا ثمر نے ربیع کو گود میں لیے ہی سارے کام نپٹائے اور علی کو صائمہ نے پکڑا۔

ولیمہ لاہور میں تھا صائمہ دبئی سے گھر جانا چاہتی تھی۔ یہ صاحب ادھر بہن کے مکلاوے کی خاطر آنا، مجھے تب پتا چلا جب شور مچا۔

اس نے اصرار کیا "گھر چلو ورنہ میں اپنی امی کے ساتھ رکشہ میں جارہی ہوں۔"

اس نے اکتا کر کہا۔ "دفع ہو۔"

لو جی..... ہم تو دھڑام سے گر گئے۔ ان سے بھی زیادہ واویلا ڈالا۔ کہ یہ ہوا کیا ہے۔ سب کو ہماری پڑ گئی۔ مگر ہم تب اٹھے جب صائمہ نے اٹھایا۔ پھر ہم نے خوب تقریر کی کہ "پہلے تو بچہ مانگتی ہیں۔ اب اللہ نے دو دے دیے تو سنبھالے نہیں جاتے۔ لاؤ میں پال کر واپس کردوں گی۔ اگر پھپھو کے ساتھ گزارا نہیں تو الگ ہوجاؤ مگر ثمر کے ساتھ خوش رہ کے گزارا کرو۔"

پھر ثمر کو ڈانٹا۔ "تمہیں کہا تھا کہ انہیں پال لو، جڑانوالہ آؤ تو بیگم کے ساتھ راضی خوشی ورنہ مت آؤ۔"

ثمر نے معافی مانگی اور ہم اپنے گھر آئے۔ اب لوگوں کو اچنبھا ہو رہا ہے کہ ہماری بیٹی مکلاوے کے بعد آٹھ دن رہنے کیوں نہیں آرہی تو بھئی قرآن میں لکھا ہے کیا؟ "میاں بیوی راضی تو" ماؤں کے لیے کافی ہونا چاہیے۔ ہے ناں۔

یہ تو تھا ہماری زندگی پر تبصرہ..... شمع کی ٹیچر مس عائشہ کی تمنا ہے کہ میں شعاع میں شادی کا حال

https://reading.caretofun.net

لکھوں (وہ صرف شعاع کی دلدادہ ہیں) بھلا کیا لکھوں۔

معمولی سی مہندی کی رسم میری بھو نے زبردستی کی۔ پھولوں والے دوپٹے کی چارپائی بنا کر چند قدم چلا کر شمع کو اسٹیج پر بٹھادیا۔ لوگوں نے پیسے وارے ہم سے زبردستی یہ کام کروایا گیا۔

کھانا۔ پٹھورے، چنے اور حلوہ تھا اور بہت مزے دار تھا۔ بارات پر صرف دودھ پلائی کی رسم ہوئی، ہم نے نہیں دیکھی۔ پندرہ ہزار ملا جو کزنوں میں بانٹ دیا گیا جبکہ کہا گیا۔ ''رضا کو رضیہ بنالیں کپڑے بدل کر'' (یعنی مذاق)۔

کھانے میں دو قسم کے چکن، نئے زمانے کی سیلڈ، چاول، نان اور گجریلا تھا۔ ہم نے شمع کے پاس منے سے کمرے میں صرف گاجر کا حلوہ کھایا اور بوتل پی۔ بعدازاں بیمار بچوں۔ نند کا بیٹا محسن اور فرزانہ بیوہ کی جو بیٹی جٹھانی کی بہن کو گود دلائی تھی (سال کی ہوگئی ہے اتنی پیاری ہے) کو دم کرنے لگی۔

اتنے میں دولہا، دلہن پاس سے گزرے تو سمدھی حمید مرزا نے کہا۔

''بیٹی سے مل لیں۔''

ہم نے ہاتھ رکھا دونوں پر۔ دعا دی اور بیٹھ گئے۔ ساس کو کمبل میں بٹھا رکھا تھا۔ وہاں بیٹے کے ساتھ بٹھائی تھیں۔ خوب کھایا اور الٹی کرتے گھر آئیں۔

رہا ولیمہ...... لاہور سیلبرٹی والا کوئی ہوٹل تھا۔ ہر جگہ پھول ہی پھول۔ میری خاطر داماد نے ''پھول'' والے مدیر شعیب مرزا کو بلا رکھا تھا۔ دادی کو ان کے بیٹے کے ساتھ گھر پر چھوڑ گئے (فالج کے بعد لنگڑاہٹ رہ گئی ہے)

ابرارالحق یاسر حمید داماد کا جگری یار ہے۔ اسے میری نند کی بیٹی راحت خوش ہو کر دیکھ رہی تھی۔

جبکہ میری بہن عالیہ بیمار تھی مگر میک اپ کیے بیٹھی تھی (کیا اتنا ضروری ہے؟) نیلام گھر جا کر طارق عزیز سے آٹوگراف لینے والی بہن نے ابرار الحق کی خوشی کیوں نہ منائی؟ کیونکہ جان ہے تو جہان ہے۔ مگر راز صحت تو یاد خدا ہے۔

جب ہم گھر سے چلے تو بڑی بھوک لگی تھی۔ باسی بروٹی پر چنے ڈال کر برگر بنایا۔ بوتل پکڑی اور گاڑی میں کھالیا۔ لہٰذا وہاں شعیب مرزا سے مل کر ایک کونے میں بیٹھے رہے۔

میرا گونگا بہنوئی اصرار کرتا رہا۔ ''کھانا کھالو۔'' ہم ناں کرتے رہے، شاید بہن نے کہا ہوگا کہ میٹھا کھالیتی ہے۔

اس نے میٹھا دیکھا تو گاجر کا ذرا سا حلوہ اٹھالایا۔ بھوک تو تھی نہیں تو مزے دار تھا یا نہیں مگر۔ ہم نے اتنا ہی اور منگوا کر کھالیا۔ اور رخصتی کا منظر تو آپ پہلے ہی دیکھ چکے۔

''وہاں کسی نے کہا کہ اگر کوثر کو یوں ڈرامہ کرتے اس کا شعیب مرزا دیکھ لیتا تو کیا کہتا؟''

لوجی یہ تو فون پر پوچھ لیا جائے گا۔

شعاع والو آپ بتاؤ...... میں لڑائی ہٹانے کے لیے اور کیا کرتی؟ اس سے بہتر ایمان سے کہانی لکھنا کتنا مشکل ہے ناں...... شاعری آسان ہے۔

میں تو تھک گئی۔ اب تبصرہ کیا کروں۔ اس بار سالوں میں دوسرا سرورق ہے جو لڑکی کے اندرونی تاثرات پرکشش لگ رہے ہیں اور موتیوں بھری بالیاں بج رہی ہیں اور سہیلی شہناز کی شبیہ ابھر رہی ہے۔ انجم خوش رہو اور باقی اس کی شاگردی کرلیں۔

شعاع سارا پڑھ لیا۔ اس بار سمیرا حمید نے اصل موضوع یعنی (رب دو جہاں) کو چنا ہے۔ کاش ہم بھی حافظ ہوتے ہم بھی کسی قابل ہوتے۔ پچھلی بار کوثر پھپھو والے خط میں آپ نے کس مولانا کو مخاطب کیا تھا مشعل نما خواتین کے حوالے سے نام کیوں نہ لکھا؟ قارئین ہماری شادی کا حال آپ کو کتنا عجیب لگا لکھنا نہ بھولیے گا اجازت...... اللہ حافظ

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

م۔ الف۔ خ

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے میں اکثر خواتین شادی شدہ زندگی کے رونے روتی نظر آتی ہیں۔ لیکن شادی کے بعد آپ کی زندگی بہت خوب صورت ہو جاتی ہے۔ یہ بہت اچھا سلسلہ ہے، سوچا شرکت کی جائے۔

س: شادی کب ہوئی؟

ج: شادی 18 نومبر 1998ء کو ہوئی، یہ خالصتاً ایک لو میرج تھی۔

س: شادی سے پہلے مشاغل و دلچسپیاں؟

ج: شادی سے پہلے زبردست، ذمہ داریوں سے آزادی والی زندگی تھی۔ والد نوکری پیشہ اور والدہ ہاؤس وائف تھیں۔ ہم صرف تین بہنیں تھیں۔ ہم سب بہنیں ریڈیو پاکستان کے پروگرام میں شرکت کرتیں۔ شاعری کے مقابلے اور مقامی زبان کے گانوں کی فرمائشیں کرنا۔ ہم ریڈیو کی دنیا میں خاصی مقبول تھیں۔ گھر کے کاموں کی کوئی ذمہ داری نہ تھی۔ اماں سارے کام خود کرتیں۔ میں ڈائجسٹ پڑھنے کے ساتھ ساتھ بی اے بھی کر رہی تھی۔ ہم پر ابا کی کوئی غیر ضروری پابندیاں نہیں تھیں، ایک خوب صورت زندگی تھی شادی سے پہلے۔

س: رشتے میں مرضی شامل تھی؟

ج: جی بالکل۔ بلکہ رشتہ ہوا ہی میری مرضی سے تھا۔ میرے میاں چھوٹی بہن کے جیٹھ تھے۔ بہن کی شادی کے بعد ہماری شادی۔ میرے میاں چچازاد سے شادی شدہ اور تین بچوں کے باپ تھے۔ اپنی شادی شدہ زندگی سے خوش نہیں تھے۔ بیگم سے بنتی نہیں تھی، بس انہوں نے مجھے منتخب کیا، میں نے انہیں۔

س: ذہن میں جیون ساتھی کا تصور؟

ج: میں ڈائجسٹ پڑھنے والی تھی۔ ذہن میں جیون ساتھی کا تصور ناولوں کے ہیرو والا تھا۔ خوب صورت، لونگ، کیئرنگ، خوش قسمتی سے میرے میاں میں تمام خوبیاں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ انہیں مجھ سے محبت تھی اور ہے، مجھ سے رشتہ نبھانے کے لیے انہوں نے جو تکلیفیں اٹھائیں، شاید ہی کوئی مرد اٹھاتا۔

س: منگنی کتنا عرصہ رہی؟

ج: میاں جی کی دوسری شادی تھی، سو منگنی کا تصور نہ تھا۔ ساس آئیں، رشتہ طے ہو گیا۔ شادی نہ بہت دھوم دھام سے ہوئی، نہ بہت سادگی سے۔ جمعہ کے دن شادی ہوئی تھی۔

س: شادی سے پہلے سسرال والوں کے بارے میں خیالات؟

ج: خیالات تو بڑے نیک تھے۔ ہر لڑکی شادی سے پہلے خود کو ہیروئن سمجھتی ہے، میں نے بھی سوچا تھا کہ میں مثالی بہوؤں کی مگر سسرال والے مثالی نہ تھے۔ ان کے ساتھ میرے تعلقات دھوپ چھاؤں سے تھے۔ شادی کے چوتھے دن میری نند نے میاں کے لیے ناشتا بنانے سے انکار کر دیا۔ مجھے تو روٹی بنانا تک نہ آتی تھی، جو کچی پکی بنی میاں نے کھالی۔ مڑے سے بولے "کوئی بات نہیں، تم سیکھ لو روٹی بنانا۔ میں کچی پکی کھالوں گا۔" اور چھ ماہ لگے مجھے روٹی بنانا سیکھنے میں۔ تب تک میرے میاں جلی، کچی، پکی کھاتے رہے، کیسے اچھے بندے ہیں وہ۔

س: شادی کے لیے کن چیزوں کی قربانی دینی پڑی؟

ج: میرے میاں روایتی زمین دار تھے۔ ان کو ڈائجسٹ پڑھنا، ریڈیو، خط لکھنا پسند نہ تھا۔ سو مجھے اپنے شوق کی قربانی دینی پڑی۔ اب اتنے سال بعد بیٹی ڈائجسٹ پڑھتی ہے تو اسے کچھ نہیں کہتے۔ اپنی بیٹی جو ہوئی۔ شادی سے پہلے گھر کے کام کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ شادی کے بعد دیہات میں بجلی نہ تھی۔ میاں کے کپڑے ہاتھ والے نلکے چلا کے دھوتی۔ انگاروں والی استری سے استری کرتی۔ رات کو مچھر کاٹتے لیکن مجھے اپنے میاں سے محبت تھی اور جس سے محبت ہو اس کے لیے آپ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ شادی کے تین سال بعد ہم شہر شفٹ ہو گئے۔

س: شادی کے بعد شوہر نے دیکھ کے کیا کہا؟

ج: شوہر نے ہلکی پھلکی تعریف کی تھی۔ کوئی نصیحت وغیرہ نہیں کی تھی۔

س: شادی کے بعد کیا تبدیلیاں آئیں؟

ج: کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔ ساس نندوں نے میرے لیے کچھ مشکلات پیدا کیں۔ ایک نند کا سوکن سے وٹہ سٹہ تھا۔ ایک کنواری تھی۔ ایک ناراض ہو کے میکے آ بیٹھی تھی۔ تین نندوں اور ساس نے مجھے اور میری دیورانی بہن کو ستانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ مگر میں سوچتی تھی کہ آہستہ آہستہ اپنے گھروں کو چلی جائیں گی۔ ویسا ہی ہوا، وٹہ سٹہ میں نند راضی ہو کے واپس چلی گئی۔ سوکن علیحدہ گھر میں اپنے بچوں کے ساتھ شفٹ ہو گئیں (میکے سے واپسی پر)۔ کنواری نند کی شادی ہو گئی۔ دوسری ناراض نند بھی سسرال سدھار گئی۔ ساس بے ضرر ہو چکی ہیں، وقت ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہتا، بدلتا ہے۔

س: میکے اور سسرال کے کھانوں میں فرق؟

ج: خاص فرق نہیں تھا۔ سسرال دیہات میں تھا۔ اپنے مویشی ہونے کے باعث دودھ، مکھن، دہی، لسی، دیسی مرغیاں وغیرہ کثرت سے پائی جاتی تھیں۔

س: سسرال نے وہ مقام دیا جو آپ کا حق تھا؟

ج: میرے میاں نے مجھے میرا حق دلوایا۔ خاندان ان کی دوسری شادی کے خلاف تھا مگر وہ میرے ساتھ تھے۔ انہوں نے مجھے چھوڑنے سے انکار کیا اور ڈٹے رہے۔ آج ہم میاں بیوی بچوں کے ساتھ فخر سے خاندان کی تقریبات میں شرکت کرتے ہیں۔ شادی کے بعد سے آج تک خاندان مجھے ان کی بیوی کی حیثیت سے عزت دیتا ہے۔ میرا حق مجھے میرے میاں نے دلایا۔ مرد زندگی میں عورت سے زیادہ قربانیاں دیتا ہے، اس کی تعریف ضرور کرنی چاہیے۔ میرے میاں عظیم انسان ہیں۔

س: سسرال سے وابستہ توقعات؟

ج: سسرال سے وابستہ توقعات پہلے پہل تو پوری نہ ہوئیں مگر اب سب اچھا ہے۔ نندوں نے شادی کے بعد جب اپنے سسرالیوں کو بھگتا تو عقل ٹھکانے آ گئی۔ اب وہ میری بہت اچھی دوستیں ہیں۔ ساس بھی بدل چکی ہیں، گھر صرف میرا ہے۔ وقت بدلتا ہے، ضرور بدلتا ہے۔

س: پہلے بچے کی پیدائش کب ہوئی؟

ج: پہلے بچے کی پیدائش شادی کے تین سال بعد ہوئی جو کہ بیٹی تھی۔ بیٹی بہت کمزور تھی جب وہ سات دن کی ہوئی تو ہم دیہات سے شہر شفٹ ہو گئے۔ بیٹی کی پیدائش خیر خیریت سے ہوئی، اس کے بعد اللہ نے چار بیٹوں سے نوازا۔ پہلی بار آرزو تھی کہ بیٹا ہو مگر اللہ نے رحمت سے نوازا۔ اب خوشی محسوس ہوتی ہے کہ پہلی اولاد بیٹی تھی۔ بیٹی اکلوتی ہونے کے باوجود بگڑی ہوئی، لاڈلی نہیں ہے بلکہ احساس کرنے والی اور ہمدرد ہے۔

س: جوائنٹ فیملی سسٹم پسند ہے یا علیحدہ؟

ج: جوائنٹ فیملی سسٹم کے فائدے بھی ہیں اور نقصان بھی۔ میرے خیال میں سب کے گھر ساتھ ساتھ ہوں مگر ہوں علیحدہ۔ میری صرف ایک دیورانی جمع بہن ہے، ان کا گھر ہمارے گھر سے تھوڑا ہی دور ہے۔

س: سسرال کے ماحول کو تبدیل کرنے کی کوشش کی؟

ج: سسرال کا ماحول میری موجودگی سے خود بخود تبدیل ہوا۔ میری نندیں ان پڑھ تھیں۔ میں کوئی خالص اردو کا لفظ یا انگریزی کا لفظ بولتی وہ سیکھ لیتیں۔ ہر کسی کو سسرال میں مثالی ماحول نہیں ملتا مگر برداشت کرنے اور وقت گزرنے سے سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔ میرے میاں نے بہت ساتھ دیا میرا۔ ہر طرح کے گھٹن زدہ ماحول میں وہ میرے لیے اطمینان اور راحت کا احساس تھے۔ آج ہم کامیاب ازدواجی زندگی گزار رہے ہیں تو بڑا ہاتھ میرے میاں کا ہے۔

پہلے وہ سخت مزاج تھے، اب بالکل الٹ ہو چکے ہیں۔ شوگر کے مریض ہیں، روز صبح میں ان کے سر ہوتی ہوں کہ چلیں ورزش کریں۔ وہ چھپ چھپ کے میٹھا کھاتے ہیں اور میں ان کے پیچھے پیچھے ہوتی ہوں۔ کسی نہ کسی بات پہ ہماری نوک جھونک کو بچے بہت انجوائے کرتے ہیں۔ یہی تو زندگی ہے اس کی اصل خوب صورتی مشکل اور سہل دونوں وقتوں سے ہے۔ وقت بدلتا ہے ضرور بدلتا ہے۔ بیس سال پہلے ہمارا ناتا جڑا۔ ہم دونوں نے اس ناتے کو نبھایا اور تا مرگ نبھانا ہے ان شاء اللہ۔

☆

ایف ایم 101 کی آر جے

ارم کاشف ہمراہ کاشف بقائی

شاہین رشید

ایف ایم 101 کی آر جے ارم کاشف ہمراہ کاشف بقائی

خوب صورت آواز، خوب صورت انداز گفتگو اور خوب صورت خدوخال کی مالک ارم کاشف سب کی پسندیدہ آر جے ہیں..... گھر اور سسرال میں یہ کتنی پسندیدہ شخصیت ہیں اور کس طرح انہوں نے اپنے گھر اور اپنی جاب کو بیلنس رکھا ہوا ہے یہ معلوم کریں گے اپنے مقبول سلسلے ''بندھن'' میں۔

''ارم! کیا حال ہے؟''

''جی..... اللہ کا شکر ہے۔''

''لائف کیسی گزر رہی ہے؟''

''الحمدللہ بہت اچھی۔''

''شادی کے خوب صورت بندھن میں بندھے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا؟ بچے اور شادی سے پہلے کیا ریلیشن تھا؟''

''میری شادی 31 دسمبر 2010ء میں ہوئی۔ میرے میاں صاحب کا نام کاشف بقائی ہے اور ان کا تعلق ''دہلی'' فیملی سے ہے۔ مطلب ''حکیمانہ دہلی برادری'' سے ان کا تعلق ہے، جبکہ میں حیدرآبادی ہوں اور کاشف آج کل سینئر نیوز پروڈیوسر ہیں ''نیوز ون'' چینل میں۔ اس سے پہلے وہ ڈان نیوز میں ''سن ٹی وی'' میں اور پی ٹی وی میں بھی پروڈکشن سائیڈ پر اپنے فرائض انجام دے چکے ہیں..... کاشف میرے رشتے دار نہیں ہیں لیکن چونکہ ہم دونوں ساتھ کام کرتے تھے تو آپ ہماری شادی کو لو میرج کہہ سکتی ہیں۔ ہمارے لو کو ہمارے والدین نے ارینج میں تبدیل کر دیا۔ ماشاءاللہ سے..... ہم اچھی لائف گزار

رہے ہیں اور میرا ایک بیٹا ہے ''محمد احمد بقائی'' اور اب وہ ماشاء اللہ سات سال کا ہو گیا ہے۔''

''شادی کے بعد شہر بدر ہوئیں یا کراچی میں ہی رہیں اور جو خواب دیکھے تھے شادی کے بارے میں پورے ہوئے؟''

''شادی کے بعد شہر بدر نہیں ہوئی بلکہ کراچی میں ہی رہی اور کاشف بھی کراچی میں ہی رہتے ہیں اور شادی کے لیے ایسے کچھ خواب نہیں دیکھے تھے کہ گھوڑے پہ شہزادہ آئے گا اور مجھے ''محلوں'' میں رکھے گا۔ دیو مالائی کہانیوں والے کوئی خواب نہیں تھے میرے...... لیکن یہ ضرور سوچا تھا کہ پارٹنر اچھا ہو اور ہمارے درمیان انڈراسٹینڈنگ رہے۔ اعتماد کے ساتھ ہم اپنی لائف گزاریں اور الحمد للہ میں بہت اچھی لائف گزار رہی ہوں۔''

''جوائنٹ فیملی میں آئیں؟ بڑی بہو بن کے آئیں؟ کتنے فیملی ممبرز ہیں؟''

''جی...... میں جوائنٹ فیملی میں آئی تھی اور میں سب سے چھوٹی بہو بن کے آئی تھی۔ ان کے تین بڑے بھائی اور ایک بہن ہے اور سب شادی شدہ ہیں...... اور بہت اچھا ریلیشن رہا سب سے۔ تین بھائی، تین بھابیاں اور ساس سسر سب مل جل کر ایک ساتھ رہتے تھے...... جبکہ میرے میکے میں ایک ایک بھائی اور ایک بہن تھی۔ بہن کی شادی ہو چکی تھی اور وہ بیرون ملک چلی گئی تھی۔ تو میں بہت مختصر فیملی سے جب بڑی فیملی میں آئی تو اچھا لگا تھا...... اور اس لیے بھی زیادہ اچھا لگا کہ دونوں فیملیز میں رشتوں کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ بڑے چھوٹوں کا ادب اور لحاظ بہت تھا۔

بچپن میں ہماری پھوپھو ہمارے ساتھ رہتی تھیں تو بڑا اچھا ریلیشن تھا ہمارا اور چونکہ ہماری تربیت بہت اچھی ہوئی تھی تو بالکل بھی مشکل نہیں ہوئی ایڈجسٹ ہونے میں...... شادی کے تقریباً چار پانچ سال ہم جوائنٹ فیملی میں رہے۔ اب سب کے بچے بڑے ہوئے تو سب علیحدہ ہوئے ہیں...... میرے سسر کا دو سال قبل انتقال ہوا، اور اب ساس ہمارے ساتھ ہیں تو جب ساس سے ملنے سب آتے ہیں تو رونق دوبالا ہو جاتی ہے۔''

''میاں صاحب دہلی کے آپ حیدر آبادی تو کھانوں کے ذائقے میں تو فرق ہوگا؟''

''جی...... بالکل فرق تھا۔ مگر دونوں کے کھانوں کا مزہ اپنا اپنا ہوتا ہے۔'' ان کے یہاں روٹی پہ زیادہ زور ہوتا تھا اور ہمارے یہاں چاولوں پہ زیادہ زور ہوتا تھا...... تو شروع میں روٹی کھانے کو زیادہ ملتی تھی۔ مگر پھر آہستہ آہستہ عادت ہو گئی اور پھر میں ''دہلی'' کے کھانے بھی بہت اچھے بنانے لگی اور حیدر آبادی تو بناتی ہی تھی...... دہلی کے کھانے سسرال میں آ کر سیکھے اور اس میں کچھ حیدر آبادی رنگ بھی شامل کر دیا ہمارے والدین کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے لڑکیوں میں کچھ ایسی عادتیں ڈالی ہوئی ہوتی ہیں کہ وہ آہستہ آہستہ اس ماحول کو اپنا لیتی ہیں جہاں وہ رہتی ہیں اور کچھ اپنی چیزیں بھی شامل کر دیتی ہیں اپنے پیار محبت سے۔''

''شادی کے بعد کاشف صاحب کو کیسا پایا؟''

''الحمد للہ میں کہہ سکتی ہوں کہ میں ان خوش نصیب لوگوں میں سے ہوں جن کا پارٹنر بہت اچھا اور سمجھ دار ہے...... کاشف بہت اچھے انسان ہیں اور سب کا بہت زیادہ خیال رکھتے ہیں اور سب کے لیول پہ جا کر ان کی بات کو سمجھتے ہیں اور نیوٹرل ہو کر بات کرتے ہیں۔ کاشف کی نیچر بہت اچھی ہے اور پوزیٹو نیچر ہے۔''

''مزاج کے نرم یا گرم؟ کوئی بری عادت؟ جہیز کی کوئی ڈیمانڈ کی؟''

''غصہ ایک فطری عمل ہے۔ ہر انسان کو آتا ہے۔ مگر ردِعمل مختلف ہوتے ہیں۔ کاشف کی سوچ چونکہ بہت مثبت ہے تو ہر ایک بات میں مثبت پہلو نکال لیتے ہیں...... اور کوئی ایسی عادت نہیں ہے جو

بہت بُری ہو..... ہم دونوں نے ایک ساتھ کافی وقت گزارا تو مجھے ان میں کوئی بری عادت نظر نہیں آئی بلکہ اچھی عادتیں بہت زیادہ ہیں ..... جہیز کی کوئی ڈیمانڈ نہیں کی اور کہا کہ ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو بیٹی بھی لے لیں اور جہیز بھی، تو مجھے اس وقت ان کی سوچ پر بہت فخر ہوا کہ میں اتنے اچھے انسان کے ساتھ بیاہی جارہی ہوں ..... انہوں نے گھر کی، کمرے کی ساری سیٹنگ خود کی تھی ..... ان کے

اس عمل سے فیملیز میں ایک پوزیٹو سوچ نے جنم لیا کہ ایسا ہی ہونا چاہیے۔"

"شادی میں بے جا اصراف ہوا؟ مطلب بہت دھوم دھام سے ہوئی شادی؟"

"میری شادی میں بہت زیادہ اصراف نہیں ہوا تھا۔ نارمل انداز میں شادی ہوئی، حالانکہ ہم دونوں میڈیا پرسن تھے..... شادی ولیمہ ماشاء اللہ بھرپور ہوا تھا لیکن کوئی اصراف نہیں ہوا تھا..... مایوں میں اپنے گھر پہ ہی بیٹھی تھی۔ نماز جمعہ کے وقت ہمارا نکاح ہوا تھا اور رات کو رخصتی ہوئی تھی۔ کوئی فضول رسومات نہیں ہوئی تھیں۔ ولیمے میں سب نے بھرپور حصہ لیا، دوست احباب نے شرکت کی۔ ایک اچھی گیدرنگ تھی۔"

"ہنی مون کے لیے کہاں گئی تھیں؟ منہ دکھائی میں کیا ملا تھا؟"

"ہنی مون کے لیے ہم پاکستان ٹور پہ گئے تھے۔ جنوری کا مہینہ تھا اور خوب سردی تھی، برف باری بھی دیکھی تو بہت مزہ آیا تھا۔ منہ دکھائی میں مجھے گولڈ اور ڈائمنڈ کا پینڈنٹ ملا تھا جو وہ مجھے بہت پسند ہے۔"

"لڑائی جھگڑے تو ہوتے ہی ہوں گے۔ کوئی تیسرا آتا ہے درمیان میں یا نہیں؟"

"کسی بھی مسئلہ کو لے کر ہمارے درمیان تھوڑا سا بھی اختلاف ہوتا ہے تو ہم آپس میں بات کر کے اس کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسا نہیں کہ وہ الگ منہ بنا کے بیٹھے ہوں اور میں الگ اور کوئی تیسرا فرد ہمارے درمیان آتا نہیں کہ ہم دونوں اتنے سمجھ دار ہیں کہ اپنے مسائل خود ہی حل کر لیتے ہیں..... روٹھنا منانا تو چلتا رہتا ہے زندگی کے ساتھ..... بڑا مسئلہ کبھی نہیں ہوا اور یہ بھی شکر ہے اللہ کا کہ کسی تیسرے کے پاس جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی..... اور سب سے بڑی بات یہ کہ ہم اپنے پرابلمز اور اپنی باتیں کسی سے شیئر نہیں کرتے۔ اس وجہ سے ہمارا ریلیشن بہت کامیاب ہے۔"

"آپ بھی جاب کرتی ہیں اور کاشف بھی..... گھر ڈسٹرب ہوا آپ کا؟"

"ہم دونوں کا تعلق میڈیا سے رہا ہے..... شادی سے پہلے۔ اس وقت میں ریڈیو بھی کر رہی تھی پروڈکشن میں بھی کام کر رہی تھی ٹی وی پہ 2005ء سے میں ریڈیو پر ہوں، پہلے 103 پہ تھی 2011ء تک مسلسل کام کیا۔ ریڈیو ایف ایم 103 پہ — اسسٹنٹ ڈائریکٹر نیوز تھی میں..... لیکن جب شادی ہوئی اور ذمہ داریاں بڑھیں تو اس وقت میں نے ایک جاب کو خیرباد کہہ دیا تھا..... دوسری چل رہی تھی۔ مگر بیٹے کی پیدائش کے بعد میں نے دونوں جابز کو خدا حافظ کہہ دیا۔ کیونکہ مجھے لگا کہ میرے بیٹے کو میری زیادہ ضرورت ہے۔ اس لیے کہ اگر اس وقت میں نے اس کی تربیت پر توجہ نہ دی تو اس کی شخصیت ادھوری رہ جائے گی..... پھر 2014ء میں میں نے ریڈیو دوبارہ جوائن کر لیا..... چونکہ فری لانس کام کر رہی ہوں تو مجھے روزانہ نہیں جانا پڑتا..... بلکہ کچھ شوز ہوتے ہیں جو مجھے کرنے ہوتے ہیں، ان کی ٹائمنگ اس طرح ایڈجسٹ کر لیتی ہوں کہ گھر ڈسٹرب نہ ہو بچہ نظر انداز نہ ہو۔ میاں اور گھر نظر انداز نہ ہو۔ یہ جاب اپنے شوق اور اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لیے۔ یہ کہ میں گھر داری کے علاوہ بھی کچھ کر سکتی ہوں کر رہی ہوں..... بیک وقت ہم دونوں گھر سے غائب نہیں ہوتے ہیں۔ گھر میں، میں ہوتی ہوں یا پھر کاشف گھر پر ہوتے ہیں..... کیونکہ اولاد کی

https://reading.urduforum.net/

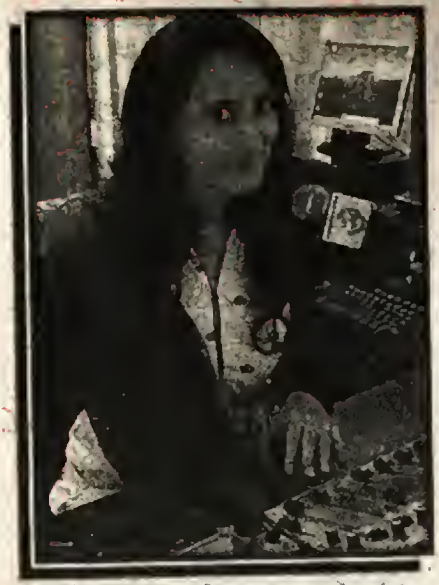

تربیت اللہ نے والدین کے ذمہ لگائی ہے اس سے کوتاہی تو کر ہی نہیں سکتے۔''

''آپ کے کام کو آپ کے سسرال والے سراہتے ہیں؟''

''ہاں...... جی...... الحمد للہ میرے کام کو میرے سسرال والے سراہتے ہیں۔ چاہے گھر کے کام ہوں یا باہر کے کام...... گھر والے چونکہ کھانے کے شوقین ہیں تو میری کوکنگ کو بھی پسند کرتے ہیں اور میرے گھر سے باہر والے کام کو بھی...... گھر والوں کی تعریف میرا حوصلہ بڑھاتی ہے۔''

''شادی میں جو رسمیں ہوئیں، ان میں سب سے اچھی رسم کون سی لگی آپ کو؟''

''ایک رسم مجھے بہت اچھی لگی جو ہمارے خاندان میں نہیں ہوتی۔ نہ کبھی دیکھی تھی...... مگر اس رسم میں مزہ آیا۔ یہ رسم شادی کے دوسرے دن کی رسم تھی...... ناشتے کی رسم تھی اور بہت زیادہ اہتمام کیا جاتا ہے۔ قریبی رشتے داروں کو بلایا جاتا ہے۔ لڑکی کے گھر والوں کو بھی مدعو کیا جاتا ہے۔ ایک بڑا دسترخوان بچھتا ہے۔ سب بیٹھتے ہیں اور نئے جوڑے (couple) سے سب کا تعارف کرایا جاتا ہے اور آنے والے مہمان اپنی مرضی سے ایک ایک نوالہ دولہا دلہن کو کھلاتے ہیں اور پھر سب کی طرف سے منہ دکھائی ملتی ہے۔ تو بہت اچھی لگی تھی یہ رسم اور میں نے بھرپور انجوائے کیا تھا...... بہت خوشگوار موڈ میں تھے اور ہنسی مذاق چل رہا ہوتا تھا۔''

''نکاح نامہ پڑھا تھا؟ کیا تاثرات تھے؟''

''جی نکاح نامہ پڑھا تھا اور نکاح کے وقت جو کیفیت ایک لڑکی کی ہوتی ہے اس کو لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے...... لڑکی ان رشتوں کو چھوڑ کر جارہی ہوتی ہے جن سے دور رہنے کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔

اس کیفیت کو لفظوں میں بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ رخصتی کے وقت رونا بھی آتا ہے اور خوشی بھی ہوتی ہے کہ ایک نئی زندگی کی شروعات کرنے جارہے ہیں اور

یہ دعا کی تھی کہ اللہ تعالیٰ جس رشتے میں مجھے باندھنے جارہا ہے وہ میرے لیے خوشیاں لے کر آئے اور جو فیصلہ بڑوں نے کیا ہے وہ اچھا ثابت ہو، کسی کو مایوسی نہ ہو اور الحمد للہ یہ دعا پوری ہو رہی ہے اور ہم ایک اچھی زندگی گزار رہے ہیں اور ہمارے بڑے بہت خوش ہوتے ہیں ہمیں ایک اچھی زندگی گزارتے دیکھ کر۔''

''کہتے ہیں لڑکی کو بہت کچھ سہنا بھی پڑتا ہے اور کمپرومائز بھی کرنا پڑتا ہے...... ایسا ہے؟''

''میاں بیوی گاڑی کے دو پہیے ہیں اور گھر دونوں مل کر ہی بناتے ہیں، اگر لڑکی یہ سوچ لے کہ یہ گھر میرا ہے اور مجھے ہی سنوارنا ہے تو کوئی مسئلہ نہ ہو...... کمپرومائز دونوں کو ہی کرنا پڑتا ہے، لڑکی کو ذرا زیادہ کرنا پڑتا ہے کیونکہ وہ ایک نئے ماحول میں آتی ہے اور اسے اپنے آپ کو چینج بھی کرنا پڑتا ہے اور ایڈجسٹ بھی...... اور سارے کام چٹکی بجاتے نہیں ہو جاتے...... کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جس میں اپنے من کو مارنا بھی پڑتا ہے...

...اور پھر جس مرد کے ساتھ آپ کا

رشتہ استوار ہوا ہے اس مرد کے بھی اپنے رشتے ہیں اور اسے ان رشتوں کے ساتھ قبول کرنا آپ کی ذمہ داری ہے، یہ نہیں ہونا چاہیے کہ پہلے اپنی ماں کے پاس کیوں گئے۔ اپنی بہن کو یہ کیوں دیا..... یہ سوچ کر اگر آپ نئی زندگی میں آئیں گی تو کبھی ایڈجسٹ نہیں کر پائیں گی اور ان ہی باتوں کا خیال ایک مرد کو بھی کرنا چاہیے اور الحمدللہ میرے شوہر نے مجھے اپنے ماحول میں ایڈجسٹ ہونے میں بہت مدد کی ہے۔ بہت کچھ انہوں نے مجھے سمجھایا ہے۔ نہ اپنے گھر والوں کو میرے سامنے نیچا کیا ہے نہ اپنے گھر والوں کے سامنے مجھے نیچا کیا ہے۔ ایک باہم انڈر اسٹینڈنگ سے سارے معاملات حل ہو سکتے ہیں۔"

"میاں صاحب کھانے پینے کے شوقین ہیں؟"

"میرے میاں صاحب بہت چٹورے ہیں، لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا کہ وہ چٹ پٹے کھانے ہی کھائیں..... الحمدللہ کھانے پینے میں کوئی نخرے نہیں ہیں۔ مگر کھانے کے شوقین ہیں۔ اسی حساب سے گھر کا دسترخوان سجتا ہے۔ اور کاشف میری بہت مدد بھی کرتے ہیں اور میرے ساتھ کام بھی کرواتے ہیں۔"

"کاشف کی کوئی اچھی اور بری عادت بتائیں؟ وہ آپ کی جاب سے خوش ہیں؟"

"بہت پوزیٹو ہیں۔ بہت کوآپریٹو ہیں اور جب کوئی پازیٹو ہوتا ہے تو کسی بھی معاملے کو حل کرنے میں مشکل نہیں ہوتی، ہر چیز میں بہت زیادہ ساتھ دیتے ہیں۔ شادی کے بعد اور پھر بیٹے کی پیدائش کے بعد میں نے جاب چھوڑ دی تھی تو دوبارہ جاب کی طرف راغب کاشف نے ہی کیا کہ تم میں بہت ٹیلنٹ ہے گھر بیٹھ کر اپنے ٹیلنٹ کو ضائع مت کرو۔ انہوں نے ہی مجھے اعتماد دیا اور مجھے ان کی یہ عادت بہت اچھی لگی۔ اور جب میں نے دوبارہ ریڈیو میں قدم رکھا تو اپنا وہ شوق پورا کیا جو مجھے بہت بچپن سے تھا..... یعنی ریڈیو آر جے پریزنٹر بننے کی خواہش..... اور شکر گزار ہوں کاشف کی کہ انہوں نے مجھے موقعہ دیا۔"

"کاشف کو آپ کس روپ میں بہت اچھی لگتی ہیں؟"

"کاشف کو میں ہر روپ میں اچھی لگتی ہوں۔ سجی بنی بھی اچھی لگتی ہوں..... گھر میں تو میں سادہ ہی رہتی ہوں۔ وہ خوش ہوتے ہیں جب میں تیار ہوتی ہوں..... اور اچھی لگتی ہوں تب ہی تو ان کی لائف پارٹنر ہوں۔"

"کاشف کی کوئی بات جو آپ ان سے کہنا چاہتی ہیں..... تو اس انٹرویو کے ذریعے سے کہہ دیں؟"

"کاشف ایک اچھے انسان ہیں..... اور ہر لڑکی کی خواہش ہوتی ہے کہ ایک ایسا لائف پارٹنر ملے جو کانفیڈنٹ ہو۔ اچھی نیچر کا مالک ہو اور کاشف ایسے ہی ہیں۔ کہتے ہیں نا کہ عادتیں تو بدلتی رہتی ہیں انسان کی نیچر، فطرت اچھی ہونی چاہیے..... کاشف کی فطرت بہت اچھی ہے، مائنڈ بہت صاف ہے، سلجھے ہوئے، سمجھ دار اور فیملی اور رینڈ ہیں اور ہمیشہ پوزیٹو رہتے ہیں..... کاشف بہت معاملہ فہم ہیں اور معاملے کو بڑی جلد بھانپ جاتے ہیں اور مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کو لے کر بیٹھتے نہیں ہیں..... یہ صرف میرے ساتھ بلکہ سب کے ساتھ بہت پیار محبت سے رہتے ہیں اور اپنے رشتے کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ میرے والدین سے بہت پیار کرتے ہیں۔ میرے بھائی، بھابھی سے بھی بہت پیار کرتے ہیں اور ایک بیلنس لائف گزارتے ہیں۔ اپنے بیٹے سے بہت زیادہ محبت کرتے ہیں۔ ایک والد کے روپ میں بھی کاشف زبردست شخصیت کے مالک ہیں؟ مجھے اکثر جلدی غصہ آجاتا ہے..... مگر انہیں نہیں۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے ارم کاشف سے اجازت چاہی۔

https://reading.pakistan.net

شعاع کے ساتھ ساتھ

ادارہ

ماریہ نذیر بھاگٹانوالہ

1۔شعاع کب پڑھنا شروع کیا یہ یاد تو ہے مگر تھوڑا تھوڑا کیونکہ تب چھوٹی تھی۔

میں 4th کلاس میں تھی تب جوڑ توڑ کر کے اردو پڑھائی جاتی تھی تو جب اردو پڑھنا آ گئی پھر تو ہم سے کوئی چیز نہ بچ سکی۔ ہاہاہا۔ ہر چیز پڑھ کر ہی چھوڑتے تھے خواہ وہ عمر وعیار، ٹارزن والی کہانیوں والی کتاب ہوتی یا کوئی ڈائجسٹ۔ پڑھنے کا ایسا چسکا لگا کہ ابھی تک یہی عادت ہے۔ کچھ پڑھے بغیر نیند نہیں آتی۔ صفائی کرتے وقت جو بھی اخبار کا ٹکڑا یا کوئی اور چیز مل جائے پڑھ کر پھر صفائی پوری کرتی ہوں۔ ہاہاہا۔

مختصر یہ کہ شعاع پڑھتے ہوئے چودہ، پندرہ سال ہو گئے ہیں۔ پہلے ادھر ادھر سے لے کر پڑھ لیتے تھے مگر 2013 سے باقاعدگی سے لینا شروع کر دیا ہے۔ پندرہ سال پرانا ساتھ ہے شعاع کا مجھ سے۔ دوستی اور ساتھ جتنا پرانا ہو اتنا ہی پائیدار ہوتا ہے۔ شعاع نے ہر موڑ پر راہنمائی کی ہے۔ شعاع کے لیے شعر عرض ہے۔

خدا تجھے اتنا عروج دے !!!
کہ آسمان بھی تیری وسعتوں پر ناز کرے !!!

2۔صبح کا آغاز چار بجے ہو جاتا ہے۔ بچپن کی روٹین تھی مطلب پڑھائی کے زمانے کی، جلدی اٹھنا ہے ٹیسٹ یاد کرنے کے لیے تو ابھی تک وہی روٹین ہے۔ رات جتنا مرضی دیر سے سولوں، صبح جلدی آنکھ کھل جاتی ہے۔ اللہ رب العزت کی حمد وثناء کے بعد صفائی کرتی ہوں صحن کی۔ پھر ناشتہ کر کے سارا دن فارغ (ہاہاہا) کیونکہ میں نے بی ایس (آنرز) کیا ہے کیمسٹری میں تو ابھی جاب نہیں ملی اس لیے گھر میں ہی ہوتی ہوں ویسے سی ایس ایس کرنا ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔ آپ سب دعا کیجیے گا۔ پھر سارا دن میں کوئی کتاب پڑھ لی یا کارڈز وغیرہ بنا لیے۔ شام کو ٹیوشن پڑھا کر تھوڑا ریسٹ کر کے کھانا کھایا اور سو گئی۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر کے کہ سارا دن اللہ کے کرم سے اچھا گزر گیا۔ اب رات بھی اچھی گزر جائے۔ نئے دن کی امید لے کر۔

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عمر یونہی تمام ہوتی ہے !!!

3۔افسانوں کی دنیا بہت اچھی ہوتی ہے۔ کچھ دیر کو ہی سہی لیکن انسان زندگی کی تلخیوں سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔ افسانے بھی ہمارے اردگرد کی ہی کہانیاں ہوتی ہیں کچھ سچ ہوتی ہوں گی کچھ خیالی۔ ویسے میں خواب نہیں دیکھتی۔ اک ہی خواب، خواہش اور آرزو کہ ایس ایس سی کا ایگزام کلیئر کر لوں۔

4۔خوبیاں اور خامیاں..... بندہ بشر ہوں۔ خامیاں بھی ہوں گی اور خوبیاں بھی۔ خامی یہ ہے کہ غصہ جلدی آ جاتا ہے اور اب تو ہر وقت ہی آیا رہتا ہے مگر آتا غلط بات پر ہے۔ بس میرے خیال میں یہ خامی ہی ہے۔ باقی سب ٹھیک ہے اور خوبی یہ ہے کہ کسی کے دکھ پر دکھی ہو جاتی ہوں جلدی، کسی کو دکھ، تکلیف اور مصیبت میں دیکھ نہیں سکتی اور بس میں کچھ نہ ہو تو دعا ضرور کرتی ہوں کہ سب کی مصیبتیں پریشانیاں اور دکھ دور فرما دے مولا اور ہاں سچ یاد آیا۔ خامی یہ بھی ہے کہ دوسروں پر جلدی اعتبار کر لیتی ہوں۔ انجان لوگوں پر بھی (ہاہاہا) پھر بہت دکھ ہوتا ہے۔ جب اگلا بندہ بے وقوف بنا جاتا ہے۔ باقی اللہ کا شکر ہے جو اللہ نے بنایا جیسا بنایا سب ٹھیک ہے۔

5۔شعاع کی ہر تحریر لاجواب ہوتی ہے۔عمیرہ احمد، نمرہ احمد، نعیمہ ناز، نگہت عبداللہ، نگہت سیما، بشریٰ سعید، فائزہ افتخار، رخسانہ نگار، صائمہ اکرم، نایاب جیلانی، فرحت اشتیاق، رفعت سراج، راحت جبیں، سمیرا حمید، فرزانہ کھرل، ان سب کی تحریر بہت لاجواب ہیں۔ اللہ نے ان سب کو بہت زیادہ صلاحیت دی ہے۔مدتوں یاد رہنے والی اسٹوری سمیرا حمید کی (راہ نور) ہے۔بہت بہت اچھی کہانی تھی۔ بہت امید والی۔رونا بھی آیا پڑھ کر۔اس کے علاوہ یارم، زرد موسم، محبت، خواب، سفر، ام الیقین، شہر خطا، خواب شیشے کا، جنت کے پتے، محل، قرا قرم کا تاج محل، بیلی راجپوتوں کی ملکہ، پیر کامل، آب حیات (بیسٹ ترین)، پھول منڈی اور رزق زوال یہ سب تحریریں ابھی تک ذہن پر نقش ہیں اور تا عمر رہیں گی۔

کسی کردار میں اپنی جھلک نظر نہیں آئی مگر جنت کے پتے کی "حیا" کی طرح ہونا چاہوں گی اور دینا فضل کریم جیسی بھی۔

ایمل رضا موسٹ فیورٹ رائٹر اور فیورٹ اسٹوری (پیال ساز) صائمہ اکرم چوہدری (دیمک زدہ محبت اور فرح بخاری (بن پانی)

6۔ساون، برسات اور سردیوں کی بارش میرے خیال میں سب کو اچھی لگتی ہوگی مگر مجھے بارش نہیں پسند، سردیوں کی تو بالکل بھی نہیں۔ہاں گرمیوں کی تھوڑی بہت پسند ہے مگر بعد میں جب حبس ہو جاتا ہے تب اچھی نہیں لگتی۔ویسے برسات کی بارش اور گیلی مٹی کی خوشبو پسند ہے۔جب بارش مٹی پر گرتی ہے تو سوندھی سوندھی خوشبو بہت پسند ہے۔(ہاہاہا مگر بارش نہیں پسند) آپ لوگ بھی کہہ رہے ہوں گے عجیب سائیکو کیس ہے یہ ہاہاہا۔

7۔پسندیدہ شعر:۔

ہم سفر وہ عطا کرنا مولا!
جو تیرے خیال سے غافل نہ کردے!!!

الف لیلہ ہزار داستانیں

دلچسپ اور خوبصورت داستانیں جنہیں پڑھ کر بچے ہیری پوٹر کو بھول جائیں گے، ایسی داستانیں جنہیں بڑے بھی پڑھ کر لطف اندوز ہونگے

کتاب بذریعہ رجسٹری منگوائیں
-/300 روپے کا ڈسکاؤنٹ حاصل کریں
فی کتاب -/1200 روپے
ڈسکاؤنٹ -/300 روپے
آج ہی -/950 روپے
منی آڈر ارسال فرمائیں

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37 اردو بازار، کراچی۔فون: 32216361

8۔ پسندیدہ کتاب، سفال گر، جنت کے پتے، راجہ گدھ، زاویہ اشفاق احمد، تاریخ کی ساری کتابیں پسند ہیں۔

9۔ پسندیدہ اقتباس:۔

سمیرا حمید (راہ نورد شوق)

" جب ایک دروازہ بند ہوتا ہے تو دوسرا کھل جاتا ہے۔ دوسرا بند ہوتا ہے تو تیسرا اور جب سارے دروازے بند ہو جاتے ہیں تو " اللہ کے فضل " کا دروازہ کھلتا ہے جو کبھی بند نہیں ہوتا۔"

10۔ آخر میں اک بات سب کے لیے

" کسی کو چھوڑنے سے پہلے اتنا ضرور سوچنا کہ اب تک اس کے ساتھ کیوں تھے؟"

سب بتائیے کیسا لگا تعارف (ہاہاہا)

حفصہ اسلم نیازی...... دریا خان بھکر

1۔ شعاع پچھلے سال پڑھنا شروع کیا یعنی 2017 سے پہلے کرن خریدا پھر خواتین پھر شعاع۔ اب تینوں پڑھتی ہوں۔ کبھی ماما سے پیسے لیتی ہوں کبھی پاکٹ منی سے۔ ماما کہتی ہیں ایک پڑھو یا دو۔ مگر میں کہتی ہوں تینوں — شعاع سے جو عقیدت ومحبت ہے وہ کبھی کم نہ ہوگی اب ان شاء اللہ ساری زندگی پڑھوں گی۔

2۔ صبح کا آغاز آج کل ساڑھے چھ بجے ہوتا ہے۔ نماز کے بعد میں ٹی وی دیکھتی ہوں۔ اس کے بعد کالج جانے کی تیاری کر کے کالج پہنچ جاتی ہوں۔ کالج کو رونق بخشنے (آہم آہم) کوئی لائق فائق بندی نہیں البتہ میں ذہین ہوں۔ لیکن پڑھائی کے معاملے میں انتہا درجے کی سست۔ کالج میں ہمارا گروپ مشہور ہے۔ جناب! پڑھائی کے بارے میں نہیں ہنسنے کے بارے میں۔ سخت سے سخت سچویشن چل رہی ہو لیکن ہماری ہنسی نہیں تھمتی۔ ٹیچرز سے ہماری جان جاتی ہے۔ جس دن سبق یاد ہو تو بھی نہیں سناتے کہ کہیں ٹیچر پہچان نہ لیں۔ (ظاہر ہے پھر روز روز سنیں گی)۔

دنیا بھر سے منتخب معیاری ادب

عمران ڈائجسٹ

Emale: id@khawateendigest.com

مارچ 2019 کے شمارے کی ایک جھلک

سلطان محمد فاتح

ملت اسلامیہ کے لازوال کردار "سلطان محمد فاتح" کے کارہائے نمایاں کی سبق آموز داستان

محترمہ شاہدہ لطیف کی سلسلہ وار کہانی تاریخ کے جھروکے سے۔

انمول شوق

کھیل شروع کسی بھی انداز میں ہو لیکن اختتام ہمیشہ چونکانے والا ہوتا ہے

جاوید راہی کی کاوش۔

معیاری دشمن

الیکشن کا موسم آتے ہی ہر سیاست دان جیتنے کے لیے داؤ پیچ آزمانے لگتا ہے۔ ایک ایسے ہی ذہین سیاست دان کی سرگرمیاں۔

امجد آغا کے قلم سے۔

زیست پرستم

دوسروں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے والی ایک لڑکی کی ذہانت۔

فریحہ ملک کا منفرد انداز۔

خزاں کے بعد

زمین پر کروفر سے چلنے والے ایک ظالم شخص کا عبرت انگیز انجام۔

محمد سلیم اختر کی جادو بیانی۔

شام کے بعد

ماں کا عشق کسی کے ملنے سے ممتا کے جذبے سے سرشار پائی جاتی ہے۔

صائمہ عروج کی ترجمانی۔

اس کے علاوہ دیس بدیس کی پراسرار، سسپنس اور تجسس سے بھرپور 9 مشہور و معروف مصنفین کی طبع زاد و ترجمہ کہانیاں

مارچ 2019 کا تازہ شمارہ آج ہی خرید لیں

جس دن ٹیسٹ یاد نہ ہو، سارا گروپ تین تین بار آیت الکرسی پڑھ کر کے خود پے اور میم پہ پھونک مار دیتا ہے۔ حیرت انگیز طور پر آج تک ہم بچ جاتے ہیں (اللہ کا بہت کرم ہے)۔

آہم...... خیر کالج سے گھر لوٹ کے میں نماز پڑھنے کے بعد تھوڑا سا بالکل تھوڑا سا پڑھتی ہوں۔ شام سے پہلے گھر کی صفائی کرتی ہوں۔ آٹا گوندھ کے روٹی بناتی ہوں۔ کیوں کہ سالن ماما کی ڈیوٹی۔ بتانا بھول گئی کہ میری کوئی بہن نہیں ہے (ایک ہاہ) صرف چار جنگلی بلے چھوٹے بھائی ہیں، ماما، پاپا اور دادی ہماری چھوٹی سی فیملی ہے۔ خیر روٹیاں بنانے اور ڈکارنے کے بعد میں پھر ٹی وی دیکھتی ہوں۔ اپنے پیارے، دلارے، شعاع خواتین اور کرن پڑھتی ہوں۔ ماما کی کسی نہ کسی بات پر ڈانٹ کھا کے سونے چلی جاتی ہوں (کتنی نکمی ہوں ناں میں)

3۔ خوبیاں بے شمار ہیں۔ لیکن مجھے جو سب سے اچھی لگتی ہے ہر وقت ہنستے اور ـــــ بولتے رہنا۔ میں کبھی ٹینشن نہیں لیتی۔ غصہ بالکل نہیں آتا (کاش تھوڑا آتا) میں دوسروں کو عملی خوشیاں نہیں دے سکتی تو اپنی زبان سے انہیں ہنسا سکتی ہوں۔ یہ میری سب سے بڑی خوبی ہے۔

خامی یہ ہے کہ (بہت سوچنا پڑ رہا ہے) آہم آہم ہاں کسی کو نہیں بخشتی۔ ہر کسی پر جگت مار دیتی ہوں۔ میری دوستوں کے بقول "تمہیں سیاست پسند ہے۔ یہ تمہاری خامی ہے" (ایویں ہی) جب میں نے اپنی کلاس میں کہا تھا کہ میں سیاست دان بنوں گی تو ساری کلاس اور میم قمر کی آنکھیں ابل پڑیں۔

"غصہ سے دور رہو۔ اس کے ارادے بڑے خطرناک ہیں۔" میم قمر نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

ایک اور خامی میں چار وقتہ نمازی ہوں۔ عشا کی نماز ہمیشہ چھوڑ دیتی ہوں۔ ان شاء اللہ جب 2019 گزرے گا تو میں پانچ وقت کی نمازی ہوں گی۔

4۔ پسندیدہ کہانیاں ایک نہیں بے شمار چاہے وہ نمیرا احمد کی ٹیولپ، راہ نوردِ شوق، راہ نور افسانہ، اس در کا جوگی ہو یا نمرہ احمد کے قراقرم کا تاج محل، حالم یا عمیرہ احمد کے پیر کامل، الف یا فرح بخاری کا بن باسی یا سدرہ حیات کا "کچھ خواب ہیں" یا نازیہ رزاق کا یورپ پچھم، سائرہ رضا کا حسن المآب، ثریا کی گڑیا، جمال زہرا، مصباح علی سید کا مہجور، ثمین، تنزیلہ ریاض کا رپنزل اور غم ہے یا خوشی ہے میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ پیر کامل پڑھنے کے بعد میں نے نماز کی پابندی شروع کی۔

5۔ شعروشاعری کوئی خاص پسند نہیں بس پڑھ لیتی ہوں۔ پسندیدہ شعر

تم سے الفت کے تقاضے نہ نبھائے جاتے
ورنہ ہم کو بھی تمنا تھی کہ چاہے جاتے

کتابیں پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ کالج کی لائبریری سے ہر ہفتے نکلوانے پہنچ جاتی ہوں۔ اب تک لائبریری سے نکلوا کے جو کتابیں پڑھیں۔ ان میں خدیجہ مستور کا آنگن، شوکت صدیقی کا "خدا کی بستی" اور مستنصر حسین تارڑ کا ناول پکھیرو پسند آئے۔ پسندیدہ اقتباس، نمیرا احمد کے ناول راہ نورد شوق سے۔

"جس جگہ آپ نے اپنے نام کا جھنڈا لگانا ہو، وہ جگہ پتھر ہوتی ہے جس جگہ قدموں کے نشان ثبت کرنے ہوں۔ وہ جگہ دلدل ہوتی ہے۔"

اعتذار

معذرت خواہ ہیں، ہاتھ میں فریکچر کے باعث اس ماہ صائمہ اکرم ناول کی قسط نہ لکھ سکیں۔ اس لیے اس ماہ ناول "شہرزاد" کی قسط شامل نہیں ہے۔ ان شاء اللہ آئندہ ماہ قارئین ناول شہرزاد کی قسط پڑھ سکیں گی۔

خواتین و دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ

مارچ 2019ء کے شمارے کی ایک جھلک

- "الف" عمیرہ احمد کا ناول،
- "حالم" نمرہ احمد کے ناول کی قسط،
- "میرا ایک آئندہ ہے" فرزانہ کھرل کا مکمل ناول،
- "میرے تم" سدرۃ المنتہیٰ کا مکمل ناول،
- "زندگی ایک پہیلی" افشین نعیم کا ناولٹ،
- بشریٰ احمد، قرۃ العین سکندر، مونا قریشی،

قرۃ العین خرم ہاشمی، شازیہ الطاف ہاشمی اور ماہم انصاری کے افسانے،

- مشہور صحافی سہیل وڑائچ سے ملاقات،
- سالنوری کے تبریز "اسامہ اعظم خان" سے باتیں،
- کرن کرن روشنی پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں،
- ہمارے نام، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں،

عدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

خواتین ڈائجسٹ کا مارچ 2019 کا شمارہ آج ہی خرید لیں

نعیمہ ناز

سحرِ تمنا

عالیہ بیگم اپنی بیٹی حمنہ کے رشتے کے لیے خاندانی لوگوں کی تلاش میں تھیں۔ جب کہ ان کی ساس کا کہنا تھا کہ رشتہ کے لیے دین داری اور شرافت کو ترجیح دو۔

عائشہ اپنی والدہ اور بھائی کے ساتھ ایک چھوٹے سے گھر میں رہتی تھی۔ رشتوں کے نام پر اس کی ایک خالہ تھیں جن کے دو بچے فہد اور علیزے تھے۔ فہد اپنے باپ کے پاس امریکہ میں پڑھنے گیا تھا۔ اس کی والدہ سلائی کر کے اپنے بچوں کو پڑھا رہی تھیں۔ عائشہ کی سہیلیاں اس کی بے پناہ خوب صورتی کو سراہتی تھیں۔

سید صاحب کو مسجد کمیٹی کا صدر منتخب کیا جا رہا تھا۔ ان کی بیٹی نائلہ ایک خودسر لڑکی تھی، اس کی اپنے شوہر سے بالکل نہیں بنتی تھی۔ وہ آئے دن اپنے شوہر سے لڑ جھگڑ کر باپ کے گھر آ بیٹھتی۔ اس میں ماں کے مزاج کی جھلک تھی۔ اسے اپنی خوب صورتی پر ناز تھا۔ سید صاحب اس کی طرف سے بہت پریشان تھے۔ نائلہ کے شوہر سرمد کا دوست جمال اس پر مر مٹا تھا۔

طلال شیخ ایک نامور سیاست دان اور جاگیردار کا بیٹا تھا جو جیکی کے حسن پر مرمٹا تھا۔
شاہ میر رسول بخش کا سب سے چہیتا شاگرد تھا، جو ان کے ساتھ ہی رہائش پذیر تھا۔
احمد فجر کے بعد جلدی جلدی گھر سے نکلا۔ آج ڈبل سواری پر پابندی کی وجہ سے پڑوس کے کامران ا
اسے اپنی موٹر سائیکل پر لفٹ نہیں دے سکے۔ اسے کافی انتظار کے بعد بس کی کھچا کھچ بھری چھت پر جگہ
انتہائی تیز رفتاری سے موڑ کاٹتے ہوئے کچھ مسافر نیچے جا گرے جن میں احمد بھی شامل تھا۔

دوسری قسط

قیامت تو روز آرہی تھی مگر حشر اٹھے تو سزا جزا کا کچھ سلسلہ چلے۔ حشر تھا کہ اٹھایا ہی نہیں جا رہا تھا۔
ایک تازہ قیامت آتی اور گزر جاتی۔

ماریہ نے اپنے لیے ایک کپ چائے بنائی تو بڑے شوق سے تھی مگر اب اسے سامنے رکھے جانے کن خیا
میں گم تھی۔

"ہاؤ......ؤ......ؤ......!" مانی نے دبے پاؤں آکر اس کے پیچھے اتنی خوفناک آواز نکالی کہ وہ حقیقتاً ا
پڑی۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟" اپنے دھڑکتے دل کو قابو میں کرتے ہوئے اس نے خفگی سے بھائی کو گھورا۔

"بدتمیزی تو تم کررہی ہو مائی ڈیر سسٹر، اللہ کا دیا ہوا رزق سامنے رکھا ہے اور اسے کھانے کے بجائے نہ جا
کیا اوٹ پٹانگ سوچ رہی ہو۔" مانی نے بڑے آرام سے اس کا کپ یوں اٹھایا جیسے ماریہ نے چائے اس
لیے بنائی ہو۔

"پتا نہیں کیوں میرا دل گھبرا رہا ہے۔ عجیب سی" وہ کچھ کہتے کہتے رکی۔

"عجیب سی فیلنگز ہو رہی ہیں۔" ماریہ نے چند لمحوں بعد بات مکمل کی۔ خلاف توقع اس نے مانی کے ہاتھ
اپنا چائے کا کپ بھی نہیں چھینا تھا۔

"دو دن سے کالج نہیں گئی ہو نا۔ سہیلیوں سے ملاقات نہیں ہوئی اس لیے عجیب سا محسوس ہو رہا ہے۔"
نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے تجزیہ پیش کیا۔

"اپنی کسی سہیلی کو فون کر کے بات کر لو۔ ان شاء اللہ افاقہ ہوگا۔" مانی نے علاج بھی ساتھ ہی تجویز کر دیا۔

"کل رات سے تو لائٹ غائب تھی۔ اب چارجنگ پہ لگایا ہے لائٹ آنے پر" ماریہ کا انداز مضمحل سا تھا۔
دن چھٹی کر کے وہ واقعی بور ہو گئی تھی۔

"موبائل اتنا تو چارج ہو گیا ہوگا کہ ایک کال ہو سکے۔" ماریہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ کس کو ک
کرے؟ سنیعہ، انیلا، عائشہ۔ وہ ایک ایک کر کے سب کے ناموں پر ذہن دوڑا رہی تھی۔ معاً اس کا موبائل ب
ماریہ نے نمبر دیکھا سنیعہ کا تھا۔

"یا اللہ شکر!" مانی نے چائے کا کپ خالی کر کے میز پر رکھا۔ ماریہ نے خلاف توقع کوئی خاص ردعمل ظا
کیے بغیر اپنا موبائل کان سے لگایا۔

"ہیلو، السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام، ماریہ! ایک بری خبر ہے یار۔" سنیعہ نے بغیر کسی تمہید اور توقف کے کہا۔

''ہم تو عادی ہیں بری خبروں کے، بائی داوے کیا بات ہے؟'' ماریہ نے برا سا منہ بنایا۔ روز ہی کوئی نہ کوئی سیاپا ہو جاتا ہے۔

''ماریہ..... عائشہ ہے نا.....'' سمیعہ نے رک رک کر کہا اور پھر چپ ہو گئی۔

''کیا بات ہے۔ سب خیریت تو ہے نا؟'' سمیعہ کا انتہائی سنجیدہ لب ولہجہ یک دم ہی ماریہ کو تشویش میں مبتلا کر گیا۔

''عائشہ کے بھائی کی ڈیتھ ہو گئی کل۔''

''عائشہ کے بھائی کی؟'' ماریہ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس کی بات دہرائی۔ پھر یکا یک ہی اسے اس خبر کی سنگینی کا ادراک ہوا۔

''عائشہ؟ ہیلو عائشہ؟'' بوکھلاہٹ میں اسے خود بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا پوچھ رہی ہے۔ کیا کہہ رہی ہے۔

''عائشہ کے بھائی کی ڈیتھ ہو گئی کل، ایک ایکسیڈنٹ میں، وہ ہماری برابر والی گلی میں تو رہتی ہے۔ مجھے میرے بھائی نے بتایا تھا۔ میں کل بھی گئی تھی۔ آج بھی جاؤں گی۔ تمہیں اطلاع اس لیے نہ دے سکی کہ کل موبائل سروس بند تھی۔ آج بھی صبح سے ٹرائی کر رہی ہوں۔ اب جا کر تم سے رابطہ ہوا ہے۔'' سمیعہ آہستہ آہستہ اسے بتا رہی تھی۔

''ماریہ! تم سن رہی ہو نا میری بات؟'' اس کی مستقل خاموشی پر سمیعہ نے گھبرا کر پوچھا۔

''سمیعہ! میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا کیا کہہ رہی ہو۔ یہ سب کیسے اچانک'' ماریہ کی آواز جیسے کسی گہرے کنویں سے آ رہی تھی۔

''جب میں نے سنا تھا تو مجھے بھی اسی طرح شاک لگا تھا۔ میری بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میرے کان کیا سن رہے ہیں اور یقین تو ابھی تک مجھے بھی نہیں آیا۔'' سمیعہ دھیرے دھیرے بول رہی تھی۔ ماریہ کی ساری حسیات جیسے برف ہو گئی تھیں۔

''میں آج دوپہر میں جاؤں گی ظہر کے بعد قرآن خوانی ہے۔ تم آؤ گی نا۔''

''ہاں..... میں آؤں گی۔'' الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے منہ سے نکلے اور پھر خالی الذہنی کے عالم میں اس نے موبائل بند کر دیا۔

''کیا ہوا؟'' مانی باہر جاتے ہوئے رک گیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات ہی ایسے ہو رہے تھے کہ وہ پریشان ہو گیا۔

''خیریت تو ہے نا؟'' ماریہ کی خاموشی پر اس نے دوبارہ سوال کیا۔

''پتا نہیں۔'' ماریہ نے بے بسی سے اس کی جانب دیکھا۔

''ریلیکس۔ یہ لو پانی پیو۔'' مانی نے گلاس میں پانی ڈال کر اسے دیا۔ ماریہ نے ایک گھونٹ پی کر گلاس رکھ دیا۔

''ہاں اب بتاؤ؟''

''میری دوست ہے نا عائشہ؟'' وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

''عائشہ۔'' مانی نے زیر لب دہرایا۔ وہ پہلی اور آخری لڑکی جس نے اس کے دل کے دروازے پر دستک دی تھی اسے وہ کیسے فراموش کر سکتا تھا۔ ماریہ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔

"عائشہ کے بھائی کی ڈیتھ ہوئی ہے۔" ماریہ نے گلوگیر لہجے میں اسے بتایا اور اپنی آنکھیں صاف کرنے لگی۔

"اوہ!" مانی نے اناللہ...... پڑھی۔ یکا یک اس کا دل بھی بوجھل ہو چلا تھا۔

"چلو۔" میں تمہیں وہاں لے چلتا ہوں۔ تم امی کو بتا دو۔ منہ دھولو اور حوصلہ رکھو تم ایسے کمزور پڑ و گی تو دوسرے کو کیسے حوصلہ دو گی۔" مانی نے نرم لہجے میں اسے دلاسا دیتے ہوئے سمجھایا۔

وہ اپنا چہرہ صاف کرتی ہوئی باہر نکل گئی۔ مانی وہیں بیٹھا گہری سوچ میں گم تھا۔

انسان اور انسانی زندگی کے نرخ اس شہر ناپرسان میں سب سے ارزاں تھے۔

☆☆☆

رات بھر کے تھکے ہارے سب گدھے گھوڑے بیچ کر سو رہے تھے۔ سوائے ایک مہک جان کے جسے خواب اور گولیوں سے ہی نیند آتی تھی۔ اب تو شاید وہ بھی اپنا اثر کھو چکی تھیں۔ تب ہی تو وہ علی الصبح ہی بیدار ہو کر ادھر ادھر کروٹیں لے رہی تھی۔ زبردستی آنکھیں بیچ بیچ کر کوشش کر رہی تھی کہ نیند آ جائے۔ مگر ہر کوشش بے سود، ایک بار کروٹ لے کر اس نے بے زار ہو کر آنکھیں کھول دیں۔

"فٹے منہ، دفع دور۔" اس نے غصے کے عالم میں نیند کو صلواتیں سنائیں۔ اور اچانک ہی ٹھٹک گئی۔ بیڈ کے سامنے دیوار پر لگی سنگھار میز کا آئینہ، اس کا عکس، اسے دکھا رہا تھا۔ کوئی نیا منظر تو نہیں تھا۔ روز ہی آئینہ دیکھتی تھی مگر وہ مہک جان تو کچھ اور ہوتی تھی۔ زرق برق لباس، بھڑکیلا میک اپ، نت نئے ہیئر اسٹائل ایک ٹھسے دار عورت کا روپ آئینہ اسے دکھاتا تھا۔ مگر اس وقت آئینہ اسے جو تصویر دکھا رہا تھا۔ یہ تو کوئی اور عورت تھی اجڑی ہوئی، ہر قسم کے سنگھار، زیب و زینت سے محروم، چہرے کے کھڑے کھڑے نقوش وہی تھے مگر ایک کرختگی نے مستقل بسیرا کیا ہوا تھا چہرے پر۔ آئی شیڈ سے محروم ویران سی آنکھیں، بے انتہا فٹنگ کی قمیص میں پھنسا ہوا، بے ڈول ہوتا جسم۔

"آہ......! کیا چیز ہوا کرتی تھی تو بھی کبھی، مہک جان۔" اس نے حسرت بھری نگاہیں خود پر ڈالتے ہوئے ایک آہ بھری۔

"اب تو ایسی ہوگئی ہے کہ جیسے کوئی ڈائن، کوئی چھل پیری؟" وہ خود پر ہنسی۔ ایسی ہنسی جس میں رونا بھی شامل تھا۔

اس نے دوسری طرف منہ پھیر کر کروٹ لینی چاہی تھی جب دروازہ کھول کر شمس عرف شمشو اندر داخل ہوا۔ وہ دبلا پتلا منحنی سا شخص تھا۔ کوئی چالیس، پینتالیس کے پیٹے میں۔ پکی رنگت پر پھیلے پھیلے نقوش، چھنی چھوٹی آنکھیں تھیں۔ اتنی بڑی بڑی مونچھیں رکھی ہوئی تھیں۔ چندیا آدھی ہو چکی تھی۔ باقی جو بال بچے تھے وہ ہر وقت چنبیلی کے تیل کا [illegible] تے رہتے تھے۔ انتہائی پتلی اور اتنی ہی سیاہ گردن میں تین چار تعویذ ڈالے ہوئے تھے۔ جو بالترتیب دولت مندی، محبت اور جوئے میں کامیابی کے تھے۔ ایک تعویذ نظر بد سے بچانے کا بھی تھا۔ (تو تو خود بد نظر ہے کم بخت، تجھے کس کی نظر بد لگتی ہے۔ منحوس، اپنے تمام تر غصے کے باوجود مہک جان کی ہنسی نکل گئی تھی) بالوں سے بھری سوکھی سڑی کلائیوں میں کالی ڈوریاں ڈالی ہوئی تھیں۔

چوروں کی طرح چپ چاپ اس نے دروازہ کھولا تھا سامنے مہک جان کو جاگتا پا کر وہ کھسیانا ہو گیا۔

"تو ابھی تک جاگ رہی ہے؟" وہ اندر آ گیا۔

"ہاں تیرے انتظار میں جاگ رہی تھی کہ میرا دولہا ابھی تک آیا نہیں؟" مہک جان نے کینہ توز نظروں سے

اسے گھورتے ہوئے جواب دیا۔
''تو تو ہر وقت۔ بس مرچیں چباتی رہتی ہے۔ کبھی پیار سے بھی بات کرلیا کر۔ آخر شوہر ہوں تیرا۔'' شمشو اس کے پاؤں کے پاس آن بیٹھا۔
''ہونہہ شوہر! بڑا آیا خصم کہیں کا۔ یہ بتا تو تھا کہاں۔ ہر دوسرے تیسرے دن کون کون سے جن، چڑھتے ہیں تیرے اوپر، جنہیں پوری رات جھڑواتا رہتا ہے۔'' مہک جان کا رویہ اور لہجہ ہنوز پہلے جیسا ہی تھا۔
''الیاس بھائی نے تاش کی محفل جمائی ہوئی تھی بس زبردستی پکڑ کر بٹھالیا۔'' اس نے بولتے ہوئے مہک جان کے پاؤں پر ہاتھ رکھے اور دھیرے دھیرے انہیں دبانے لگا۔
''بس یہی ایک کام ہے جو تو ذرا ڈھنگ سے کرتا ہے۔'' مہک جان نے تیکھے لہجے میں سگریٹ لائٹر نکالا اور سگریٹ سلگانے لگی۔
''الیاس بھائی دھندے کیوں بدلتا رہتا ہے۔ کبھی چرس، کبھی لڑکیاں، کبھی جوا؟'' مہک جان نے فضا میں دھواں اڑایا۔
''الیاس بھائی کو ہر چھ مہینے بعد کاروبار میں نقصان ہونے لگتا ہے۔ وہ اپنے پیر صاحب کے پاس جاتے ہیں جو چلہ کھینچ کر دوسرا دھندا تجویز کردیتے ہیں۔ بس اسی لیے ہمارے الیاس بھائی دھندے بدلتے رہتے ہیں۔'' شمشو کے ہاتھ اب بڑی مہارت اور جانفشانی سے مہک جان کی پنڈلیاں دبا رہے تھے۔
''الطاف پنواڑی پچاس ہزار روپے ہار گیا رات جوئے میں۔'' شمشو نے بات نکالی۔
''ہوں!'' مہک جان نے بے توجہی سے اس کی بات سنی اور کروٹ لے کر سگریٹ کی راکھ نیچے فرش پر جھاڑی۔
''اصل بات بتا، تو کتنے ہار کر آیا؟'' وہ اب سیدھی ہو کر لیٹی۔
''بس اس بار نصیب نے ساتھ نہیں دیا ورنہ پورے دس ہزار کا داؤ تھا۔ جیت ہی لیتا۔'' شمشو کے لہجے میں لجاجت اور پاؤں دبانے میں اور بھی پھرتی آگئی۔
''دس ہزار؟ دس ہزار، پورے دس ہزار روپے جوئے میں دے آیا بے غیرت، کمینے، میری محنت کی کمائی ایک گھنٹے میں اڑا کر آگیا۔ ذلیل۔'' مہک جان نے اس کو زوردار لات رسید کی وہ الٹ کر نیچے گرا۔
''تیری ماں بہن کی کمائی نہیں تھی جو اتنے آرام سے جوئے میں گنوا کے آگیا۔ مہک جان کا پیسہ ہے۔ حلق چیر کے نکال لوں گی۔'' وہ غرائی ساتھ زبان سے مغلظات کی بوچھاڑ بھی جاری تھی۔
''اس بار معاف کردے۔ آئندہ کے لیے میری توبہ۔ جو الیاس بھائی کے اڈے پر قدم بھی رکھا۔ میری زبان جل جائے جو کبھی ان کا نام بھی لیا تو۔'' شمشو دوبارہ پائنتی پر چڑھا بیٹھا بڑی لجاجت اور خوشامد سے بول رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے زبردستی دوبارہ مہک جان کی پنڈلیاں دبانا بھی شروع کردی تھیں۔
''حرامی نہ ہو تو، ڈھیٹ، بے غیرت۔'' مہک جان اس سے اپنا پاؤں چھڑانے کی کوشش میں ہانپنے لگی تھی۔
''اتنا غصہ مت کیا کر۔ تیری صحت کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔ پھر تیرا بی پی ہائی ہو جائے گا۔''
''ارے بھاڑ میں گیا بی پی اور جہنم میں گئی مہک جان!'' وہ اور بھڑک اٹھی۔ ختم ہوتی سگریٹ کا ٹوٹا انگلی اور انگوٹھے سے یوں مسل کر نیچے پھینکا جیسے شمشو کا ٹینٹوا دبا رہی ہو۔
''اب جانے بھی دے جان۔ اللہ پاک کی قسم داؤ اسی لیے لگایا تھا کہ جیت گیا تو تیرے لیے فیروزہ جڑی سونے کی انگوٹھی لاؤں گا۔ تجھے پسند ہے نا۔ بس کیا کہوں قسمت نے ساتھ نہیں دیا۔'' شمشو مسلسل اسے رام کرنے

ہی تو بس کر رہا تھا۔

"تو ہر بار یہی بکواس کرتا ہے۔ جیسے میں جانتی نہیں ہوں تجھے۔" مہک جان نے بالآخر تھک ہار کر اپنا سر تکیے پر ڈال دیا۔

"حلوہ پوری لے آؤں تیرے لیے گرما گرم تل رہا ہوگا اپنا یار۔" شمشو نے اس کو مزید مسکہ لگایا۔

"پہلے تو مجھے ایک چائے بنادے۔ سر درد سے پھٹا جارہا ہے منحوس ماری نیند آکے ہی نہیں دی۔"

"اچھا میں فٹافٹ بنا کر لاتا ہوں۔" شمشو نے انتہائی تابعداری سے سر ہلایا۔

"اور بات سن، ذرا مینا کماری کو جگا دینا۔ اس سے کہنا دونوں بڑھیاؤں کو ناشتہ کروا کر دوائی دے دے۔ مردوں سے شرطیں باندھ کر ایسے سوتی ہے جیسے سب سے زیادہ رت جگا اس نے کیا ہو' نشے باز کہیں کی۔" مہک جان نے اسے مزید ہدایات جاری کرتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

"سر درد کی گولی بھی لے آؤں چائے بسکٹ کے ساتھ۔" شمشو دروازے پر رکا۔

"نہیں تو کیا پستول کی لائے گا؟" وہ غرائی۔

"آں، ہاں۔ لے آتا ہوں۔" وہ ہڑبڑا کر جلدی سے باہر نکل گیا۔

"شیدا کہیں کا کمینہ۔" مہک جان نے بڑبڑاتے ہوئے آئینے کی مخالف سمت میں کروٹ لے لی۔

☆☆☆

ماریہ، سنیعہ کے ساتھ عائشہ کے گھر میں داخل ہوئی۔ سامنے کمرے میں چند خواتین اور بچیاں سپارے پڑھ رہی تھیں۔

عائشہ اک دم ہی آکر ماریہ کے گلے لگی تھی۔

"ماریہ، میرا بھائی!" اس نے سسکی لی۔ "میرا بھائی چلا گیا۔ ہمیں اکیلا چھوڑ کر چلا گیا۔ اس کے سب ٹیچرز نے کہا تھا کہ اس بار بورڈ میں اس کی کوئی نہ کوئی پوزیشن ضرور بنے گی۔ اتنا ذہین، اتنا محنتی، سب کچھ خاک میں مل گیا۔" عائشہ کے بے قابو آنسو تواتر سے بہہ رہے تھے۔

ماریہ چپ چاپ اسے گلے سے لگائے کھڑی رہی۔ اس کے پاس تو الفاظ بھی نہیں تھے تسلی کے لیے' کہاں سے لاتی ایسے الفاظ جو دونوں ماں بیٹی کے دکھ کا درماں بن سکتے۔

لفظ اگر مرہم بن سکتے تو اب تک درجنوں افراد کے تعزیتی الفاظ ان کے دکھ اور آنسوؤں کی شدت کو کم کر دیتے مگر ابھی تو یہ زخم بالکل ایسے ہی تازہ تھا جیسے ابھی ابھی لگا ہو۔

عائشہ کی امی حزن وملال کی خاموش تصویر بنی بیٹھی تھیں۔ صبر وہ بھی قیامت کا۔ آسان تو نہیں تھا۔ ایک فرماں بردار، سمجھ دار، ذہین بیٹا، ان کی آنکھوں کی روشنی، ان کے ہاتھوں کی لاٹھی۔ قضا کے بے رحم ہاتھوں نے آنکھوں کی بصارت سے انہیں محروم کر دیا تھا۔ ان کی لاٹھی چھن گئی تھی۔ بے دست وپا وہ منہ کے بل زمین پر گری تھیں۔ کتنی ہمت، کتنا حوصلہ چاہیے تھا کھڑے ہونے کے لیے، سنبھلنے کے لیے اور پھر دوبارہ آگے چلنے کے لیے۔ بیٹے کی مغفرت کے ساتھ ساتھ وہ اپنے اور عائشہ کے لیے برابر صبر کی دعا بھی مانگ رہی تھیں۔ یہی وہ روشنی تھی جو اس گھپ اندھیرے میں ان کی معاون ومددگار رہوتی۔

☆☆☆

اذان کی آواز پر اس کی آنکھ کھلی تھی۔ مندی مندی آنکھوں کو دوبارہ میچ کر اس نے کاہلی سے کروٹ بدلی' ارادہ تو یہی تھا کہ ابھی کچھ دیر اور سوئے مگر بھوک کے مارے پیٹ میں اینٹھن سی ہورہی تھی۔ وہ اٹھ بیٹھی۔ اپنے

الجھے بالوں کو سمیٹ کر جوڑا بنایا اور بیڈ سے اتر کر سیدھی واش روم میں گھس گئی۔

ہاتھ منہ دھو کر وہ کچن میں آئی۔ کچن کی ابتر حالت دیکھ کر اسے جھنجلاہٹ ہونے لگی' رات کے جھوٹے برتن تک سنک میں یونہی پڑے تھے۔ سرمد نے صبح ناشتہ بنایا تھا اپنے لیے۔ چائے کی کیتلی اور کپ پر مکھیاں بھنک رہی تھیں۔ سنک کی نالی سے ایک کاکروچ نکل کر بھاگا۔ وہ بے اختیار اچھل گئی۔

"اف، کیا مصیبت ہے۔" اپنے دھڑ دھڑاتے دل کو قابو کرتے ہوئے وہ باہر آگئی۔ اس کا موڈ آف ہو چکا تھا۔ نہ جانے کیوں؟ یا شاید یہ اب اس کی عادت بن گئی تھی۔ گھر میں ہونے والی کسی نہ کسی بات، کسی نہ کسی معاملے پر اس کو بے تحاشہ غصہ آجاتا اور لے دے کے یہ غصہ نکلتا غریب سرمد پر۔

اس وقت بھی اسے شدید غصہ آرہا تھا۔ فریج میں نہ انڈا تھا نہ مکھن، نہ ڈبل روٹی۔ جوس کے سارے پیکٹس بھی ختم ہو چکے تھے۔ رات کو اس نے سرمد سے کہا تھا کہ صبح ناشتے کے لیے چیزیں لاکر رکھ دے۔ اس نے پراٹھا پکا کر کھانے کا مشورہ دے دیا۔ "منع کر دیا ہے جبار بھائی نے مزید ادھار دینے سے' پہلے ہی اتنا لمبا بل بنا ہوا ہے۔" سرمد نے بے چارگی سے اسے دیکھا۔ نائلہ کے شاہانہ اخراجات ہی تو تھے جو دکاندار کا اتنا لمبا چوڑا بل بن جاتا تھا۔

"تو کیا صبح ناشتہ نہیں کروں گی میں، بھوکی رہوں گی۔ مجھے نہیں پتا کہیں سے بھی انتظام کرو۔ ایک ذرا ناشتے کھانے کی ذمہ داری نہیں اٹھا سکتے تم۔ اور ذمہ داریاں کیا اٹھاؤ گے۔"

نائلہ چیخ کر بولی اور منہ لپیٹ کر پڑ گئی پھر اسے نہیں پتا چلا کہ سرمد رات کو کب سویا۔ صبح کب اٹھا اور ناشتہ کر کے کب گیا۔ شروع شروع میں وہ جاتے وقت نائلہ کو جگا دیتا تھا کہ وہ کنڈی لگا لے۔ نائلہ نیند میں جھنجلا جاتی پھر اس نے اس کا حل یہ نکالا کہ سرمد جاتے وقت باہر سے تالا لگا دیا کرے اور چابی پڑوس میں حلیمہ بوا کو دے جایا کرے۔ وہ اچھی ملنسار قسم کی بڑی بی تھیں۔ روزانہ دوپہر میں تالا کھول کر نائلہ کے پاس آجاتیں، تالا چابی اس کے حوالے کرتیں اور کچھ دیر باتیں کر کرا کے رخصت ہو جاتیں۔ آج وہ ابھی تک آئی نہیں تھیں۔ ورنہ وہ ان ہی سے کچھ منگوا لیتی۔ رقم تو اس کے پاس تھی جمال اب جب بھی آتا کبھی ہزار، کبھی پانچ سو زبردستی اس کے ہاتھ میں تھما دیتا۔

"بس یہ میرا اور آپ کا سیکریٹ ہے۔ سرمد کو علم نہیں ہونا چاہیے۔ بلاوجہ میں برا مانے گا۔ دل دکھتا ہے آپ کو اس حال میں دیکھ کر' اپنی چھوٹی موٹی ضرورتیں پوری کر لیا کریں۔" جمال اپنی بہت بڑی ضرورت پوری کرنے کے لیے اس کی چھوٹی موٹی ضرورتیں پوری کر رہا تھا۔

نائلہ جھنجلاہٹ کے عالم میں ریموٹ لے کر بیٹھ گئی۔ تب ہی دروازے پر آہٹ ہوئی۔ بوا آگئیں۔ تالا کھلنے کی آواز پر اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

"بوا، ناشتہ کے لیے کچھ منگوا دیں۔" وہ چینل پر چینل بدل رہی تھی۔

"اب تو کھانے کا وقت ہے بیٹا۔ کھانا ہی کھا لو۔" انہوں نے بڑے آرام سے مشورہ دیا۔

"کیا پکاؤں، کیا کھاؤں۔ گھر میں کچھ ہو تو پکاؤں۔" وہ جھلا گئی۔

"اے ہائے بیٹا۔ کل میرے سامنے ہی آدھا کلو مرغی اور آدھا کلو گوشت لے کر آیا تھا سرمد!" بڑی بی کی یادداشت کافی تیز تھی۔

"اب اکیلی جان کے لیے کیا ہنڈیا پکاؤں۔" نائلہ نے چینل کے ساتھ ساتھ پینترا بدلا۔

"تم دن میں بازار سے منگا کر کھا لیتی ہو۔ رات میں روزانہ تمہارا میاں بازار سے تم دونوں کے لیے کچھ نہ

کچھ لے آتا ہے۔ یہ تو اچھا طریقہ نہیں ہے بیٹا۔ جس گھر میں چولہا نہ جلے۔ ہنڈیا روٹی نہ پکے۔ وہاں خیر و برکت بھی نہیں ہوتی۔ بازاری کھانے کبھی کبھار کے اچھے، منہ کا ذائقہ بدلنے کو، مگر روز روز نہیں۔ ہمیں تو نہیں پسند لٹورے بے برکتی کھانے۔'' بوا پند و نصائح کے موڈ میں تھیں۔ نائلہ محض پہلو بدل کر رہ گئی۔

''بوا عقیل گھر پر ہے تو کچھ منگوا دیں۔ بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔'' نائلہ اکتا کر بولی (لیکچر دینے بیٹھ گئی بڑھیا)

''عقیل تو گھر پر نہیں ہے۔ شمسہ کے گھر دیکھتی ہوں اس کا لڑکا اسکول سے آ گیا ہوگا تو کچھ لا دے گا۔'' بوا اٹھتے ہوئے بولیں۔ ابھی وہ دروازے سے نکلی ہی تھیں کہ اس کا موبائل بج اٹھا۔ اسکرین پر نمبر دیکھ کر اس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔

''ہیلو جمال بھائی! کیا حال ہیں؟''

''آپ سے دور رہ کر کون کم بخت اچھے حال میں رہتا ہے۔''

''ہاں۔ جب ہی چار دن ہو گئے۔ آئے ہی نہیں۔ جھانکا بھی نہیں کہ میں کس حال میں ہوں۔'' نائلہ نے ناز و ادا سے کام لیا۔

''ہم تو روز آ جائیں۔ آپ کے محلے والوں کو ہی تشویش ہوگی، جانتا ہوں نا ایسے لوئر مڈل کلاس گھرانوں کی ذہنیت۔'' جمال نے کہا۔

''ہاں، یہ تو ہے۔'' نائلہ نے اس کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے گہری سانس لی۔

''اچھا تو کیا ہو رہا ہے؟''

''کچھ بھی نہیں صبح سے بھوکی بیٹھی ہوں۔ محلے میں کہلوایا ہے ابھی کوئی بچہ آ گیا تو کچھ منگوا لوں گی۔'' نائلہ کے لہجے دنیا بھر کی مظلومیت آ گئی تھی۔

''صبح سے بھوکی؟'' ''چہ چہ..... ایسا کرتے ہیں کہ آج کا لنچ میری طرف سے ایک بڑا اچھا ریسٹورنٹ ہے میرے آفس کے قریب۔ وہیں چلتے ہیں۔''

''میں کیسے جا سکتی ہوں کسی اچھے ریسٹورنٹ میں۔ ہماری اوقات تو بس بیبیں کی ہے ٹھیلے والے سے برگر لے کر کھا لیا یا چنا چاٹ منگوا لی۔'' نائلہ اداس ہوئی۔

''میرے ہوتے ہوئے آپ کو ایسی باتیں سوچنے کی ضرورت نہیں نائلہ جی!'' جمال اب بھی جان سے نائلہ جی پر آ گیا تھا۔

''بس آج کا لنچ آپ میرے ساتھ کریں گی۔ بتائیں کہاں سے پک کروں آپ کو۔''

''کسی نے دیکھ لیا تو؟'' وہ ہچکچائی۔

''بھروسا رکھیں مجھ پر کوئی نہیں دیکھے گا۔'' جمال نے یقین دلایا۔

''پھر بھی.....''

''دیکھیں دنیا والوں کا خوف کریں گی تو یونہی اس ڈربے میں گھٹ گھٹ کر مر جائیں گی۔ اس کی پروا کریں جو آپ کی پروا کرتا ہو۔ بس باقی سب چھوڑیں اب یہی دیکھ لیں۔ آپ صبح سے بھوکی ہیں کسی نے آ کر جھانکا، آپ کا حال احوال جانا۔ آپ سے پوچھا کہ آپ کو کسی شے کی ضرورت تو نہیں؟ یہ دنیا والے صرف باتیں بنانے کے ہوتے ہیں۔ باتیں بنا کر خود ہی خاموش ہو جاتے ہیں۔ ایسی دنیا سے خوف حماقت ہے۔'' جمال نے پورا لیکچر دے دیا۔

''بتائیں پھر جلدی سے۔ اگر آنا ہے تو آجائیں۔ ورنہ میں اپنے پچھ کلائنٹس سے ڈیلنگ کرلوں۔'' جمال نے ذرا بے رخی اختیار کی۔

''ٹھیک ہے۔ آپ آدھے گھنٹے بعد مجھے پک کرلیں۔'' نائلہ نے اسے جگہ بتائی۔

''ٹھیک ہے۔ آدھے گھنٹے بعد ملتے ہیں۔'' جمال نے فون بند کردیا۔

نائلہ اپنی الماری کھول کر جائزہ لینے لگی کہ کون سا سوٹ پہنے۔

☆☆☆

دھوپ میں تھوڑی شدت تھی ـــــــــ مگر سرد ہوتے موسم میں یہ تمازت بھلی لگ رہی تھی۔ وہ متوازن چال چلتے ہوئے اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھا۔ سڑک ٹریفک کے ہجوم سے لبریز تھی۔ دونوں جانب دکانیں، سامان اور لوگوں سے بھری ہوئیں بھانت بھانت کی آوازوں کا شور تھا اس کے اردگرد مگر اس کی سماعتیں ہر آواز سے بے بہرہ تھیں۔ اس کے اندر کی خاموشی اور سناٹا۔ اس کی ذات کے باہر اس کے وجود کے اردگرد بھی پھیلا ہوا تھا۔

چلتے چلتے وہ معروف سڑک اور وہ بھری پُری دکانیں پُررونق بازار پُرہجوم مناظر کہیں پیچھے رہ گئے تھے۔ یہ والی سڑک اور راستہ نسبتاً خاموش اور پرسکون تھا۔ شاید اس لیے کہ یہاں سڑک کے دونوں جانب دکانوں کے بجائے مکانات بنے ہوئے تھے۔ منزل اب قریب ہی تھی۔ اس کے پاؤں اب تھکنے لگے تھے۔ حالانکہ وہ پیدل بلکہ بہت زیادہ پیدل چلنے کا عادی تھا۔ مگر اس کے گھر سے یہاں تک کا رستہ واقعی بہت طویل تھا۔ حالانکہ چاچا رسول بخش سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں بار اس سے کہہ چکا تھا کہ وہ ایک موٹر سائیکل لے لے۔ ایک معقول رقم ان کے پاس جمع تھی اس کی۔ نہ بھی ہوتی تو وہ خود بھی خرید دیتے اسے۔ مگر وہ ہر بار کی طرح انکاری۔ جواز؟ وہی ایک۔

''یہ مشینیں، کاموں کو آسان کردیتی ہیں۔ وقت بچاتی ہیں۔ مجھے کیا کرنا ہے وقت بچا کر فارغ ہونے سے۔ یہ فراغت اور فرصت تو میرے لیے بڑے خطرناک لمحات ہوتے ہیں۔ سانپ کی طرح ہر آن ڈستے رہتے ہیں۔'' وہ آدھی بات چاچا سے کہتا اور آدھی اپنے دل میں ہی کہیں دفن کرلیتا۔

چلتے چلتے بالآخر وہ ایک بنگلے کے آگے رکا جس کا مین گیٹ کھلا ہوا تھا اور باہر کی جانب دائیں بائیں دو گارڈ اسلحہ سے لیس کھڑے تھے۔ وہ اکثر ہی یہاں آیا کرتا تھا اب تو وہ دونوں بھی اسے پہچاننے لگے تھے۔

یہ ایک فلاحی ادارہ تھا۔ یتیم، لاوارث، گھر سے بھاگے ہوئے یا گھر سے نکالے ہوئے یا پھر غربت کے مارے والدین کے ہاتھوں پہنچائے ہوئے بچے یہاں موجود تھے۔ معمول کے مطابق کئی گھنٹے یہاں گزار کر وہ واپس ہوا تھا۔ واپسی کا سفر بھی ایسا ہی تھا۔ پیدل، تنہا، خاموش، چلتے چلتے وہ ٹریفک اور آوازوں سے بھری اسی معروف سڑک پر آگیا تھا۔ یہاں پیدل چلنا بھی بڑا مشکل کام تھا۔ دکانوں کے آگے پتھارے دار اور ٹھیلے والے آگے بڑھ کر فٹ پاتھ تک آئے ہوئے تھے۔ پیدل چلنے والے کبھی فٹ پاتھ پر چلتے۔ اس پر راستہ نہ ملتا تو نیچے اتر کر سڑک پر چلتے۔

وہ بھی یہی کررہا تھا۔ اس بار فٹ پاتھ سے اتر کر سڑک پر آیا تو ایک موٹر سائیکل تیزی سے اس کے قریب سے گزری۔ شاہ میر نے بچنے کی کوشش کی مگر وہ بائیک اس کو ٹکر مارتی ہوئی سیدھی نکلتی چلی گئی۔ وہ پہلو کے بل سڑک پر گر پڑا۔ اسی لمحے ایک دوسری بائیک اس کے پاس آکر رکی۔ ایک نوجوان بائیک سے اتر کر تیزی سے اس کی جانب بڑھا۔

''زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟'' وہ بہت نرمی اور ہمدردی سے مخاطب تھا۔ اردگرد سے بھی دو چار لوگ اکٹھے

ہو رہے تھے۔
''وہ تو مار کر سیدھا نکل گیا۔ مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ بدتمیز، بے شرم۔'' ایک بزرگ با آواز بلند گویا ہوئے۔
''پہلی فرصت میں ڈاکٹر کے پاس جاؤ صاحب۔ ٹیٹنس کا انجکشن ضرور لگوالینا۔'' ایک اور ہمدرد نے اسے مشورہ دیا۔ وہ بائیک والا نوجوان تب تک اسے سہارا دے کر کھڑا کر چکا تھا۔
''میں رکشہ کروا دیتا ہوں آپ ڈاکٹر کے.....'' وہ نوجوان کہہ ہی رہا تھا کہ شاہ میر نے تیزی سے اس کی بات کاٹ دی۔
''میں ٹھیک ہوں۔ چلا جاؤں گا۔'' وہ اپنے اردگرد موجود لوگوں سے خائف ہو رہا تھا۔
''مگر.....''
''بہت شکریہ میں چلا جاؤں گا۔'' شاہ میر نے ایک نظر سامنے دیکھا۔ ایک ویگن آکر وہیں رکی۔ اس نے ایک لمحے کا توقف بھی نہ کیا اور لنگڑاتا ہوا ویگن میں سوار ہو گیا۔
''اسٹرینج۔'' مانی نے سر جھٹکا اور واپس آکر اپنی موٹر سائیکل اسٹارٹ کرنے لگا۔
''یہ کیا ہوا؟'' ماریہ نے حیرانی سے مانی کو دیکھا۔ اس لڑکے کے پاؤں سے تو خون بہہ رہا تھا۔ ڈاکٹر کے پاس جانے کے بجائے یہ ویگن میں چڑھ گیا۔''
''اللہ جانے۔'' مانی نے کندھے اچکائے، ماریہ بھی خاموش ہو گئی۔ گھر پہنچتے ہی مانی تو ڈھیر ہو گیا۔
''لڑکی! جلدی سے کچھ کھانے کو لے آ۔ بھوک کے مارے دم نکل رہا ہے میرا۔''
''لڑکی خود بھی تھکی ہوئی آئی ہے۔'' ماریہ نے ٹکا سا جواب دیا اور گھونٹ گھونٹ پانی پینے لگی۔
''میں تو موٹر سائیکل چلا کر آیا ہوں۔ تم کس خوشی میں تھک گئیں؟'' مانی نے اسے گھورا۔
''بس تمہاری محبت میں تھک گئی۔ تمہاری تھکن مجھے بھی محسوس ہو رہی ہے۔''
''بس اسی محبت کے نام پر جلدی سے ٹرے لگا کر لے آ میری پیاری بہن!'' مانی نے دہائی دی۔
''آپی! ذرا آپ ہی ثواب کما لیں۔ ایک بھوکے کو کھانا کھلا کر۔'' ماریہ فروا سے مخاطب ہوئی۔
''پانچ منٹ ٹھہرو۔'' وہ کپڑے استری کر رہی تھی۔
''تمہارا کام ہو گیا؟''
''ہاں۔ شکر ہے ہو گیا۔ ایک سگنیچر کے لیے اتنی خواری ہوئی۔'' ماریہ کے ایگزامینیشن فارم میں ایک دستخط رہ گیا تھا۔ اس کے لیے وہ پورا آفس گئی تھی مانی کے ساتھ۔
ماریہ ہاتھ منہ دھو کر آگئی تھی۔ اب کاہلی سے صوفے پر بیٹھی تھی۔
''تم کھا رہی ہو کھانا؟'' فروا مٹر پلاؤ گرم کر رہی تھی۔
''نہیں بھئی۔ وہاں برگر کھا لیا تھا اور کولڈ رنک پی لی تھی۔ میرے پیٹ میں تو بالکل گنجائش نہیں اس وقت۔ ہمارے بھائی صاحب ہی ہیں ہر گھڑی تیار، کامران ملیں گے کھانے کے لیے۔'' ماریہ نے صاف انکار کرتے ہوئے مانی کو چھیڑا۔
''موٹر سائیکل چلا کر لایا ہوں۔ سب ہضم ہو گیا راستے میں۔''
''بیٹھ کر چلا کر لائے ہو نا، تھیسٹ کر تو نہیں لائے جو اتنی جلدی سب کچھ ہضم ہو گیا۔'' ماریہ بدستور جرح کر رہی تھی۔
''تمہیں کیا تکلیف ہے میرے کھانے پینے سے۔''
''اگر یہی حال رہا تو توپ کا گولہ بن جاؤ گے کسی دن۔ ویٹ دیکھا ہے اپنا۔ کتنا ہو گیا؟''

"پرسوں چیک کیا تھا۔ [illegible]ی ایٹ کے جی۔" مانی نے لاپروائی سے جواب دیا۔

"پرسوں سے اب تک دو چار کلو اور بڑھ گیا ہوگا۔"

"سکس فٹ ہائٹ پر اتنا ویٹ چلتا ہے۔"

"ویٹ صرف ہائٹ کے حساب سے نہیں ایج کے حساب سے بھی کاؤنٹ ہوتا ہے۔" ماریہ نے جتایا۔

فروا ٹرے میں کھانا لے آئی تھی۔

"گرما گرم بھاپ اڑاتا مٹر پلاؤ، کباب، سلاد رائتہ اور چٹنی۔"

"جیتی رہو میری پیاری آپی، اللہ تمہیں چاند سا دولہا عطا فرمائے۔"

"بکواس مت کرو۔" فروا مسکراہٹ دباتی ہوئی واپس پلٹ گئی۔

"چاند سے دولہا کا کیا کریں گی وہ، دسترس سے دور پتا بھی ہے چاند زمین سے کتنی دور ہے؟" ماریہ نے فلسفہ اور علمیت ایک ساتھ بگھارا۔

"مجھے تو بس یہ معلوم ہے کہ بھوک میں چاند بھی روٹی لگتا ہے۔ گول گول سنہری روٹی۔" مانی مزے دار پلاؤ کھاتا ہوا مزے سے بولا۔

فروا کپڑے استری کر کے وہاں سے چل دی۔ اسے اپنی سہیلی کے گھر قرآن خوانی میں جانا تھا اب۔ کچھ دیر بعد مانی اسے چھوڑ کر آتا۔

"اف، مانی غریب کی زندگی......" مانی نے یہی بات سوچ کر ایک آہ بھری اور پھر اسی شد و مد سے کھانے میں معروف ہو گیا۔

ادھر ساس بہو حمنہ کے رشتے کو لے کر باتیں کر رہی تھیں۔ مہمانوں کو حمنہ پسند آئی تھی۔ یہ لوگ بھی ان کے گھر ہو آئے تھے۔ گھر والوں سے مل لیے۔ لڑکے سے بھی ملاقات ہوگئی۔ لڑکا قابل تھا۔ سنجیدہ مزاج اور بردبار دادی کو

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے 4 خوبصورت ناول

چلمن

نادرہ خاتون

قیمت -/300 روپے

دل ایک گلشن

رضیہ جمیل

قیمت -/300 روپے

دستِ کوزہ گر

فوزیہ یاسمین

قیمت -/750 روپے

بھول بھلیاں

نسیم سحر قریشی

قیمت -/400 روپے

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار، کراچی

فون نمبر: 32735021

پسند آیا تھا۔ [illegible] ٹھیک ہی تھی۔

"پھر دلہن! کیا خیال ہے تمہارا؟" انہوں نے اپنی بہو سے پوچھا۔

"ان کی پھوپھی بیگم کی گفتگو سنی تھی آپ نے؟" بہو صاحبہ نے الٹا ان سے ہی سوال کر ڈالا۔

"تھوڑی بہت بات ہوئی تھی۔ کیوں کیا ہوا؟" وہ چونک کر بولیں۔

"بار بار لکھنو کو لکھنؤ بول رہی تھیں۔ پھوٹی ہانڈی آواز سے پہچانی جاتی ہے۔ مجھے تو اہل زبان نہیں لگے یہ لوگ۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے بیٹا! ضعیف العمر خاتون تھیں، کیا پتا زبان یونہی پلٹ رہی ہو۔"

دادی نے رسان سے لڑکے کی پھوپھی بیگم کو مارجن دینے کی کوشش کی۔

"اونہوں اماں!" عالیہ بیگم نے نفی میں سر ہلایا۔"وہ اپنے ماضی کی باتیں کر رہی تھیں۔ باتوں کے دوران ان کے منہ سے نکلا کہ ہاں ہم نے بھی بڑا مشکل وقت کاٹا ہے۔ دودھ بیچ بیچ کر، یہاں بھی ویسے ہی گزارا کیا جیسے انڈیا میں کرتے تھے۔ کیا پتا پیچھے سے گھوسی ہوں یہ لوگ۔"

"پتا نہیں میں نے تو یہ سب باتیں سنی نہیں۔ میں نے تو لڑکے سے کچھ دیر بات کی پھر جانے کون تھیں چچی کہ ممانی، خاصی دلچسپ خاتون تھیں۔ انہی کو سنتی رہی" دادی نے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے تو دال میں کچھ کالا لگ رہا ہے۔"

"اتنا شک نہیں کرتے بیٹا! کچھ معاملات اللہ پر بھی چھوڑ دیا کرتے ہیں۔ اگر باقی سب کچھ ٹھیک لگ رہا ہے تو اللہ کا نام لے کر ہاں کر دو۔"

دادی نے انہیں سمجھایا۔ مگر بہو بیگم کی سمجھ دانی ان سے کہیں آگے تھی۔ انہیں تو کوئی ایسا خاندان چاہیے تھا جس کے حسب نسب میں کوئی "نی" نہ ہو۔

"عالیہ! تم اپنے رشتہ داروں میں ہی کیوں نہیں دیکھ لیتیں حمنہ کے لیے کوئی رشتہ۔" ان کی ایک عزیز سہیلی نے محتاط الفاظ میں انہیں مشورہ دیا تھا۔

"یہاں بھی مسئلے مسائل ہیں۔ کچھ لڑکوں کی ہو گئی ہے۔ کچھ حمنہ کے جوڑ کے نہیں چھوٹے ہیں۔ پھر بہت سے رشتے دار بیرون ملک جا کر آباد ہو گئے ہیں۔ اب کہاں دیکھیں کس سے کہیں۔" وہ کچھ اداس سی ہو گئیں۔

"چلو اللہ مالک ہے وہ اچھا کرے گا۔" انہوں نے جھٹ تسلی دی تھی۔

"بات سنو دلہن! اتنا باریک مت چھانو کہ بعد میں خدانخواستہ کر کرا ہی کھانے کو ملے۔ بے عیب تو بس خدا کی ذات ہے۔ ایسی بھی کوئی کشمش ہے جس میں تنکا نہ ہو؟"

ساس نے ایک بار اور انہیں قائل کرنے کی کوشش کی۔ دراصل انہیں حمنہ کے لیے وہ لڑکا پسند آیا تھا۔ باادب، بردبار اور سلجھا ہوا وہ حمنہ جیسا ہی تھا۔ مگر بات تو ساری عالیہ بیگم کی تھی۔ ان کی سمجھ میں معاملہ آتا تو آگے بڑھتا۔ اور ان کا وہ حساب تھا کہ سنتیں سب کی مگر کرتیں اپنے من کی اور آثار یہی نظر آ رہے تھے کہ اس بار بھی اس رشتے سے انکار ہو جائے گا۔

☆☆☆

شام نے اپنے سرمئی پر پھیلائے اور بڑھتے بڑھتے دن کی روشنی کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ تاریکی کا راج شروع ہونے والا تھا۔ مسجد سے مغرب کی نماز کے لیے اللہ اکبر کی صدا بلند ہوئی۔

عائشہ نے ایک دم ہڑبڑا کر تسبیح ہاتھ سے رکھی اور موم بتی جلانے لگی۔ وہ بھی اب تھوڑی ہی رہ گئی تھی۔ یہ لوڈشیڈنگ کا ٹائم تھا۔ گھر میں ایک چارجنگ لائٹ تھی جو احمد لایا تھا۔ کئی ماہ چل کر اب وہ بھی دغا دے گئی تھی۔ فی الحال تو موم بتیوں پر گزارا تھا۔ اس میں بھی بہت کفایت شعاری سے کام لینا پڑتا تھا۔ دس روپے کی ایک

https://reading.soberkoti.net

موم بتی وہ تین سے چار دن چلاتیں۔ مغرب کی نماز پڑھ کر وہ موم بتی بجھا دیتیں۔ سامنے والوں کا گھر تین منزلہ تھا۔ جنریٹر چلتا تھا اور خوب چلتا تھا۔ ان کی بالکنی میں لگے سیور کی روشنی سے ان کے صحن میں بھی کچھ اجالا ہو جاتا تھا۔ اسی نیم اندھیرے صحن میں دونوں ماں بیٹی بیٹھ کر تسبیح پڑھتی رہتیں۔ منہ زبانی ذکر اذکار کرتی رہتیں۔

دو ماہ گزر گئے تھے۔ آنسوؤں کی روانی اور شدت میں کچھ کمی آئی تھی مگر غم کی شدت تو اب بھی وہی تھی۔ دکھ کی بھاری سل تھی جس کا بوجھ اب بھی دل اور زندگی دونوں پر تھا۔ مگر اب اسی بوجھ کو ساتھ لے کر چلنا تھا۔

دھیرے دھیرے دونوں معمولات زندگی کی طرف پلٹ رہی تھیں مگر یہ پلٹنا بھی قیامت خیز تھا۔ مریم کھانا لگاتی تو بے دھیانی میں تین پلیٹیں دستر خوان پر رکھ دیتی۔ کبھی صبح ناشتے کے وقت چائے نکال کر احمد کو آواز لگانے کا سوچتی اور پھر ایکا یک کچھ یاد آنے پر وہ موم کا بت بن جاتی۔ قطرہ قطرہ پگھلتا ہوا بت۔

''امی! خالہ جان کا فون آیا تھا۔ آپ نماز پڑھ رہی تھیں۔'' عائشہ نے چائے کا کپ ان کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''کیا کہہ رہی تھیں؟''

''وہی، جو آپ سے کہا تھا۔ مجھ سے اصرار کر رہی تھیں کہ میں آپ کو سمجھاؤں۔'' عائشہ سلائی مشین کا کور ہٹانے لگی۔ ارجنٹ سلائی سوٹ آیا تھا۔ رات تک سی کر دے دیتی تو کچھ رقم ہاتھ آ جاتی۔ اس کے ہاتھ میں صفائی کے ساتھ ساتھ اب بہت پھرتی بھی آ گئی تھی۔ ڈیڑھ سے دو گھنٹے میں سوٹ سی لیتی۔

''پھر امی، کیا سوچا آپ نے؟'' عائشہ نے یونہی پوچھا۔

''سوچنا کیا ہے۔ بس سیدھی سچی بات ہے کہ پرائے محل سے اپنی جھونپڑی بھلی۔'' امی نے چائے کا کپ منہ سے لگایا۔

عائشہ کی خالہ ویسے تو کم کم ہی آتی تھیں۔ تنک مزاج تھیں۔ ادھر چھوٹی بہن بلا کی خوددار، وہ متعدد بار ان کو سپورٹ کرنے کی پیش کش کر چکی تھیں۔ رہائش خوراک، بچوں کی تعلیم سے لے کر ہر معاملے تک۔ مگر بہن کی خودداری کسی اور کے آگے سوالی نہ بننے دیتی۔ وہ تو بس ایک ہی در پر ہاتھ پھیلانے کی قائل تھیں وہاں سے جو کچھ بھی عطا ہو رہا تھا اسی پر راضی بہ رضا پھر وہ کچھ اس لیے بھی اپنی انتہائی امیر بہن سے زیادہ میل جول نہ رکھتیں کہ ان کے بچے احساس کمتری میں مبتلا نہ ہوں۔ ان کے اس رویے سے بڑی بہن ناراض ہی رہتی تھیں۔ انہوں نے بھی دھیرے دھیرے ان لوگوں سے میل جول بہت کم کر دیا تھا مگر پھر احمد کی وفات کے بعد سے وہ کئی بار آ چکی تھیں۔ اب وہ اصرار کر رہی تھیں کہ بہن، بھانجی ان کے گھر شفٹ ہو جائیں مگر وہ ہر بار سہولت سے انکار کر دیتیں۔ مگر وہ بھی کہ برابر انہیں قائل کرنے کی کوششوں میں لگی ہوئی تھیں۔

''اکیلے رہو گی؟''

''ہم دو ہیں۔ تیسرا ہمارا اللہ، اکیلے کہاں سے ہو گئے ہم؟'' انہوں نے رسان سے جواب دیا۔

''حالات دیکھ رہی ہو کیسے ہیں۔ جوان جہان لڑکی کا ساتھ ہے۔ تمہیں تو پہلی فرصت میں کوئی ایسا ٹھکانا ڈھونڈنا چاہیے جہاں تم دونوں محفوظ رہو۔'' آپا جان اپنی دھن میں ہی بولتی رہتیں۔

''یہ بھی پرانا محلہ ہے ہمارا۔ لوگ جان پہچان کے ہیں شریف ہیں۔ عزت کرتے ہیں ہماری۔ آگے اللہ مالک ہے۔''

''تم شروع سے ہی ضدی ہو۔ تمہیں سمجھانا تو بس......'' وہ جھنجلا جاتیں۔

''آپا جان، آپ ہماری فکر مت کریں۔ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیں۔ ہم نے خود کو اللہ کی مرضی پر چھوڑا ہوا ہے۔ وہ یقیناً ہمارے ساتھ برا نہیں کرے گا۔'' امی نے بہت نرمی کے ساتھ بات ختم کر دی تھی مگر اب بھی

کا ہے یہ کہ آپا جان کا فون آجاتا اور پھر وہی اعتراف۔ آج بھی ان کا فون عائشہ نے اٹینڈ کیا تھا۔

"خاموشی اختیار کرلو۔ وہ خود ہی چپ ہو جائیں گی۔" امی نے کپ خالی کر کے واپس رکھا۔

"ہوں۔" عائشہ کا دل و دماغ سلائی کی مد میں ملنے والی رقم پر اٹکا ہوا تھا۔ وہ حساب لگا رہی تھی کہ امی کی آنکھوں کے آپریشن کے لیے مزید کتنی رقم درکار ہے۔

☆☆☆

کاسنی رنگ کا کرتا پاجامہ پہنے اس کا چہرہ اتنی روشنیاں بکھیر رہا تھا کہ نظر ہٹائے نہیں ہٹتی تھی۔

"تو آج کل بڑی لائنیں مار رہی ہے۔" مہک جان نے سر سے پاؤں تک اسے دیکھا۔

"یہ دیکھو۔" چنبیلی نے بڑے فخر سے اپنے دائیں ہاتھ کو اس کے سامنے کیا۔ تیسری انگلی میں سونے کی بیش قیمت انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔

"اوہ! انگوٹھی تک پہنچ گیا معاملہ۔"

"اس سے بھی آگے تک جائے گا۔" چنبیلی نے فخر آمیز لہجے میں بولتے ہوئے انگوٹھی اتار کر اس کے ہاتھ میں دی۔ "پورا سیٹ ہے۔"

"ہوں! یہ تو بھاری۔" مہک جان نے ہتھیلی پر اسے تولا۔

"ہے نا!" چنبیلی نے بے حد اشتیاق سے اسے دیکھا۔

"بات سن دیوانی! دل والوں کے لیے یہ سب چیزیں کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ نہ سونا۔ نہ دولت اور دولت والوں کے لیے بھی دل والے کوئی معنی نہیں رکھتے۔ اتنا خوش مت ہو۔ زہر میں بجھے راستے ہیں یہ نس نس میں اتر جاتا ہے یہ زہر۔ ایسا زہر جو نہ مارتا ہے نہ جینے دیتا ہے۔"

مہک جان تو کوئی اور ہی مہک جان لگ رہی تھی۔ چنبیلی نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"وہ محبت کرتا ہے مجھ سے، شادی بھی کرے گا۔" چنبیلی کے خواب اس کی آنکھوں سے لبوں تک آگئے تھے۔

"محبت کرنا آسان ہوتا ہے۔ شادی کرنا اس سے بھی آسان اور نبھانا سب سے زیادہ مشکل۔" مہک جان نے انگوٹھی اسے واپس دیتے ہوئے ایک گہری سانس لی۔

چنبیلی حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے چپ چاپ پلٹ گئی۔ مہک جان سگریٹ ہونٹوں میں دبا کر لائٹر سے شعلہ دکھا رہی تھی مگر نہ جانے کیوں اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

چنبیلی واپس پلیٹ کر لڑکیوں کے پاس چلی گئی۔ بیری بوا اور رینا کماری کھانا لگا رہی تھیں اور ساتھ ساتھ سب کو آوازیں بھی لگا رہی تھیں۔

"کیا پکایا ہے بوا؟"

"ملکہ مسور، چاول اچار، چٹنی اور سلاد ہے اور ساتھ ہی مرغی کا قورمہ بھی ہے۔" ردٹی بوا نے فہرست گنوائی۔

"وہ چٹنی املی کی ہے؟" پریا نے بڑے اشتیاق سے سوال کیا۔

"او ٹانسلو کی شہزادی۔ مہک جان نے سن لیا نا تو تیری چٹنی بنا دیں گی۔ تیرے ٹانسلو کے آپریشن کو ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ کھٹاس کا تو خاص طور پر پرہیز ہے تجھے۔" دسترخوان پر بیٹھتے ہوئے گوری نے اسے لتاڑا۔

"پرہیز کر کر کے میرا تو حال برا ہو گیا۔" پریا نے ایک آہ بھرتے ہوئے پلیٹ میں سلاد نکالی۔

"مہک جان کبھی کبھی عجیب سی باتیں نہیں کرنے لگتی؟" چنبیلی نے گوری کے کان میں سرگوشی کی۔

"صرف باتیں۔ وہ تو پوری عجیب ہے۔ شمشو جیسے مخنجو ــــ سے شادی کرلی۔ یہ کام صرف اور صرف کوئی عجیب عورت ہی کر سکتی ہے۔" گوری حسب عادت منہ پھاڑ کے ہنسی۔

ان دونوں کی تو پوری لواسٹوری ہے۔ تم ہی الو ہو نا اس لیے معلوم نہیں ہے۔" خوب صورت نے دھیرے سے لقمہ دیا۔

"ان دونوں کی لواسوٹری؟ گوری پر ایک بار پھر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔

"خاموشی سے کھانا کھا لڑکی۔" بیری بوا نے اسے ٹوکا۔

"لواسٹوری سنا دونوں کی۔" گوری نے خوب صورت کے کان میں تقریباً گھس کر کہا۔

"تم لوگ کیوں کان میں پکوڑے تل رہی ہو؟" اس بار مینا کماری نے دونوں کو دیکھا۔

"مہک جان کی لواسٹوری کی فرمائش کر رہی ہے۔" خوب صورت نے جھٹ سے بتایا۔

"اسی سے جا کر سن لے۔ اچھی طرح بتائے گی تجھے اپنی لواسٹوری۔" بیری بوا نے گھور کے دیکھا۔

"چپ ہو جا۔ رات میں بتاؤں گی۔" خوب صورت نے اس کا گھٹنا دبایا۔ گوری خاموش ہو گئی کھانے کے دوران اسے یہی کھد بد ہوتی رہی کہ آخر مہک جان اور شمشو کی لواسٹوری کیا ہے۔

☆☆☆

آج کئی مہینوں بعد وہ اپنا موبائل لے کر بیٹھی تھی۔ آخری میسج پچھلے ہفتے آیا تھا۔ گلابی ناخن والی خوبصورت انگلی اس نے بٹن پر رکھی اور اسے پریس کیا۔ اسکرین پر الفاظ چمکنے لگے۔ الفاظ جو کبھی زخم ہوتے ہیں۔ اور کبھی زخم کا درماں، کبھی پیاس تو کبھی پیاس بجھانے کا سامان۔ وہی الفاظ اس کے سامنے تھے۔ دھیرے دھیرے اس کے دل کو بدلنے والے الفاظ اور شاید زندگی کو بھی۔ اس کی نظریں اسکرین پر پھسلنے لگیں۔

"میرے الفاظ شاید تمہارے غم کا مداوا نہ کر سکیں مگر تم سے دور رہ کر میرے پاس یہ الفاظ ہی ہیں جنہیں میں تمہیں تسلی دینے کے لیے استعمال کر سکتا ہوں۔ سچ کہوں تو احمد کی یوں اچانک ڈیتھ نے مجھے بری طرح ہلا ڈالا۔ میں نے بہت گہرائی میں جا کر سوچا مگر پھر بھی مجھے یہی محسوس ہوا کہ تمہارے غم کی شدت میں اس طرح نہ محسوس کر سکوں جیسے کہ تم محسوس کرتی ہو۔

تمہارے آنسو، تمہارا دکھ۔ تمہارے احساسات، میرے لیے سب کچھ بہت قیمتی ہے اور اس سے بھی زیادہ بیش قیمت، خوشی کی وہ چمک ہے جو میں تمہاری آنکھوں میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ تمہارے لبوں کی ہلکی سی مسکراہٹ بھی میرے لیے کسی قیمتی متاع سے کم نہیں۔ غم اور آزمائش کی اس گھڑی میں میرا دل اور خود میں تمہارے ساتھ کھڑے ہیں شاید یہ عام سی بات لگے مگر خود کو اکیلا محسوس کرنے سے غم کا بوجھ اور بڑھ جاتا ہے۔ اس لیے تمہیں یہ یقین دلانا اور یاددہانی کرانا ضروری ہے کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔

"تمہارا ہر آنسو اپنی ہتھیلی پر لینے کے لیے اور تمہارا یہ غم اپنے دل پر لینے کے لیے تم مجھے یہ دونوں چیزیں دو گی نا؟"

عائشہ نے یہ میسج ایک بار پڑھا۔ پھر دوبارہ پھر سہ بارہ، بالآخر ایک گہری سانس لیتے ہوئے اس نے اپنا ان بکس کھولا۔ پہلے کے سارے میسجز اس میں محفوظ تھے۔ اس نے مانی کا سب سے پہلا میسج نکالا۔

"مجھے نہیں پتا کہ تم مجھے کتنی اچھی لگی ہو مگر تم مجھے بہت اپنی اپنی سی لگتی ہو۔ اسی اپنائیت کے احساس نے تم سے مخاطب ہونے کی ہمت دی۔ اور شاید اسی احساس نے تم سے محبت کی جرات بھی دی۔ یہ تم سے فلرٹ کا آغاز نہیں ہے۔ میں بالکل سنجیدہ ہوں اسی لیے اپنی شناخت ظاہر کر رہا ہوں تم مجھے غلط یا برا سمجھو تو میری کمپلین کر سکتی ہو۔ مگر مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ تم ایسا نہیں کرو گی۔"

عائشہ نے ایک اور میسج پڑھا۔

"میرے دل کی بات تم تک پہنچنا ہی میرے لیے کافی ہے۔ تم بے شک مجھے ابھی کوئی جواب نہ دو۔ مجھ سے بات نہ کرو۔ یہ خاموشی بھی بہت خوب صورت ہے۔"

عائشہ نے موبائل آف کر دیا۔ بدن سے روح کھینچ لینے والے کرب کا احساس کم ہو گئی تھی اور شدت دھیرے دھیرے کم ہونے لگی تھی۔ کچی عمر کے اولین خواب، آنکھوں کے جھروکوں سے باہر جھانک رہے تھے۔ محبت کے رنگین پروں والی سنہری تتلی دل کے آس پاس کہیں منڈلا رہی تھی۔

☆☆☆

''کیا ہوا بچے۔ کتنی دیر انتظار کرنا پڑے گا۔'' دادی نے لیپ ٹاپ کھولے مانی کو مخاطب کیا۔

''دادی حضور بس چند سیکنڈز زادر۔''

''السلام وعلیکم بڑی دادی۔ میں مانی بات کر رہا ہوں۔''

رابطہ ہو گیا تھا۔ دادی کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

جی، الحمدللہ سب خیریت ہے یہاں مجھ سمیت، دادی جان سے بات کریں۔''

''کیسی ہیں آپا جان؟'' سلام دعا کے بعد وہ اپنی بڑی بہن سے مخاطب ہوئیں جو امریکہ میں مقیم تھیں۔

''ٹھیک ہوں۔ پچھلے دنوں شوگر لیول کچھ گڑبڑ کر رہا تھا۔ اب سب کچھ سیٹ ہے۔''

''بدپرہیزی کی ہو گی۔ ہے نا۔ میٹھا کھانے سے آپ باز نہیں آتیں۔'' دادی کا تجزیہ درست تھا۔

''میٹھا کھا کر مرنے سے بڑی میٹھی موت آتی ہے۔'' وہ ہنسیں۔

''اف، برسوں پرانا یہ ڈائیلاگ آپ کو آج بھی یاد ہے؟ کیا کہنے آپ کی یادداشت کے۔ قریب قریب کوئی ساٹھ برس تو بیت گئے ہوں گے اس بات کو، جب آپ مرتبان سے مٹھی بھر کھانڈ نکال نکال کر کھا جاتی تھیں اور رشیدہ بی ان دیکھے چور کو غائبانہ دھمکیاں دیتی تھیں کہ ہاتھ آ جائے تو جان سے مار دوں۔ تب آپ کا یہ ڈائیلاگ ہم ساری بہنوں کو ہنسنے پر مجبور کر دیتا تھا مگر چپکے چپکے۔ یاد ہے رشیدہ بی کتنا ڈانٹتی تھیں زور زور سے ہنسنے پر۔''

''وہ تو ہر بات پر ہی ڈانٹتی تھیں۔ دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھو، دھیمے بولو۔ دھیمے ہنسو، ہر ایک کا ادب لحاظ رکھو۔ اللہ کی پناہ، وہ دن بھر میں ہمیں سینکڑوں نصیحتیں کر جاتی تھیں اور آج میں اپنی تیسری نسل کو یہ سب باتیں سکھاتے ہوئے سوچتی ہوں کہ اس وقت ہمیں یہ سب نصیحتیں کتنی ناگوار لگتی تھیں۔''

''وہ بھی تو یہی کہتی تھیں کہ آج ہماری نصیحتوں پر تم لوگ منہ بناتے ہو۔ کل کو یہی باتیں اپنی اولادوں کو سکھاؤ گے۔'' دونوں بوڑھی خواتین حسب عادت اپنے ماضی میں کھوئی ہوئی تھیں۔

''اچھا یہ بتاؤ حالات کیسے ہیں وہاں کے یہاں خبریں سن سن کر دل ہولتا ہے میرا۔''

''حالات؟'' دادی نے ایک آہ بھری۔'' بہت عرصے سے وہی حالات ہیں۔ ایک جیسے، قتل و غارت، دہشت گردی، دھماکے ایسا لگتا ہے کہ ہم عادی ہو گئے ہیں یا بے حس وہ حساب ہو گیا کہ ''برسر فرزند آدم ہر چہ آئد بگذرد'' (انسان پر جو مصیبت آتی ہے وہ بھگت ہی لیتا ہے) تو بس مر رہے ہیں بھگت رہے ہیں۔

''میں تو ہر نماز میں یہی دعا کرتی ہوں کہ اللہ ہمارے پاکستان میں امن قائم کر دے۔ اور ہر اس جگہ، جہاں خون خرابہ ہو رہا ہے۔''

''دعا کے ساتھ عمل بھی تو ہو۔ خیر اور سناؤ، فہمیدہ کی کوئی خیر خبر؟''

''پچھلے ہفتے بات ہوئی تھی اور ہاں اچھا ہوا۔ تم نے پوچھ لیا۔ دیکھا اس کم بخت یادداشت کو کہاں تو پچاس ساٹھ سال پرانی باتیں یاد رہتی ہیں اور کہاں وہ بات ہی بھول گئی جس کے لیے فون کیا تھا۔'' وہ پھر ہنسیں۔

''ہوں۔'' دادی ان کی بات سننے کی منتظر تھیں۔

''فہمیدہ کی بڑی نند اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کے لیے لڑکی تلاش کر رہی ہیں۔ اگلے ماہ پاکستان آئیں گی۔ فہمیدہ نے حمنہ کا ذکر کیا ہے ان سے۔ فہمیدہ کہہ رہی تھی کہ افتخار اور عالیہ سے بات کرے گی دو چار دن میں۔''

''اچھا چلو دیکھتے ہیں۔ اللہ مالک ہے جو اس کا علم اور نصیب میں لکھا ہے وہی ہوگا۔''

''مردے از غیب بروں آید و کارے بکند (جب کوئی کام ہونے والا ہوتا ہے تو غیب سے اس کے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں)

''ویسے کسی اور نے بھی کہا تھا مجھ سے حمنہ کے لیے مگر تم ناپسند کرتی ہو ان لوگوں کو اس لیے میں نے ذکر ہی نہیں کیا۔''

''تم کس کی بات کر رہی ہو؟'' دادی چونکیں۔

''وہی روہیل کھنڈ والے خان صاحب، اپنے پوتے کے لیے حمنہ کا کہہ رہے تھے۔ میں نے ٹال دیا۔''

''بہت اچھا کیا۔ ایسے کم ظرفوں سے تو رشتہ داری کرنی بھی نہیں مجھے۔ انسان بے شک نکٹے کا کھائے مگر اوچھے کا نہ کھائے۔ ہماری لڑکی لے کر ہماری سات پشتوں پر احسان جتاتے۔''

''چلو وہ اوچھے ہی۔ کیا پتا ان کا پوتا ایسا نہ ہو۔'' بڑی دادی نے یونہی لطف لیا۔

''کیوں نہ ہوگا۔ پتا یہ پوت ـ یہ گھوڑا۔ بہت نہیں تھوڑا تھوڑا۔ خان صاحب کا تو آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا تھا۔'' دادی نے منہ بنایا۔

''تب ہی تمہارے لیے رشتہ بھیجا تھا۔ موصوف نے بگڑے ہوئے جو ٹھہرے۔'' بڑی دادی آج بڑے موڈ میں تھیں۔

''توبہ توبہ۔ کیا باتیں لے کر بیٹھ گئیں آپ۔ ہم نے تو اس وقت بھی خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ خالہ جان کے گھر بچپن سے ہی ہماری زبانی کلامی نسبت طے تھی ورنہ ابا جان تو موصوف پر ایسے فدا تھے کہ فوراً ہی ہاں کر دیتے۔''

''کچھ بھی کہو۔ خان صاحب تھے دل والے۔ جب تک تمہاری شادی نہیں ہوئی۔ وہ بھی کسی معجزے کے انتظار میں رہے۔ تمہارے بیاہ کے کئی برسوں بعد انہوں نے بیاہ رچایا تھا اپنا۔''

''ہاں تو ہم کیا کریں۔ ہم نے کہا تھا ایسا کرنے کو پتا تھا کہ ان تلوں میں تیل نہیں پھر بے کار کا ناٹک کیا کرنا۔'' دادی کا لہجہ تیز ہو گیا۔

''اچھا بھئی خفا تو مت ہو۔ ہمیں یاد آیا تو یونہی ہم نے ذکر کر دیا۔ مقصد تمہیں چڑانا نہیں تھا۔'' بڑی دادی نے سفید پرچم لہرایا۔

''اچھا بچوں اور بہو سے تو بات کروائیں میری۔'' دادی نے فرمائش کی۔

''بالکل میں ابھی بلاتی ہوں۔'' بڑی دادی اپنی پوتی کو آواز دے رہی تھیں۔

☆☆☆

وہ ریسٹورنٹ بالکل نیا نیا کھلا تھا ابھی، جدید طرز اور دیدہ زیب انداز کا بنا ہوا۔ دھیمے سروں میں بجتی موسیقی، دھیمی روشنیوں والا خوابناک ماحول۔

وہ اندر داخل ہوتے ہی ایک دم ٹھٹک سی گئی۔ ایسی جگہوں پر آنا اس کا خواب تھا اور آج پہلی بار اس خواب کی تعبیر ملی تھی۔ اس نے بے حد احسان مندی سے جمال کو دیکھا۔ وہ اس کا محسن تھا اس کا نجات دہندہ تھا۔ ایئر کنڈیشن کی ٹھنڈک خوشبودار فضا میں گھل مل کر دل میں ایک نئی ترنگ جگا رہی تھی۔ وہ کچھ جھجکتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئی۔

''اتنی نروس کیوں ہو؟'' جمال نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔

''سرمد کی طرف سے بے فکر رہو۔ اس نے خواب میں بھی ایسی جگہوں پر آنے کا تصور نہیں کیا ہوگا۔ لہٰذا یہاں آس پاس اس کی موجودگی کا تو کوئی امکان نہیں ہے۔ اور بالفرض اگر ایسا ہو بھی جائے تو اس کو الو بنانا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔'' جمال حقارت سے بولتے ہوئے ہنسا۔ نائلہ بھی اس کے ساتھ ہنسی میں شریک ہو گئی۔

"ہوں تو ہماری نائلہ جی، آج ہمارے سامنے ہیں۔" جمال نے میز پر دھرے اس کے نرم و ملائم ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

نائلہ ہنستے ہنستے چپ ہوگئی اور پھر چند لمحوں بعد وہ ایک دم مسکرا دی۔

"آپ کو تو سچ مچ کسی محل میں ہونا چاہیے تھا۔ یہ ہوش ربا حسن، یہ قیامت خیز جوانی۔ اس گھٹیا سے گھر میں ایک معمولی سے بندے کے ساتھ آپ کو گھٹ گھٹ کر جیتے ہوئے دیکھتا ہوں تو میرا دل خون کے آنسو روتا ہے۔" جمال اپنے لہجے میں دنیا زمانے کا دکھ سمو کر بول رہا تھا۔ نائلہ کا ہاتھ ابھی تک اس کی گرفت میں تھا۔

"بس شاید یہی لکھا تھا تقدیر میں۔" نائلہ نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کی ہتھیلی کے نیچے سے نکالا۔

"تقدیر تو خیر..... اچھا چلو یہ سب باتیں بعد میں یہ بتاؤ کیا کھاؤ گی"

"جو آپ کھلائیں۔"

"سوچ لو، اپنی پسند کا کھانا، اپنی پسند کو، میں اپنے ہاتھوں سے کھلاؤں گا۔"

جمال نے بڑی گہری نگاہوں سے اس کے چہرے کا طواف کیا۔ اس چہرے پر کچھ نہیں تھا۔ نہ خوف، نہ گھبراہٹ، نہ شرم، بس حسن ہی حسن تھا جو بکھرا ہوا تھا۔ اس بکھرے حسن کو وہ اپنی نظروں سے سمیٹ رہا تھا۔

جتنی دیر میں جمال نے ویٹر کو آرڈر لکھوایا۔ نائلہ ریسٹورنٹ کا جائزہ لیتی رہی۔ وسیع ہال بڑی خوب صورتی سے سجا ہوا تھا۔ دیواروں پر آویزاں خوب صورت پینٹنگز دیکھنے والوں کی توجہ خود پر مبذول کرانے میں بڑی کامیاب تھیں۔ ریسٹورنٹ کی بناوٹ اور سجاوٹ میں لکڑی اور شیشے کو بڑی عمدگی اور نفاست سے استعمال کیا گیا تھا۔ ان دونوں کے علاوہ اس وقت ہال میں تین کپل اور بھی موجود تھے۔ خوب صورت، طرح دار لوگ، مہکی بہکی سی مسکراہٹیں۔ دھیمی دھیمی سرگوشیاں۔ نائلہ سب کو دیکھتی رہی اور بے اختیار ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئی۔ اپنی دانست میں وہ اپنا سب سے بہترین جوڑا پہن کر بہت اچھے طریقے سے تیار ہوئی تھی۔ مگر پھر بھی نہ جانے کیوں اس وقت اسے اپنی کم مائیگی کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" جمال نے دھیرے سے اس کا رخسار چھوا۔

"کچھ نہیں۔" وہ اب بھی کھوئی کھوئی سی تھی۔

"کچھ تو ہے۔ چاند پر بدلی۔ کیوں چھائی یکا یک۔" جمال نے اصرار کیا۔

"دوسرے لوگوں کو دیکھتی ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ میں اتنے پکچر حال میں کیوں ہوں من پسند زندگی گزارنے کا خواب ہر کوئی دیکھتا ہے مگر تعبیر ہر ایک کے ہاتھ میں نہیں آتی۔ کچھ لوگ میرے جیسے بھی ہوتے ہیں سسک سسک کر زندگی گزارنے والے۔" نائلہ احساس کمتری کی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ خواہشات کی پٹی آنکھوں پر یوں بندھی تھی کہ وہ کچھ بھی دیکھنے سے قاصر تھی۔

"تمہیں کس نے مجبور کیا ہے کہ تم یوں سسک سسک زندگی گزارو گھٹ گھٹ کر مرتی رہو۔ ایک بات تو طے ہے کہ سرمد کو لہو کے بیل کی طرح زندگی گزارنے والا فرد ہے۔ وہ کبھی بھی تمہیں وہ زندگی، وہ لائف اسٹائل نہیں دے سکتا جس کے تم خواب دیکھتی ہو۔ بلکہ مجھے یہ کہنا چاہیے کہ ایسی زندگی جسے تم ڈیزرو کرتی ہو۔" جمال نے لوہا گرم دیکھا تو چوٹ مارنے کا آغاز کیا۔

"پھر کیا کروں؟ پیروں میں پڑی زنجیر کو اب تمام عمر گھسیٹنا ہی ہے۔" نائلہ کے لہجے میں بے بسی تھی۔

"اتار پھینکو اس زنجیر کو۔"

"میرے ابا اور بھائی کبھی بھی اس فیصلے کو قبول نہیں کریں گے۔" نائلہ نے نفی میں سر ہلایا۔

ان لوگوں کی پروا کیوں کرتی ہو۔'' جمال گرم لوہے پر متواتر چوٹیں مار رہا تھا۔
''تو پھر کون پورا کرے گا میرے خوابوں کو۔''
''میں، اور کون؟'' جمال دلکشی سے مسکرایا۔
''آپ؟'' نائلہ نے حیرانی سے اسے دیکھا۔
''کھانا کھاؤ۔ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔'' جمال نے اس کی پلیٹ میں چاول ڈالے۔
وہ فیصلہ کن چوٹ مار کر اب بڑے اطمینان سے کھانا کھا رہا تھا۔

☆☆☆

آٹے کے ڈبے کو پورا الٹا کر، اچھی طرح سارا آٹا سمیٹ کر اس نے گوندھ لیا۔ بس اتنا تھا کہ دو روٹیاں پک جاتیں۔
''چلو اس وقت کا تو پورا ہو جائے گا۔ پھر پڑوس میں کلثوم خالہ سے کہہ دوں گی وہ کہیں سے منگوا دیں گی۔'' عائشہ نے ہاتھ دھوتے ہوئے سوچا۔
پانی بھی شاید ختم ہونے کو تھا ٹنکی میں نل سے گرتے پانی کا پریشر انتہائی کم تھا۔ ہاتھ دھو کر وہ تخت پر آ گئی جہاں سلائی کے کپڑوں کا ڈھیر اس کا منتظر تھا۔ امی کی آنکھ کی تکلیف اب بڑھتی جا رہی تھی۔ کپڑوں کی کٹائی سلائی اب ان کے بس کی بات نہیں رہی تھی اور عائشہ نے بھی سختی سے انہیں منع کیا ہوا تھا کہ وہ اپنی آنکھوں پر بالکل بھی زور نہ ڈالیں۔
''ان شاء اللہ تعالیٰ اگلے ماہ آپ کی آنکھوں کا آپریشن ضرور ہو جائے گا۔'' عائشہ نے بڑے یقین سے کہا۔
تھیلے سے اس نے ادھورا پڑا ٹراؤزر نکالا اور اسے مکمل کرنے لگی یہ جوڑا آج شام تک سی کر دینا تھا اسے ابھی بہت ٹائم تھا۔ شام تک تو دو سوٹ سل جاتے۔ وہ تیزی سے ہاتھ چلانے لگی۔
''تھوڑی دیر آرام کر لیتیں بیٹی صبح سے لگی ہوئی ہو۔ سلائی میں بیٹھے بیٹھے کمر اکڑ جاتی ہے۔'' امی نے نرمی سے کہا۔
''کمر سیدھی کر لی ہے امی۔ ابھی اٹھی تو تھی۔'' عائشہ کا ہاتھ بدستور رواں تھا۔
''اچھا۔'' وہ پتا نہیں کیا سوچ رہی تھیں۔
''امی مشین کسی کو دکھا دیں بار بار سلائی خراب ہو رہی ہے۔ پہلے تو بھائی دکان پر دے آتے تھے اب.....'' عائشہ نے روانی سے بولتے ہوئے ایک دم دانتوں تلے زبان دبائی۔
''ہاں، گھر میں کوئی مرد نہ ہو تو ہر کام کے لیے پریشانی ہو جاتی ہے۔'' امی نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے جیسے خود کلامی کی تھی۔ ان کی آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہ تھی۔
''کلثوم خالہ سے کہہ دیجیے گا وہ عنایت بھائی سے کروا دیں گی۔'' عائشہ نے اپنی پہلی والی بات کا اثر زائل کرنے کے لیے ان کا دھیان دوسری طرف لگایا۔
''اللہ، خالہ کلثوم اور ان کے گھرانے کو اجر دے۔ بہت اچھے پڑوسی ہیں۔ ہمارے بہت کام آ رہے ہیں۔'' امی کا لہجہ شکر اور احسان مندی کے جذبات سے لبریز تھا۔
''میں کہہ دوں گی ان سے وہ عنایت کے ذریعے مشین دکان پر بھجوا دیں گی، کاریگر ٹھیک کر دے گا۔ ایک آدھ دن کی بات ہے۔ زیادہ ٹائم تو نہیں لگے گا نا۔''
''امی جی، بجلی کا بل دو مہینے سے نہیں بھرا۔ اب تیسرا بل آنے والا ہے۔''
''ہاں۔ مجھے یاد ہے۔ کیا کریں، اتنی آمدنی ہو رہی ہے کہ کھینچ تان کر مہینہ نکال دیں بجلی کے بل کے ہزاروں روپے کہاں سے لائیں، دیکھو، اللہ مسبب الاسباب ہے۔ کیا پتہ کہیں سے کوئی سبب بن جائے اس بوجھ کو

اتارے گا۔" امی کے الفاظ حوصلہ افزا مگر لہجہ بجھا بجھا سا تھا۔
"ایک بات کہوں؟" عائشہ نے جھجکتے ہوئے ماں کی طرف دیکھا۔
"کیا بات ہے؟" وہ چونکیں۔
"خالہ جان سے کچھ رقم بطور قرض لے لیں۔ انہوں نے تو خود آفر بھی کی تھی۔"
"نہیں۔" امی نے دوٹوک انکار کیا۔
"بطور قرض کہہ رہی ہوں امی، وہ بھی بجلی کے بل کی وجہ سے۔ ادائیگی نہیں کی تو بل اسی طرح بڑھتا چلا جائے گا۔ سیزن میں جب سلائی کا کام زیادہ ہوگا تو ان کا قرضہ اتار دیں گے۔"
"بندوں کے آگے ہاتھ پھیلانے سے بہتر ہے جو مانگنا ہے اللہ سے مانگو۔"
"اللہ تعالیٰ بھی زمین پر کسی نہ کسی کو وسیلہ بنائے گا۔ کوئی چھپر پھاڑ کر تو نوٹ نہیں برسیں گے؟" عائشہ تھوڑی سی تلخ ہوگئی۔
"وہ مسبب الاسباب ہے۔ کوئی نہ کوئی سبب بن جائے گا۔" امی کے اطمینان میں ہنوز کوئی فرق نہیں آیا تھا۔
"آپ کی وجہ سے ہی کہہ رہی ہوں مجھے معلوم ہے نا کہ آپ کو کتنی ٹینشن رہتی ہے بل بھرنے کی۔ فکر کے مارے رات کو نیند بھی ٹھیک سے نہیں آتی آپ کو۔"
"کیا کروں، عادت سے مجبور ہوں۔" امی کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ آگئی۔
"اچھا چلیں۔ چھوڑیں ان سب فالتو باتوں کو، یہ بتائیں، پلاؤ کھائیں گی؟ کل پکا لیتی ہوں۔"
"پلاؤ؟" امی نے حیرت سے اسے دیکھا گھر کے محدود سے بجٹ میں اس اس کی عیاشی ذرا مشکل ہی تھی۔
"کونے والی فیروزہ آنٹی کے گھر سے عقیقے کا گوشت آیا تھا نا۔ وہ رکھا ہوا ہے۔ کل اس کا پلاؤ بنالوں گی۔" عائشہ نے انہیں یاد دلاتے ہوئے کہا۔
"مجھے یاد ہی نہیں تھا۔ تبھی میں حیران ہو رہی تھی کہ" امی نے مسکراتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔
رات میں عائشہ سونے لیٹی تو دھیان کے پرندے اس کی جانب پرواز کرنے لگے جو آج کل اس کے خیالوں میں بہت آرہا تھا۔
عائشہ نے موبائل نکالا، دو تین دن پہلے اس کا میسج آیا تھا۔
"کتنی رومانٹک اور خوب صورت محبت ہے ہماری، اوہ سوری، میرا مطلب ہے میری کہ تم نے تو ابھی کچھ کہا ہی نہیں۔ مگر سنا ہے کہ خاموشی میں اقرار چھپا ہوتا ہے۔ تو کیا میں یہ سمجھوں کہ...... دیکھا۔ میں پھر اپنے موضوع سے ادھر ادھر ہوگیا۔ دراصل میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ دھیمی دھیمی آنچ والی، کالموں والی، خاموش محبت، اس کا حسن میں شاید لفظوں میں بیان نہ کرسکوں۔"
حسن تو میں تمہارا بھی لفظوں میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ مگر یہ بات یونہی برسبیل تذکرہ کہہ رہا ہوں یہ مت سمجھنا کہ تمہارے حسن و جمال نے میرے ہوش اڑا دیئے اور اس عالم دیوانگی میں تم سے محبت کا دعویٰ کر بیٹھا۔ یہ جو محبت ہوتی ہے نا۔ یہ شکل و صورت سے ماورا کچھ اور ہی شے ہے۔ بے شک تمہاری سادگی، تمہاری معصومیت بڑی دل موہ لینے والی ہے مگر محبت کا رشتہ فقط چہرے اور مادی وجود کے ساتھ قائم نہیں ہوتا۔ یہ دل سے دل کا اور روح سے روح کا رشتہ ہوتا ہے۔ میرا تم سے رشتہ کیا ہے؟ دل کا یا روح کا۔ جو بھی ہے بس بہت خوب ہے۔"
"جو بھی ہے، بہت بہت خوب ہے۔" عائشہ نے زیر لب دہرایا اور مسکرادی۔

☆☆☆

بستر پر لیٹے لیٹے وہ تنگ آگیا تھا مگر چاچا رسول بخش کی محبت اسے کبھی کبھی ان کی بات ماننے پر مجبور کر دیتی

تھی۔ دائیں بائیں کروٹ لے کر بھی اسے سکون نہ ملا تو وہ دوبارہ چت لیٹ گیا اور لیٹے لیٹے چک پھیریاں کھاتے چھت کے پنکھے کو دیکھتا رہا۔ وہاں سے نظریں ہٹیں تو کونے میں رکھی لوہے کی الماری پر ٹک گئیں۔ اس کے برابر میں دو لکڑی کی کرسیاں دو پلنگ، ایک چاچا کا، ایک اس کا۔ چاچا کے پلنگ کے نیچے ٹین کا صندوق تھا۔ جس میں وہ بڑے اہتمام سے تالا لگا کر رکھتے تھے اور چابی ان کے ازار بند میں بندھی جھولتی رہتی۔

یہ سب کچھ وہ برسوں سے اپنے بچپن سے دیکھتا چلا آرہا تھا۔ چند سال پہلے فقط ایک تبدیلی یہ آئی تھی کہ دیواروں پر سجے اللہ اور رسول ﷺ کے طغروں کے علاوہ چاچا نے ایک آئینہ اور لگا دیا تھا۔ شاہ میر کے لیے۔ مگر ان کا یہ اہتمام بے سود ہی رہا۔ اسے بھلا کہاں دلچسپی تھی آئینہ وغیرہ دیکھنے سے بس چاچا خود ہی کبھی کبھار خود کو آئینے میں دیکھتا اور اپنی گزری جوانی پر آہیں بھرتا۔

"یہ لے پتر، ناشتہ کر اور دوائی پی کر آرام کر۔" چاچا تڑے میں اس کے لیے کھانا لے آیا۔ اس دن شاہ میر پیر کی چوٹ اور نکلتے خون کی پروا کیے بغیر بس میں بیٹھ کر سیدھا گھر آگیا۔ خود ہی الٹی سیدھی پٹی باندھ لی خون روکنے کے لیے۔ مگر جب چاچا ڈانٹ ڈپٹ کر کے زبردستی ڈاکٹر کے ہاں لے گئے تو ایکسرے سے پتا چلا کہ پیر کی ہڈی میں فریکچر ہے۔ تکلیف اور درد کے مارے اس کا برا حال تھا مگر وہ ضبط کرتا رہا۔ پلاسٹر چڑھ کر اب اتر بھی گیا تھا مگر پھر بھی ڈاکٹر نے احتیاطاً دو چار روز آرام کرنے کو کہا تھا اور چاچا اس کے آرام کے معاملہ میں انتہائی سختی اور احتیاط برت رہے تھے۔

"چاچا! تم بلاوجہ کی تکلیف اٹھا رہے ہو میرے لیے۔ میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ نہ درد ہے نہ کوئی اور تکلیف۔" شاہ میر نے انہیں دیکھ کر احتجاج کیا۔

"بس بس رہنے دے مجھے معلوم ہے تو کتنا ٹھیک ہے اور کتنا نہیں۔ بس کل کا دن اور ہے پھر پرسوں تو کام پر آجانا۔" چاچا نے رعب سے بولتے اسے آخر میں بچوں کی طرح پچکارا۔

"چاچا کل ول نہیں بس میں آج چل رہا ہوں تمہارے ساتھ۔ بس ہو گیا آرام۔ تنگ آگیا ہوں میں بستر پر پڑے پڑے۔ پھر شرم بھی آتی ہے تم سے اپنی خدمتیں کرواتے ہوئے۔" شاہ میر بولا تو بولتا چلا گیا۔

"کیوں پتر، شرم کس بات کی۔ تو مجھے باپ سمجھے نہ سمجھے میں تو تجھے اپنا بیٹا سمجھتا ہوں نا۔" چاچا دھیرے سے مسکرا دیے۔

"یہ بات نہیں ہے چاچا!" وہ شرمندہ سا ہو گیا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ مجھے فارغ بیٹھنا کتنا برا لگتا ہے اور اب اتنے دنوں سے بستر پر فارغ پڑے پڑے۔ مجھے تو ایسا لگ رہا ہے کہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔" شاہ میر کے لہجے میں بے بسی تھی۔

"کبھی ایسا بھی ہوتا ہے بیٹا کہ انسان جس چیز سے دور بھاگتا ہے وہی چیز اس کے سامنے آجاتی ہے۔"

"پر ایسا کیوں ہوتا ہے چاچا؟"

"وہ جو ہمارا رب ہے نا، ہماری رگ رگ سے واقف ہے۔ وہ اپنی قدرت دکھاتا ہے۔ ضروری تھوڑی ہے کہ ہم ہمیشہ اپنی مرضی اور پسند کی زندگی گزاریں۔ جو کچھ ہمیں ناپسند ہو اس کا سامان ہی نہ کریں۔"

"مرضی اور پسند کی زندگی؟ اس سے بڑا لطیفہ اور کیا ہو سکتا ہے؟" شاہ میر کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ آگئی۔

"چل چھوڑ ان سب باتوں کو، تو ناشتہ کر اور دوائی کھا۔"

"تو مجھ سے اتنی محبت کیوں کرتا ہے چاچا؟" شاہ میر کے جذبات عجیب سے ہو رہے تھے۔

"ایک دن جمعے کی نماز میں مولوی صاحب تقریر کرتے ہوئے بتا رہے تھے کہ جب اللہ اپنے کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو اپنے دوسرے بندوں کے دلوں میں اس انسان کی محبت ڈال دیتا ہے۔" چاچا کچھ دیر سوچ کر اسے بتانے لگے۔

"تو پتر، یہ جو میرے دل میں تیرے لیے محبت ہے نا یہ اللہ نے ڈالی ہے۔ ورنہ انسان کی کیا مجال کہ وہ دوسرے کو ایک گھونٹ پانی ہی پلا دے یا مسکرا کر ہی دیکھ لے۔ یہ تو سب اللہ کی رحمت اور محبت کا کرشمہ ہے جو اس نے اپنی مخلوق میں بھی اتنی سی رکھ دی ہے۔ چاہے جانور ہوں پرندے ہوں یا انسان، سبھی تو یہ جانور بھی اپنے بچوں سے محبت کرتے ہیں۔ تو نے دیکھا اس دن جب بلی اپنے بچوں کو منہ میں دبائے لالا کر یہاں ٹھکانہ بنا رہی تھی اور میں نے ایک بچے کو اٹھا لیا تو کیسے غرا کر مجھ پر جھپٹی تھی کہ کہیں میں اس کے بچے کو نقصان نہ پہنچا دوں۔" چاچا کچھ یاد کر کے ہنس پڑے۔

"کچھ انسان تو جانوروں سے بھی بدتر ہوتے ہیں۔ سگی اولاد کو دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔" شاہ میر کی آنکھوں میں کرب کا سمندر اتر آیا۔

"ہر بندے کی اپنی اپنی آزمائش ہوتی ہے بیٹا جی اور ہر کوئی اپنے اپنے ظرف کے مطابق اس آزمائش کا سامنا کرتا ہے۔ پر تجھے کس نے کہا اتنی مشکل مشکل باتیں سوچنے کو اور کرنے کو۔ اپنے دماغ کو زیادہ مت الجھا، ان باتوں کے چکر میں تو نے ناشتہ بھی ٹھنڈا کر دیا۔ میں اب آرام سے کرسی پر بیٹھا ہوں۔ کچھ بھی نہیں بولوں گا۔ تاکہ تو آرام سے ناشتہ کر لے۔"

چاچا نے کرسی پر بیٹھ کر اپنا قدیمی ریڈیو ہاتھ میں لے لیا۔ ریڈیو سننا ان کا بہت پرانا اور واحد مشغلہ تھا۔ جسے وہ بڑے شوق سے آج تک اختیار کیے ہوئے تھے۔

☆☆☆

نہا دھو کے کاٹن کا سوٹ، زیب تن کیے وہ تکیے کے سہارے مسہری پر بیٹھی تھیں۔ بیری بوا نے بالوں میں تیل لگا کے خوب اچھی طرح کنگھی کر کے چوٹی باندھ دی تھی۔ سر پر اب گنتی کے چند بال رہ گئے تھے۔ بے حد پتلی سی چوٹی کندھے تک آ کر رک گئی تھی۔

"کتنے دنوں بعد بڑا سکون ملا ہے۔" وہ بیری بوا سے مخاطب ہوئیں۔

"ہاں تو کتنے ہفتوں بعد تو نہائی ہو۔ سارا میل کچیل صاف ہو گیا۔ سر میں اتنے بال نہیں ہیں جتنی جوئیں بھری ہوئی تھیں۔ گھنٹہ بھر لگا کے سر صاف کیا ہے تمہارا۔" بیری بوا کا لہجہ احسان جتانے والا نہیں تھا۔ بس یونہی کہہ دیا۔

"وہ قطامہ کدھر ہے؟" ان کا اشارہ مہک جان کی طرف تھا۔

"بلاؤں؟"

"ہاں۔ ذرا بلا تو اسے۔"

مہک جان کو بلاوا گیا تو تھوڑی ہی دیر میں آ گئی۔

"ہاں اماں! بولو کیا بات ہے؟" اپنے بھاری اور تھکے ہوئے وجود کو اس نے نیچے کارپیٹ پر ڈھیر کر دیا۔ بیری بوا نے جلدی سے گاؤ تکیہ اس کے سر کے نیچے کیا۔

"پتا تو ہے تجھے کہ کیا بات ہے پھر پوچھتی کیوں ہے؟" بڑی بی بدمزاجی سے گویا ہوئیں۔

"تمہیں بھی معلوم ہے کہ میرے پاس تمہارے سوال کا کیا جواب ہے پھر آئے دن کیوں اپنا اور میرا دماغ خراب کرتی ہو؟" مہک جان چلا کر بولی۔

"تو کیا زمین کھا گئی اسے، آسمان نگل گیا۔ وہ جو تو نے لچوں لفنگوں کی فوج جمع کی ہوئی ہے۔ کسی کام کی ہے یا نہیں۔ ایک بندے کا سراغ نہیں لگا سکتے کہ کہاں ہے؟ میں بھونک بھونک کے پاگل ہو گئی کہ پولیس سے مدد لے لے۔ تو نے وہ بھی نہیں کیا۔" بڑی بی کا پارہ ہمیشہ کی طرح آسمان کو چھونے لگا۔

"لچے لفنگے کوئی بھی کام اللہ نام پر نہیں کرتے۔ نوٹ چاہئیں ان کو۔ وہ مردود کون سی جائیداد چھوڑ کر گیا ہے جو میں اس کی تلاش کے لیے خرچتی رہوں۔ اور پولیس سے کیا کہوں؟ ایک بیٹا اپنی ماں کو چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔

https://reading.urduclub.net

اسے ڈھونڈ کر لے آئیں؟"

مہک جان کی کڑوی زبان بہت تلخ الفاظ اگل رہی تھی۔ آئے دن دونوں ماں بیٹی میں یہی معرکہ ہوتا تھا۔ اور جیت اس غصے کی ہوتی جو ان دونوں کو ایک دوسرے پر بھی آتا ___ خود پر بھی آتا اور اس دنیا اور اس سسٹم پر جس کا وہ حصہ تھے۔

"کیا کرو گی اسے ڈھونڈ کے، سترہ سال گزر گئے۔ کیا پتا مر کھپ گیا ہو۔" مہک جان سفاکی سے بولی۔

"تیرے منہ میں خاک، کرموں جلی، کالی زبان۔" بڑی بی کا گورا رنگ غصے سے سرخ ہو گیا۔ منہ سے کف نکلنے لگا۔

"چل دفع ہو یہاں سے کچھ کر نہیں سکتی تو بددعائیں کیوں دے رہی ہے؟"

"بددعا دے بھی دوں تو کون سا اس کو لگنی ہے۔ تمہاری جیسی ماں کی دعاؤں کی چھتری جو ہے اس کے اوپر۔" مہک جان کا تلخ لہجہ استہزائیہ ہو گیا۔

"تیری اولاد ہوتی تو تجھے احساس ہوتا۔ تو کیا جانے اس آگ کو، ممتا کی آگ بہت بری ہوتی ہے۔" بڑی بی کا انداز یکا یک بدل گیا۔ وہ اک دم ڈھے سی گئی تھیں۔

"اچھا ہے اولاد سے محروم ہوں۔ جیسی اولاد تمہارے نصیب میں لکھی ہے ایسی اولاد سے میں بے اولاد ہی بھلی۔" مہک جان نے بڑی بے رحمی سے خود اپنے آپ کو بھی اپنی زبان کا نشانہ بنایا۔

"تجھے اللہ کا واسطہ ہے مہک کسی طرح پتا کروا دے اس کا۔ کہیں سے ڈھونڈ نکال۔ مجھے معلوم ہے تیرے لیے یہ مشکل نہیں ہے۔" بڑی بی کا سارا غصہ اور تنتنا بے بسی اور عاجزی میں بدل گیا۔

"مشکل ہی تو ہے۔ میرے لیے تو سب سے زیادہ مشکل ہے۔" مہک جان کی آنکھوں کی سرخی گہری ہونے لگی۔

"کوئی بھی میری فریاد پر کان نہیں دھرتا۔ نہ اللہ نہ بندے۔ کہاں جاؤں۔ کس کے آگے رووں۔ فریاد کروں۔" بڑی بی نے تھک ہار کے تکیے پر سر رکھ دیا اور بڑبڑانے لگیں۔

مہک جان نے بھی آنکھیں موند لیں۔ ابھی چند سیکنڈ ہی ہوئے تھے اسے آنکھیں بند کیے ہوئے کہ چھن چھن کی آواز کے ساتھ انتہائی تیز خوشبو کا بھبکا کمرے میں پھیل گیا اور ساتھ ساتھ تارا کی پاٹ دار آواز بھی۔

"باجی، اری باجی، سو رہی ہو کیا؟" اس نے بڑی نزاکت سے مہک کو آواز دی۔

"نہیں، مر گئی ہوں چل دفنا کر آ، مجھے۔" مہک جان نے آنکھیں کھول کر انتہائی بیزاری سے اسے دیکھا۔

"ہائے ہائے۔ اللہ نہ کرے، مریں تمہارے دشمن۔ ہمارے ہوتے ہوئے تم کیوں مرو اس بھری جوانی میں۔ اللہ تمہیں میری عمر بھی لگا دے۔" تارا شروع ہو گئی۔

"او بڑبولی۔ زیادہ نہ بولا کر۔ میں اپنی عمر سے تنگ آئی ہوئی ہوں تیری عمر لے کر کیا کروں گی سگنل پر کھڑے ہو کر چنے بیچوں گی کیا؟" مہک جان نے عادت کے مطابق اسے ڈپٹا۔

"سگنل..... ہاں یہی تو بتانے آئی تھی میں تو تو بڑی اللہ والی ہو گئی باجی۔ میرے دل کی بات تیری زبان پر آ گئی۔" تارا نے مرعوب ہوتے ہوئے توصیفی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"کیا بتانے آئی تھی؟" مہک جان نے اس کی چرب زبانی نظر انداز کر کے پوچھا۔

"گلابو ہے نا، موئی بھکارن، فقیرنی، اس نے پھر دوبارہ سگنل پر اپنے لوگ بھیجنے شروع کر دیے۔ روزانہ ٹولہ کا ٹولہ آ کر کھڑا ہو جاتا ہے وہاں۔ میری تو ساری دہاڑی ماری جا رہی ہے۔ وہ گندی سندی میلی کچیلی فقیرنیاں، مکھیوں کی طرح گاڑیوں سے چپک جاتی ہیں۔ بڑی بڑی گاڑیوں والے ان کے ساتھ ساتھ مجھے بھی بھگا دیتے ہیں۔ ہاں۔" تارا نے بات بناتے ہوئے آخر میں منہ بسورا۔

اس بدذات گلابو کو کیا سوجھی جب معاملہ طے ہو گیا تھا۔ اس کو بڑے بازار کا علاقہ مل گیا تھا ہمیں سگنل کا، سگنل پر اپنے بندے کیوں بھیجے اس شیدی نے؟'' مہک جان کا چہرہ غصے سے تمتمانے لگا۔

''بدذات جو ٹھہری۔'' تارا نے اپنی کلائیوں میں پڑی چوڑیاں کھماتے ہوئے جلدی سے لقمہ دیا۔

''تو فکر نہ کر، میں ابھی تھانے دار سے بات کرتی ہوں۔ اسی نے معاملہ طے کروایا تھا۔ اس کا حصہ ہر ماہ پابندی سے پہنچا رہے ہیں ہم، پھر یہ کیا حرامی پن ہے۔ لائیو ذرا میرا موبائل۔''

''کہاں ہے؟''

''میرے کمرے میں ہی کہیں پڑا ہوگا۔ دیکھ کر لے آ۔'' مہک جان جمائی لیتی ہوئی پھر لیٹ گئی۔

پانچ منٹ بعد موبائل بھی آ گیا۔

''یہ لو۔'' تارا نے موبائل اسے دیا۔

مہک جان نے موبائل آن کیا اور نمبر ملانے لگی، درمیان میں بڑی سریلی آواز میں اسے اطلاع دی گئی کہ اس کے موبائل کا بیلنس صفر ہے۔ جس کی وجہ سے کال نہیں کر سکتی۔

''رات کو تو پانچ سو کا کارڈ ڈلوایا تھا، کہیں فون بھی نہیں کیا میں نے۔''

مہک جان نے بے یقینی سے بیلنس چیک کرتے ہوئے خود کلامی کی اور پھر اس کے منہ سے مغلظات کا طوفان اُبل پڑا۔

''یہ کمینہ آج تو ضرور میرے ہاتھوں سے قتل ہوگا۔ آنے دے ذرا اس کو دیکھو اس کا کیا حشر کرتی ہوں۔ کتے کی نسل، اس کی ٹانگیں نہ توڑ دیں تو میرا نام بھی مہک جان نہیں۔'' وہ شمشو کو غائبانہ صلواتیں سنا رہی تھی جو اکثر یہ حرکتیں کرتا رہتا تھا۔

''میرا موبائل لے لو باجی!'' تارا نے گریبان میں ہاتھ ڈالا اور اپنا موبائل اسے پکڑایا۔

مہک جان نے نمبر ملایا۔ بیل جا رہی تھی۔

''ہیلو جان!'' دوسری طرف سے تھانیدار شبیر چاچڑ کی چہکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''مہک جان بات کر رہی ہوں۔'' اس نے تھانے دار کا چھچھورا پن نظر انداز کیا اور سنجیدگی سے مخاطب ہوئی۔

''ہیں؟'' وہ چونکا۔ ''نمبر تو تارا کا ہے۔''

''ہاں ہاں اسی کے موبائل سے بات کر رہی ہوں۔ یہ بتاؤ تھانے دار صاحب کہ گلابو ہمارے ایریے میں کیا کر رہی ہے؟'' وہ فوراً ہی مطلب کی بات پر آ گئی۔

''گلابو.....'' وہ ہنسا۔ ''ارے اوپر سے آرڈر آیا تھا اس کے لیے۔ اس لیے.....'' شبیر چاچڑ نے فقرہ ادھورا چھوڑا۔

''اس لیے کیا؟ پیسے ہم سے لیتے ہو۔ آرڈر اوپر والوں کا مانتے ہو۔'' مہک جان اپنے کرخت لہجے میں بغیر کسی لاگ لپٹ کے بولی۔

''اوپر والوں کی بات ماننی پڑتی ہے جی یار سمجھا کرو۔ بس دو تین ہفتے کی بات ہے پھر اس کی کہانی ختم ہو جائے گی۔ تم بے فکر رہو۔'' اس نے مہک جان کو یقین دلایا۔

''دو تین ہفتے۔ ساری آمدنی تو اس کے لوگ لے جائیں گے ہم کیا خاک پھانکیں گے؟''

''اچھا چل تو ایسا کرنا۔ میرا اس ماہ کا حصہ مت دینا۔ پھر تو تیرا حساب ٹھیک بیٹھ جائے گا نا۔'' شبیر چاچڑ نے حاتم طائی کی قبر پر لات مارتے ہوئے اسے رعایت دی۔

''گلابو سے ڈبل حصہ لے لیا ہوگا تب ہی اتنا سخی بن رہا ہے۔'' مہک جان اس کی رگ رگ سے واقف تھی۔

''جب بھی سوچے گی۔ الٹا ہی سوچے گی۔ اتنا نگیٹو مت سوچا کر۔ تیری جان کی قسم ایسی کوئی بات نہیں۔''

https://reading.sarotolan.net

"میری جان کیا فالتو کی ہے۔ اپنی جان کی قسم کھا۔" وہ گرم ہوگئی۔

"صحیح قسم کھائی ہے تو ہی تو میری جان ہے۔" وہ زور سے ہنسا۔

"اگر اگلے ہفتے تک گلابو کے بندے وہاں سے نہیں ہٹے تو میں اپنے لوگوں کو کھلی چھوٹ دے دوں گی۔ مار پیٹ کر کے بھگا دیں گے سب کو پھر مجھ سے شکایت مت کرنا۔" مہک جان نے دھمکی دی۔

"کہہ تو رہا ہوں۔ دو تین ہفتے صبر کر لے میں خود ٹھیک کر لوں گا سارا معاملہ۔"

"نہ دو نہ تین۔ صرف اگلا ہفتہ بس۔" مہک جان نے دوٹوک کہتے ہوئے کال کاٹ کر فون تارا کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ لے پکڑ۔"

"کیا ہوا؟"

"گلابو سے پیسے کھائے ہیں کمینے نے۔ اب مجھے ڈرامے بازی دکھا رہا ہے' ناک کے رستے سے سارا نا تک نکال باہر کروں گی اس کا۔" وہ پھنکاری۔

"ہائے ہائے اب کیا ہوگا باجی، مجھے لڑائی جھگڑے سے بڑا ڈر لگتا ہے۔" تارا نے اپنے دل پر ہاتھ رکھا۔

"کچھ نہیں ہوگا۔ چل ذرا آرام کرنے دے مجھے۔" مہک جان نے کروٹ لی۔

☆☆☆

گھر بھر میں خوشی کا سماں تھا۔ بات ہی کچھ ایسی تھی۔ حمنہ کا رشتہ طے ہونے جا رہا تھا۔ فہمیدہ، دادی جان کی سب سے بڑی بھانجی تھیں۔ انہوں نے اپنی نند کے بیٹے سے کروا دیا تھا۔ ان لوگوں سے پہلے ہی سے دور پرے کی رشتہ داری تھی۔ اس لیے عالیہ بیگم کو اس طرف سے تو مکمل اطمینان تھا کسی قسم کی چھان بین کی ضرورت نہ تھی اور لڑکے کے بارے میں فہمیدہ کے تعریفی اور توصیفی کلمات کافی تھے۔ پھر شہروز سے مل کر سب ہی خوش ہوئے تھے۔

اعلا تعلیم یافتہ خوش مزاج اور پرکشش سا شہروز سب کو پسند آیا بشمول حمنہ کے، سب کی مشاورت سے یہ طے پایا کہ اگلے ہفتے سادگی سے نکاح کر دیا جائے اور رخصتی اگلے سال۔ نکاح کی تقریب یوں ضروری تھی کہ حمنہ کے کاغذات ابھی سے جمع ہو جاتے اور رخصتی کے بعد اسے سسرال والوں کے ہمراہ باہر جانے میں کوئی خاص مشکلات درپیش نہ آتیں۔

"اللہ کا شکر ہے۔ اس نے ایک فرض سے سبکدوش ہونے میں مدد کی۔" دادی نے باآواز بلند اللہ کا شکر ادا کیا۔

"شکر ہے دادی آپ نے یہ نہیں کہا کہ ایک بوجھ سر سے اترا۔" ماریہ نے حسب عادت لقمہ دیا۔

"بوجھ کاہے کا؟ اللہ کی رحمت کو بوجھ کہنا اور سمجھنا کتنا بڑا گناہ ہے۔ استغفار۔" دادی نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"لوگ تو بڑے دھڑلے سے کہتے ہیں دادی، دیکھا نہیں سلمٰہ آنٹی کتنے فخر سے کہتی ہیں۔ شکر ہے اللہ نے ایک ہی بیٹی دی مجھے۔ آج کے دور میں ایک پہاڑ سر کانا بھی بہت ہے۔"

ماریہ نے سلمٰہ آنٹی کی نقل اتاری۔ اسے ان سے کوئی ذاتی پرخاش نہیں تھی مگر وہ اکثر ان کے گھر آتیں تو یہی ہائے ہائے کرتیں۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

افشین نعیم

یار دل دار

ایک چھوٹی سی پک اپ میں ان کا تمام ساز و سامان سما گیا تھا۔ محب اللہ، باباجی کو بلانے گیا تھا تاکہ ان کا شکریہ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ گھر کی چابی بھی ان کے حوالے کر دی جائے۔

عادل اور انس نے مل کر گھر کی صفائی بھی کر دی تھی۔

''چلیں جی! آخری صفائی تو مکمل ہوئی۔'' انس نے جھاڑو دیوار کے ساتھ ایک کونے میں ٹکاتے ہوئے ہاتھ جھاڑے۔

''کیوں؟''

''نیا گھر اپنی صفائی خود کیا کرے گا کیا؟'' عادل نے سوالیہ نظریں انس کے چہرے پر گاڑتے ہوئے پوچھا۔

''اوہو، میں اس گھر کی بات کر رہا تھا۔ آپ بھی نا عادل بھائی...... کوئی موقع جانے نہ دیا کریں، مجھے باتیں سنانے کا۔'' انس منہ بنا کر بولا۔

تب ہی محب اللہ اور باباجی آگے پیچھے گھر کے اندر داخل ہوئے۔ عادل اور انس سلام کر کے ایک طرف کھڑے ہو گئے۔

باباجی نے گھوم پھر کر اچھی طرح کمرے کے در و دیوار کا جائزہ لیا۔

''باقی دو کہاں ہیں؟'' باباجی نے روئے سخن محب اللہ کی طرف کر کے پوچھا۔

''دیوار میں چُن دیے ہیں۔'' عادل نے انس کے کان میں سرگوشی کی۔

''جی، وہ باہر پک اپ پر سامان وغیرہ لوڈ کروا رہے ہیں۔'' محب اللہ نے جواب دیا۔

''ہوں......'' باباجی نے ہنکارا ابھرا۔ ''تو گھر مل گیا تم لوگوں کو؟''

''یہ سوال کچھ عجیب سا نہیں ہے عادل بھائی؟'' انس نے سرگوشی سے ذرا سے بلند لہجے میں عادل کے کان میں کہا۔

''میرے خیال سے باباجی یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم سامان کے ساتھ سڑک پر بسیرا کرنے والے ہیں۔'' عادل نے جوابی سرگوشی کی۔

''جی، عادل کی کمپنی والوں نے ڈھونڈا ہے گھر۔'' محب اللہ نے وضاحت بھی کر دی۔

''چلو، ٹھیک ہے۔ جہاں رہو، خوش رہو۔'' باباجی نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ''اچھا ساتھ تھا جو ختم ہوا۔''

باباجی کے جملے نے زیادہ اداس کیا یا لہجے نے، وہ سمجھ نہیں پائے۔ بہرحال ایک باب تمام ہوا۔

☆☆☆

ان لوگوں کا سامان اوپر پہنچاتے ہی سائیکل خان بھی اوپر آ گیا۔

''صاب! آپ لوگوں کا باقی کا سامان کب آئے گا؟''

سائیکل خان نے اتنا تھوڑا سا سامان دیکھ کر تعجب سے پوچھا۔

''باقی کا کون سا سامان؟'' حیدر نے پوچھا۔

''صوفہ، بیڈ، فرج، میزیں...... اور قالین...... اور...... اور......'' وہ ذہن پر زور ڈال کر ابھی کچھ اور بھی کہتا کہ احسن نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روکا۔

''بھائی، یہ جن چیزوں کے نام لے رہے ہو، ان میں سے کچھ بھی ہمارے پاس نہیں ہے۔''

"لیکن...... یہ چیزیں تو سب کے پاس ہوتی ہیں۔" وہ حیرت سے آنکھیں پھیلا کر بولا۔

"ہم "سب" نہیں ہیں۔ اس لیے ہمارے پاس نہیں ہیں یہ چیزیں۔"

"ہمارے پاس تو بس یہی کچھ ہے۔" عادل نے اس کا کندھا دباتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی ہاتھ سے اپنے سامان کی طرف اشارہ کیا۔

"بس...... اتنا ذرا سا سامان۔" اس کی آنکھیں حیرت کے مارے پھٹنے کے قریب ہوگئیں۔

اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان کی اکلوتی چارپائی اور اس کے اردگرد پڑے ان کے بیگز اور اٹیچی کیس دیکھے۔

"صاب! آپ لوگ بغیر سامان کے کرتے کیا ہو؟" سائیکل خان نے آنکھیں آخری حد تک پھیلا

کر ہاتھ سوالیہ انداز میں ان کے سامنے کیے۔

''وہی جو دوسرے لوگ سامان کے ساتھ کرتے ہیں۔ ہم بغیر سامان کے کر لیتے ہیں۔'' حیدر نے اس کی حیرت کا لطف اٹھایا۔

''مثلاً..... ہم کھانا کھا لیتے ہیں۔'' احسن بولا۔

''پانی پی لیتے ہیں۔'' انس نے ٹکڑا لگایا۔

''دوسروں کی برائیاں کر لیتے ہیں۔'' عادل نے اضافہ کیا۔

''اور سو بھی لیتے ہیں۔'' بات حیدرت نے مکمل کی۔

''صاب! آپ لوگ ایک بستر پر اتنے سارے لوگ کیسے سو لیتے ہو؟'' بے چارے خان نے ہاتھ سے چارپائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں، یہ والی سائنس ایک راز ہے۔ اس کو ہم ہر کسی کو نہیں بتاتے۔''

''ام ہر کسی نہیں ہے صاب! ام سائیکل خان ہے۔'' اس نے فخر سے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''تو سائیکل خان.....؟''

''تم بتاؤ..... کہ ہم کیسے ایک چارپائی پر پانچ بندے سوتے ہوں گے؟'' محب اللہ اس کی ذہانت جانچنا چاہ رہا تھا غالباً سو سوال کی گیند واپس اسی کی کورٹ میں لڑھکا دی۔

''صاب! ام سمجھ گیا، آپ لوگ کیا کرتا ہے۔'' سائیکل خان نے چٹکی بجائی، گویا راز پا لیا ہو۔

''آپ لوگ باری باری اس بستر پر سوتا ہے، ہے نا.....؟'' کہہ کر فخریہ انداز میں ان سب کو دیکھا۔

''شاباش بھئی۔'' محب اللہ کی بات درمیان میں ہی تھی کہ ان سب کو احساس ہوا کہ، بات ابھی سائیکل خان کی بھی درمیان ہی میں ہے۔ اس نے ان لوگوں کے انداز پر غور کیے بنا بات جاری رکھی۔

''آپ سب دو، دو گھنٹے باری باری اس بستر پر سوتا ہے اور باقی کی رات، باقی سارا لوگ جاگتا ہے۔''

بات مکمل کر کے داد طلب نظروں سے حاضرین محفل کو دیکھا۔

جن کے منہ اس ذہانت پر کھلے کے کھلے رہ گئے تھے۔

☆☆☆

صرف دو گھنٹے میں وہ لوگ ساری سیٹنگ وغیرہ کر کے فارغ ہو چکے تھے۔

صبح کے تقریباً ساڑھے دس بجے وہ لوگ یہاں پہنچے تھے اور اب ساڑھے بارہ بجے وہ تمام لوگ اپنے اپنے کپڑے اور باقی سامان الماریوں میں سیٹ کر چکے تھے۔

انس اور احسن نے مل کر کچن کا سامان بھی سیٹ کر لیا تھا۔

''یار عادل! کھانا وانا پکانے کا کام کل سے شروع کریں گے۔ آج کھانا کہیں باہر سے کھا کر آتے ہیں۔'' حیدر نے عادل کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''اور وہ جو شام کی چائے ہم نے مونا میم کے ساتھ پینی ہے۔ اس کا کیا بنے گا؟'' عادل نے جوابی سوال داغا۔

''یار بڑا ٹائم ہے ابھی شام میں۔ واپس آ کر بنا لیں گے، چائے وائے۔'' احسن بھی حیدر کے باہر کھانے والے خیال سے متفق تھا۔

''اگر ہم دن کا کھانا باہر کھا رہے ہیں تو وہ کھانا میری طرف سے ہوگا۔'' انس نے اعلان کیا جس پر تمام لوگوں نے تالیاں بجا کر خوشی کا اظہار کیا۔

''صاب! آپ لوگ تالی کیوں بجا رہا ہے؟'' اسی وقت سائیکل خان کسی بوتل کے جن کی طرح ہاتھ میں ایک ٹرے اٹھائے نمودار ہوا جو کپڑے سے ڈھکی ہوئی تھی۔

''بس یار! جب ہم خوش ہوتے ہیں تو تالیاں بجاتے ہیں۔'' عادل نے جواب دیتے ہوئے ٹرے کو گھورا۔

''یار ویسے ہم مونا میم کے اخلاق سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔ ابھی ہمیں آئے ہوئے چند گھنٹے

بھی نہیں ہوئے اور انہوں نے کھانا بھجوادیا۔" احسن نے ازحد عقیدت مندانہ لہجے میں کہا۔

"لاؤ دکھاؤ، ذرا...... کیا ہے۔" عادل نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

سائیکل خان نے فوراً ٹرے آگے بڑھائی۔

"صاب! اس میں دو بندوں کا کھانا ڈال کر دے دو۔ ذرا جلدی سے۔" عادل نے حیرت سے اس کی بات سنی اور ساتھ ہی ٹرے پر ڈھکا ہوا کپڑا ہٹایا۔

ٹرے کے اندر دو خالی پلیٹیں اور ایک تہ کیا ہوا دسترخوان رکھا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" عادل نے حیرت میں ڈوبے ہوئے لہجے میں خالی برتنوں کو دیکھا۔

"یہ برتن ہے صاب!" سائیکل خان نے اس کی عقل پر ماتم کرتے ہوئے کہا۔

"وہ تو مجھے بھی نظر آرہا ہے۔ پر یہ خالی برتن کیوں لائے ہو؟"

"صاب! وہ موٹا میم بول رہی تھی کہ پتا نہیں آپ لوگ ٹھیک طرح سے برتن دھوتا بھی ہوگا یا نہیں، اس لیے برتن اپنا بھجوادیا۔ اب آپ لوگ اس میں دو بندوں کا کھانا ڈال کر مجھے دے دو۔"

"ہم تو ہاتھ بھی ٹھیک طرح نہیں ہوتے۔" احسن نے بچے کو گھورتے ہوئے کہا۔

"وہ ام میم کو نہیں بتائے گا، بس آپ کھانا دے دو۔"

"کھانا، وانا کوئی نہیں بنایا ہم نے۔ ہم تو خود کھانا کھانے باہر جارہے ہیں۔" حیدر کچھ چڑ کر بولا۔

"صاب! امارا تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ام تو آپ لوگ کا ساتھ باہر جا کر کھالے گا، پر موٹا میم بازار کا کھانا نہیں کھاسکتی۔ ان کا واسطے تو آپ کو کھانا گھر پر ہی بنانا پڑے گا۔"

"اچھا صاب! کھانا ذرا جلدی بنا کر بھجوادو، میم کو دوائی بھی لینا ہوتا ہے کھانے کے بعد۔"

وہ کہہ کر باہر چلا گیا (ان کو کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر)۔

دروازے تک پہنچ کر کچھ یاد آنے پر رک گیا اور پلٹ کر بولا۔

"صاب! جب آپ لوگ کھانا نیچے دینے کے واسطے آؤ تو امارے کو آواز دے لینا۔ ام آپ کے ساتھ ہی چلے گا۔ نہیں تو جب تک آپ کھانا کھا کر پارسل بنوا کر لاؤ گے تب تک تو ام بھوک سے فوت ہوچکا ہوگا۔" وہ کہہ کر دو دو سیڑھیاں پھلانگتا نیچے اتر گیا۔

"اب پتا چلا کہ کرایہ دار دو تین ماہ میں کیوں بھاگ جاتے ہیں یہاں سے۔" حیدر نے عادل کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"یار! یہ ہم نے گھر کرائے پر لیا ہے یا مالک مکان کو گود لے لیا ہے۔" عادل دیوار کو گھورتے ہوئے بولا۔

"اب کرنا کیا ہے؟" حیدر آگے بڑھ کر بولا۔

"کچھ نہیں کرنا ورنا، یہ برتن جا کر واپس ان کے گھر پھینک کر آتے ہیں۔ گھر کرائے پر دیا ہے یا ہمیں خرید لیا ہے۔" احسن طیش کے عالم میں بولا۔

"چل بیٹے، اٹھا یہ برتن اور واپس دے کر آ۔" احسن نے انس کی طرف منہ کرکے آرڈر کیا۔

"کیا، میں......" انس زور سے چیخا کہ محب اللہ دوسرے کمرے سے نکل کر باہر آگیا۔

"میں کہیں نہیں جارہا۔" انس بدکا۔

"کیا ہوگیا ہے؟ کیوں شور کررہے ہو؟"

"یہ......" احسن نے ہاتھ سے خالی برتنوں کی طرف اشارہ کیا۔ "آرڈر آیا ہے نیچے سے...... کھانا جلدی بنا کر نیچے بھجوادیں۔ موٹا میم نے دوا لینی ہے۔"

"اور کھانا بھی گھر کا بنا ہوا ہونا چاہیے۔ بازاری کھانے میڈم کو ہضم نہیں ہوتے۔" عادل نے تڑکا لگایا۔

"پانی کا بل ہم بھریں گے، لان کی صفائی

کرنا ہی ہمارے ذمے ہے۔ تمام کی چاہے بھی ہمارے فرائض میں شامل ہے اور اب یہ...... یہ......"

عادل نے جوش سے کہتے ٹرے کی طرف اشارہ کیا۔

"کھانا بھی، ہم لوگوں کے ذمے ہوگا۔" مارے غصے کے عادل کے نتھنے پھڑکنے لگے۔

"کیا ہو گیا ہے تم لوگوں کو۔ انسانیت نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہ گئی ہے تم لوگوں میں۔" محب اللہ نے افسوس سے ان سب کو دیکھا۔ "اتنی بزرگ خاتون ہیں وہ، ہماری نانی یا دادی کے برابر ان کی عمر ہے۔ اکیلی رہتی ہیں، دوا لیتی ہے اگر کہہ دیا ہے گھر کے کھانے کا تو کون سی قیامت آ گئی ہے۔ میں تیار کر دیتا ہوں کھانا۔" محب اللہ خفگی سے کہتا ٹرے اٹھا کر کچن کی سمت بڑھا۔

"میں بھی مدد کرواتا ہوں۔" انس اس کے پیچھے لپکا۔

باقی تینوں شرمندگی سے نظریں چراتے رہ گئے۔

☆☆☆

آدھے گھنٹے کے اندر اندر محب اللہ اور انس نے مل کر آلو کا سالن اور چپاتیاں تیار کیں۔

ٹرے سیٹ کر کے وہ پانچوں نیچے آئے۔

خیال تھا کہ ٹرے نیچے دے کر وہیں سے کھانے کے لیے باہر چلے جائیں گے۔ اجازت طلب کر کے اندر داخل ہوئے۔

مونا میم کوئی کتاب پڑھ رہی تھیں، ان کو دیکھ کر کتاب بند کر کے سائیڈ پر رکھ دی۔

"یہ کھانا......" انس نے ٹرے آگے بڑھائی۔

مونا میم نے بے یقینی سے ٹرے کو دیکھا۔

"کھانا لائے ہو؟" ان کی حیرت نے محب اللہ کو حیران کیا۔

تب ہی سائیکل خان اندر آ گیا۔

"تم سب لوگ کھڑے کیوں ہو، بیٹھ جاؤ نا۔"

"نہیں بس چلیں گے ہم لوگ۔"

"یہ آپ کھانا کھائیں، پھر آپ کو دوا بھی لینی ہوگی۔" عادل نے اخلاق کے تقاضے پورے کرتے ہوئے کہا۔

"صاب! آپ لوگ کھانا بنا کر لے آیا۔" سائیکل خان کے لہجے میں بھی مونا میم والی ہی بے یقینی اور حیرت تھی۔

"صاب! آپ پہلا لوگ ہے جو کھانا بنا کر لے بھی آیا ہے ورنہ تو لوگ برتن بھی خالی واپس کرتا ہے اور بدتمیزی بھی کرتا ہے۔"

اس سے پہلے سائیکل خان مزید بھی کچھ کہتا، مونا میم نے اس کی بولتی بند کروا دی۔

"سائیکل......" مونا میم نے انگلی اٹھا کر تنبیہ کرنے والا انداز اپنایا۔

"سائیکل کہاں ہے...... کم بخت اسکوٹر ہے پورا۔ چلتا ہے تو رکنا بھول جاتا ہے۔" احسن نے عادل کے کان میں سرگوشی کی۔

"بھئی...... میں بہت متاثر ہوئی ہوں، تم لوگوں کے اخلاق سے۔" انہوں نے کہتے ہوئے ان سب کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ سب لوگ باری باری صوفوں پر بیٹھ گئے۔

انس نے بیٹھنے سے پہلے ٹرے سامنے دھری شیشے کی میز پر رکھ دی۔

"عظیم ہیں وہ لوگ جن کے ہاتھوں تم لوگوں کی تربیت ہوئی ہے۔" عادل نے فخر سے سر اونچا کیا۔

"آج کل کے لوگوں کے پاس دنیاوی ساز و سامان کی بھرمار ہے، مگر تربیت اور اخلاق کا کاسہ بالکل خالی ہے۔ میں بہت خوش ہوں کہ آخر کار مجھے وہ انسان مل ہی گئے، جن میں انسانیت اور اخلاقیات دونوں ہی موجود ہیں۔"

مونا میم کے چہرے پر خوشی واضح طور پر محسوس کی جا سکتی تھی۔

"بس جی! ہمارے والدین نے خاص طور پر ہمیں تاکید کر رکھی ہے کہ بیٹا انسانیت سے آگے کچھ بھی نہیں ہے۔ دوسرے انسانوں کی بھلائی کے معاملے

میں ہمیشہ دوسروں پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے رہنا۔" احسن نے انتہائی بردباری اور سنجیدگی سے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

"جی میم! میرے والدین حیات نہیں ہیں مگر انہوں نے جو نیکی سے محبت اور انسانیت کی خدمت میری گھٹی میں شامل کر دی ہے، وہ میری ساری زندگی کے لیے مشعل راہ ہے۔" عادل نے کہتے ہوئے نظریں کچھ مزید نیچی کرلیں، ساتھ ہی ہاتھ بھی نماز والے انداز میں باندھ لیے۔

دل میں ایک خواہش سی ابھری، اے کاش سر پر ٹوپی بھی رکھ لی ہوتی۔ اب کے محب اللہ اور انس نے منتظر نظریں حیدر کے چہرے پر گاڑ دیں۔ گویا کہہ رہے ہوں "تم بھی کرلو جو گل فشانی تم نے کرنی ہے" اور حیدر نے بھی ان کی نگاہوں کا مفہوم سمجھ لیا۔

"بس میم! دنیا اور دنیا داری کے سارے جھمیلے تو یہیں رہ جائیں گے۔ اچھا اخلاق ہی ہے جو انسان کے ساتھ آگے تک جائے گا اور کام آئے گا۔"

حیدر بھلا کیوں ان دونوں سے پیچھے رہتا۔ مونا میم مسکراتے ہوئے ان کی باتیں سن رہی تھیں۔

جانے ان کی مسکراہٹ اس قدر پراسرار کیوں ہے، عادل بس سوچ کر رہ گیا۔ کسی سے شیئر کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔

"تم نہیں کہو گے کچھ......؟" وہ انس کی جانب متوجہ ہوئیں۔

"میں کیا کہوں...... سب ہی کچھ تو ان لوگوں نے کہہ دیا۔" انس بے چارگی سے بولا۔

(بے چاروں کو کچھ معلوم ہی نہیں، مونا میم کی مسکراہٹ مزید گہری ہوگئی)۔

"پھر بھی کچھ تو بولو۔" وہ مصر ہوئیں۔

"ان لوگوں کی صحبت میں رہا تو کبھی نہ کبھی میرا اخلاق بھی بہتر ہو ہی جائے گا۔" (بے چارے انس کو وہ آنسو یاد آئے جو اس نے پیاز کاٹتے ہوئے بہائے تھے)۔ سو دکھے دل سے یہ جملہ بولا۔

"تمہاری صحبت بہترین ہے ینگ بوائے۔

[illegible] نہ ہونے پاتے۔

مونا میم کے لہجے میں کچھ تو ایسا تھا جس نے ان سب کو چونکایا۔

"خیر، تم سب کے اخلاق و اطوار دل لبھانے والے ہیں۔ باقی جو کمی بیشی ہے وقت کے ساتھ ساتھ ٹھیک ہو جائے گی۔" انہوں نے فوراً ہی نشست برخاست کرنے کا عندیہ ظاہر کیا۔

وہ پانچوں بھی فوراً ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔

"یہ انہوں نے محب اللہ کے خیالات نہیں جاننے چاہے، پتا نہیں کیوں؟" احسن نے عادل کے کان میں منہ گھسا کر کہا۔

وہ سب لوگ آگے پیچھے باہر نکلنے ہی والے تھے کہ مونا میم کی آواز نے پلٹنے پر مجبور کیا۔

"تمہیں زحمت ہوئی میری وجہ سے، اس کے لیے بہت معذرت۔ لیکن شکریہ میں ادا نہیں کروں گی کہ اس سے احسان ضائع ہو جاتا ہے۔" وہ محب اللہ سے مخاطب تھیں۔

عادل نے احسن کی جانب دیکھ کر ایک ابرو اٹھائی (کیا مطلب......)۔

احسن نے دونوں کندھے اچکا دیے (پتا نہیں)۔

محب اللہ ان کی بات کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا، مونا میم بھی بھانپ گئیں۔ سو اپنی بات کی وضاحت کی۔

"سائیکل خان نے مجھے آ کر بتایا تھا کہ تم لوگوں نے کھانا نہیں بنایا، باہر جا کر کھانے کا ارادہ ہے۔ میں نے اسے واپس بھیجا تھا کہ برتن واپس لے آؤ جا کر، وہ برتن واپس لینے آیا تو......"

انہوں نے سانس لینے کو توقف کیا۔ احسن، عادل اور حیدر کی سانسیں ایک ساتھ رکیں۔ یعنی کہ سائیکل خان عین اس وقت واپس پہنچا ہوگا جب وہ...... اس سے آگے وہ کچھ سوچ نہ پائے۔

وہ برتن لیے بغیر ہی واپس آ گیا تھا۔

"اصل میں جو لڑکی میں نے کھانا ــــ بنانے

کچھ عرصہ کی چھٹی پر ہے۔ بازار کا کھانا، میں کھا نہیں سکتی، طبیعت بگڑ جاتی ہے۔ بہر حال..... مجھے تم سب ہی کے خیالات جان کر بہت اچھا لگا۔"

انہوں نے ایک نظر ان تینوں کو دیکھا۔ وہ نظر چرا گئے۔

محب اللہ بجائے باہر نکلنے کے ان کی کرسی کے قریب آ گیا۔

"آپ نے شکریہ ادا نہیں کیا، بہت اچھا کیا۔ شکریہ والی کوئی بات بھی نہیں ہے لیکن احسان والی بات مت کریں، مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ جب تک آپ کی کھانا پکانے والی لڑکی واپس نہیں جاتی، آپ کا کھانا میرے ذمے ہے۔"

محب اللہ خاموش ہوا تو وہ مسکرائیں۔

"صرف تمہارے ذمے کیوں؟ یہ چھوٹو بھی تو ہے۔" انہوں نے انس کی طرف اشارہ کیا۔

انس نے رکی ہوئی سانس خارج کی۔

وہ سب آگے پیچھے باہر نکل آئے (کچھ شرمندہ اور کچھ خوش باش) اور ان سب کے پیچھے پیچھے سائیکل خان بھی باہر آ گیا۔

آخر اس کو باہر کا کھانا منع تھوڑا ہی تھا۔

☆☆☆

کھانا کھانے کے بعد، ان لوگوں کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا سرپرائز ملا۔

بل سائیکل خان نے ادا کیا۔ انس کے والٹ نکالنے سے بھی پہلے اس نے بل نکال کر ویٹر کے حوالے کر دیا۔

"ابے اسکوٹر! بڑا تیز ہے تو تو، کہاں سے آئے تیرے پاس اتنے پیسے؟" حیدر نے اس سے پوچھا۔

"مونا میم نے دیے تھے۔" وہ آرام سے ڈرنک ختم کرتے ہوئے بولا۔

"پر ہمارے سامنے تو انہوں نے کوئی پیسے نہیں دیے۔" انس حیران سا بولا۔

"نہیں..... وہ جب ام برتن واپس لینے آیا تھا ہور ہا ہے۔" اس نے انگلی سے عادل، حیدر اور احسن کی جانب اشارہ کیا۔

"اور یہ دونوں کھانا بنانے گیا ہے۔" اس نے دوسری بار انس اور محب اللہ کی جانب اشارہ کیا۔ "تو میم نے ام کو پیسہ دیا کہ بل تم ادا کرنا۔"

"آج کا تو دن ہی شرمندگی اور بے عزتی کا ہے۔" احسن بڑبڑایا۔

"ویسے صاب! آپ کا امی، ابو لوگ نے جو اچھا باتیں آپ کو سکھایا ہے، وہ ام کو بھی سکھا دو۔" سائیکل خان نے کہتے ہوئے دانت نکالے۔

"ابے اسکوٹر..... باز آ جا۔" عادل نے فضا میں مکا لہرایا۔

"اسکوٹر نہیں صاب! سائیکل۔" اس نے جلدی سے تصحیح کی۔

"ہاں، وہی۔"

"صاب! ویسے اگر آپ کو شرمندگی تھوڑا کم کرنا ہے تو میم کا واسطے کسی اچھی بیکری کا بسکٹ لے لو۔ چائے کا ساتھ کھانے کے واسطے، اس کا دل بالکل صاف ہو جائے گا۔"

"میم تو باہر کی چیزیں کھا ہی نہیں سکتیں، تو پھر بسکٹ تو ضائع ہو جائیں گے۔" حیدر دور کی کوڑی لایا۔

"نہیں صاب! ام کھا لے گا۔ ضائع نہیں ہونے دے گا۔" بے ساختہ ہی اس کے منہ سے نکلا۔

اپنی بے ساختگی پر وہ خود بھی کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔

"چل اسکوٹر! تو بھی کیا یاد کرے گا، آ جا، تجھے بسکٹ دلائیں۔"

عادل نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کو اپنے برابر کیا۔

ویسے بھی مخبر سے بنا کر رکھنے میں فائدہ ہی تھا۔

اب قدم سے قدم ملا کر چلتے، وہ پانچ نہیں چھ تھے۔

https://reading.pakistan.net

نگہت سیما

من عارف نفسہٗ

''عورت کو کب لگتا ہے کہ وہ بہت بے وقعت اور بے توقیر ہے۔''

ایک بار پتا نہیں کیوں استانی جی نے مجھ سے پوچھا تھا اور مجھے ہنسی آ گئی تھی۔

''بھلا عورت کیسے بے وقعت اور بے توقیر ہو سکتی ہے۔ عورت سے تو اس کائنات کی تصویر میں رنگ ہیں۔ عورت کا مرتبہ اور مقام تو بہت بلند ہے۔ اس کی گود میں تو ولیوں پیغمبروں نے پرورش پائی ہے۔ وہ ماں ہے۔ بیٹی ہے، بیوی ہے، بہن ہے سارے رشتے ہی اس کی توقیر میں اضافہ کرتے ہیں۔''

اور استانی جی میرے جواب پر مسکرا دی تھیں۔ ایسی مسکراہٹ جو کسی چھوٹے کی ناسمجھی پر کسی بڑے کے لبوں پر بکھرتی ہے۔

''وقت کبھی نہ کبھی کسی کسی پر یہ راز کھول ہی دیتا ہے شاید کبھی وقت تمہیں بھی بتا دے کہ عورت کب بے وقعت اور بے توقیر ہوتی ہے۔''

''تو کیا آپ پر وقت نے یہ راز کھول دیا؟'' میں نے پوچھا تھا۔

''ہاں!'' استانی جی کا چہرہ کسی ان دیکھے دکھ کی تصویر تھا اور آنکھوں سے کرب جھلکنے لگا تھا۔

''تو پھر میں بھی اس وقت کا انتظار کروں گی جب وقت مجھ پر یہ راز کھولے گا۔''

میں ہنسی..... چودہ پندرہ سال کی عمر میں میری ہنسی یوں ہی بات بے بات بکھر جاتی تھی اور استانی جی جیسے کسی خواب سے چونکی تھیں۔

''اللہ نہ کرے کہ کبھی وقت تمہیں اس سوال کا جواب دے۔''

ان کی آنکھوں میں خوف کے سائے لرزتے تھے۔ ''اللہ کرے تم کبھی بھی اس سوال کا جواب نہ جان پاؤ۔''

انہوں نے دعا دی تھی اور میں پھر ہنس پڑی تھی۔

''استانی جی! آپ بھی نا۔ خود ہی سوال پوچھتی

ہیں اور پھر خود ہی جواب نہ جاننے کی دعا کرتی ہیں۔"

یہ استانی خورشید جہاں تھیں۔ جن سے میں نے قرآن مجید پڑھا تھا گاؤں کی ساری بچیاں ان کے پاس ہی قرآن پڑھتی تھیں۔ میں نے بھی پانچویں پاس کرنے سے بہت پہلے قرآن ختم کر لیا تھا۔ ان کا گھر ہمارے گھر سے جڑا تھا۔ دائیں طرف صحن کی دیوار سانجھی تھی اور میں وقت بے وقت ان کی طرف چلی جاتی تھی اور آج کیسی عجیب بات کی تھی۔ خود ہی سوال کر کے خود ہی جواب نہ ملنے کی دعا دے رہی تھیں لیکن میرے اندر جو تجسس پیدا ہو گیا تھا۔ اس نے مجھ سے کئی لوگوں سے اس سوال کا جواب جاننے کی سعی کی تھی۔ اماں، ابا گل ریز چاچا سب سے ہی۔

"بالکل فضول سوال ہے عورت کبھی بے وقعت نہیں ہو سکتی وہ تو اس کائنات کا حسن ہے، ملکہ ہے، شہزادی ہے۔ سر کا تاج ہے۔"

گل ریز کو تقریریں کرنے کا بہت شوق تھا۔ وہ میرے چچا کا بیٹا تھا..... وہ بہنوں سے چھوٹا۔ سب کا لاڈلا۔ ان دنوں وہ نیا نیا شہر گیا تھا پڑھنے، ایسی ہی باتیں کرنے لگا تھا اور بہت گہری نظروں سے مجھے دیکھتا تھا۔ اٹھارہ سالہ گل ریز کی آنکھیں مجھے دیکھتے ہی چمکنے لگی تھیں۔ یوں جیسے ہزاروں کرمک شب ان آنکھوں میں بسیرا کیے ہوں.....

اور میں نے سوچا تھا جب گل ریز کے پاس جو شہر میں پڑھتا ہے۔ اس سوال کا جواب نہیں ہے تو پھر بھلا اور کس کے پاس ہوگا۔ استانی جی نے کہا تو تھا کہ وقت خود ہی یہ راز آشکار کر دیتا ہے اور میں نے دعا کی تھی کہ وقت مجھ پر بھی یہ راز ضرور کھولے۔ میں نے اس سوال کا جواب جاننے کی چاہ کی تھی لیکن ایسے اس طرح تو اس کا جواب نہیں چاہیے تھا۔ جیسے آج جانا تھا..... ہاں اتنے سالوں بعد آج مجھے وقت نے اس کا جواب دے دیا تھا بھلا طلاق سے بڑھ کر بھی عورت کی کوئی بے وقعتی اور بے توقیری ہے..... اور وہ بھی بلا جواز، بلا قصور طلاق۔

ہاں اس وقت مجھے اپنا آپ بڑا بے وقعت اور بے توقیر لگا تھا جب مراتب علی نے اپنے شان دار بیڈ پر بیٹھے گھٹنوں پر رکھے بریف کیس کو کھولتے ہوئے کہا تھا۔

"آئینہ خاتون! میں نے تمہیں بقائمی ہوش و حواس طلاق دی۔ طلاق دی۔ طلاق دی۔"

اور میں جو گرم دودھ کا گلاس بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر واپس جانے لگی تھی۔ حیران سی اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔ اس نے بہت اطمینان سے بریف کیس سے ایک براؤن لفافہ نکالا۔

"اس میں تمہاری طلاق کے پیپرز ہیں۔"

اور میں نے پیچھے ہٹتے ہٹتے دیوار سے ٹیک لگا لی تھی۔ میری ٹانگوں میں لرزش تھی اگر میں ٹیک نہ لگاتی تو شاید گر جاتی۔

"قانونی طریقے سے صبح پہلی طلاق تمہارے گاؤں کی یونین کونسل میں بھجوا دوں گا۔ تمہارے میکے کے پتے پر تمہیں نوٹس مل جائے گا۔"

"میرا میکہ.....!" تو کیا میرا کوئی میکہ بھی تھا۔ بیس سالوں بعد میں نے مراتب علی کے منہ سے اپنے میکے کا لفظ سنا تھا۔ اس نے لفافہ واپس بریف کیس میں رکھ دیا۔

"یوں زبانی طور پر میں نے تمہیں طلاق دے دی ہے لیکن قانونی اور گھرا آدمی ہوں، سب کام قانونی طریقے سے کرتا ہوں۔ تمہارا حق مہر پانچ ہزار مقرر ہوا تھا۔ نصف جس کا ڈھائی ہزار ہوتے ہیں جس میں سے ایک ہزار مؤجل اور چار ہزار غیر مؤجل۔"

اب وہ نکاح نامے کی کاپی نکالے بیٹھا تھا۔

"لیکن یہ صرف تحریر ہے اصل بات تم جانتی ہو کہ تمہارے اس حق مہر کے عوض میں نے تمہارے باپ کا قرض معاف کیا تھا۔ بلکہ یہ سمجھ لو کہ میں نے تمہارا حق مہر تمہاری رضا مندی سے تمہارے باپ کو ادا کر دیا تھا جس سے اس نے اپنا قرضہ چکایا تھا۔"

"اور یہ رہے تین ہزار روپے تمہاری عدت کا خرچا۔"

https://reading.pakistanipoint.com

اس نے ایک لفافہ میرے قدموں میں پھینکا تھا۔ میں نے اسے نہیں اٹھایا تھا۔ بس اس کی طرف دیکھتی رہی تھی۔ چھوٹی چھوٹی مکار آنکھیں، تنگ پیشانی، موٹے موٹے ہونٹ اور گہری سانولی رنگت۔ یہ تھا مراتب علی خان میرا شوہر جس نے صرف چند لفظوں میں مجھے بے توقیر کر دیا تھا اور میں نے زندگی کے بیس برس اس شخص کے ساتھ گزار دیے تھے جو ہرگز میرے قابل نہیں تھا لیکن میرے باپ نے روتی آنکھوں اور بندھے ہاتھوں کے ساتھ بیس سال پہلے مراتب علی کے ساتھ رخصت کرتے ہوئے کہا تھا۔

''مجھے معاف کر دینا میرے بچے! میں نے اپنی عزت بچانے کے لیے تیری خوشیاں قربان کر دیں۔''

میرا لاغر و بے بس اور مجبور باپ ہاتھ جوڑے میرے سامنے کھڑا تھا اور بیس سالوں میں یہ جڑے ہاتھ ایک بار بھی میری نظروں کے سامنے سے نہیں ہٹے تھے، نہ بھولے تھے اگر بھول جاتی تو مراتب علی کے ساتھ زندگی کے طویل برس کیسے گزارتی۔ جب اپنی معصوم اور پاکیزہ محبت سے بچھڑ جانے پر دل کرلاتا تو یہ جڑے ہاتھ آنکھوں کے سامنے آجاتے اور اب جب میں نے اس شخص کو دل و جان سے قبول کر لیا تھا کہ وہ میرے بچے کا باپ تھا۔ تو اس نے لمحوں میں مجھے بے توقیر کر دیا تھا۔

''بخشی صبح تمہیں ٹرین پر بٹھا دے گا لاہور اسٹیشن پر اتر جانا۔ وہاں کسی سے پوچھ لینا، سکھاں والی کی طرف جانے والی سواری کہاں سے ملے گی۔ یہاں اس گھر سے جو لینا چاہو لے جاؤ۔ میرا مطلب ہے کپڑے، لتے جوتے اور اپنے استعمال کی چیزیں کہ وہ نہ تو میرے کسی کام کے ہیں نہ صغیرا کے۔''

صغیرا کون تھی۔ میں نہیں جانتی تھی۔ لیکن ایک بار چند ماہ پہلے بخشی نے بتایا تھا کہ خان دوسری شادی کے چکر میں ہیں تو میں نے سوچا تھا بھلا انیس سالہ بیٹے کے ساٹھ سالہ باپ سے کون شادی کرے گا۔ لیکن مراتب علی کو لوگوں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھانا آتا تھا اور یقیناً صغیرا وہی لڑکی ہوگی جس سے وہ شادی کرنا چاہتا تھا۔

''تمہیں یاد ہوگا آئینہ خاتون! کہ تم اس گھر میں خالی ہاتھ آئی تھیں صرف تن کے کپڑوں کے ساتھ۔''

اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں کسی زہریلے سانپ کی آنکھوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ میں دیوار سے لگی اسے دیکھ رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اپنی اس بے توقیری پر چیخ چیخ کر روؤں یا پھر اس کی منتیں کروں کہ وہ میرے ساتھ ایسا نہ کرے لیکن وہ تو سب کچھ ختم کر چکا تھا۔

''اور احمد.....!'' میرے لبوں سے سرسراتی سی آواز نکلی مجھے اپنی آواز خود ہی اجنبی لگی تھی۔

''احمد.....!'' وہ اتنے زور سے ہنسا تھا۔ اتنے زور سے کہ اس کے پیلے نسوار زدہ دانت نظر آنے لگے تھے۔

''بھول گئیں وہ آج صبح امریکا کے لیے روانہ ہو چکا ہے۔''

''بھولی تو نہیں تھی میں کہ وہ آج صبح پڑھنے کے لیے امریکا جا چکا ہے۔ جانے کب سے مراتب کوشش کر رہا تھا کہ اسے اپنے چھوٹے بھائی کے پاس امریکہ بھجوا دے۔ میں نے اسے روکا تھا لیکن بعض معاملوں میں وہ اپنے باپ کی طرح ہی سخت گیر اور اٹل فیصلہ کرنے والا تھا۔

''آپ کو نہیں پتا، باہر کی تعلیم کی اہمیت کا۔ میں تو لکی ہوں اماں! کہ میرا چاچا وہاں ہے اور وہ مجھے بلوا رہا ہے۔''

اور اپنا اے لیول کرتے ہی وہ آج صبح چلا گیا تھا۔ میں بھولی تو نہیں تھی۔ میں تو بس احمد کے متعلق اس کا فیصلہ سننا چاہتی تھی۔

''احمد میرا بیٹا ہے۔'' ہنستے ہنستے یک لخت اس نے ہونٹ بھینچ لیے تھے اور اس کی آنکھوں سے سفاکی اور کرختگی جھلکنے لگی تھی۔

''اور ابھی میں نے تمہیں یاد دلایا ہے کہ تم اس گھر میں خالی ہاتھ آئی تھیں۔ صرف تن کے کپڑوں میں، احمد کو جہیز میں نہیں لائی تھیں تم۔''

تو کیا وہ احمد کے جانے کا انتظار کر رہا تھا۔

''بھول جانا اسے۔''

اس نے بریف کیس بند کر کے سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور میری طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو ''اب یہاں کیوں کھڑی ہو۔ جاؤ۔''

ہاں واقعی میں اب وہاں کیوں کھڑی تھی میرا اب اس سے کیا رشتہ۔

''ٹرین صبح آٹھ بجے چلے گی۔ جلدی اٹھ جانا۔ بخشی کو میں نے کہہ دیا ہے۔''

میں جب مراتب علی خان کے ساتھ بیاہ کر یہاں آئی تھی تو بخشی نو دس سال کا تھا۔ پتا نہیں..... مراتب اسے کہاں سے لایا تھا۔ شاید اس کا کوئی آگا پیچھا نہ تھا۔ نہ کبھی کوئی اس کا پوچھنے آیا اور نہ کبھی وہ خود کسی سے ملنے گیا تھا۔ میں نے مراتب کو کبھی اسے تنخواہ دیتے بھی نہیں دیکھا تھا۔ کبھی کبھار عید وغیرہ پر اس کے ہاتھ پر چند روپے رکھ دیتا تھا۔ بخشی گھر پر اس کے چھوٹے موٹے کام کرنے کے علاوہ دکان بھی اس کے ساتھ ہی جاتا تھا۔

میں نے ایک نظر کمرے پر ڈالی میں نے زندگی کے بیس سال اس کمرے میں گزارے تھے اور جو آج صبح تک میرا بھی تھا۔ میری نظر اپنے بستر پر گئی تھی جس میں ہلکا سا گڑھا پڑا تھا۔ مراتب کے گھر آنے سے پہلے میں اسی پر سر رکھے لیٹی تھی اور شاید وہ ابھی تک میرے ان آنسوؤں سے گیلا ہوگا جو میں نے احمد کے جانے کے بعد بہائے تھے۔ میں جانے کے لیے مڑی ہی تھی کہ اس کی کرخت آواز نے میرے اٹھتے قدم روک دیے تھے۔

''وہ لفافہ اٹھالو۔ مراتب خان کھرا آدمی ہے۔ سب کام قاعدے اور قانون کے مطابق کرتا ہے۔''

میں نے جھک کر لفافہ اٹھالیا۔ اتنی ہی وقعت تھی میری۔ تین ماہ دس دن کی عدت کا خرچ اور کمرے سے باہر نکل آئی۔

میں نے ساتھ والے کمرے میں ساری رات بیٹھے بیٹھے گزار دی۔ صبح بخشی کی دستک پر میں چونکی تھی تو کیا رات گزر گئی۔

میں نے گھٹنوں سے سر اٹھایا۔

لیکن کیا واقعی رات گزر گئی تھی یا شروع ہوئی تھی میں نے اپنے سُتے ہوئے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے تھے اور سیاہ چادر لپیٹ کر خالی ہاتھ بخشی کے ساتھ گھر سے نکل آئی تھی۔ ویسے ہی خالی ہاتھ جیسے آج سے بیس سال پہلے آئی تھی۔ لیکن دل میں گل ریز کی اور اپنے بابل کے آنگن کی یاد بسائے۔

اور آج بھی خالی ہاتھ جا رہی تھی لیکن دل میں احمد کی محبت اور مامتا کی تڑپ چھپائے۔

تب ''سکھاں والی'' کے کچے صحن والے گھر میں اپنی اولین محبت سسکتے چھوڑ آئی تھی اور اب ناظم آباد کے اس دو منزلہ بڑے سے مکان میں اپنی مامتا کی تڑپ اور محبت چھوڑ کر جا رہی تھی۔

میرے اس آنے اور جانے میں کتنی مماثلت تھی۔ ہاں تب میرے دل میں ایک سوال چھپا تھا اور آج اس سوال کا جواب میرے پاس تھا۔ آج میں جانتی تھی کہ عورت کو کب اپنا آپ بے وقعت اور بے توقیر لگتا ہے۔

☆☆☆

اسٹیشن پر ہمیشہ کی طرح گہما گہمی تھی۔ گرم گرم چائے، ابلے انڈے، مختلف آوازوں کا بلند ہوتا شور، سامان اٹھائے ادھر سے ادھر جاتے وردی پوش قلی اور مسافروں کی آمد و رفت۔ بیس سال پہلے جب میں آئی تھی تو تب بھی ایسی ہی گہما گہمی تھی اسٹیشن پر اور میں ایسی ہی بڑی سی کالی چادر لپیٹے سہمی سہمی سی مراتب علی کے ساتھ چل رہی تھی۔

کراچی بہت بڑا شہر تھا..... اور میں نے بڑا شہر تو کجا چھوٹا شہر بھی کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں تو کبھی ''سکھاں والی'' سے باہر گئی ہی نہیں تھی۔

بیس سال میں کچھ بھی تو یہاں نہیں بدلا تھا۔ وہی قلی، وہی مسافر وہی خوانچہ فروشوں کی آوازیں بس میری زندگی میں بدلاؤ آ گیا تھا۔ بیس سال پہلے میں مراتب علی خان کی دلہن تھی اور آج ایک طلاق یافتہ

عورت۔

بخشی نے مجھے ٹرین میں مطلوبہ ڈبے میں بٹھا کر ٹکٹ میرے حوالے کیے تھے اور پوچھا تھا۔

''گاؤں تک جانے کا کرایہ ہے آپ کے پاس؟''

اور پھر جیب سے مڑے تڑے دس دس کے نوٹ نکالنے لگا تھا۔

''ہاں.....!'' میں نے مٹھی میں بند لفافے میں سے تین ہزار کے نوٹوں میں سے ایک نوٹ رکھ کر باقی دوا سے دے دیے تھے۔

''اسے رکھ لو بخشی! اور جب بھی احمد آئے اسے میرا بتانا۔'' میری آواز بھرا گئی تھی۔ اس کی بھی آنکھیں نم ہوگئی تھیں۔

''بی بی جی..... خان نے اچھا نہیں کیا!''

ٹرین رینگنے لگی تھی۔ پہلے آہستہ اور پھر تیز۔ میں خالی خالی آنکھوں سے کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ بیس سالوں بعد میں اپنے گاؤں لوٹ رہی تھی بے بس اور بکھری ہوئی بے وقعت اور بے توقیر۔

ٹرین بھاگ رہی تھی، عمارتیں، درخت سب چیزوں کو پیچھے چھوڑتی ہوئی۔ بیس سال پہلے میں ٹرین میں پہلی بار بیٹھی تھی اور بھاگتے مناظر کو حیرت سے دیکھتی تھی۔ اور میرے ساتھ بیٹھا مراتب بار بار اپنی مونچھوں کو بل دیتا۔ کبھی بازو پر چٹکی لیتا۔ کبھی ہاتھ دبا دیتا اور میں ہر بار نفرت اور کراہیت سے اس کا ہاتھ جھٹک دیتی اور وہ ہنس پڑتا..... ملکیت کے تفاخر میں لتھڑی ہنسی۔

میں اس کی ملکیت ہی تو تھی جسے اس نے میرے باپ کا قرض معاف کر کے خریدا تھا۔ میں خریدی ہوئی بکی ہوئی عورت تھی اور اس وقت کھڑکی سے باہر بھاگتے مناظر کو دیکھتے مجھے ادراک ہوا تھا۔

عورت کی اس سے بڑی بے وقعتی اور بے توقیری کیا ہوگی کہ اس کا شریک سفر اس کا محبوب نہ ہو۔ ایک بکی ہوئی عورت سے بڑھ کر بے وقعت اور بے توقیر عورت کون ہوگی۔ جو نکاح کے بندھن میں ہو۔ تب میں نے سوچا تھا کہ ''سکھاں والی'' جاؤں گی تو استانی جی کو بتاؤں گی کہ وقت نے بہت جلدی ان کے سوال کا جواب مجھے دے دیا ہے لیکن میں پھر بھی ''سکھاں والی'' نہ جا سکی۔ مراتب علی نے کہا تھا۔

''اب سکھاں والی کو بھول جاؤ۔ میں نہیں چاہتا کہ تم وہاں جا کر اپنے اس چاچے کے بیٹے سے ملاقاتیں کرتی رہو جو تمہارا امنگیتر تھا۔ ہم اپنی عزت کی حفاظت کرنا جانتے ہیں۔ عورت تو بے اعتبار ہوتی ہے۔ اس پر اعتبار کرنے والے بے وقوف ہوتے ہیں اور مراتب علی خان بیوقوف نہیں ہے۔''

تو میں اس کے نزدیک قابل اعتبار نہیں تھی۔

میں جس نے باپ کی عزت کی خاطر اپنی محبت قربان کر دی تھی۔ اس کی عزت کی حفاظت نہیں کر سکتی تھی..... اور میں اپنی ہی نظروں میں بے توقیر ہوگئی تھی۔

تب میں نے سوچا تھا کہ وہ عورت جس کا مرد اس پر اعتبار نہ کرے، اس سے بڑھ کر بے وقعت اور بے توقیر عورت کون ہو سکتی ہے۔ بے اعتباری سے بڑھ کر بے عزتی اور کوئی نہیں۔ تو استانی جی کے سوال کا اصل جواب تو اب وقت نے میری جھولی میں ڈالا تھا۔

اور بیس سال گزر گئے۔ میں مراتب علی کے لیے کبھی اتنی اعتبار کے قابل نہ ہو سکی کہ سکھاں والی جاتی۔ اماں چلی گئیں۔ چاچا، چاچی چلے گئے لیکن مجھے سکھاں والی جانے کی اجازت نہ ملی۔ بس گاؤں سے دکان پر اطلاع آتی تو وہ بتا دیتا تھا۔ اماں کے مرنے کی خبر جب اس نے بتائی تو اماں کو رخصت ہوئے چھ دن ہو گئے تھے۔

میں تڑپ کر روتی اور سوچتی تھی..... کہ جب میرا ابا تھکا ہارا کھیتوں سے واپس آ کر دھریک کے درختوں والے صحن میں بچھی چارپائی پر آ کر بیٹھتا ہوگا تو اس کا حقہ کون تازہ کرتا ہوگا..... کون وقفے وقفے سے چلمٹے سے پکڑ کر چلم پر انگارے رکھتا ہوگا..... کون اس کے آنے سے پہلے بان کی کھردری چارپائی پر

کالا اور سفید چار خانوں والا کھیس بچھا کر تکیہ رکھتا ہو گا۔ اور میں نے پہلی اور آخری بار سکھاں والی جانے کی اجازت چاہی تھی۔

"کیوں ...... اب جا کر قبرستان کی مٹی دیکھنی ہے کیا۔ تو یہاں کے قبرستان کی دکھلاتا ہوں۔ ہر جگہ کی مٹی ایک جیسی ہی ہوتی ہے۔ یا پھر چاچے کے پتر سے ملنے کی ہڑک اٹھ رہی ہے۔"

اور میں جیسے زمین میں گڑ گئی تھی پھر جب چاچا، چاچی گئے تو میں نے "سکھاں والی" جانے کی بات ہی نہیں کی بس گل ریز کے متعلق سوچتی رہی کہ چاچا چاچی کے بعد کتنا اکیلا ہو گیا ہو گا۔ بیاہی بہنیں تو چار دن رہ کر چلی گئی ہوں گی...... میں ہوتی وہاں تو اس کے آنسو پونچھتی۔ اس کا درد بانٹتی اور میرے دل سے درد اٹھ کر پورے وجود میں پھیل گیا تھا۔

اور آج بیس سال بعد جب میں سکھاں والی واپس جا رہی تھی تو اس درد کی کسک اب بھی محسوس کرتی تھی اور پتا نہیں گل ریز اب بھی اکیلا ہو گا۔

"ہاں اکیلا ہی ہو گا۔" دل نے اس یقین پر مہر لگائی تھی۔ اس کے اکیلے پن اور تنہائی کا احساس وجود کو کاٹنے لگا تو میں نے کھڑکی سے سر ٹیک کر آنکھیں موند لیں اور یادیں ہاتھوں میں ہاتھ دیے چلی آنے لگی تھیں۔ یادیں جنہیں بیس سالوں میں خود سے دور رکھنے کی کوشش میں ہانپ ہانپ گئی تھی۔ جب بھی قریب آتیں۔ دور دھکیل دیتی تھی لیکن آج مجھے انہیں خود سے دور کرنے کی ضرورت نہ تھی اور وہ ایک کے بعد ایک چلی آتی تھیں۔

میری شفیق ماں

میرے نیک دل ابا

محبت لٹانے والے چاچا، چاچی

شوخ سا گل ریز اور اپنا کچے صحن والا بڑا سا گھر آج سب ہی یاد آ رہے تھے اور یاد آئے چلے جاتے تھے۔ ہمارے صحن میں دھریک کے درخت تھے امرود اور انار کے پیڑ تھے جب دھریک کے درخت کاسنی پھولوں سے بھر جاتے تو پورے گھر میں ہلکی ہلکی مہک سی پھیل جاتی تھی۔

مجھے اپنا گھر سکھاں والی کے سارے گھروں سے اچھا لگتا تھا...... صاف ستھرا، مہکتا ہوا...... ابا نے جانوروں کے لیے الگ سے احاطہ بنا رکھا تھا کہ اماں کو گھر کے اندر جانور رکھنا پسند نہ تھا جبکہ سکھاں والی کے اکثر گھروں میں صحن کے اندر ہی جانوروں کے لیے کوٹھا ہوتا تھا۔ وہاں صحن میں ہی کمرلی بھی بنی ہوتی تھی لیکن ہمارے صحن میں تو بس ایک طرف تندور تھا اور ایک طرف مٹی کا چولہا بنا ہوا تھا۔ ہمارا برآمدہ پکی اینٹوں کا تھا اور لائن میں بنے دونوں کمروں کے دروازے برآمدے میں ہی کھلتے تھے۔ دائیں بائیں ذرا چھوٹے کمرے تھے۔ ایک کمرے میں اناج، بستروں والی پیٹی اور دوسرا سامان ہوتا تھا یعنی وہ اسٹور تھا۔

اور دوسرے چھوٹے کمرے میں بارش اور سردی میں اماں مٹی کا چولہا صحن سے اٹھا کر اندر رکھ لیتی تھیں۔ وہیں ایک طرف زمین پر گدا بچھا دیتیں۔ کھانا بن جاتا تو وہاں اسی گدے پر بیٹھ کر ہم کھانا کھاتے۔ آگ بجھانے کے بعد کوئلے مٹی کی انگیٹھی میں ڈال دیے جاتے اور ساتھ ساتھ مزید کوئلے ڈالتے جاتے تھے جنہیں گرمیوں میں لکڑیاں بجھا کر اکٹھا۔ کیا جاتا تھا۔

مجھے کوئلوں میں آلو بھون کر کھانا بہت پسند تھا اور کبھی کبھی میں گل ریز کو بھی اس طرح آلو بھون کر دیتی اور ہم گدے پر بیٹھ کر نمک مرچ چھڑک کر کھاتے تھے۔ اس چھوٹے کمرے کو ہم "پسار" کہتے تھے۔ سردیوں میں اماں اپنے سارے کام ادھر ہی بیٹھ کر کرتی تھیں۔ زندگی سکھاں والی میں کتنی سادہ اور خوب صورت تھی اور میں کتنی بے وقوف تھی کہ میں نے شہر میں رہنے کی خواہش کی تھی۔

☆☆☆

میری زندگی کی سب سے منحوس گھڑی تھی وہ جب میں چاچا کے گھر کے پیپل کے درخت پر پینگ پر بیٹھی تھی اور پینگ بڑھاتے بڑھاتے میں اتنی اونچی

لے گئی تھی کہ آس پاس کے گھروں کے آنگن نظر آنے لگے تھے اور صحن میں کھڑا گل ریز خوف زدہ سا چلا رہا تھا۔

"بس کر...... بس کر آئینہ! رسی ٹوٹ جائے گی۔"

"پہلے وعدہ کر مجھے شہر لے جائے گا۔ ہم شہر میں رہیں گے۔"

"اچھا وعدہ، تجھے شہر لے جاؤں گا پر ہم نہیں رہیں گے وہاں...... رہیں گے تو سکھاں والی میں ہی۔ سکھاں والی جیسا تو کوئی شہر نہیں ہے۔"

اور میں خوش ہو گئی تھی کہ چلو شہر لے جانے کا وعدہ تو کر لیا ہے۔ رہنے کا بعد میں سوچیں گے، مجھے کیا پتا تھا۔ میری خواہش ایسے، اس طرح پوری ہو گی۔ میرے ابا رب نواز سکھاں والی کے ایک چھوٹے سے زمین دار تھے۔ بلکہ سکھاں والی میں سب ہی چھوٹے زمین دار تھے تھوڑی تھوڑی زمین، ڈھور ڈنگر، سال بھر کا اناج، دودھ دہی اور گھر کا خرچ ان زمینوں سے حاصل ہو جاتا تھا۔

سب لوگ اپنی اپنی زندگیوں میں مطمئن تھے۔ زیادہ کا لالچ تو کسی کو نہ تھا۔ جس کے پاس تھوڑی زمین تھی اسے بھی نہیں اور جس کے پاس زیادہ تھی اسے بھی نہیں۔ میں آئینہ خاتون چار کم عمری میں مر جانے والے بہن بھائیوں کے بعد پانچویں تھی جو بچ گئی تھی اور اپنے ابا اماں کی ہی نہیں چاچا چاچی کی بھی لاڈلی تھی...... اور مجھ سے بڑی میرے چاچا کی بیٹیاں ہر وقت مجھے سنوارتی سجاتی رہتی تھیں کہ میں ان کے چھوٹے لاڈلے بھائی کی منگ جو تھی۔ چاچی نے تو میرے پیدا ہوتے ہی مجھے ابا سے مانگ لیا تھا۔

اماں نے مجھے بتایا تھا کہ میرے پیدا ہوتے ہی چاچی نے مجھے گود میں لیتے ہوئے کہا تھا۔

"لو بھائی رب نواز! اللہ اسے زندگی دے۔ میری تو فکر پریشانی مک (ختم) گئی اب مجھے اپنے گل ریز کی دلہن ڈھونڈنے کے لیے جوتیاں نہیں گھسانی پڑیں گی اور نہ ہی دن رات یہ فکر ستائے گی کہ بہو جوتے مار کر گھر سے نکال کر اکلوتے بیٹے پر قبضہ کر لے گی۔" چاچی ایسی ہی تھی ہنسوڑ سی۔ بات سے بات نکال کر ہنستی اور دوسروں کو بھی ہنساتی تھی۔

اور اماں ابا میرے رشتے سے بے فکر ہو کر میرے لاڈ اٹھاتے تھے۔ اور میں اپنے گھر کے کچے صحن میں گڑیوں سے کھیلتی پینگوں پہ جھولتی اتنی بڑی ہو گئی تھی کہ گل ریز کے نام پر میرے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی تھی۔ وہ ہمارے صحن میں قدم رکھتا تو رخسار تپ اٹھتے۔ چاچی تو ہمیں چاند سورج کی جوڑی کہتی تھیں۔

ہم دونوں تو جیسے ایک دوسرے کے لیے ہی بنے تھے۔ ایک دوسرے کے لیے ہی جیتے تھے لیکن نہ کبھی اس نے مجھ سے کہا کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے، نہ میں نے لیکن ہم دونوں جانتے تھے کہ ہم ایک دوسرے کے ہیں اور ہمارا جینا مرنا ایک ساتھ ہی ہے۔ ہماری محبت میں کوئی چھچھورا پن نہیں تھا۔ نہ تو ہم کبھی کھیتوں میں چھپ چھپ کر ملے اور نہ کبھی چھتوں پر ملاقاتیں کیں اور پھر ضرورت بھی کیا تھی چھپ کر ملنے کی جب اس کا جی چاہتا۔ مجھے دیکھنے کو تو ہمارے گھر آ جاتا اور جب میرا دل چاہتا۔ میں چاچی کی طرف چلی جاتی۔ جب میں پندرہ سال کی ہوئی تھی تو اماں نے کہا تھا۔

"بھئی اب آئینہ کا گل ریز سے پردہ ہو گا۔"

لیکن چاچی نے صاف صاف کہہ دیا تھا۔

"نہ بھئی نہ، میرا پتر آئینہ کو نہیں دیکھے گا کسی روز تو اس کا تو ساہ (سانس) ہی بند ہو جائے گا۔ بس اب جلدی سے اس کی شادی کر دے میرے گل ریز سے۔"

اور پھر وہ کھل کھل کر کے بہت ہنسی تھیں اور میں شرم سے لال ہو رہی تھی۔ وہ جب بھی شہر جاتا تو میرے لیے چوڑیاں، انگوٹھیاں اور بالیاں لے آتا...... میں اس کے لیے سویٹر بنتی بس ہماری محبت ایسی ہی تھی لیکن جب سے وہ دس پڑھ کر شہر پڑھنے گیا تھا ذرا مشکل مشکل باتیں کرنے لگا تھا۔ محبت کی۔ وصالی

''تمہیں پتا ہے نا آئینہ! محبتیں کبھی آسانی سے نہیں ملتیں لیکن مجھے میری محبت اتنی آسانی سے مل گئی ہے۔ جب تمہاری محبت نے میرے دل میں بسیرا لگائی تو تم پہلے ہی میری ہو چکی تھیں تو اتنی آسانی سے محبت مل جائے تو ڈر لگتا ہے تو مجھے بھی کبھی کبھی بہت ڈر لگتا ہے۔ یہ اتنی آسانی سے ملنے والی محبت چھن نہ جائے۔''

''بھلا کیوں چھن جائے گی؟'' میں اس بات پر ناراض ہو جاتی تھی۔ ''شہر جا کر کیسی اوٹ پٹانگ باتیں کرنے لگے ہو تم۔''

''اچھا چل۔ اب نہیں کروں گا لیکن تمہیں کھونے کے خیال سے میرا دل بہت ڈرتا ہے آئینہ! مجھے لگتا ہے میں تمہارے بغیر زندہ نہ رہ پاؤں گا۔ تم نہیں جان سکتیں۔ میں تم سے کتنی شدید محبت کرتا ہوں۔''

میں بھلا کیسے نا جان پاتی۔ میں بھی تو اس سے اتنی ہی شدید محبت کرتی تھی۔

اس نے بارہ جماعتیں پاس کیں تو دونوں گھروں میں شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ چاچی کے منع کرنے کے باوجود اماں ابا نے میرے لیے نا جانے کیا کیا خرید ڈالا تھا۔ ان کا تو جی چاہتا تھا کہ ہر چیز ہی میرے لیے خرید لیں۔ لیکن کبھی کبھی ڈر مجسم ہو جاتے ہیں۔ گل ریز کا ڈر بھی سچ ثابت ہو گیا تھا۔

شادی سے صرف دو ہفتے پہلے گاؤں میں سیلاب آ گیا تھا۔ میری سولہ سالہ زندگی میں پہلی بار ایسا سیلاب آیا تھا..... تھوڑا بہت پانی تو ہر برسات میں ہی چڑھ جاتا پر ایسا سیلاب تو کبھی نہیں آیا تھا جس نے کھڑی فصلیں، مال، جانور گھر سب تباہ کر دیے تھے۔

مہینوں بعد ہم کیمپ سے گھر آئے تھے۔ زندگی کو نئے سرے سے شروع کرنا آسان تو نہ تھا۔ گھر کی چھت ڈالنے سے لے کر جانور خریدنے تک سب کے لیے پیسے کی ضرورت تھی۔

زیور فروخت کرنے کے باوجود ابا کو ادھار لینا پڑا۔ مراتب خان سے ابا کی پرانی جان پہچان تھی۔ منڈی میں ہی ایک روز ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ ابا گندم اور دوسرا ضرورت سے زیادہ اناج شہر کی منڈی میں بیچنے کے لیے لے جاتے تھے۔ تو ابا نے مراتب علی خان سے ادھار لیا تھا۔ صرف بیس ہزار روپے..... بلکہ اس نے خود ہی ابا سے کہا تھا کہ جتنی رقم کی ضرورت ہے۔ وہ اس سے لے لیں..... ابا ہفتوں اس کی تعریفیں کرتے رہے۔

زمین زرخیز تھی۔ ابا کا خیال تھا دو تین اچھی فصلیں ہو گئیں تو ادھار اتر جائے گا اور پھر بیاہ کی تیاری کر لیں گے۔ چاچا کی طرف بھی یہی حال تھا۔ انہوں نے بھی ادھر ادھر سے ادھار لے کر گھر کو رہنے کے قابل بنایا تھا جانور خریدے تھے۔ گل ریز شہر میں چھوٹی موٹی نوکری کرنے لگا تھا۔

''یہ تو آزمائش ہے اللہ کی طرف سے نیک بخت۔'' اماں کو پریشان دیکھ کر ابا سمجھاتے۔ ''صبر و شکر کے ساتھ وقت گزار لو۔ جانی نقصان تو نہیں ہوا۔ کتنا بڑا کرم ہوا اللہ کا کہ زندگیاں بچ گئیں۔''

اور اماں بھی شکر ادا کرتیں کہ زندگیاں بچ گئیں لیکن کیا واقعی زندگیاں بچ گئی تھیں۔ نہیں کچھ زندگیاں زندہ درگور ہو گئی تھیں۔

زمین تیار ہو گئی تھی۔ بوائی ہو گئی تھی ابا اٹھتے بیٹھتے مراتب کی تعریف کرتے لیکن وہ اتنا اچھا نہیں تھا جتنا ابا سمجھتے تھے۔

ایک بار وہ کیمپ میں ابا سے ملنے آیا تھا۔ شاید ابا کے کچھ واجبات ادا کرنے جسے لینے کے لیے ابا منڈی گئے تھے اور وہ وہاں نہیں ملا تھا تو پیغام دے آئے تھے

اور کیمپ میں اس نے مجھے دیکھا تھا اور فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے مجھ سے ہی شادی کرنی ہے۔

شادی کے بعد ایک بار موڈ میں آ کر اس نے مجھے بتایا تھا لیکن میرے سیدھے سادے ابا تب نہیں جانتے تھے کہ وہ انہیں کیوں ادھار دے رہا ہے۔ ہر فصل کی کٹائی کے بعد ابا اسے کچھ نہ کچھ رقم دے دیتے تھے۔ لیکن دو سال بعد جب ابا نے اپنے حسابوں میں اس کی پائی پائی ادا کر دی تھی وہ ایک روز سکھاں والی آ گیا تھا۔

”ہاں تو ملک صاحب! رقم کب تک دینے کا ارادہ ہے۔ ایسا ہے کہ میں نے تو اب کراچی میں ڈرائی فروٹس کا کاروبار شروع کر دیا ہے تو ادھر آنا نہیں ہو گا تو دو تین روز میں حساب چکا دو۔“

اور ابا حیران رہ گئے تھے۔

”میں نے تو بیس ہزار پورے کر دیے ہیں۔“

”بہت بھولے ہو رب نواز ملک! وہ تو سود تھا اصل زر تو سارا باقی ہے۔“

”پر تم نے سود کی تو کوئی بات نہیں کی تھی۔“ ابا از حد پریشان ہو گئے تھے۔

”لو میں کوئی مفت میں پیسے بانٹتا پھرتا تھا۔ کاغذ پہ سب لکھا تو تھا جس پر تم نے انگوٹھا لگایا تھا رب نواز۔“

اور وہ تین دن کا وقت دے کر چلا گیا۔ اب بھلا ابا تین دن میں کہاں سے بیس ہزار اکٹھا کرتے۔ سکھاں والی میں تو کسی کے پاس بھی اتنا پیسہ نہ تھا۔

”اور تین دن میں رقم ادا نہ ہوئی تو کیا ہو گا بھائی۔“ چاچا بھی از حد پریشان تھا۔ کھیت ڈھور ڈنگر سب سانجھے تھے۔

”کیا ہو گا...... وہ کہتا تھا قرقی ہو جائے گی مگر اب سب کھیت، مال مویشی ضبط کر کے نیلام کر دیں گے اور جیل بھجوا دے گا مجھے۔“

”تو کتنی بے عزتی ہو گی شاہنواز اگر رب نواز جیل چلا گیا اس کے کھیت مال ڈنگر نیلام ہو گئے تو؟“ اماں نے چاچا سے پوچھا تھا۔

چاچا ابا کے ساتھ اس کی منت کرنے منڈی چلا گیا کہ وہ کچھ وقت دے دے زیادہ نہیں تو صرف چھ مہینے۔ اس نے اس مسئلے کا یہ حل بتایا تھا کہ ابا اگر اسے اپنی بیٹی کا رشتہ دے دے تو وہ قرض کی رقم معاف کر دے گا۔

”لیکن میری بیٹی کا رشتہ ہو چکا ہے میرے بھائی کے بیٹے سے۔“

”تو رشتہ ہی ہوا ہے نا نکاح تو نہیں ہوا نا۔“

”میری بیٹی بہت کم عمر ہے مراتب خان! تم سے آدھی عمر کی ہو گی۔“ ابا گڑگڑائے تھے۔

”مرد کی عمر کس نے دیکھی ہے، دولت میں کھیلے گی۔ تمہاری بیٹی عیش کرے گی۔“

”پھر بھی مراتب خان میں اپنی بیٹی کا رشتہ نہیں دے سکتا تمہیں، بچپن کی منگ ہے میرے بھتیجے کی۔“

”تو ٹھیک ہے۔ کل کا دن ہے۔ رقم دے دو۔ نہیں تو۔“

ابا اور چاچا گھر آ گئے تھے۔

”تم ہی بتاؤ شاہنواز! کیا کروں۔“ ابا بے بس سے چاچا سے پوچھ رہے تھے۔

”بظاہر تو اس کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے بھائیا جی۔ وہ کہتا ہے بیس ہزار قرض کے اور پانچ ہزار مزید سود بن گیا ہے۔ ٹوٹل پچیس ہزار بن گیا ہے۔ بیس ہزار معاف کر دے گا اور پانچ ہزار حق مہر ہو گا۔“ چاچا نے سر جھکا لیا تھا۔

ابا جیل چلے جاتے تو پورے گاؤں میں بے عزتی ہوتی۔ اماں رو رہی تھیں...... اور میری زندگی کا فیصلہ ہو گیا۔ میں آئینہ خاتون صرف بیس ہزار روپوں کا قرض چکانے کی خاطر بے وقعت اور بے توقیر ہو گئی تھی۔ وہ ہو گیا تھا جس سے گل ریز ڈرتا تھا۔

”آئینہ! میں تمہارے بغیر جی نہیں پاؤں گا۔ میں نے صرف تم سے محبت کی ہے۔“ ابا نے مراتب خان کو ہاں کر دی تھی اور گل ریز یہ سنتے ہی گھر چلا آیا تھا۔

”اور کوئی راستہ بھی تو نہیں ہے گل ریز۔“

میں رو رو کر تھک چکی تھی۔

''ہاں کوئی راستہ نہیں۔ لیکن میں عمر کی آخری سانس تک تمہارا انتظار رہوں گا کہ شاید کبھی تم لوٹ آؤ۔ اس دل اور اس گھر میں کسی اور کی گنجائش نہیں ہے آئینہ! اس گھر اور دل کے دروازے ہمیشہ تمہارے لیے کھلے رہیں گے اس امید پر کہ شاید کبھی زندگی ہم پر مہربان ہو جائے۔''

اور بیس سالوں میں ایک بار بھی زندگی مہربان نہیں ہوئی تھی۔

تو کیا گل ریز اب بھی میرا انتظار ہوگا۔ یقیناً وہ میرا انتظار کرتا ہوگا اب بھی..... اس نے کہا تھا محبت کبھی نہیں مرتی، وہ ہمیشہ زندہ رہتی ہے..... اور میری محبت بھی اس کے دل میں روز اول کی طرح ہمیشہ زندہ رہے گی۔''

میں آئینہ خاتون اٹھارہ سال کی عمر میں سکھاں والی سے گئی تھی اور اب بیس سال بعد اڑتیس سال کی عمر میں سوچتی تھی محبت بھی میری منتظر ہوگی۔ یادوں کی انگلی تھامے تھامے کراچی سے لاہور تک کا طویل سفر کاٹ دیا تھا۔

جب میں لاہور اسٹیشن پر اتری تو گھبرائی ہوئی تھی اور اسٹیشن سے باہر آتے ہوئے ایک عورت سے پوچھا تھا کہ ''سکھاں والی'' جانے والی سواری کہاں سے ملے گی؟''

''ادھر باہر ہی سب سوزوکیوں اور ویگنوں والے کھڑے ہوتے ہیں۔''

عورت نے بتایا تھا اور پھر جلد ہی مجھے ایک لڑکا آوازیں لگاتا نظر آ گیا جو ایک ویگن کے دروازے پر لٹکا سکھاں والی، سکھاں والی کہہ رہا تھا۔ میں اپنی چادر سنبھالتی دھڑکتے دل کے ساتھ وین میں بیٹھ گئی تھی۔ شام ڈھل رہی تھی جب میں سکھاں والے کے اڈے پر اتری تھی اور اچھی طرح چادر لپیٹتی جانے پہچانے راستوں پر چل رہی تھی۔

ماتھے پر طلاق کا جھومر سجائے، بے وقعت اور بے توقیر۔

بیس سال بعد بھی میرے قدموں تلے بچھے راستے اجنبی نہیں تھے لیکن میں چند قدم چل کر رک جاتی۔ پتا نہیں میرے قدموں کے نشان اس دہلیز پر باقی ہوں گے یا نہیں۔ پتا نہیں وہ دروازہ میری دستک پر وا ہوگا یا نہیں۔

میرے گھر کا دروازہ نیم وا تھا۔ بے اختیار جی چاہا بھاگتی ہوئی اندر جاؤں اور اپنے بابل کے گلے لگ جاؤں لیکن میں امید کا دیا اٹھائے آگے بڑھ گئی تھی جہاں میری محبت میری منتظر تھی چند گھر چھوڑ کر چاچا کا گھر تھا۔

وقت تو بہت گزر گیا تھا۔ پورے بیس سال لیکن محبت کرنے والے تو وقت کی قید سے آزاد ہوتے ہیں ان کے لیے سال، دن، مہینے کچھ نہیں ہوتے۔ میں اس دروازے کے سامنے کھڑی تھی جہاں سے کبھی بے جھجک اندر داخل ہو جاتی تھی۔

بیس سالوں میں چاچا کا گھر تو بالکل ویسا ہی بن گیا تھا جیسا سیلاب سے پہلے تھا بلکہ اس سے بھی اچھا۔ میں نے دستک دینے کے لیے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ دروازہ کھول کر سترہ اٹھارہ سال کا خوبرو سا لڑکا باہر نکلا تھا۔ گل ریز کی جوانی۔

''گل ریز.....!'' میرے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

''ابا تو شہر گئے ہیں۔''

''وہ گل ریز کا بیٹا تھا۔ عمر کے آخری سانس تک انتظار کرنے والے نے شاید سال دو سال بھی انتظار نہیں کیا تھا۔ ادھ کھلے دروازے سے بچوں کے بھاگنے، دوڑنے، شور کرنے کی اور کسی عورت کے ڈانٹنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

اور وہاں کھڑے کھڑے مجھے اپنا آپ بڑا بے وقعت اور بے توقیر لگا تھا اور میں نے سوچا تھا کہ عورت کی اس سے بڑی بے وقعتی اور بے توقیری کیا ہوگی کہ وہ طویل سفر طے کر کے آبلہ پا محبوب کے در پر آئے اور محبوب اس کا منتظر ہی نہ ہو۔

اور میں تھکے تھکے قدموں سے واپس پلٹ گئی

https://reading.urdutaan.net

تھی۔
درماندہ زخمی دل اور وجود کے ساتھ۔

☆☆☆

ابا برآمدے میں بچھی چارپائی پر چارخانوں والا کالا اور چتا کھیس اوڑھے سو رہا تھا۔

"ابا!" میں کھلے دروازے سے اندر آ کر چارپائی کے سرہانے کھڑی ہوگئی۔

"آئینہ......!" ابا ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے تھے اور پھر مجھے اپنے کمزور بازوؤں میں بھینچ لیا تھا۔

"کتنی دیر لگا دی تم نے آنے میں۔ یوں بھی کوئی ماں باپ سے خفا ہوتا ہے۔ میں نے تو تمہارے جانے کے بعد کبھی دروازہ بند ہی نہیں کیا کہ کبھی تم آؤ اور دروازہ کھلنے میں دیر ہو جائے۔ بڑھاپے کی نیند کا کیا پتا آنکھ ہی نہ کھلے۔"

اور میرے بیس سالوں کے رکے آنسو بہہ نکلے تھے۔ بیس سالوں بعد میں ابا کے گلے لگی اماں، چاچا چاچی اور اپنی محبت کے مرنے پر چیخیں مار مار کر رو رہی تھی۔

صبح میں نے زمانوں بعد صحن میں بنے مٹی کے چولہے میں لکڑیاں جلا کر روٹیاں پکائی تھیں اور ابا نے تیل کے چولہے پر اپنے ہاتھوں سے میرے لیے چائے بنائی تھی اور پیڑھی پر بیٹھ کر چائے پیتے ہوئے ابا بتاتے رہے تھے۔

"تیرے جانے کے بعد ایک روز بھی ہماری آنکھیں خشک نہیں ہوئیں۔ ہم روتے ہوئے سوتے تھے اور روتے ہوئے جاگتے تھے۔ ہم سے بڑا ظلم ہو گیا تھا۔ لے جاتا سب کچھ کھیت، گھر، جانور...... ہماری شہزادی تو ہمارے پاس ہوتی۔ چلا جاتا میں جیل...... ایسی عزت کیا کرنی تھی جو بیٹی کو ناراض کر کے ملنی تھی۔"

"میں ناراض نہیں تھی ابا! مراتب نے کبھی آنے ہی نہیں دیا۔" میں نے چنگیر میں رکھی روٹی پر دیسی گھی لگا کر ابا کی طرف بڑھائی۔

جس روز گل ریز کی بارات چڑھی، اس روز تمہاری اماں نے دم دیا۔ اسے شاہنواز اور گل ریز سے بھی گلہ تھا...... اور غلط گلہ تو نہ تھا۔ وہ اگر اس روز میرے سر پر کھڑا ہوتا میرا ہاتھ تھامتا مجھے سہارا دیتا کہ۔ "کوئی بات نہیں بھاء جی کھیت جانور سب ضبط ہو جائیں یہ تو پھر مل جائیں گے تو میں......"

"جو ہوا، ہو گیا ابا!" میں نے ان کے بے اختیار امڈ آنے والے آنسو اپنے ہاتھوں سے پونچھے اور پوچھا۔

"آپ کو کھیتوں میں نہیں جانا؟"

"تمہاری اماں کے بعد میں نے کھیت ٹھیکے پر دے دیے۔ تمہارے چاچا نے اپنی زمین الگ کر لی تھی۔ ایک بندے کا خرچ ہی کتنا ہوتا ہے آئینہ!"

اور میں سر ہلاتی ہوئی برتن دھونے کے لیے اٹھ گئی تھی۔ برتن دھو کر میں صحن میں جھاڑو دینے لگی تو صحن میں ساتھ والے گھر سے بچیوں کے قرآن پڑھنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

"ابا! کیا استانی جی ہیں...... استانی خورشید جہاں۔" ابا برآمدے میں بیٹھے مجھے جھاڑو دیتے دیکھ رہے تھے۔

"ہاں ہیں۔" اور میں جھاڑو دے کر ابا سے پوچھ کر استانی جی سے ملنے چلی آئی تھی۔ استانی جی پیڑھی پر بیٹھی بچیوں سے سبق سن رہی تھیں۔ ضعیفی کی پُروقار کشش سے ان کا چہرہ چمک رہا تھا۔

"استانی جی! السلام علیکم!" میں آہستہ قدموں سے چلتی ان کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی۔

"کون...... آئینہ؟" انہوں نے آنکھوں پر ہاتھوں کا چھجا بنا کر مجھے دیکھا تھا۔

"جی آئینہ......!"

"ایسی گئیں شہر کہ اپنے سکھاں والی کو بھول گئیں۔" وہ کھڑی ہو کر مجھ سے گلے مل رہی تھیں۔

"بھولی تو نہیں تھی استانی جی! پر ادھر واپسی کے سب راستے ہی بند کر دیے گئے تھے۔"

اور وہ لڑکیوں کو سبق یاد کرنے کا کہہ کر مجھے لے کر اندر کمرے میں آ گئی تھیں۔

''اب بتا..... کیسی ہے۔ کیسی گزر رہی ہے۔ خوش تو ہے تو؟ بچے ہیں؟''

''خوشی تو یہاں سکھاں والی میں ہی رہ گئی تھی اور گزر گئی استانی جی! جیسی بھی گزری۔ ایک ہی بچہ ہے۔ پیدا تو چار ہوئے پر زندہ ایک ہی بچا۔''

''جیتا رہے، لمبی حیاتی ہو۔ کتنے دنوں کے لیے آئی ہے؟''

''بس اب آ گئی ہوں تو جانا کیسا؟''

اور میں نے چند لفظوں میں ساری داستان سمیٹ دی۔ استانی جی دکھ اور تاسف سے مجھے دیکھتی رہیں..... اور پھر میری خاطر تواضع کے لیے اٹھنے لگیں تو میں نے روک لیا۔

''آپ کو یاد ہے استانی جی! آپ نے ایک بار مجھ سے سوال کیا تھا اور کہا تھا وقت خود ہی میرے سوال کا جواب دے گا تو استانی جی! آج بیس سالوں کی مسافت طے کر کے آئی ہوں تو وقت نے میری جھولی میں آپ کے سوال کے جواب ڈال دیے ہیں.....'' اور میں نے بیس سالوں میں حاصل ہونے والے سارے جواب ان کے سامنے رکھ دیے تھے۔

''تم نے تو اسی وقت میرے سوال کا جواب دے دیا تھا آئینہ۔ پر تب میں سمجھ ہی نہیں پائی تھی میرا تو سوال ہی غلط تھا۔ عورت کبھی بے وقعت اور بے توقیر نہیں ہوتی۔ یہ تو مرد ہے جو اسے بے وقعت کرتا ہے۔'' بوڑھی آنکھوں کی سطح پر نمی پھیل گئی تھی۔

''لیکن تب میں سمجھتی تھی ہر عورت کو اس سوال کا جواب وقت اسے اپنے حساب سے دیتا ہے۔ میری ماں کہتی تھی عورت تب بڑی بے وقعت اور بے توقیر ہو جاتی ہے جب اس کے سر کا سائیں نہ رہے اور اولاد اسے فالتو سامان سمجھ کر ایک کونے میں پھینک کر بھول جائے لیکن جب میری شادی ہوئی تو مجھے لگتا تھا کہ عورت کی اس سے زیادہ بے وقعتی اور بے توقیری کیا ہو گی کہ اس کا مرد اس کی خوبیوں کو تسلیم نہ کرے اس کے وجود کی نفی کرے اور عورت کو لگے کہ وہ تو ایگزسٹ ہی نہیں کرتی۔ صابر میرا شوہر ایسا ہی تھا، میری تعلیم، میری خوب صورتی، میرا ہنر، میرا سلیقہ اس کے نزدیک کچھ بھی نہیں تھا۔ جیسے میں بڑی بے وقعت اور حقیر سی مخلوق ہوں۔''

جس روز میں نے تم سے وہ سوال پوچھا تھا اس روز شہر میں صابر نے ایک ان پڑھ، عام سی شکل و صورت کی بد سلیقہ لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ میں پڑھی لکھی تھی، خوب صورت تھی۔ اولاد والی تھی پھر بھی..... تب مجھے لگا تھا کہ عورت بے وقعت اور بے توقیر تب ہوتی ہے جب اس کا مرد ایک کمتر عورت کو اس پر سوکن بنا کے بٹھا دیتا ہے۔

میرے سامنے تین جواب تھے اور اسی الجھن میں تم سے پوچھ بیٹھی تھی لیکن آئینہ! میں نے کہا نا میں غلط تھی تم صحیح کہتی تھیں عورت کبھی بے وقعت اور بے توقیر نہیں ہوتی اس کی گود میں تو ولی اور پیغمبر پلتے ہیں لیکن مجھے اس کا ادراک اس روز ہوا تھا جب میرے بیٹے اور میری بیٹیاں میرے گرد حصار باندھے کھڑے تھے اور میری محبتوں، مشقتوں، محنتوں کو سراہ رہے تھے۔

میں بے وقعت اور بے توقیر نہیں تھی میں تو عزت والی اور باوقار تھی ہمیشہ سے اپنی تخلیق کے وقت سے جب تخلیق کار نے مجھے تخلیق کرنے کا اعزاز دے کر دنیا میں بھیجا تھا۔

''تو آئینہ خاتون! عورت ماں ہے، نہ وہ بے وقعت ہے نہ بے توقیر۔ یہ تو مرد ہے جو اسے کبھی سر کا تاج بنا لیتا ہے اور کبھی پاؤں کی جوتی سمجھ لیتا ہے۔ اس کا مقام تو ازل سے بلند ہے۔ اسے تخلیق کرنے کا اعزاز بخشا گیا ہے۔ بس اپنے آپ کو پہچاننے کی ضرورت ہے آئینہ خاتون!''

اور جب میں استانی جی کے گھر سے نکل کر اپنے گھر کی طرف جا رہی تھی تو میرا سر اٹھا ہوا تھا اور گردن اکڑی ہوئی تھی کہ میں نہ تو بے وقعت تھی نہ بے توقیر۔

https://reading.urdutolan.net

کشف بلوچ

تنو کی نظریں ادن کے سیاہ گولوں میں اٹکی ہوئی تھیں جو کھڑکی سے چھن کر آتی سرما کی روپہلی دھوپ میں چمک رہے تھے۔ تنو آنکھوں سے بہنے والے پانی کو صاف کرنے کے لیے دوپٹے کا پلو

رکڑتی تو دھیان میں فقط یہی ہوتا کہ کہیں گود میں پڑا سیاہ ریشم پھسل کر فرش پر نا گر پڑے۔ زکام زدہ سرخ ناک کو فقط انگوٹھے سے مسل دیتی۔ فرش پر گولے گرنے کے تصور سے ہی اسے جھرجھری آجاتی۔

''تنو! افراسیاب کی گاڑی ایئر پورٹ سے نکل چکی ہے اور تو نے ابھی تک کپڑے بدلنے کی زحمت تک نہیں کی۔''

بڑی تائی نے کھڑکی سے جھانک کر اسے تنبیہی نظروں سے دیکھا۔ اس نے جھٹ سویٹر ٹانگ کے نیچے چھپالیا۔ اندر آتی چنو سے اس کی یہ حرکت چھپی نہ رہ سکی۔ بے چاری پچھلے ایک ماہ سے میگزین میں دیکھے سویٹر کے جیسا ڈیزائن بنانا چاہ رہی تھی۔ مگر کچھ دیر بننے کے بعد ادھیڑ دیتی۔ کبھی وہ ڈیزائن ہو بہو اترتا اور کبھی اسے سویٹر کا ناپ صحیح نہ لگتا۔ چنو جلدی جلدی کپڑے استری کرنے لگی۔ تنو کے ہاتھ تیزی سے سویٹر مکمل کرنے میں لگے ہوئے تھے۔

باہر دھوپ دیواروں سے سرک کر صحن میں اتر آئی تھی۔ تخت پر لیٹی دادی نرم گرم دھوپ سینکتی لندن سے تعلیم مکمل کر کے آنے والے پوتے کی پاکیزہ جوانی کے قصے نئے سرے سے دہرا رہی تھیں۔

''یہ پنڈلیوں تک ننگی ٹیموں کے ساتھ پانچ سال پڑھتا رہا مگر مجال ہے جو اس کی آنکھ میں کسی گوری کا عکس رہا ہو۔ شریف خاندان کا ہے۔ قسم ہے جو کسی کو آنکھ بھر کر بھی دیکھا ہو۔''

یہ کہہ کر وہ اس جملے کے ساتھ وہ مشہور زمانہ قصے کہانیاں بھی جوڑ دیتیں جو اس گھر کے مکینوں کو زبانی یاد تھے۔ مگر آج کی صبح ذرا مختلف تھی۔ اس واقعے کی شہادت دینے والی تائی باورچی خانے میں گاجر کا حلوہ پکانے میں مصروف تھیں اور ہمیشہ کی طرح ہونہہ کہہ کر جلنے والی چھوٹی چچی صبح سے کمرے میں بند۔ اس سے پہلے کہ دادی کوئی قصہ چھیڑتیں۔

کھلے دروازے سے بڑے تایا اندر داخل ہوئے اور چپ چاپ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے۔ ان کے پیچھے بھاری بھرکم سوٹ کیس گھسیٹتے چچا اور پھر افراسیاب داخل ہوئے۔

افراسیاب کے منہ سے نکلا ہیلو تو جیسے جادو کی لفظ ہو گیا۔ چلتے پھرتے انسان پتھر ہو گئے۔ چنو کے استری کرتے ہاتھ وہیں قمیص پر جم گئے۔ تائی کا ہاتھ چمچے سے چپکا رہ گیا اور تنو جھٹکے سے اٹھی تو سیاہ ریشم کے گولے گود سے پھسل کر فرش پر دور تک لڑھکتے چلے گئے۔ دروازے کے پاس ہیل کی ٹک ٹک اور کبوتر جیسے سفید پیروں کے اوپر گوری سڈول ننگی پنڈلیاں دیکھ کر سب کو سانپ سونگھ گیا۔

شام اپنی سرمئی زلفیں کھول رہی تھی۔ جب تنو بوکھلائی بوکھلائی دادی کے کمرے میں داخل ہوئی۔ تایا اور دونوں چچا قالین پر بیٹھے جیسے دور خلاؤں میں گھور رہے تھے۔ دادی دیوار سے لگی رو رہی تھیں۔ تنو خود پر گڑی نظروں کے وار سہہ نہ پائی۔ سامنے کھڑکی کے پٹ سے لٹکتے گیلے تولیے کو یوں شکر گزار نظروں سے دیکھا جیسے عزت بچانے پر اس کا شکریہ ادا کر رہی ہو۔ اور پھر جس تیزی سے اندر آئی تھی۔ اسی طرح واپس چلی گئی۔

''اے تنو! کیا دیکھا؟''

چنو نے اسے یوں حواس باختہ انداز میں اندر آتے دیکھا تو کلائی سے پکڑا اور کمرے کے آخری کونے میں لے جا کر سرگوشی کے سے انداز میں پوچھا۔

صبح سے وہ دادی کے کمرے میں جانے کے لیے بے تاب تھی جہاں وہ ہیل کی ٹک ٹک گم ہوئی تھی۔ اس نے افراسیاب کی جھلک تو ایک دو بار دیکھ لی مگر وہ ٹک ٹک پھر کہیں سنائی نہ دی۔ چنو نے کئی بار بہانے بہانے سے سن گن لینے کی کوشش کی مگر کچھ پلے نہ پڑا اور تو اور بات بے بات اسے پکارنے والی دادی بھی اس دن منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھی رہیں۔ اسے کسی ضرورت کے لیے بلایا تک نہیں۔

''چل ہٹ! مروا دینے میں کوئی کسر نہ

https://reading.sureteam.net

چھوڑی۔"

تنو کا چہرہ خفت سے سرخ پڑا۔ سرخ پڑتی چھوٹی سی ناک اور آنکھ کی جھیل میں تیرتے آنسو تو زکام کی نشانی لگ رہے تھے۔ مگر پھیکا پڑتا رنگ تو کسی حالیہ حادثے کی نشاندہی کررہا تھا۔ وہ تنو کے چہرے سے کچھ اخذ نہ کرپائی تو اس کے بازو میں چٹکی بھر کر بولی۔

"پھوٹ بھی دے تنو! کیوں تجسس کو ہوا دے رہی ہے۔"

چٹکی کاٹنے کی دیر تھی کہ تنو تو ساون کے بادل کی طرح برس پڑی۔ دادی کے کمرے میں تائی نے جس انداز سے اسے نظروں ہی نظروں میں لتاڑا تھا۔ وہ انداز اسے بھلائے نہیں بھولتا تھا۔ کمرے میں بیٹھے بڑوں کا احترام نہ ہوتا تو تائی اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیتیں۔ کئی سالوں کا تجربہ تھا۔ تنو کی بے عزتی کا موقع ہو اور تائی چھوڑ دیں۔

"کیا پھوٹے بے چاری، اس کا تو پتا ہی صاف ہوگیا۔"

کھڑکی کے پار سے کسی کا طنزیہ قہقہہ گونجا تو دونوں چونک اٹھیں۔ اس بار چھوٹی چچی ہنس رہی تھیں۔

بڑے تایا کے ہاں افراسیاب اور کرن، منجھلے چچا چنو اور ہادی کے ابا، اس کے بعد تنو کے ابا۔ اور ان کے بعد چھوٹے چچا جو پچھلے کئی برس سے اولاد کی نعمت سے محروم تھے۔ چچا بھتیجوں اور بھتیجیوں پر پیار نچھاور کرکے شاد رہتے۔ مگر چچی حسد کے مارے یا تو دوسروں کا جینا حرام کرتیں یا پھر سر درد کا بہانا بنائے ہمہ وقت بستر پر پڑی رہتیں۔

چچی کی بات پر تنو کی آنکھیں چھما چھم برسنے لگیں۔

"خدانخواستہ چچی کی بات سچ نکلی تو......؟"

اس سے آگے کا سوچ کر ہی اسے ہول اٹھنے لگے۔ سوچ کی دیمک اسے چاٹنے لگی۔ دیوار پر رینگتی چھپکلی مچھر کو گھورتے ہوئے اس کی بے خبری کو جانچ رہی تھی۔ تنو گھبرا کر دور ہٹی۔

چچی آگ لگا کر پھر سے کمرے میں گم ہوگئیں۔

چنو، ماں کے بلاوے پر باہر دوڑی اور تنو دروازے سے لگ کر کھڑی ہوگئی۔ افراسیاب کے ساتھ گوری میم کو دیکھ کر کانپ تو وہ بھی گئی تھی مگر یہ بھی سچ تھا کہ نہ تو کبھی افراسیاب کے نام پر اس کے گالوں پر سرخی دوڑتی اور نہ ہی جذبات میں ہلچل مچلتی۔ وہ تنو سے سات برس بڑا تھا۔ جب بھی آمنا سامنا ہوا۔ رعب ودبدبہ بیچ میں حائل رہا۔

"کیا کمی ہے مجھ میں؟"

افراسیاب نے پینسل اس کی انگلیوں پر سختی سے مار کر کہا۔ روکھا سوکھا ہاتھ جس میں گوشت نام کو نہیں تھا۔ تنو نے جھٹ ہاتھ کھینچ کر پاس ہی تخت پر اونگھتی دادی کو شکوہ کناں نظروں سے دیکھا۔ اور پھر ڈبڈبائی نگاہوں سے افراسیاب کو جو انگلش کی کتاب ہاتھ میں پکڑے اسے گھور رہا تھا۔ وہ غصے سے بار بار مٹھیاں بھینچتے ہوئے اپنا سوال دہراتا۔

"اس جملے کی انگلش بتاؤ۔"

"کیا کمی ہے مجھ میں؟"

اور تنو اس کے غضب ناک تیور دیکھ کر سہم سہم جاتی۔

اس کے اسکول سے شکایت آئی کہ تنو پھر انگلش کے پیپر میں فیل ہوگئی۔ اگلے دن دادی نے چھپن چھپائی کھیلتی تنو کو پکڑ کر فر فر انگریزی بولتے افراسیاب کے سامنے بٹھا دیا۔ اس کے کالج کی چھٹیاں تھیں۔ دادی کو خوش کرنے کے ساتھ ساتھ اسے بیٹھے بٹھائے رعب جھاڑنے کا موقع بھی مل گیا۔

تنو نے دماغ کو الٹ پلٹ کرکے رکھ دیا۔ مگر اسے کمی کی انگلش نہ آئی۔ یقیناً یہ کمی اس میں نہیں بلکہ اس کے اسکول کی انٹر پاس استانیوں میں تھی۔ جہاں تائی نے بچت کی خاطر اسے ڈال دیا۔ اس دن کے بعد افراسیاب نے اسے پڑھانے سے انکار کردیا۔

بچپن کا یہ کوئی آخری قصہ نہ تھا۔ ایسے ہزاروں قصے تھے۔ اس سے پہلے تنو کو لگتا کہ افراسیاب اپنی ماں کے برعکس اپنے دل میں اس کے لیے ایک نرم گوشہ رکھتا ہے۔ مگر اس شام یہ خوش فہمی بھی رخصت ہوگئی۔

پرانی یادوں کی راکھ کرید کے اکتائی تو تنو وجود پر شام اوڑھے صحن میں نکل آئی۔

رات بھر پرانی کتابوں سے ڈکشنری نکال کر تنو صفحے پر صفحے پلٹتی رہی۔ صبح جب نیند سے بھاری پپوٹوں کے ساتھ وہ ناشتہ بنا رہی تھی، تب اس نے افراسیاب کو اپنے کمرے سے نکل کر باتھ روم کی طرف جاتے دیکھا تو دل کیا کہ توے پر پڑے پراٹھے کو چھوڑ کر آگے بڑھے اور نہایت درشت لہجے میں یہ جملہ دہرا دے۔

”کیا کمی ہے مجھ میں؟“

مگر پھر تائی بڑی تیزی سے اس کے پاس آئیں اور اترے ہوئے چہرے کے ساتھ پراٹھوں کو پرے دھکیل کر اس کے سامنے ڈبل روٹی رکھ دی۔ وہ توے پر جمی تہوں کو چمٹے کی نوک سے کھرچنے لگی۔

اگرچہ تنو نے اپنی آنکھوں میں افراسیاب کے نام کے خواب نہیں سجائے تھے۔ مگر وہ پچھلے پانچ سال سے دادی کو اپنے لیے آئے ہر رشتے کو رد کرتے دیکھ رہی تھی۔

دادی ہر مرتبہ یہی کہتیں۔

”اس کا مرحوم باپ اسے افراسیاب کے نام منسوب کر گیا تھا۔ میں تنو کو اس کے لوٹنے تک بیاہنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔“

کمرے میں کل رات کی گھسی پراسرار خاموشی طویل تر ہونے لگی تو گھر کے چھوٹوں میں تشویش بڑھ گئی۔

باورچی خانے میں بیٹھی ناشتہ کرتی کرن نے تنو سے اشاروں ہی اشاروں میں کچھ پوچھنا چاہا مگر اندر آتی ماں کے بگڑے تیور دیکھ کر بیگ کندھے پر رکھا اور اللہ حافظ کہہ کر باہر نکل گئی۔

”سب کہتے ہیں کہ افراسیاب گوری میم کو صرف اپنا گھر دکھانے لایا ہے۔ مگر اندر کی بات تو یہ ہے کہ وہ گھر والوں کو لڑکی دکھانے لایا ہے۔“

چنو دو انگلیوں سے آٹے کی مروڑیاں اتارتی تنو کے سامنے آ بیٹھی۔ بتانے کا انداز رازدارانہ تھا۔ مگر وہ راز ہی کیا جو چچی سے چھپا رہ جائے۔ وہ پل میں محلے کے چھپے رازوں کو ننگا کر کے رکھ دیتی تھیں۔ یہ تو پھر ان کے اپنے گھر کی بات تھی۔ دیوار سے دیوار جڑی تھی۔ ان کے سامنے کوئی بات چھپی رہ جانی ممکن ہی نہیں تھا۔

”افراسیاب گوری میم کو بیاہ چکا ہے لڑکیو۔ یہ تو بس محض خانہ پری ہے۔“ انہوں نے آنکھیں مٹکا کر کہا اور اپنی بات سے مزہ لیتی ان کے پاس آ بیٹھیں۔

”یہ ہے اصل اندر کی بات۔“ چچی نے داد طلب نظروں سے چنو اور پھر تنو کو دیکھا۔

چنو منہ بناتی پاس پڑا صفائی کا کپڑا اٹھا کر چل دی اور تنو تسلے میں پڑے آخری پیڑے پر بے دلی سے انگلیاں مارنے لگی۔

☆☆☆

جاڑے کی بارش تھی۔ دوپہر کے بعد جو برسی تو پھر شام تک بغیر کسی وقفے تک برستی رہی۔ چنو ادھر صحن میں جمع پانی کو دھکیل کر آرام سے بیٹھتی اور ادھر پھر سے ننھی بوندیں ریلے کی شکل اختیار کر لیتیں۔

ایسے میں چنو اور تنو کی جھنجلاہٹ عروج پر تھی۔ جانے اتنا پانی کہاں سے آیا۔ تنو غڑر غڑر کر گلا صاف کرتی۔ مگر اگلے ہی لمحے دل بھر آتا اور پھر آنسوؤں سے لبالب آنکھیں چھلک اٹھتیں۔

تنو رات کے لیے آٹے کی پرات بھر کر بیٹھی تھی کہ پیچھے سے چنو آ دھمکی۔ وہ اسے دیکھ کر ناراضی سے رخ موڑ گئی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو اس نے منت بھرے لہجے میں چنو سے کہا تھا۔

”زکام کی وجہ سے میرا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔ چل میری بہن آٹا گوندھ دے۔“ مگر وہ جواب میں بڑی سرد مہری سے بولی۔

اب تب ہی آواز دینا جب کھانا پک گیا۔" اور ڈائجسٹ میں گم ہوگئی۔

"ابھی سالن پکنے میں تھوڑی دیر ہے۔۔کھانا پکے گا تو آواز دے دوں گی۔"

تنو نے بھی اسی رکھائی سے کہا اور آٹے میں پانی انڈیلنے لگی۔مگر وہ جانے کے بجائے اس سے لپٹ گئی اور گدگداتے ہوئے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"ہائے وہ بارش میں بھیگتا ہوا ہو بہو فرحت اشتیاق کی کہانیوں کا ہیرو لگ رہا ہے۔"

"کون؟" یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔چنو اکثر ڈائجسٹ کی کہانیاں پڑھ کر کئی روز تک ان کے ہیرو ہیروئین کے خیالوں میں کھوئی رہتی۔

مگر اس سے پہلے کہ چنو اسے ہیرو کے بارے میں تفصیلاً بتاتی۔باہر سے نانی کی آواز آئی۔

"تنو! تیری نانی آئی ہے۔"

یہ سننے کی دیر تھی کہ تنو کرنٹ کھا کر اٹھی اور آٹے سے لتھڑے ہاتھوں سمیت باہر کو دوڑی۔

"کل رات تیری اماں خواب میں آئی تھی، یہ نئیس اجلی سفید چادر اوڑھے ہوئے مگر ملول سی۔میں نے سبب پوچھا تو روئے چلی گئی مگر منہ سے کچھ نہ بولی۔"

اندر کمرے میں نانی تنو کو خود سے لپٹائے بولے جارہی تھیں اور تنو ان کی کڑھائی والی سیاہ چادر پر آٹے والے ہاتھوں سے نقش ونگار بناتی روئے چلی جارہی تھی۔

"آئے ہائے! ایسی بھی کیا شکایت کردی ہماری دیورانی صاحبہ نے کہ آپ یوں بھری برسات میں دوڑی چلی آئیں۔"

تنو سردی سے کانپتی نانی کو کمبل اوڑھا کر ہٹی ہی تھی کہ چچی ٹرے میں چائے کی پیالی رکھے کھڑی تھیں۔تیزی سے اندر آتی چنو نے اسے اشاروں ہی اشاروں میں کچھ بتانا چاہا۔تنو نے گھبرا کر نانی کی منہ پر کہہ دیا۔اپنے پرائے اور بڑے چھوٹے کا لحاظ تو بھول ہی چکی تھیں۔

"بس بیٹی کا اداس چہرہ دیکھا تو لگا شاید وہ تنو کی طرف سے فکر مند ہے۔اور پھر پچھلی عید پر تو یہاں آئی تھی۔"

نانی نے بات کے اختتام پر تنو کی طرف دیکھا۔جیسے کہہ رہی ہوں کہ سچ کہہ رہی ہوں نا؟"

اس کے سر ہلانے پر مطمئن ہو کر کہنے لگیں۔

"مگر لاتا کون، بیٹا زمینوں پر گیا ہوا تھا اور پوتے اپنی اپنی نوکریوں پر اور اتوار ابھی دور تھا۔یہ تو اللہ نے سبب بنایا کہ شریفل چھٹیوں پر گھر آیا تو اسے لے کر تو اسی کا حال پوچھنے آگئی۔"

نانی نے تفصیلاً جواب دیا۔چچی نے بھی سر ہلا دیا۔تب ہی تنو کی نظر چائے کی پیالی پر پڑی تو دل بجھ کر رہ گیا۔چچی صبح کی بچی چائے ہی گرم کر کے لے آئی تھیں۔تنو اپنی بے وقعتی پر کڑھ کر رہ گئی۔وہ اپنی طرف دیکھتی چنو سے کہنے ہی لگی تھی کہ کچھ سوچ کر سر جھٹک دیا۔اس کے ہاتھ میں ابھی تک ڈائجسٹ تھا۔وہ چنو کے نزدیک پہنچی تھی کہ چھوٹے چچا اندر آئے اور نانی کا حال احوال پوچھنے کے بعد چچی سے بولے۔

"گاڑی میں بیٹھے ڈرائیور کو بھی ایک پیالی چائے بھیج دیتیں۔میں نے تو دور سے دیکھا لڑکا بے چارہ سردی سے کانپ رہا تھا۔" چچی نے شوہر کی فرمائش پر انہیں خشمگیں نظروں سے گھورا۔یہ سن کر پیر پسارتی نانی جھٹ بولیں۔

"اے لو ڈرائیور کہاں، وہ تو میرا پوتا ہے۔پچھلے ماہ ہی تو اسلام آباد کے بڑے بینک میں افسر لگا ہے۔"

وہ بچوں کے سے بھول پن سے بولیں تو چھوٹے چچا اسے اندر لانے کے لیے دوڑے۔

"اسی کے بارے میں تو میں تمہیں کب سے اشاروں اشاروں میں بتانا چاہ رہی تھی۔مگر تم تو مجھ

تمہاری بھینس چرالی ہو۔" چنو نے سب کی توجہ نانی پر دیکھ کر پاس کھڑی تنو کے کان میں سرگوشی کی۔

"کس کے بارے میں۔" تنو نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

"لمبی سی گاڑی میں بیٹھے تمہارے ہینڈسم سے کزن کے بارے میں۔"

چنو نے ایک آہ بھر کر کہا۔

اتنے میں چنو کی اماں جو باورچی خانے سے غصے سے تمتماتا چہرہ لیے دونوں لڑکیوں کو اچھی خاصی سنانے آئی تھیں۔ نانی کی بات سنتے ہی ان کا سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ ڈانٹنے کا ارادہ بدل کر فقط چنو سے بولیں۔

"چل بیٹی! مہمانوں کے لیے کھانا تیار کر۔ بے چارے کتنی دور سے آئے ہیں۔"

تنو ان کے نرم لہجے پر الجھ سی گئی۔

چچی نے ماتھا پیٹ کر کہا۔

"ہائے میں مرگئی۔" اور تنو چچی کی چیخ پر اچھل پڑی۔

"چولہے پر چنے کی دال چڑھا کر آئی تھی۔" سب کے گھورنے پر خفت بھرے انداز میں کہا۔

"جل گئی ہوگی۔" کہتے ہوئے باہر دوڑیں۔

"ایسی پھپھسی دال تو روز جل مرے۔"

چنو نے جل کر کہا تو سب ہنس دیے۔

چنو کو لگتا تھا کہ چچی چنو کو چڑانے کے لیے روز چنے کی دال چڑھا لیتی ہیں۔ باقی سب تو چنو کی بات پر مسکرا دیتے مگر تنو اس بات سے زیادہ اس جملے میں چ کی بہتات کے باعث ہنس ہنس کر دہری ہو جاتی۔

وہ اکثر چنو کے بھائی ہادی کو میٹھا پراٹھا پکا کر دینے کی یہی شرط رکھ دیتی کہ وہ یہ جملہ تین بار جلدی جلدی دہرائے گا تو پراٹھا بنا کر دے گی اور وہ بے چارہ دوسری بار پر ہی پھسل جاتا۔

وہ اپنے دراز قد اور متناسب جسم کے باعث مردانہ وجاہت کا نمونہ لگ رہا تھا۔ گورے چٹے

شرجیل کو آخری بار اس سے بڑے راحیل کی شادی میں دیکھا تھا۔ تقریباً پانچ سال پہلے جب افراسیاب پڑھنے کے لیے بیرونِ ملک گیا تھا۔ اسے یاد تھا۔ دادی نے ننھیال جانے کے لیے بڑی مشکل سے اجازت دی تھی۔ والدین کی وفات کے بعد تنو کے ننھیال میں چکر سالوں بعد ہی لگتے۔

"تانیہ بی اے مکمل کرلیا تھا ناں؟"

شرجیل نے صوفے سے ٹیک لگاتے ہوئے اس سے پوچھا۔ اور تنو چونک اٹھی۔ اس کے سوال پر نہیں بلکہ اس کا پورا نام لینے پر۔ اماں، ابا اور ننھیال کی تانیہ کب تنو بنی خبر ہی نہیں ہوئی۔

"نہیں، میں پہلے سال انگلش میں رہ گئی تو نانی نے اگلے سال داخلہ ہی روک دیا۔" اس نے شرمندگی سے گردن جھکا کر کہا۔ اور شرجیل سرد آہ بھر کر رہ گیا۔

کچھ دیر تک وہ اپنے جوڑے کے پرانے ڈیزائن کو گھورتی رہی اور شرجیل گہری سوچ میں پڑ گیا۔

"اگر میں کسی اچھے سے کالج میں تمہارا داخلہ کرادوں تو؟" شرجیل نے بات کے اختتام پر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے حیرت سے اس کا منہ تک رہی تھی۔ غالباً آج تک کسی نے اس کو فیصلے کا اختیار نہیں سونپا تھا۔ کہنیوں کو گھٹنوں پر ٹیکے وہ عجیب گومگو کی کیفیت میں بیٹھی رہ گئی۔

موسم کی خنکی نے رگوں میں کپکپی سی دوڑا دی تھی۔

تنو نے اپنے ہاتھ جلدی سے شال کے اندر کر لیے اور بڑی توجہ سے اپنے اس وجیہہ کزن کو دیکھا جس کی آنکھوں کے گوشوں سے اس وقت ایک نرم سی روشنی جھانک رہی تھی۔ باہر بجلی کی ہلکی سی کڑک سنائی دیتی تو کمبل میں اونگھتی نانی ہڑبڑا جاتیں۔

☆☆☆

تنو نے اپنے ... وقت گزارا۔ مگر جب کافی دیر تک باورچی خانے سے اس کے نام کی پکار نہیں مچی تو اسے گھر والوں کی مہربانی نئے سرے سے یاد آئی۔ رات بھی مہمانوں کی بدولت اسے باورچی خانے سے چھٹی مل گئی تھی۔ وہ پلنگ پر بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگی۔

نیند کی ابتدا بڑی لطیف تھی مگر جب آوازوں نے شور کی شکل اختیار کی تو وہ جھٹ اٹھ بیٹھی۔

''میں کہوں، یہ تنو کی ماں کیوں میرے خواب میں رو رو کر ہلکان ہوئے جا رہی تھی۔ یہ کیسی بے انصافی کر دی بہن! آپ نے میری تانیہ کے ساتھ۔''

بات جب تنو کے پلے پڑی تو وہ دادی کے کمرے کی طرف سرپٹ دوڑی۔

''یقیناً بلڈ پریشر ہائی ہو گیا ہوگا۔''

رات کو کھانا کھاتے وقت شرجیل نے دو بار ڈانٹ کر انہیں کہا تھا کہ ''نانی قورمے میں مسالے ذرا زیادہ ہیں۔ بلڈ پریشر کی مریضہ ہیں۔ ہاتھ روک کر کھائیے گا۔''

مگر نانی کو تو سردی چڑھی تھی۔ قورمے کی ساری پلیٹ منٹوں میں چٹ کر گئیں۔

تنو بھاگی بھاگی اندر آئی مگر باہر نکلتی چچی کے لبوں پر بکھرا تبسم بتا رہا تھا کہ وہ موجودہ حالات نانی کو بتا چکی ہیں۔

''بس بہن! شرمندہ ہوں۔ سوچا تھا کہ یتیم پوتی ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے رہے گی تو میری آنکھیں ٹھنڈی رہیں گی۔ مگر کیا خبر تھی کہ پوتا ولایت سے گوری بیاہ لائے گا۔'' دادی پھپھک پھپھک کر رو دیں اور تنو کی رہی سہی امید بھی اس لمحے دم توڑ گئی۔

''بس کر دیں اماں! نکاح تھوڑی تھا۔'' بڑی تائی نے پہلو بدلا۔ بیٹا بنا بتائے میم بیاہ لایا۔ ہاتھ تو ان کے بھی کلیجے پر پڑا تھا مگر اب سب کے سامنے بیٹے کی بے عزتی بھی منظور نہیں تھی۔

''بھلے وقتوں میں بزرگوں کی بات نکاح کی ... بھی جاتی تھی۔'' تائی نے لقمہ دیا۔

''اور نہیں تو کیا۔'' دادی کہہ اٹھیں۔ تائی نے یوں چارپائی پر پہلو بدلا، جیسے نیچے کسی نے انگاروں بھرا تھال رکھ دیا ہو۔

''پوتا تو آپ بھی ماشاء اللہ ساتھ لیے پھر رہی ہیں۔ ہمارا افراسیاب نہ سہی آپ کا شرجیل سہی۔'' تائی کہہ کر تیزی سے کمرے کا دروازہ پار کر گئیں۔

ان کی بات سن کر نانی چپ کی چپ بیٹھی رہ گئیں۔ شرجیل کی نظر بے اختیار تنو کی طرف اٹھی۔ وہ بھی اسی کو دیکھ رہی تھی۔ شرجیل کی نظریں جھک گئیں اور تنو کا جسم ہولے ہولے کپکپانے لگا۔

جب کراچی سے چلے تھے اچھا خاصا خوشگوار موسم تھا ان کے ہاں تو ابھی تک اے سی ہی چل رہے تھے مگر لاہور آ کر پتا چلا یہاں تو سردی کو آئے کئی دن ہو چکے ہیں۔

نانی سب سے مل کر آئیں تو کمرے میں کھڑا شرجیل چھینکوں پر چھینکیں مار رہا تھا۔ ناک کی نوک بے تحاشا سرخ ہو رہی تھی۔ وہ بار بار ٹھٹھراتے ہوئے ہاتھوں کو بغلوں میں داب لیتا۔ سادہ سی شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ گرم چادر یا جیکٹ تک ساتھ نہیں لایا تھا۔ نانی تنو سے ملنے کے لیے آگے بڑھیں تو ٹھٹک گئیں۔ وہ بڑی سی پیٹی میں سر دیے کچھ تلاش کر رہی تھی۔

مہمان باہر نکلے تو باورچی خانے کی کھڑکی کے پار کھڑی چنو اور اس کی ماں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ شرجیل تنو کے ہاتھ کا بنا وہی سیاہ سویٹر پہنے بڑا ہنس ہنس کر تنو سے باتیں کر رہا تھا۔

کمرے سے نکلتی چچی نے بھی یہ منظر حیرت سے دیکھا۔ سویٹر شرجیل کے متناسب جسم پر فٹ آیا تھا اور سفید رنگت کی بدولت جچ بھی رہا تھا۔

جانچ لیتی ہیں محبت کی نگاہیں پل میں
ماپ لے کر تو سویٹر نہیں بنے جاتے جاناں

طوقِ عشق

https://reading.suretolan.net

مکمل ناول

عزیزہ......آمنہ......اور جنت

شہر کی تین خوب صورت اور امیر طوائفیں ایک درویش کے وعظ و نصیحت سے تائب ہو جاتی ہیں۔ وہ قحبہ خانہ چھوڑ کر درویش کے گھر رہنے لگتی ہیں۔ وہاں وہ چکی پیس کر گزارہ کرتی ہیں۔ ان کے دل میں حج کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔

حج کاروان کا امیر ابن موسیٰ اپنی دیانت اور بہادری کے لیے مشہور ہے اسے بہترین امیر الحج مانا جاتا ہے۔ اس کی مقبولیت نے اس کے کئی دشمن بھی پیدا کر دیے ہیں۔

درویش امیر الحج ابن موسیٰ سے ملتا ہے۔ درویش اسے بتاتا کہ تین طوائفیں حج کاروان کے ساتھ جانا چاہتی ہیں۔ ابن موسیٰ انکار کر دیتا ہے لیکن بچوں کے کھیل میں اسے ادراک ہوتا ہے کہ اللہ کے لیے جانے والوں کو روکنا غلط ہے۔ وہ ان تینوں کو حج کاروان میں شامل کر لیتا ہے۔

راستے میں ان تینوں کو ایک مسجد کی کھوہ سے کچھ تحفے ملتے ہیں۔ یہ حاجیوں نے آنے والے لوگوں کے لیے رکھے ہیں۔ جنت کے حصے میں ایک سیاہ رنگ کا پارچہ آتا ہے جس پر فارسی میں کوئی عبارت لکھی ہے۔

ابن منصور امیر الحج ابن موسیٰ سے حسد کرتا ہے۔ وہ اس کو عہدے سے ہٹا کر امیر الحج بننا چاہتا ہے۔ لیکن اسے اب تک کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ اسے پتا چل جاتا ہے کہ ابن موسیٰ نے جن تین عورتوں کو حج کاروان میں شامل کیا ہے۔ وہ طوائفیں ہیں۔ ابن منصور ان تینوں کو ذلیل کرتا ہے اور کہتا ہے کہ حج قافلے کے ساتھ طوائفیں جا رہی ہیں۔ ہم پر اللہ کا قہر نازل ہوگا۔ ہم صحرا میں تباہ و برباد ہوں گے۔

وہ امیر الحج سے کہتا ہے تم اس عہدے کے لائق نہیں ہو یہ تمہارا آخری کاروان ہے جس کے تم امیر ہو۔

حج کاروان کا سفر جاری ہے۔ وہ تینوں خود کو خوش قسمت سمجھ رہی ہیں۔ لیکن یہ نہیں جانتیں کہ اگلی رات کیا ہونے والا ہے۔

دوسری اور آخری قسط

دراصل سفر کی طرف مائل کرتی ہے۔ اللہ نے سفر کو پسند کیا ہے۔ جو گھر سے باہر نہیں نکلے گا، وہ اللہ کی حمد کیسے بیان کرے گا۔ وہ دریا، سمندر، صحرا، جنگل، پہاڑ..... عالم جہاں..... کیسے دیکھے گا؟ وہ کیسے جانے گا کہ اس کے رب نے کیا کچھ تخلیق کیا ہے۔ ہر شے کیسے اس کی صفات کی مظہر ہے۔ جب ''جہاں'' ہی نہیں دیکھے گا تو ''خالق جہاں'' کیسے دیکھے گا۔ عالم کا علم نہیں رکھے گا تو ''رب عالمین'' کو کیسے پہچانے گا۔

اللہ چاہتا ہے کہ اس کی مخلوق سے ملا جائے، اسے دیکھا، سنا اور جانا جائے۔ ہر انسان کے پاس رب کی ایک صفت ہے..... ایک رب..... جسے صرف اس نے تلاش کیا ہے، اس تلاش میں حصہ دار بنا جائے۔ اس کے پاس اپنی ایک کہانی ہے، جو کسی دوسرے کی نہیں ہے، اس کی وہ کہانی سنی جائے۔

جب اللہ نے سب سے زیادہ محبت، انسان سے کی ہے، تو پھر انسان کو بھی سب سے زیادہ محبت انسان سے ہی کرنی ہے۔ انسان کا سفر کبھی ختم نہیں ہوتا اور اللہ چاہتا ہے کہ انسان سفر میں رہے۔ بچپن، جوانی، بڑھاپا..... روح، زندگی، موت، بعد موت..... وہ گھر سے نکل کر زمین کا ہو یا، عقل سے آگے علم و شعور اور روح کی بیداری کا۔

حج کا سفر..... ہر صاحب حیثیت پر فرض..... صاحب چاہت، صاحب عقل پر..... اللہ کی پہچان کا سفر..... مقصود کے لیے ہر راہ کا سفر.....

عزیزہ..... اس کا جی یہ منظر دیکھ دیکھ کر بھرتا نہیں تھا کہ صحرا سجدہ گاہ (جائے نماز) ہے، جس پر وہ سب مسافر حج کی نماز پڑھ رہے تھے۔ زمین ان کی سواری تھی، جس پر رینگ کر، چل کر، دوڑ کر، بھاگ کر وہ مرکز کی سمت جا رہے تھے۔ کاروان کے ساتھ، اونٹوں پر سوار..... اونٹ..... جو کبھی اپنے سوار کو گرنے نہیں دیتا اور اس کے لیے بڑے احترام سے بیٹھتا ہے۔

دن کے پڑاؤ میں عزیزہ نے امیر کاروان کو ابن منصور کی بات بتانا چاہی تھی لیکن آمنہ نے اسے منع کر دیا۔

''چھوڑ دو عزیزہ! امیر کاروان پر اتنے بڑے کاروان کی ذمہ داری ہے، ہمارا کیا ہے، آجائے ساری دنیا اور مار لے سو جوتے۔ حج کے لیے جا رہے ہیں نا، تو پہلے اپنے ماضی کی کنکریاں کھا لیتے ہیں۔ مار لینے دو لوگوں کو گناہوں کے پتھریلے طعنے۔ اللہ کے گھر تو سب برابر ہو جاتے ہیں نا..... ہم حاجی ہی کہلائیں گے..... دیکھ لینا.....''

''درویش نے کہا تھا کہ وہم نہ کرنا لیکن عزیزہ! کیا ہماری وجہ سے کاروان پر کوئی مصیبت آسکتی ہے؟'' اب جنت کو بھی وہم ستانے لگے تھے۔ ابن منصور نے انہیں سمجھا دیا تھا۔

''دل تو میرا بھی ڈرتا ہے، لیکن مجھے درویش کی بات پر یقین ہے کہ اللہ کے رحم پر شک نہ کیا جائے، بلکہ یقین رکھا جائے۔ ہمیں یہ بھول جانا چاہیے کہ ہم کون تھیں، بس یہ یاد رکھنا ہے کہ ہم کون ہیں۔ اب جاؤ، تمہیں تمہاری ہونے والی ساس آواز دے رہی ہے.....''

وہ پانی کے لیے جنت کو آواز دے رہی تھیں اور بہری جنت کے بجائے کان والی عزیزہ نے سن لیا تھا۔

''توبہ توبہ! ایسی باتیں تو نہ کرو۔ شرم کرو.....'' جاتے جاتے جنت نے شرما کر کہا۔

''شرم میں کر لوں گی، تم دعا کرو کہ ایسا ہو جائے۔ اپنی ساس کے دل پر پڑھ پڑھ کر پھونکا کرو، دل بدل جائے گا ان کا۔''

''اف عزیزہ! انہیں خواہ مخواہ میری ساس بنا دیا ہے۔'' جنت کے گال گلابی ہو چکے تھے اور کہتی تھی۔ اف، اف۔

''کتنی بار تو کہہ چکی ہیں کہ حج سے واپسی پر بیٹے کا نکاح کرنا ہے، کہتی بھی ہم دونوں سے ہیں۔ ہم اندھے یا پاگل تو نہیں..... سب سمجھتے

https://reading.urdufanz.net

"......

سب سمجھ کر وہ سب کچھ بھلا چکی تھیں، اپنا
ی، اپنا لقب۔

امیر انج، کاروان میں حاجیوں کی خبر گیری کر
ہے تھے۔ کچھ لوگ بیمار ہو چکے تھے، انہیں کچھ عام
مشورے عنایت کیے جا رہے تھے۔ لیکن چونکہ وہ
یب نہیں تھے، امیر تھا، اور اسے بیماروں کا علاج
رنا نہیں آتا تھا۔ یا دعا آتی تھی یا مزاج پرسی تو وہ
ڑا خائف ہوتا جا رہا تھا۔ بیماروں کو لگتا تھا کہ وہ ہر
ی مولا ہے، تلوار رکھتا ہے تو دوا بھی رکھتا ہوگا۔

وہ معصوم یہ نہیں جانتے تھے کہ تلوار رکھنے والا
ار" رکھتا ہے یا "دفاع"...... ورنہ للکار...... دوا کا
ں کیا کام...... وہ اس سے سفر کے دوران لاحق
نے والی عمومی بیماریوں کا علاج پوچھ رہے تھے۔
ص طور پر پیٹ میں گڑبڑ اور سر چکرانے کی
ریوں کے بارے میں......

"میں امیر ہوں...... طبیب نہیں......" وہ چڑ
گیا۔ وہ کوئی خاتون ٹوٹکہ تھا، وہ تو محترم ابن موسیٰ

"امیر تو باپ کی طرح ہوتا ہے، شفیق اور
یان......"

ابھی وہ خود باپ بنا نہیں تھا کہ اتنے بڑے
روان کا باپ بن گیا تھا۔ چچی ٹھیک کہتی ہیں، نکاح
لو ورنہ دنیا ایسی ایسی زبان میں طعنے مارے گی کہ
ز چھلنی کر دے گی...... کر دیا تھا ناں چھلنی...... سینہ،
د، پیر...... سب......

"امیر تک تو ٹھیک ہے، لیکن باپ؟ یہ کیا ہوتا
......" وہ پیٹ کے عارضے میں مبتلا بیمار پر غصہ
بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

"بہت سارے بچے ہوتے ہیں نا ان کا والد
زم ہوتا......" جو اونٹ بان اسے نکاح کا مشورہ
ے چکا تھا، اب وہ دانت نکال کر اس کی معلومات
ں اضافہ کر رہا تھا۔

"تمہارا نکاح ہو چکا ہے......؟"

یہ اونٹ بان ہر طنز پر جواب دینے کے لیے اس کی پشت کے پیچھے ہی موجود ہوتا تھا۔ جان کے دشمن ہمیشہ آگے پیچھے ہی موجود رہتے ہیں، ساری طنزیہ باتیں سب سے پہلے یہی سنتے ہیں...... دشمنوں میں شریک...... جی جان جلاتے فریق...... بدتمیز، بدتہذیب۔

"ہاں جی! اسی لیے تو میں کسی کو آزاد، خودمختار، خوش حال نہیں دیکھ سکتا۔ امیر! آپ بھی یہ شکنجہ اپنی زندگی کے گرد کس لیں، یقین جانیں، صبر و ضبط کے ایسے ایسے مرحلوں سے گزریں گے کہ مر جانا چاہیں گے یا مار دینا...... لیکن ہوگا تیسرا کام "مار دیے جائیں گے۔""

وہ بے ساختہ ہنس دیا۔ "تو یوں کہو، مجھے خوش باش دیکھ کر جل جاتے ہو۔"

"اپنا دل جلا ہوا ہو تو جی چاہتا ہے سب ایسے ہی جلے بھنے رہیں۔"

"کیسی عورتوں جیسی باتیں کر رہے ہو۔" اس نے قہقہہ لگایا۔

"عورت سے ہی سیکھی ہیں...... زوجہ سے۔" اس کے دانت پھر باہر آئے تھے۔

عورتانہ اونٹ بان کی ٹھوڑی کو اپنی چار انگلیوں سے مسل کر، رگڑ کر وہ آگے بڑھ گیا۔

کاروان میں گھومتے پھرتے اس نے ان تینوں کو ایک اونٹ (بے چارے) سے باتیں کرتے ہوئے دیکھا۔ عزیزہ نے اونٹ (آہ...... معصوم) کی مہار پکڑی ہوئی تھی اور وہ اسے بڑی محبت سے ہولے ہولے جھٹک کر کرا اپنے سوالوں کی طرف متوجہ کر رہی تھی۔ یعنی وہ اس سے کچھ قصے کہانیاں سننا چاہتی تھی۔ یعنی کیا اسے اونٹ کی زبان آتی تھی؟ یعنی کیا اونٹ کو اس کی زبان سمجھ میں آتی تھی...... یعنی کیا...... اسے اونٹ سے ہی قصے کہانیاں سنی تھیں۔ انسان مر گئے تھے کیا؟

دو میں سے ایک "یا اللہ مجھے ان سے بچالے" کی صورت بنے اونٹ کو پتا نہیں کیا کھلانے کی کوشش

کر رہی تھی۔

دوسری اس کا منہ کھولنے کی تگ و دو کر رہی تھی۔ وہ نہیں کھول رہا تھا تو جھلا کر کہہ رہی تھی "یہ تو منہ ہی نہیں کھول رہا۔"

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ نیچے سے اپنی لمبی ٹانگ چھوڑ دیتا، جوان میں سے کسی ایک کو تو جا کر لگتی، اور پھر وہ ان سے پوچھتا۔ "میری جان چھوڑو گی یا یہ جہاں؟"

"یہ جہاں..... پر تم پر سوار ہو کر....." عزیزہ کہتی..... یقیناً یہی کہتی۔

"کارواں والے جسمانی بیمار ہیں اور یہ تینوں ذہنی۔" امیر کاروان نے زیرلب کہا۔ یقین سے کہا۔

ذہنی بیماروں میں سے ایک بیمار "عزیزہ" تک اس کے تندرست ذہن کی سوچ پہنچی تھی۔ اس نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ اونٹ کی مہار پکڑے پکڑے دیکھا۔ ہوا کچھ تیز تھی، اور اس کی چادر، اس کا لباس پیچھے کی طرف کھنچا اڑا جاتا تھا۔

امیر کارواں..... وہ ایک لمحے کے لیے بھول گیا تھا کہ وہ کہاں کھڑا ہے۔ عزیزہ نے چادر واپس کھینچ کر اونٹ کے ساتھ اونٹوں والی باتیں کرنی شروع کر دی تھیں۔ وہ باتیں جو اونٹ واقعی میں سمجھ لیتا تو رک کر عزیزہ سے کہتا،

"یہ کیا ہانک رہی ہیں آپ؟ مجھے صرف جانور ہی سمجھا جائے، اپنی طرح کا پاگل نہیں۔"

"پاگل عزیزہ....." امیر کاروان آگے بڑھ گیا تو اس نے وزدیدہ نظروں سے ابن موسیٰ کو دیکھا۔

انسان کے پاس دعا میں بہت کچھ مانگ لینے کا اختیار ہوتا ہے۔ بہت کچھ جائز..... بہت کچھ ضروری۔ معاملہ اللہ کے ساتھ ہو تو کوئی بھی معاملہ طے پا سکتا ہے۔ تو کیا وہ زندگی کے کاروان کے امیر سے، حج کے کاروان کے امیر کی بات کرے؟ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ اونٹ کی مہار کو اپنی ہتھیلی سے رگڑ رہی تھی۔ اب اونٹ سے اونٹنی باتیں کرنا بھول گئی تھی۔

"تمہیں کیوں ایک دم سے چپ لگ گئی ہے؟ اونٹ نے تمہیں بدصورت تو نہیں کہہ دیا۔ چلو مان جاؤ اب کہ تم بدشکل ہی ہو۔"

آمنہ کوئی موقع ہاتھ سے جانے دیتی، ایسا ہو سکتا تھا اگر وہ دیوانی ہو جاتی یا اندھی بہری۔

"فی الحال تو مجھے اونٹ کی زبان سمجھ میں نہیں آ رہی، جسے سمجھ میں آ رہی ہے وہ قیامت خیز جلن کا اظہار کر رہی ہے۔" ادا سے آنکھیں گھمائیں۔ وہ خوش تھی۔ وہ چہک سکتی تھی۔

"اب انسان سچ بھی نہ بولے۔ سچ تو ویسے یہ اونٹ بھی بولتا ہے، مجھے بتا رہا تھا کہ جب تم اس پر بیٹھتی ہو تو اس کا جی چاہتا ہے کہ تمہیں پٹخ کر نیچے دے مارے۔ باقی کی ہڈیاں بے شک سلامت رہیں لیکن ایک گردن کی ہڈی ٹوٹ جائے بس۔"

"تمہیں دے کر مارا تو تھا دو بار۔ ایسا درویش اونٹ تک تم سے عاجز آ گیا تھا۔"

"وہ میں پھسل گئی تھی۔" یادداشت آمنہ کی بھی کمال کی تھی۔

"پورے کاروان میں تم اکیلی لڑکی ہو جو اونٹ سے پھسل جاتی ہے، تمہاری قابلیت ہمیشہ سے ہی قابل تعریف رہی ہے۔"

"منہ بند رکھو اپنا! میں کاروان حج میں شامل ہوں، اللہ کے گھر جا رہی ہوں، تمہاری وہاں شکایت کر دی نا..... تو پھر نہ کہنا۔"

"اچھا اچھا! یعنی تم اکیلی جا رہی ہو، شکایتیں صرف تمہاری سنی جائیں گی، میرے منہ میں تو زبان ہی نہیں ہو گی۔"

"تمہارے منہ میں ایک نہیں کئی زبانیں ہیں اور خیر سے کوئی ایک بھی اچھی نہیں ہے، مجھ سے اچھی اچھی باتیں سیکھ لو۔"

"تمہیں میں اچھی طرح سے سبق نہ سکھا دوں۔ یہی کوئی تین چار۔" وہ آمنہ کے بال پکڑ کر کھینچ رہی تھی۔

بہت دور..... بہت آگے۔ امیر کاروان نے یہ

زیادہ ہی ہے۔ اگر جائز ہوتا تو شاید وہ بھی امیر کاروان بن جاتی۔ عالم اسلام کی پہلی ''خاتون امیر کاروان''۔

خاتون امیر کاروان نے آمنہ کے بال نہیں چھوڑے تھے۔ آمنہ دبی دبی چیخیں مار رہی تھی۔ کچھ عورتیں انہیں دیکھ کر ہنس رہی تھیں۔

''تم میری جان کی دشمن ہو۔'' آمنہ چلا رہی تھی۔

''تمہاری زبان کی دشمن ہوں میں۔ کسی وقت سو رہی ہوگی تو کاٹ دوں گی یہ زبان۔''

''میں تمہاری یہ چوٹیاں کاٹ دوں گی، دیکھنا گنجا کر دوں گی۔ بچے دیکھ کر ہنسیں گے تمہیں۔ ہی ہی......''

کاروان والے دیکھ کر ہنس رہے تھے...... ہی ہی...... آمنہ باز ہی نہیں آرہی تھی۔ عزیزہ کو اپنے بال بہت عزیز تھے نا، بالوں پر آنچ آتی تھی، تو بھڑک اٹھتی تھی۔ اب بھی وہ بھڑک اٹھی تھی اور اونٹ بان کے ہاتھ میں لہراتی شاخ کو کھینچ کر آمنہ کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ بھاگ بھاگ کر آمنہ نے ریت پر طوفان برپا کر دیا تھا۔

''تمہاری بہنیں پاگل ہو چکی ہیں۔'' جنت کی ہونے والی ساس نے شرارت سے کہا۔

''ہو چکی ہیں...... مطلب؟ یہ پاگل ہی ہیں۔ میرا حوصلہ ہے جو ان کے ساتھ گزارا کرتی رہی ہوں۔'' آہ بھر کر کہا۔

ساس صاحبہ دل کھول کر ہنسیں۔ ''ایک سے بڑھ کر ایک ہو سب۔ جاؤ، تم بھی ان کے ساتھ تھوڑا پاگل ہو جاؤ۔''

دو پاگلوں کے قافلے میں تیسری پاگل بھی شامل ہو گئی۔ اس نے اپنی مٹھیوں میں ریت بھر لی تھی اور بڑی شرافت سے جا کر عزیزہ کی آنکھوں میں جھونک کر، آمنہ کے منہ کی طرف اچھال دی تھی۔ دور بیٹھے اونٹ بان ہنس رہے تھے۔ عزیزہ ویسے تو کافی آنکھوں میں اور وہ اندھی ہی ہو گئی۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی بھلا۔

وہ چلاتی ہوئی، آنکھیں مسلتی ہوئی، جنت کا خون پی جانے کے درپے ہو گئی۔ جنت اس سے دور بھاگتی رہی۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی بھلا۔

امیر کاروان جن کی خبر گیری کر رہا تھا، ان کی خبر لینا بھول گیا، واللہ اور ان بیماروں کی خبر گیری کرنے واپس پیچھے آیا، جن کے آس پاس بھاگی پھرتی عزیزہ، اپنی آنکھوں کے دشمن کو ڈھونڈ رہی تھی۔ ویسے تو امیر کاروان پہلے چڑ گیا تھا لیکن اب انہیں اسے ایک دم سے پیٹ کی خرابی کا ایک ٹوٹکا یاد آ گیا تھا۔ وہ اس ٹوٹکے کو اپنے دل میں دبا کر، واپس بیمار کے پاس آیا۔ بیمار بے چارا اپنی کہانی پھر سے سنانے لگا، وہ سمجھا امیر نسخہ شفاء لائے ہیں...... ہائے بے چارا......

امیر بے چارے کھڑا وہ بیمار کے پاس تھا۔ لیکن دیکھ وہ...... دیکھ وہ......

''کیا آپ بیمار کی طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کریں گے امیر؟''

یہ بات کس نے کہی ہو گی بھلا؟ بالکل! اسی اونٹ بان نے جو ایسے ہر موقعے پر امیر کے آس پاس موجود، رہ کر امیر کا دل غریب کیا کرتا ہے۔ ہر تیر زہر بجھا...... ہر تیر نشانے پر......

''تم نے ارادہ باندھ لیا ہے کہ میرے ہاتھوں ہی قتل ہو گے؟'' امیر نے اب اس کی گردن پر ہاتھ رکھ ہی دیے تھے۔

''قتل نہیں...... فوت...... امیر! جب انسان دل سے جاتا ہے، تو وہ فوت ہو جاتا ہے۔ بے چارا آپ کا دل! کہاں قبر بنوائیں گے اس کی؟ صحرا میں یا......''

''تمہارے سر میں...... کٹے ہوئے سر میں۔'' امیر نے دانت پیس کر کہا۔

''نکاح کے دو بولوں میں بنوا لیں۔ فوت شدہ دل کو، ''قبول ہے'' میں دفنا دیں۔''

امیر کاروان کا دل..... امیر کاروان کا دل.....

☆☆☆

اس دن کی رات..... کاروان کے ساتھ ان کی آخری رات..... وہ رات رحم دلی سے بے رحمی کے طوفان میں سمٹی تھی۔ ان کے کاروان پر بدوؤں کا حملہ ہو چکا تھا۔ خاموش کاروان میں ایسی دہائی مچی تھی جیسے دیکھتے ہی دیکھتے، تند ہوائیں وبال مچاتی، گرج کر آسمان کو کڑکتی بجلیوں کے جال میں بدل دیتی ہیں۔ سب تہس نہس کر دیتی ہیں۔ یہ حملہ ایسے وارد ہوا تھا، جیسے جنگ و جدل کے میدان میں موت وارد ہوتی ہے۔ آخری ہچکی لینے کا موقع بھی نہیں ملتا۔ سر کٹتا ہے اور دھڑ الگ رہ جاتا ہے۔

کاروان سے آگے..... بہت آگے۔ ابن موسیٰ کا تیار کیا محافظوں کا دستہ سفر کر رہا تھا، یہ ان سے ایک دن کے فاصلے سے سفر کر رہے تھے۔ کسی گڑبڑ کی صورت میں، وہ ابن موسیٰ کو خبردار کر سکتے تھے۔ کاروان سے مختلف سمتوں میں سفر کرنے والے جاسوس بھی چوکنا تھے۔ وہ جانتے تھے کب، کہاں کیسے خبردار کرنا ہے۔ آتش گیر مواد آسمان کی سمت بلند کرنا تھا اور پیغام پہنچ جانا تھا۔ دن کے پیام رساں پرندے تھے..... لیکن نہ آسمان چمکا، نہ پرندہ آیا۔ نہ ہوا تھمی، نہ ریت مچلی..... ان کا کاروان چلتا رہا، لٹا تو رک گیا۔

بدوؤں کا حملہ ایسے ہوا تھا جیسے وہ کاروان کے راستے کو جانتے تھے، اور ریت کے سمندر میں غار بنا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ اتنا بڑا کارواں لوٹ رہے تھے، تاریخ پر کچھ حق ان کا بھی بنتا تھا۔ صحرا ان کا تھا۔ صحرا سے باہر والوں سے تاوان جائز تھا۔ کاروان کے راہنما ستارے تھے، لیکن بدوؤں کو کئی اور راہنما بھی میسر تھے۔

دفاع پست نہیں کیا گیا تھا، کچل دیا گیا تھا۔ بدو، کاروان سے مال سمیٹ رہے تھے۔ زخمی امیر منہ کے بل ریت میں گرا تھا، اس کی پشت کو دیو قامت

تھا۔ اسے ایک پرانا حساب بھی تو یاد آیا تھا۔

کاروان کو بدوؤں کے حملے نے اتنا حواس باختہ نہیں کیا تھا جتنا ابن منصور کی تقریر نے کر دیا تھا۔ گرم ہوائیں اپنی موجوگی کا پتا جلدی دیتی ہیں۔ کاروان کے حاجیوں کے دلوں کی گرمی نے، صحرا کی گرمی کو مات دے دی تھی۔

لٹے پٹے مسافر کچھ بے رحم ہو جاتے ہیں۔ لٹے پٹے لوگ، وہ تھوڑے سے ظالم ہو جاتے ہیں۔ ان کے کشادہ دل ایک دم سے سکڑ گئے۔

امیر کاروان نے ان کے ساتھ یہ کیا کیا؟ اس نے ایسی گستاخی کیوں کی؟ ایسا گناہ..... ایسی بے حرمتی..... امیر کاروان کو اللہ پوچھے، اس نے دین پر صرف اپنا حق کیسے سمجھا؟ بھیس بدل بدل کر اب یہ طوائفیں دین کی بے حرمتی کریں گی۔ اب مذہب کے ساتھ ایسے مذاق کیے جائیں گے۔ فجیہ خانے کے لوگ، اب کاروان حج میں شامل ہوں گے۔ ان کے ساتھ باجماعت نمازیں پڑھیں گے۔ ان کے ساتھ سفر کریں گے اور ان کے برابر کے "حاجی" کہلائیں گے..... غلاف کعبہ کو ہاتھ لگا کر، اپنی ناپاک نظروں سے، رب کے گھر کو دیکھیں گے، طواف کریں گے اور ان کے ساتھ کہیں گے۔ لبیک..... لبیک..... اے رب لبیک.....

"لبیک....." صحرا نے سرگوشی کی، جسے عزیزہ نے سن لیا اور اس نے جھرجھری لی۔

"یہ ان کی نحوست کی وجہ سے ہوا ہے، اگر انہیں جگہ نہ دی جاتی تو..... اللہ نے ہم پر عذاب بھیجا ہے، اس کے گھر کا غلاف لے جاتے ہوئے۔ ہم ایسا کیسے کر سکتے ہیں۔"

کہتے کہتے ابن منصور بلند آواز سے رونے لگا۔ وہ ہچکیاں لینے لگا تھا۔

"کون طوائفیں....."

سردار بدو نے ابن منصور سے بڑے پیار سے پوچھا۔

اختتام تک نہیں پہنچی تھی۔ وہ نہ سہی تو کوئی اور ہی سہی۔ اس نے اس پر ٹھنڈا مشروب الٹ دیا تھا اور اپنے پاؤں کی ایڑی مارتے ہوئے کہا تھا۔

"میں طوائف ضرور ہوں، لیکن بے غیرت نہیں، اپنے سکے اٹھاؤ اور دفع ہو جاؤ۔ طوائفیں اتنی بھی گری ہوئی نہیں جتنا تم نے انہیں سمجھ لیا ہے۔"

ابن موسیٰ نے دانت پیس کر ابن منصور سے کہا۔ "تم یقیناً ذلیل و رسوا ہونے والے ہو، بزدل انسان! کچھ اللہ کا خوف کرو۔"

"یہ اللہ کا خوف بعد میں کر لے گا۔ پہلے تم کاروان سے طوائفیں الگ کرو۔"

"کاروان میں سب حاجی ہیں۔" ابن موسیٰ بری طرح سے زخمی تھا، لیکن یہ وہ وار تھا جو اس کے دل پر پڑا تھا۔

"حاجیوں میں سے طوائفوں کو الگ کرو۔" اس نے چلا کر کہا۔

"اپنی زبان سنبھال کر۔"

"میری تلوار کے نیچے تمہاری شہ رگ ہے اور مجھے زبان سنبھالنے کے لیے کہہ رہے ہو، تمہاری ہمت کی داد دینی پڑے گی۔"

"اپنی بے دینی کو داد دو، حاجیوں کو لوٹ رہے ہو۔" اس کے سر پر کھڑے بدو کا وزنی پیر اس کی گردن پر وزنی دھکے سے پڑا تھا۔

"کیا تمہیں کسی نے بتایا نہیں کہ چور اور ڈاکو بے دین ہوتے ہیں۔ چلو تمہیں بتا دیتا ہوں کہ میں اکیلا ہی بے دین نہیں ہوں، سارے بے دین تم اپنے ساتھ مصر سے لے کر چلے ہو۔ ستاروں نے جو راستہ تمہیں دکھانے میں دیر کر دی، وہ ان بے دینوں نے مجھے دکھانے میں دیر نہیں کی۔ چور کے ہاتھ کی کھجلی چلی جاتی ہے، ان جیسوں کے دل کی جلن نہیں جاتی۔ تم بچے ہو، ڈاکوؤں سے زیادہ انسان شناس نہیں ہو سکتے۔ جاؤ یہ سبق تمہیں سکھایا، امیر کاروان بنتے ہیں تو صحرا کے ڈاکوؤں سے لڑنے سے پہلے،

سانپوں سے...... میرے دفاع میں ڈٹ کر کھڑا ہونے سے پہلے تمہیں ان کے سر کچلنے تھے...... تم نے دیر کر دی امیر...... تم نے کاروان لٹوا دیا......"

"کیا فائدہ ایسی انسان شناسی کا! گر انسان نے شیطان صفت ہی بننا ہو۔"

ابن موسیٰ کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ وہ کن سانپوں کی بات کر رہا ہے۔ نیک فطرت انسان کا ایک ہی مسئلہ ہوتا ہے، وہ سب کو اپنی طرح کا سمجھتا ہے اور تب ہی پیٹھ پر وار کھاتا ہے۔

اس نے قہقہہ لگایا۔ "حاجیوں کو لوٹنے کا ایک یہ فائدہ ہوتا ہے، سننے کے لیے بہت کچھ مل جاتا ہے، طبیعت باغ باغ ہو جاتی ہے۔"

"حاجیوں کی بددعائیں تمہارے لیے آگ کا انتظام کرتی ہوں گی۔"

"آگ سے کھیلنے والوں کو آگ سے ڈرا رہے ہو، نادان ہو۔ ہم نے دودھ کے دانت کھیل کود میں نہیں توڑے۔ بچپن ماؤں کی گودوں میں چھپ کر نہیں گزرا۔ کاروان سے طوائفیں الگ ہوں گی یا میرے دار سے ایک ایک حاجی کا سر۔ کیا چاہتے ہو؟ صحرا کی پیاس بجھانا؟ خون سے...... اتنے مہربان نہ بنو امیر!"

"تمہیں مال اسباب چاہیے تھا، لوٹ لیا۔" ابن موسیٰ نے حتی الامکان اسے طیش میں لانے سے باز رکھا۔ وہ اپنی زبان کو نرم کرنے پر مجبور ہو چکا تھا۔ وہ معاملات کو غیرت سے پرے لے جانے کا پابند ہو چکا تھا۔

"کچھ غیرت ہم میں بھی ہوتی ہے امیر! کچھ عہد ہمارے بھی ہوتے ہیں۔ قاہرہ کی طوائف کے ہاتھ کی ضرب سہی ہے، اس ضرب کا کچھ حساب ہمیں بھی چکا لینے دو۔ میں نہیں جانتا تھا کہ آج کا صحرا مجھے اتنا کچھ دے دینے والا ہے۔ وہ میرے سارے حساب بے باق کر دینے والا ہے۔ تم امیر کاروان ہو، میں امیر صحرا...... چلو ایک کو برتری لے جانے دیتے

وہ اسے بچوں کی طرح پچکار رہا تھا۔

"تمہارا امیر تمہاری گردنیں کٹوا دینے والا ہے۔ وہ طوائفوں کی گردنوں کے بدلے میں تمہیں قربان کرنے والا ہے۔"

ابن منصور عورتوں کی طرح کاروان والوں کی طرف ہاتھ اٹھا اٹھا کر دہائیاں دے رہا تھا۔ واویلا کر رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ایک ایک حاجی اچھی طرح سے یہ منظر دیکھ لے۔ اتنی اچھی طرح سے کہ اس کاروان کے نصیب میں سزائے موت آئے ورنہ عمر قید۔ مصر کی گلیوں میں اس کا نام خاک آلود ہو، عمر بھر کی کمائی عزت کا جنازہ، ذلت کی کمائی میں بدل جائے۔ سب سن لیں کہ یہ امیر کاروان ہے جس نے سب حاجیوں کو لوٹ کھایا۔ یہ وہ ہے جس نے مصر کو عالم اسلام میں شرمسار کروایا...... صرف امیر...... صرف امیر......

ابن موسیٰ ہکا بکا اس تماشا گر انسان کو دیکھ رہا تھا۔ درویش نے ٹھیک کہا تھا۔

"ابن موسیٰ تم نے اتنا نام نہیں کمایا جتنے دشمن کما لیے ہیں۔ مصر کے ایوانوں میں جتنا تمہارے نام کا ڈنکا بجتا ہے، اتنا ہی تمہارے نام کا سانپ دشمنوں کے دلوں پر لوٹتا ہے، چوکنا رہنا...... پیٹھ میں خنجر ہمیشہ قریبی لوگوں نے ہی گھونپے ہیں۔ کاروان کے ساتھ جا رہے ہو تو صحرا کی ہواؤں سے پہلے، جماعت کے بچھوؤں پر نظر رکھنا۔"

جماعت کا سردار بچھو...... امیر کارواں کے عہدے کے لیے تڑپتا ابن منصور...... کاروان میں بھاگا پھرتا، طوائف، طوائف کر رہا تھا۔

"نکلو باہر...... طوائفوں۔ دیکھو تمہاری وجہ سے ہم پر کیسی مصیبت آ پڑی ہے۔ تم نے جرأت بھی کیسے کی اس کاروان میں شامل ہونے کی۔ تمہارے گناہ، سارا کاروان لے ڈوبے۔ ذلیل، کم خصلت عورتوں۔ تمہاری جگہ قحبہ خانہ ہے، کاروان نہیں۔"

جنت کا اونٹ عزیزہ کے اونٹ سے کچھ دُور آگے تھا، اس نے سہم کر، سر گھما کر پیچھے عزیزہ کی طرف دیکھا۔ مشعلوں کی روشنی ناکافی نہیں تھی، آسمان بھی صاف تھا، چاند بھی روشن تھا۔ آگے بیٹھی عزیزہ نے جنت کی بے چین نظروں کو پالیا تھا۔ دل کی دھڑکن سے پہلے اس نے صحرا کی پکار سن لی تھی۔

لبیک...... لبیک...... وہ بہری نہیں تھی، جانتی تھی کہ اس کی حاضری آگئی ہے...... ان کی باری۔

صحرا میدان عرفات میں بدلا۔

آزمائش کے مزدلفہ میں قیام "وُقوف" ہوا۔

☆☆☆

ابن منصور انہیں ڈھونڈ رہا تھا۔ ایک ایک اونٹ کے پاس جارہا تھا، ایک ایک کو دیکھ رہا تھا۔ وہ پاگل ہو چکا تھا۔ عزیزہ نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسے کاروان حج میں، ہزاروں لوگوں کے سامنے...... درویش اونٹ پر سوار۔ خاموش صحرا اور کھلے آسمان کے نیچے۔ انہیں طوائف، طوائف پکارا جائے گا۔ حاجیوں کے کاروان میں، ان کا ماضی انہیں پتھروں کی طرح مارا جائے گا۔

طوائف...... طوائف......

انہیں نام سے نہیں "گناہ" سے پکارا جائے گا۔ انہیں انسان نہیں صرف "طوائف" سمجھا جائے گا۔

"جو عہد کیے ہیں، ان پر قائم رہنا۔ مومن بال سے باریک، تلوار سے تیز صراط پر چلتا ہے۔"

جو عہد کیے تھے...... وہ عہد نبھانے۔ عزیزہ لپک کر اونٹ سے اتری تھی، اس نے اترنے میں بہت جلدی کی تھی۔ اس سے پہلے کہ ابن منصور انہیں ڈھونڈ لیتا۔ اس سے پہلے کہ وہ ہاتھ کا اشارہ ان کی طرف کر کے انہیں پھر سے طوائف، طوائف کہتا۔ اس سے پہلے اس نے اس کا غرور چھین لیا۔ اپنا رتبہ قائم رکھا۔ اپنی بڑائی کو کمتر نہیں ہونے دیا۔ اسے فخر تھا کہ وہ تائب ہو چکی ہے۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی شرمندہ ہونے والی نہیں تھی۔ ساری دنیا ہاتھوں میں پتھر پکڑ لیتی، ساری دنیا مل کر طوائف، طوائف پکارتی، تو بھی وہ اللہ کے رحم پر شک کرنے والی نہیں تھی۔ تو بھی وہ پلٹ کر واپس قحبہ خانے جانے والی نہیں تھی۔ ساری دنیا مل کر انہیں دنیا سے نکال دینے والی تھی تو بھی۔

لپک کر ہی آمنہ نیچے آگئی، لیکن جنت، وہ دل کی کمزور تھی نا۔ وہ رو دی تھی۔ اس کے دل سے ایک ایسی درد بھری ٹیس اٹھی کہ وہ درویش اونٹ پر سوار نہ ہوتی، تو اس ٹیس سے ہی مر جاتی۔ وہ سہم گئی، تڑپ اٹھی۔ وہ کسی امتحان کے لیے تیار نہیں تھی۔ وہ اس...... اس تماشے کے لیے بالکل تیار نہیں تھی۔ اس نے گردن موڑ کر خاتون ساس کو دیکھا، اور ان کے سینے سے جا لگی۔

"کاش دنیا یہیں ختم ہو جائے۔ سب مر جائیں۔ قیامت آجائے۔"

اس نے روتے ہوئے سوچا، انہیں اپنے سینے سے شدت سے بھینچ لیا۔ اس نے ماں نہیں دیکھی تھی، لیکن ماں پا ضرور لی تھی...... پایا تھا، تو بچھڑنا بھی تھا۔

"صبر کرو جنت! ابھی یہ لٹیرے چلے جائیں گے، ہم بہت جلد منزل پر پہنچ جائیں گے۔"

"ابھی تو شروع ہوا ہے خالہ...... سفر......" اس نے کہا اور اونٹ سے لپک کر کود گئی۔

سب سے آگے عزیزہ تھی، وہ اونٹوں، لوگوں، لٹیروں میں سے جگہ بناتی ہوئی ابن موسیٰ کی سمت بڑھ رہی تھی۔ کاروان حج، کاروان صحرا...... کاروان حیات، کاروان اشک میں بدل چکا تھا۔ عزیزہ کی چال، آمنہ کا افسوس، جنت کی دبی دبی ہچکیاں، ہتھیلی سے گیلی آنکھیں پونچھتی سسکیاں۔

دور قاہرہ میں...... کچی پکی نیند سونے والا درویش...... وہ نم آنکھیں لیے جاگ اٹھا ہوگا۔ تہجد کے لیے اٹھنے کی تیاری کرتی درویش کی زوجہ، وہ ایک دم سے رو دی ہوگی...... درویش کی چھوٹی بچیاں، جو ان سے بہت پیار کرتی تھیں، وہ ایک برا خواب دیکھ

رہی ہوں گی...... دور...... بہت دور مصر...... جہاں
سے حق نکلا تھا۔ وہ اس کے نیست و نابود ہو جانے پر
سہم گیا ہو گا۔ عاجز اونٹ سر اٹھا کر دیکھے بغیر نہیں رہ
سکے۔ وہ کلام رکھتے تو کہتے۔

"عزیزہ! جاؤ...... تمہارا اللہ نگہبان ہے۔"

عزیزہ کو اپنے پیچھے دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی، وہ جانتی تھی وہ دونوں بھی اس کے ساتھ ساتھ آ رہی ہیں۔ یہ وہی تھی جو ان دونوں کو قحبہ خانے سے لے کر نکلی تھی۔ جس نے انہیں کاروانِ حج میں شامل کروا دیا تھا...... ہاں یہ وہی تھی۔ جو اب کاروانِ حج سے باہر ہونے جا رہی تھی۔

جرأت...... جرأت...... سینہ ٹھونک کر کہنا کہ ہاں میں حاضر ہوں...... بولو کون ہو تم؟ میری موت؟ میری مشکل؟ میرا دکھ؟ میری مصیبت میری ذلت؟

میں نے کہہ تو دیا کہ میں حاضر ہوں۔ آ جاؤ، آگے سے، ورنہ پیچھے سے، ورنہ سامنے سے آ گرو، اوپر سے، ورنہ زمین سے پھوٹ نکلو۔ میں نے کہہ تو دیا کہ میں حاضر ہوں۔

دلوں میں حق کی روشنی اس وقت روح تک پہنچتی ہے جب وہ جرأت رکھتی ہے۔ دنیا میں دینِ حق "جرأت" سے سر بلند ہوا ہے۔ گھروں میں چھپ کر بیٹھے رہنے سے نہیں۔ دلوں میں سہمے رہنے اور سرگوشیوں میں تبلیغ سے نہیں۔ دینِ حق کا نام ہے...... کلمۂ حق...... یہ جرأت سے عام ہوتا ہے، اور جرأت سے ہی "خاص"۔

ابنِ موسیٰ نے عزیزہ کو آتے دیکھا تو اسے لگا کہ ہاں اب...... اب ایک تنکا بھی اس سے افضل رہا...... وہ خاک سے بدتر، خاک سے کمتر ہوا۔

"میں حاضر ہوں۔ عزیزہ! تمہاری زبان میں "طوائف......"

یہ ہمت، یہ حوصلہ صرف وہی دکھا سکتی تھی۔ حق کی روشنی سب سے پہلے اس کے دل پر وار ہوئی تھی۔ وہ اپنا انجام جان چکی تھی۔ وہ یہ بھی جان چکی تھی کہ جس کی آواز کاروانِ حج میں گونج رہی تھی، یہ وہی ہے جسے اس نے اپنے پیر سے مسل دیا تھا۔ قحبہ خا
سے اٹھوا کر باہر پھنکوا دیا تھا۔ حبشیوں نے اس
دونوں بازوؤں سے پکڑ کر زمین پر منہ کے بل پٹخ د
تھا۔

جو چیزیں بکنے کے لیے رکھی جاتی ہیں، ان کی
قیمت ہوتی ہے، وہ کتنی بھی معمولی ہوں۔ کسی بھی چ
کی قیمت "ذلت" نہیں ہوتی، وہ کتنی بھی کمتر ہوں
وہ موت کی سزا کے لیے تیار کھڑا مجرم ہی کیوں
ہو...... وہاں ہر جائز ناجائز تھا لیکن، حیوانوں کے بھ
کچھ اصول ہوتے ہیں۔ درندوں کے بھی دل ہو
ہیں۔ کتوں کی بھی کوئی غیرت تو ہو گی۔ عزیزہ
بھری محفل میں، اس کے منہ پر طمانچہ مارا تھا
ٹھنڈے مشروب کا جام اس پر الٹ دیا تھا۔

"میں طوائف ہوں، مجھے یاد ہے۔ تم خرید
ہو، یہ بھی۔ میری اوقات کے ساتھ ساتھ اپنی اوقا
بھی یاد رکھو۔" تھپڑ مار کر اس نے جتا کر کہا تھا۔
غصے سے سرخ ہو رہی تھی۔

"تمہیں بھی ماں کی گالی لگتی ہے۔" وہ جس
تھا۔ "مائیں تو شریفوں کی ہوتی ہیں۔"

"ان شریفوں کی جو یہاں آتے ہیں؟ تمہیں
نہیں لگتی؟" وہ اس سے پوچھ رہی تھی۔

جس گالی کے لیے اس نے تھپڑ کھایا تھا، اس
سے گندی گالی دے کر اس نے کہا تھا۔ "نہیں......
چاہو تو رات بھر دیتی رہو۔"

وہ تھپڑ کھا چکا تھا اور ابھی تک اسے اس کی ا
سمجھا تھا۔ وہ اس ضرب کو غیرت میں نہیں بدلنا چا
تھا، ورنہ بہت مسئلہ ہو جاتا۔ لیٹرے اتنی غیرتیں نہیں
پالتے۔ وہ قافلے لوٹے گا یا اپنی قسموں کی ت
برداریاں کرے گا۔

"تم غلط جگہ آئے ہو...... بہتر ہے چلے جاؤ۔"

"قحبہ خانے کی اینٹ، عبادت گاہ کا راستہ د
رہی ہے؟"

"نہیں...... باہر کا راستہ۔" کہہ کر، رخ موڑ
وہ سیڑھیاں اترنے لگی تھی کہ اس نے چلا کر کہا تھا۔

"رات ابھی باقی ہے۔ تمہاری ماں کی شان میں کچھ قصیدے ابھی ادھورے ہیں۔ سنتی جاؤ۔"

اس نے وہیں سے پلٹ کر دیکھا تھا۔ "یہ ادھورے قصیدے پورے کر کے دیکھ لو، زبان گدی کے پیچھے سے نکالوں گی اور اپنی ایڑی سے مسل دوں گی۔"

وہ سردار تھا وہ بھی ڈاکوؤں کا، اسے عادت نہیں تھی عورتوں کی، وہ بھی طوائفوں کی للکار سننے کی۔ کسی دوسرے کے ہاتھ سے مشروب پکڑ کر، اس کے منہ پر انگاروں کی طرح اچھال کر، وہی گالی دی تھی جس پر وہ پہلی بار بھڑکی تھی......

"طوائفوں کو، اپنی اوقات پہچاننی چاہیے ورنہ اپنی حد۔" اس رات اس نے کہا تھا۔

عزیزہ نے ایک اشارہ کیا تھا، دیوقامت محافظ نے آ کر اسے پیچھے سے پکڑ لیا تھا۔ اسے منہ کے بل نیچے گرا دیا تھا۔ اس کی گردن پر اس کا وزنی پیر تھا۔ آگے بڑھ کر عزیزہ نے جوتے سمیت اپنی ایڑی سے اس کا منہ مسل دیا تھا۔

"حیوانوں کے بھی کچھ قاعدے قانون ہوتے ہیں، تم ان سے بھی بدتر ہو۔"

حیوان، مہینوں قاہرہ کے اس قحبہ خانے کے چکر لگاتا رہا تھا۔ لیکن جو جگہ جتنی مشہور ہو، وہاں اتنے ہی اثر و رسوخ والے لوگ موجود ہوتے ہیں، جو اپنے دم خم سے کسی کو دم نہیں مارنے دیتے۔ عزیزہ کو شہر سے باہر بھیج دیا گیا تھا۔ زخم پرانے ہو جاتے ہیں، نشان نئے رہتے ہیں۔ غریب کے منہ سے گالی اور ذلیل کے ہاتھ کا طمانچہ نہیں بھولتا۔ اسے یاد رہا تھا۔ یاد رہا تھا۔ اپنا منہ ایڑی سے مسلا جانا...... یاد رہا تھا۔ یاد تازہ ہو گئی تھی۔

بھڑکتی ہوئی مشعل کو جھٹکے سے ہاتھ میں لیا اور اس کے چہرے کے قریب لایا...... وہ اسے دیکھتا رہ گیا تھا...... اور پھر وہ ایسے ہنس دیا جیسے اسے اس سے بڑا خزانہ نہ ملا ہو۔ وہ اتنی دیر تک قہقہے لگاتا رہا تھا کہ ابن موسیٰ، غیرت سے شرمسار ہو گیا تھا۔ کھینچ کر اس نے اس کی چادر پرے کی تھی۔ اس کے حسن کا چاند ماتم کناں ہو گیا تھا۔ سر کاروان، ذلت کا آغاز ہو گیا تھا۔

"میں ڈاکو ہوں، مجھے یاد ہے، تم طوائف ہو یہ بھی۔ مجھے تمہاری اوقات یاد ہے، آج تمہیں اپنی اوقات یاد کروانے والا ہوں۔"

عزیزہ خاموش کھڑی تھی۔ سارا جہاں خالی تھا۔ کہیں کچھ نہیں تھا۔ آمنہ، جنت اس کے شانوں کے پیچھے چھپ کر کھڑی تھیں۔ سارا جہاں "انسان" تھا۔ ایک وہ اکیلی "طوائف" تھیں۔

"تم اس کاروان کے ساتھ جا رہی ہو؟ تم؟ قاہرہ کی مشہور طوائفیں حج کے لیے جا رہی ہیں۔ یقیناً زمین پھٹ پڑے گی، یقیناً آسمان آ گرے گا۔ کیوں امیر کاروان...... اب تمہارا دین کے بارے میں کیا کہنا ہے؟ تمہارے لیے میں بہت خوار ہوا، اپنا بہت نقصان کیا۔ کیسے کیسے رشوت نہیں دی کہ تمہیں اٹھا کر میرے سامنے لا کر پٹخ دے، لیکن تمہارا اثر و رسوخ کمال کا تھا۔

ایک قافلے کو لوٹتے ہوئے ایک دیوانہ بار بار بڑبڑا رہا تھا کہ "مکافات عمل میری گردن دبوچ لے گا، آج میں مان گیا مکافات عمل کو...... اس نام کی چیزیں واقعی میں ہوتی ہیں...... مکافات عمل...... یہ تمہیں لے ڈوبا۔"

اس نے اس کا پرانا نام لے کر اسے گالی دی تھی۔ وہی گالی، جسے سن کر اس نے اسے تھپڑ مارا تھا، اس کا منہ کچل دیا تھا...... لیکن اب وہ خاموش تھی۔ اب وہ بھڑک نہیں رہی تھی۔

"ابن موسیٰ! کاروانوں کو بہت امیر نصیب ہوئے، لیکن تمہاری بات اور تھی...... تمہاری شہرت چار عالم تھی۔ میں نے بہت قافلے لوٹے، بہت لوگوں کو مارا، لیکن جو تاوان آج وصول پایا، اس سے پہلے کبھی نہیں پایا...... ہر شے عروج دیکھتی ہے، میں نے اپنا عروج آج دیکھ لیا۔ کیا یاد کرو گے، جاؤ تمہاری جان بخشی کی، ورنہ تمہاری کھال سے جوتے

پہنا..... اس عزت سے تمہارا سر تم کیا جو کاروان کے امیر کی حیثیت سے تمہارے شانوں پر تھی۔ میں نے آج پورا کاروان لوٹ لیا..... کسی کو نہیں چھوڑا۔"

اس رات سارا جہاں لٹ گیا۔ کوئی نہیں بچا۔

☆☆☆

کاروان لٹ چکا تھا۔ وہ ریت پر گھٹنوں کے بل گرا رہا، اس نے اٹھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ وہ مرد تھا، چٹان تھا، اب وہ ریزہ ریزہ ہو رہا تھا۔ امیر کاروان! اس کا سارا کاروان لٹ گیا۔ کیا بچا اس کے پاس..... امیر کاروان! اس کا حج کہاں رہا اب۔ تینوں جا چکی تھیں۔

اس نے دیکھا کہ صحرا جب خون جذب کرتا ہے، تو کیسا ہولناک ہو جاتا ہے۔ صحرا جب عزتوں کے لٹنے کا گواہ بنتا ہے تو کیسا بے بس ہو جاتا ہے۔

اس نے دیکھا کہ اس دنیا میں سب سے بڑا ظلم، کسی عورت کی بھرے بازار تذلیل ہے۔ اس نے جانا کہ عورت طوائف ہو یا دین دار..... اس کی عزت۔ اس کا احترام دنیا کی ہر روح پر لازم ہے۔

کوئی کتنا ہی گناہ گار کیوں نہ ہو، اس کے عیب پر عرش کے رب نے پردے ڈال دیے ہوں، تو فرش والوں کا ان پردوں کو اٹھا دینا گناہ کبیرہ ہے۔

وہ گواہ ہوا کہ اس دنیا کی سب سے بدترین چیز "ظلم" ہے اور اس دنیا کی سب سے گھٹیا چیز "بے حسی"۔

"تم نے ان کا نام کیوں لیا۔ تم وحشی انسان ہو۔ تم نے ان کی جانوں پر کتنا ظلم کیا۔" وہ ابن منصور کو نوچ نوچ کر مار رہا تھا۔ وہ اس کا خون پی جانا چاہتا تھا، اس کا گریبان جھنجوڑ رہا تھا۔

"تمہیں عہدے سے برخاست کیا جا چکا ہے ابن موسیٰ!" کاروان کے اہم ارکان اس کے سر پر کھڑے اسے ابن موسیٰ کے لقب سے بلا رہے تھے۔ یہی تو وہ سب چاہتے تھے۔ امیر کاروان، امیر الحج کو "ابن موسیٰ" میں بدل دینا۔

"ابن منصور کا گریبان چھوڑ دو، اپنا عہد پورا کرو۔ کاروان کو اس کی منزل تک پہنچاؤ۔ یہ کاروان تمہاری وجہ سے لٹا ہے، تم سے معمر واپسی پر بات ہوگی۔"

اپنے گھوڑے پر بیٹھ کر وہ ان کے پیچھے جا رہا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی۔

"تم اللہ کو حاضر ناضر جان کر کاروان کی سرپرستی کا حلف لے چکے ہو، تم کاروان کو بیچ راستے میں چھوڑ کر فرشتۂ اجل کی پکار کے سوا کہیں نہیں جا سکتے ورنہ خدا کو کیا منہ دکھاؤ گے۔"

"ورنہ اللہ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔" وہ چلا کر ان سے پوچھ رہا تھا۔ اب لٹے پٹے حاجی امیر کاروان کا نیا روپ دیکھ رہے تھے۔

"اللہ کو کیا منہ دکھاؤ گے تم سب؟" وہ چلا کر ان سب سے پوچھ رہا تھا۔ "کیا منہ دکھاؤ گے..... جواب دو۔"

اس کے سوال کی شدت نے صحرا کا سینہ لرزا دیا تھا اور آمنہ کو ملے کلام حق پر لکھی تحریر کا ایک کلام زندہ ہو گیا تھا اور وہ کہتا تھا۔

"بتا اے انسان! اللہ کو کیا منہ دکھائے گا، اس کی مخلوق کو کمتر پائے گا تو خود کو کیسے معتبر بنا پائے گا؟"

اس کا گھوڑا صحرا میں بل کھا رہا تھا۔ اس نے لٹے پٹے کاروان کو دیکھا۔ دیکھا کہ ہستیاں اور بستیاں کیسے اجڑ جاتی ہیں۔ ظلم سے، ناانصافی سے۔ سب حاجی اپنا اسباب سمیٹ رہے تھے۔

اور تین حاجی اپنا آپ سمیٹ کر جا چکے تھے۔ وہ اس کا سکون، قرار سب ساتھ لے گئے تھے۔ اس نے دیکھا کہ کاروان حج بہت پیچھے رہ گیا ہے..... لیکن حاجی بہت آگے نکل گئے ہیں، تین حاجی۔

جنت..... آمنہ..... عزیزہ!

☆☆☆

وہ ان کے گھوڑوں کے ساتھ بندھی ہوئی چل رہی تھیں۔ جیسے کاروان میں اونٹ آگے پیچھے چلتے ہیں، وہ بھی آگے پیچھے چل رہی تھیں۔ یہ عہد کا سب

کوئی بولی ان کی قیمت پر پوری نہیں اتر رہی تھی۔ وہ اپنے حسن میں بے مثال تھیں، ان کے اونچے دام لگ رہے تھے اور وہ دور، مردوں کے ہجوم میں بیٹھا ہنس رہا تھا۔ وہ کسی قیمت پر بھی ہاں نہیں کر رہا تھا۔ پہلے اس نے ان کی قیمت چڑھا دی تھی۔ اتنی چڑھا دی تھی کہ وہ وہاں سب کی پہنچ سے باہر ہو چکی تھیں۔ اتنی ہی قیمت جو کسی انسان کی دی ہی نہیں جا سکتی۔ پھر اس نے قیمت گرا دی تھی، اتنی کہ گلی کے مردہ کتے کے بدلے میں بھی انہیں خریدا جا سکتا تھا۔

ان کی غلامی، ان کی بولی، ان کی موجودگی ...... ہر دن زبان زد عام ہوئی۔ بازار میں بازاریوں کی بہتات خاص ہوئی۔

جو نہیں بھی خریدنا چاہتے تھے وہ بھی محظوظ ہونا چاہتے تھے۔ اتنا حق تو ہر انسان کا بنتا ہے نا۔ جو محظوظ نہیں ہو رہے تھے، وہ بس دیکھ رہے تھے۔ یہ محظوظ ہونے والوں سے بھی بدتر تھے، یہ گونگے تھے...... چپ تھے۔

جب وہ اچھی طرح سے محظوظ ہو چکا۔ اس کا جی بھر گیا۔ اس کی غیرت کا جام بھر گیا، تو پندرہویں دن اس نے اعلان کیا تھا۔

''آج رات کی بولیاں آخری ہوں گی۔ جوان کے جتنے گرے ہوئے دام لگائے گا، وہ انہیں ساتھ لے جائے گا۔ اتنی گری ہوئی قیمت، جتنی کبھی کسی چیز کی نہ لگی ہو۔ دوبار بولی لگانے کی اجازت نہیں ہے' لگاتے جاؤ۔ آگے بڑھتے جاؤ۔''

دنیا میں ان سے زیادہ ارزاں قیمت کسی کی نہیں لگنے والی تھی۔ دنیا کی ہر چیز گواہ ہو جانے والی تھی۔

''میں تمہیں دو کھوٹے سکے دیتا ہوں۔''

''کھوٹے ہی سہی، سکے تو ہیں، آگے بڑھو۔''

اس نے ناں میں سر ہلا دیا تھا ''گھوڑے کی نعل۔''

''ناں، ناں۔ مجھے گھوڑے عزیز ہیں۔''

ایک ایک کر کے کئی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔ مذاقاً کتنوں نے کتنی ہی بولیاں لگائیں۔ جو

یہ چھوٹا کاروان حج تھا۔ تین حاجیوں کا...... گھسیٹ کر، رینگ کر، چل کر، گر کر، اٹھ، اٹھ کر چلنے والا۔

حج کی نیت، حج کا ارادہ، حج سے محبت۔ رب کے گھر کی چاہت رکھ کر قدم اٹھانا...... چلنا...... چلتے رہنا۔ اعمال کی سرزمین، امتحان کے آسمان سے نکل کر مرکز کی سمت بڑھنا...... ٹوٹ کر، جڑ کر، رو کر، قوی ہو کر...... بڑھنا اور بڑھتے ہی رہنا۔

یہ دنیا کا سب سے مظلوم کارواں تھا، پھر بھی کیسا چپ تھا۔ کوئی دہائی نہیں تھی، کوئی سسکی، کوئی آہ نہیں تھی۔ انسان کمزور واقع ہوا ہے...... وہ بھی کمزور تھیں...... لیکن جس وقت عزیزہ بدو کے سامنے جا کر کھڑی ہوئی اور اس نے کہا،

''میں حاضر ہوں......''

اس لمحے انہیں لگا۔ ساری کائنات نے ان کے ساتھ یک زبان ہو کر کہا ''لبیک...... لبیک......''

جنت جو رو رہی تھی، اس نے بڑی سختی سے اپنے آنسو پونچھ لیے تھے۔

آمنہ جس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں، وہ چٹان ہو گئی۔ انسان بڑا کمزور واقع ہوا ہے جو کمزوروں میں قوی ہو کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے، اسے چن لیا جاتا ہے۔

صحرا کی ریت ان کے قدموں کے نیچے، ان کی زبوں حالی پر ماتم کر رہی تھی۔ سردار بدو، اپنے ٹھکانے پر پہنچ چکا تھا۔

ان کا سفر چور بازار پر ختم ہوا تھا۔ اس نے انہیں اتنی حیثیت بھی نہیں دی تھی کہ انہیں اپنے چور گھوڑوں کی پیٹھ پر سوار ہونے دیتا۔

☆☆☆

اور اب وہ چور بازار میں، مشعلوں کی روشنی میں، چبوتروں پر کھڑی ہیں...... تینوں۔

یہ ان جیسوں کا چور بازار تھا، یہاں چیزیں ارزاں قیمت پر بکتی تھیں۔ چوروں، لٹیروں کی چیزیں، یہاں نیک، پارسا، عام، خاص سب آ جاتے تھے۔ غلیظ، کمینے، بھی...... چور، لٹیرے، آقا، غلام بھی۔ تین دن تک ان کی بولیاں لگتی رہی تھیں لیکن

اسے بس اتنی پسند آئیں کہ وہ قہقہوں کے نام ہوئیں۔ بازار میں، بازاریوں کا ریوڑ کھچا کھچ تھا۔ سب کی زبان پر ایک "مول" تھا۔

"یہ لو...... یہ مجھے گندی نالی میں پڑا ملا ہے۔"

ایک بازاری مردہ، بدبودار چوہا لے کر مجمع کے سامنے آیا۔ ناک ڈھانپ کر، دم سے اٹھا کر سب کے سامنے کیا۔

"اس سے گری ہوئی قیمت اور کیا ہوگی۔"

گرے ہوئے مجمع نے، گرے ہوئے قہقہے لگا دیے...... چوہے کو آمنہ پر اچھال دیا۔

آمنہ...... فروخت...... اس کے نام ہوئی۔

اور پھر جنت...... اس کی قیمت، چمڑے کی ٹوٹی ہوئی جوتی قرار پائی......

پیر کی جوتی، پیروں کی خاک کے لیے' جنت کی قیمت...... وہ بھی فروخت ہوئی۔

"مجھے لفظوں کا جادوگر کہا جاتا ہے، میں کھڑے کھڑے لغت تیار کر لیتا ہوں۔ گری ہوئی یہ گالیاں میں اس کے نام کرتا ہوں۔"

اشارہ کر کے کہا۔ پھر ایک ایک کر کے گالیاں دینی شروع کیں...... ہر گالی پر قہقہے گونجے...... ہر گالی پر واہ ہوئی...... ہر گالی...... ہر گالی۔

ایک گالی سن کر طمانچہ مارنے والی کی فروخت...... ہر گالی کے نام ہوئی۔

عزیزہ...... وہ گالیوں کے عوض فروخت ہوئی...... فروخت سرعام ہوئی۔

دنیا کے بازار میں، انسانوں کے بھیس میں، حیوانوں کے ہجوم میں، جب کسی انسان کی "بولی" لگتی ہے، تو وہ گری ہوئی قیمت پر لگتی ہے۔ سب سے ارزاں...... وہ اعمال کی نہیں "اوقات" کی لگتی ہے۔ ان کی اوقات کی یہی قیمت تھی۔

اور ان کی صراط کی قیمت...... وہ تو وہ خود طے کریں گی۔

"دنیا میں انسان کی بولی کوڑیوں کے بھاؤ لگے تو وہ جان جائے کہ وہ راہ حق پر ہے...... راہ رب پر ہے۔

اعمال فروخت نہیں ہوتے...... یہ انعام پاتے ہیں، اعزاز، مقام اور "میرا بندہ" القاب...... (کلام حق)

☆☆☆

لٹا پٹا کارواں جیسے ہی اپنی منزل پر پہنچا، ابن موسیٰ نے اپنے گھوڑے کا رخ پھیر لیا۔ استقبال کے لیے کھڑے سرزمین حجاز کے میزبان اس کی شکل دیکھتے رہ گئے تھے۔ کاروان کے ساتھ جو گزری تھی، ان تک خبریں پہنچ چکی تھیں۔

"تمہاری سزا ابھی طے ہونی ہے ابن موسیٰ! اتنی جلدی نہ کرو بھاگنے میں، تمہیں ایک ایک حاجی کے جان و مال کا حساب دینا ہے۔"

"میں اپنا عہد پورا کر چکا ہوں، کاروان منزل پر پہنچ چکا ہے۔ میری سزا وہ ہیں جو کاروان سے الگ جا چکی ہیں۔"

"حج نہیں کرو گے......" ابن منصور نے طنزیہ کہا۔

"حاجیوں کے بغیر حج کیسے کر لوں......" اس نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی تھی۔

وہ جانتا تھا کہ یہ اب ممکن نہیں رہا کہ جو جا چکی تھیں، انہیں ڈھونڈ نکالا جائے...... اس لیے...... اس نے ان کے پیچھے خود کو بھی گم ہو جانے دیا۔

وہ امیر کارواں تھا اور امیر...... اپنے کارواں کے جانوروں تک کا خیال رکھتے ہیں، وہ تو پھر "انسان" تھیں۔ وہ امیرِ حج تھا، اور وہ مسافرِ حج۔

☆☆☆

انسانوں کے ہجوم میں، حیوانوں کے بازار میں، وہ کئی ہاتھوں سے ہوتی ہوئی، بھاگی ہوئی، لٹی ہوئی، یہاں آ گئی تھی۔ اسے ارزاں قیمت پر خرید کر، دوسری، تیسری، چوتھی جگہ بیچ کر، اس جگہ رشتہ داری نبھانے کے لیے بھیج دیا گیا تھا۔ بڑی عمر کی وہ عورت وقت سے پہلے ضعیف ہو چکی تھی۔ نابینا اور بیمار تھی۔ مرحومہ بیٹی کی بچی کے لیے ایک خادمہ چاہتی

تھی۔
"کیا نام ہے تمہارا؟"
اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر وہ پوچھ رہی تھیں۔ گیارہ مہینوں میں...... اب...... اب کسی انسان کی آواز سنی تھی۔ کسی نے انسان بن کر بات کی تھی۔ جواب دینے کے بجائے آمنہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

"آمنہ...... آمنہ......" وہ ہچکیاں لے رہی تھی۔ اسے اب یاد آیا تھا کہ وہ آمنہ ہے۔ وہ بھی تو انسان ہے۔

"آمنہ......! میری بیٹی کبریٰ بھی تم جیسی تھی۔ ایسی ہی معصوم صورت، ایسی ہی بات بات پر رو دینے والی۔"

وہ اس کے چہرے پر اپنا ہاتھ پھیر رہی تھیں۔

"نابینا لوگوں کو سب دکھائی دیتا ہے آمنہ! بس چپ ہو جاؤ، رونا بند کرو۔ دیکھو اللہ نے میری سن لی، خدمت کے لیے لوگ تو بہت مل رہے تھے لیکن "ماں" نہیں مل رہی تھی۔ چچازاد بھائی کی بہت منتیں کیں کہ کوئی اچھی سی "ماں" لا دو۔ سب کہتے ہیں، میں پاگل ہوں۔ میں نے کہا کہ بس مجھے مجھ جیسی پاگل لا دو...... دیکھو، کیا میں پاگل ہوں۔ کیا بوڑھا اور نابینا ہو جانا، انسان سے انسان ہونا چھین لیتا ہے۔ اس کا نعمتوں پر حق نہیں رہتا، اسے بس "موت" کے لائق سمجھا جاتا ہے۔ اپنے پیچھے کبریٰ اپنا جگر گوشہ چھوڑ گئی ہے، میں نابینا نہ ہوتی تو بہت کچھ کر لیتی...... اب سب تم کرنا۔"

بستر پر بیماروں کی طرح پڑی، ڈیڑھ سال کی کمزور ناتواں سی بچی کو گود میں اٹھا کر اس نے سینے سے لگا لیا۔ وہ اپنے آپ سے بچھڑ گئی تھی...... اب ملی تھی...... اتنی بے رحمی دیکھ لی تھی کہ لگتا تھا اپنے اندر سے بھی رحم مٹ گیا ہے۔ لیکن اس کے سینے میں دھڑکتے دل میں، مرحومہ ماں کی ایک دھڑکن زندہ تھی۔ بچی کو سینے سے لگایا تو اس نے اپنے اندر رحم کے سمندر کو ٹھاٹھیں مارتے محسوس کیا۔ جیسے وہ بچی ہمیشہ سے اس کی تھی۔ اس نے یہ سفر اس بچی کے لیے ہی کیا تھا۔

"کیا نام ہے اس کا؟" وہ بچی کے ہاتھ سے اپنے گیلے گال پونچھ رہی تھی۔ اسے بہت سکون مل رہا تھا۔

"کسوہ...... پتا نہیں کبریٰ کو کیسے خبر ہو گئی تھی کہ بیٹی ہی ہو گی، نو مہینے کسوہ کہہ کر اسے بلاتی رہی تھی۔"

"کسوہ؟" وہ زیر لب بڑبڑائی۔ "کسوۃ الکعبہ۔" زیرِ دل دہرایا۔

کہانی وہاں سے ہی تو شروع ہوئی تھی۔

کسوہ...... یہ اس عورت کی بیٹی تھی جو حافظ قرآن تھی۔ جس نے خواب دیکھا تھا کہ وہ اپنی اولاد کو حافظ قرآن بنا کر اس مدرسے میں بھیجے گی، جہاں بچیاں کسوۃ الکعبہ کی تیاری میں حصہ لیتی ہیں۔ جہاں غلاف کعبہ تیار ہوتا ہے۔ ماں نے نو مہینے ہر سانس قرآن کی آیتیں پڑھی تھیں۔ ماں نے پہلے لمحے سے اولاد کے لیے تیاری شروع کر دی تھی...... وہ ماں جا چکی تھی، جو ماں اسے اب ملی تھی۔ وہ...... وہ...... وہ حافظ قرآن تو نہیں تھی۔ وہ تو...... وہ تو......

☆☆☆

آمنہ شہر سے دُور...... بہت دُور۔ قبرستان جیسے ویران میدان میں بنے اس کوٹھری نما گھر میں بیٹھی ہوئی ہے۔ یہاں چند اور لوگ موجود ہیں۔ جنہوں نے اپنی ناک ہاتھ سے، ورنہ کپڑے سے ڈھانپ رکھی ہے۔ صرف وہ اکیلی ایسی ہے جس نے یہ تردد نہیں کیا۔ وہ اسے اپنے بھائی کے لیے لایا تھا۔ جو ایسی بیماری میں مبتلا تھا، جس نے اسے آبادی سے دور پھینکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ پہلے لوگوں کا ماننا تھا کہ یہ کوڑھ ہے۔ لیکن طبیب نے کہا یہ کوڑھ نہیں لیکن اس سے بہتر بھی نہیں۔ وہ وبائی مرض نہیں تھا لیکن لوگ سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس کے سوتیلے بھائی نے اسے اس ویرانے میں پھینک دیا تھا۔ اس کے سارے جسم پر بلبلوں جیسے زخم تھے، ان میں خون آلود

پیپ کی۔

وہ چلنے پھرنے سے عاجز تھا۔ تین وقت کا کھانا اس کے پاس اس ویرانے میں لانا، ایسا جوئے شیر تھا جس کے لیے ملازم رکھا ہوا تھا۔ لیکن کوئی بھی ملازم، معمولی سے معمولی انسان بھی، اس کی دیکھ بھال کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ اس کی بیماری سے خوف زدہ تھے۔ اس کے پاس ایک لمحہ کھڑا نہیں ہوا جاتا تھا۔ بازار میں بکنے والی ارزاں جنت کو وہ اپنے ساتھ لے آیا تھا۔

وہ خصلت میں کمینہ نہیں تھا لیکن جب بازار لگا ہو۔ ان حسینوں کی بولیاں دی جارہی ہوں..... تو پھر..... بہت سوں کے اندر کی خباثت باہر نکل آتی ہے۔ چیزیں مفت مل رہی ہوں تو جن کے پیٹ بھرے ہوئے ہوتے ہیں، وہ بھی انہیں لینے کے لیے دوڑ پڑتے ہیں۔ بھلا انسان کے لالچ کا بھی کہیں خاتمہ ہے؟

جس نے اسے وصول پایا تھا وہ اسے گھسیٹ کر اپنے ٹھکانے کی طرف لے جارہا تھا۔ اس نے اس کا پیچھا کیا اور اس کے آگے چند سکے پھینک دیے تھے۔

''انہیں اٹھاؤ..... اور اسے چھوڑ کر دفع ہوجاؤ۔''

اس نے سکے اٹھائے، نہ دفع ہوا، الٹا وہ تمسخر سے ہنس دیا تو اس نے اپنے خادم کو اشارہ کیا اور اس نے ایک پتھر اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا..... بس۔

''تمہاری عزت بچائی ہے۔ اب اپنی جان بچانا چاہتی ہو تو چپ چاپ میرے ساتھ چلو۔''

عزت بچانے والا اس کی جان خرید رہا تھا۔ وہ چپ چاپ نہ بھی ہوتی تو کیا اس سے جیت جاتی۔ وہ دنیا کے کسی بھی انسان سے جیت جاتی کیا؟ اس کا ایمان چٹان تھا لیکن جسم تو بھربھری مٹی ہی تھا نا۔ کوئی بھی چیر پھاڑ کر لیتا۔ کوئی بھی گھسیٹ کر، کہیں بھی لے جاتا۔

''تمہیں حنان مراد کے ساتھ نکاح قبول ہے؟''

اس سے پوچھا جارہا تھا..... سوال اس سے جاتا ہے، جس کے پاس جواب دینے کی گنجائ رہنے دی گئی ہو۔ اس کی آنکھوں کے پپوٹوں تک زخم تھے۔ اس کے قریب کھڑے ہونا ایسا ہی تھا جیسے اپنا دم گھوٹ لینا۔ اس نے سر اٹھایا، آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں، ہونٹ کانپ رہے تھے، اس کا جی چاہا بھاگ جائے، اس کا جی چاہا اسے موت آلے، اس کا جی چاہا..... کیسے اس کا جی پھٹا جاتا تھا.....

''اپنی ساس کے دل پر پڑھ پڑھ کر پھونکا کر دل بدل جائے گا ان کا۔'' عزیزہ کی آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

''تمہیں یہ نکاح قبول ہے؟''

''ہم میں سے کسی ایک کا بھی نکاح ہوگیا تو تینوں معتبر ہوجائیں گی.....''

''تمہیں یہ نکاح قبول ہے؟''

''یہ جنت ہے..... اس جیسی ڈرپوک لڑکی پورے مصر میں نہیں ملے گی.....''

قبول ہے..... قبول ہے..... قبول ہے.....؟

اس نے اپنی آنکھیں رگڑیں، بستر پر پڑے اس مرد کو ایک نظر دیکھا..... دنیا جہاں کی ڈرپوک لڑکی نے۔

''میں حاضر ہوں۔'' وہ صاحب چاہت تھی نا..... اب وہ صاحب لبیک تھی۔

اس کی آواز پر سب نے سر اٹھا کر دیکھا، کیسی بہکی بہکی باتیں کررہی تھی۔

''میں حاضر ہوں۔ حاضر ہوں۔ جنت حاضر ہے اے رب!''

ہاں وہ حاضر تھی، زندگی کا ہر تلخ جام پینے کے لیے۔ وہ حاضر تھی، ایک ایسے بیمار کی بیوی بننے کے لیے، جسے اس کے سگے، سوتیلے رشتوں نے اٹھا کر بستی سے باہر پھینک دیا تھا۔ لیکن رضا کا یہ گھونٹ پیتے پیتے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی..... انسان کمزور ہے نا۔

☆☆☆

یہاں پہاڑ ہیں، دلدل ہے، جنگل ہے۔ گھنا جنگل ہے۔ ڈراؤنا جنگل ہے۔ یہ گیلا جنگل..... یہ درندہ جنگل۔

یہ غلام جنگل ہے..... یہ آقا جنگل ہے..... اس جنگل کی نیم دلدلی زمین میں، درختوں کی جڑوں کو کھود کر وہ کچھ ڈھونڈ رہی ہے۔ ہر وہ چیز جو دولت میں شمار ہوتی ہے۔ موتی، ہیرے، سونا، چاندی، جواہر۔

یہ عزیزہ ہے۔

وہ ان تیس لوگوں میں سے ایک ہے، جنہیں طلون نے اپنا غلام بنا لیا ہے۔ اس کے آدمی بدنام زمانہ منڈیوں سے اس جیسے غلام خرید خرید کر لاتے ہیں جن کے آگے پیچھے کوئی نہیں ہوتا۔ جو کوڑیوں کے مول فروخت ہوتے ہیں۔ یہ تیس غلام نو عمر بچیاں ہیں، کچھ بڑی عمر کی عورتیں، چند ضعیف عورتیں اور ایک وہ ہے۔ وہ زمانہ عملیت سے، زمانہ غلامیت کے وقت میں آچکی تھی۔ بدترین غلاموں میں۔

طلون..... وہ بدترین آقا تھا۔

وہ اب تک اپنی پشت پر کتنے ہی کوڑے کھا چکی تھی۔ چور بازار میں گالیوں کے مول بکنے والی، جنگل میں ہیرے موتی ڈھونڈ رہی تھی۔ وہ زمین کی جنت سے خزانہ تلاش کر رہی تھی۔

کبھی یہ جنگل ڈاکوؤں کا مسکن ہوا کرتا تھا۔ وہ اتنے مشہور اور نڈر ڈاکو تھے، کہ انہوں نے کئی سو شاہی قافلے لوٹ کر ان کے خزانے جنگل کو ہضم کروا دیے تھے۔ انہوں نے بحری قزاق تک نہیں چھوڑے تھے۔ مشہور تھا کہ ہولناک زلزلے نے ان کا مسکن، گہرے اندھیرے غار کو پورا کا پورا زمین میں دھنسا دیا تھا۔ سب زندہ دفن ہو گئے تھے۔

بہت لوگ اس خزانے کی تلاش میں آئے تھے، جو ڈاکو اپنے پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ کچھ کے ہاتھ وہ آیا تھا، کچھ دلدلی زمینوں سے اپنی زندگی کو موت دے کر کبھی نہیں لوٹے تھے۔ کچھ ہمت ہار گئے تھے۔

لیکن ایک..... وہ سب پر بازی لے گیا تھا۔

اس نے غلاموں کی فوج اکٹھی کر لی تھی۔ وہ منڈیوں سے اپنے مطلب کے غلام خریدتا تھا اور انہیں درختوں کی جڑوں، غاروں کے اندھیروں، دلدلوں کی تہوں، جھاڑیوں کے جھنڈوں میں خزانے کی تلاش پر لگا دیتا تھا۔ صرف بچیاں، عورتیں، لڑکیاں..... جو جنگل سے فرار نہ ہو سکیں۔ اس کا ماننا تھا کہ پورا جنگل، ہر درخت، ہر دلدل کی تہہ، اس خزانے کا لقمہ کھائے ہوئے ہے۔ اسے اب ان کے پیٹ سے وہ سب نکالنا تھا۔ سکے اور ظروف، سونا، چاندی، ہیرا، موتی.....

اور عزیزہ۔ ہیرا..... زمین کے ہیروں کی تلاش میں تھا۔

جو سر راہ لوٹ لیتے ہیں، وہ ڈاکو ہوتے ہیں، جو زمین کے خزانوں کو اپنا پیٹ بھرنے کے لیے کھودتے ہیں، وہ چور ہوتے ہیں..... زمین کا چور..... زمین کے سینے میں جو کچھ ہے، وہ زمین پر موجود ہر انسان کا ہے۔ خزانے کسی ایک کے نہیں ہوتے، اگر ایک کے ہوں تو پھر ہڑپ کر لینے والے فرعون ہوتے ہیں۔ یہ فرعون پھر عرقاب ہوتے ہیں۔

وہ فرعون ہی تھا، سب غلام اسے ''طلون'' کہتے تھے۔ وہ فرعون اور طاعون کی خصوصیت کے اس نام سے واقف تھا لیکن اسے اس نام پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ آقاؤں کے بہت سے نام ہوتے ہیں۔ غلام کا بس ایک نام ہوتا ہے، ''غلام''۔ روشنی کی پہلی کرن کے ساتھ انہیں جنگل کی طرف ہانک دیا جاتا تھا۔ وہ زمین کھودتے تھے..... نہیں..... وہ زمین ایسے نہیں کھودی جا سکتی تھی جیسے پانی کے لیے کنوئیں کی، مردے کے لیے قبر کی..... بیج کے لیے فصل کی.....

وہ گیلی، دلدلی، کیچلی، زہریلی زمین ہاتھوں سے کھودی جاتی تھی، جیسے ریت سے بال تلاش کیا جاتا ہے، جیسے سمندر سے آنسو، جیسے جنگل سے پتنگا۔ زلزلے نے اتنے بڑے گروہ کے ڈاکوؤں کے خزانے کو دانوں کی طرح جنگل میں بکھیر دیا تھا، یہ اس کا ماننا تھا۔ وہ گیلی مٹی کے سینے میں تھا، جسے ہاتھ

تے، کس کس کر نکالنا تھا۔ وہ کیچڑ، دلدلی زمینوں میں تھا۔ کسی ہیرے کو خراش نہیں آنی چاہیے۔ اس کی قیمت کم نہیں ہونی چاہیے۔ سکوں کو، موتیوں کو..... ظروف کو..... اسے..... اُسے..... ہر چیز کو..... ارزاں..... قیمتی..... سب کو۔

انسان نے ہمیشہ کم قیمت چیزوں پر ہاتھ ڈالا ہے..... ہیرے جواہر پر۔ اپنی قیمت بھلا کر اس نے پتھروں کو قیمتی بنایا ہے۔

جنگل سے وہ خزانہ قطرہ قطرہ نچوڑ رہے تھے۔ نگرانی کے لیے چار دیو قامت حبشی تھے۔ وہ کوڑے لے کر ان کے سروں پر سوار رہتے تھے۔ نہ بھی سوار رہتے تھے تو اس گھنے جنگل سے کوئی باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ وہ اتنا گھنا جنگل تھا..... اتنا گھنا کہ ساری زندگی اس میں گزار کر بھی انسان راستہ نہیں پا سکتا تھا۔

طون کو ہیرے، موتی چاہیے تھے۔ وہ تلاش کرنے والے اپنی دعاؤں سے نکالتے یا اپنے خون سے۔ وہ معجزے کرتے یا جادو۔ ورنہ وہ غصے سے دیوانہ ہو جاتا تھا۔ وہ تیس غلام..... کسی کے مر، مرا جانے کی صورت میں ستائیس، اٹھائیس غلام۔ نئے غلاموں کی آمد پر تیس پینتیس جانور.....

اسی جنگل میں بنے اندھیرے غار ان کے ٹھکانے تھے۔ دن مشقت بھرے تھے۔ راتیں سسکیوں بھری..... جس دن ایک بھی موتی نہیں ملتا تھا، اس رات بھوک ملتی تھی، اس رات کوڑے ملتے تھے۔ اس رات کسی نہ کسی کی انگلی کٹی ملتی تھی۔

وہ ایک ایک جوڑ سے انگلی کاٹتا تھا۔ ہاتھوں کی، پیروں کی..... بچیوں تک کی دو، دو تین، تین انگلیاں کٹی ہوئی تھیں۔ اپنی غلامی کے پندرھویں دن اسے ایک درخت کی جڑ کھودتے ہوئے، ایک عمر رسیدہ پوٹلی ملی تھی۔ ابھی وہ اس کے ہاتھ میں آئی ہی تھی کہ پیچھے سے اچک لی گئی تھی۔ رات کے کھانے میں دو نوالے زیادہ ملے تھے۔ پتھریلی زمین پر سوکھی گھاس کا بستر میسر آیا تھا۔ وہ موتیوں سے بھری ایک پوٹلی کھوج نکالنے میں کامیاب ہو چکی تھی، ایسا اس نے نہیں کیا تھا، ایسا اس کے نصیب کے ہاتھوں ہوا تھا۔ وہ تو بس..... انگلیاں بچا رہی تھی..... سسکیاں خرید رہی تھی۔ تکلیفوں کی راحت ڈھونڈ رہی تھی۔

"ہم چھ مہینے سے اس جنگل میں چوہوں کی طرح درختوں کی جڑیں کھود رہے ہیں، ہمارے ہاتھ چند موتیوں کے سوا کچھ نہیں آیا، تم نے بڑا معرکہ مارا ہے....." بچیاں خوش تھیں کہ آج کی رات کوئی رو کر نہیں سوئے گا۔ کوئی تڑپے اور سسکے گا نہیں۔

"کیا پڑھ کر زمین کو کھودا تھا؟" ایک نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

"تمہاری جانوں پر کوئی آنچ نہ آئے..... یہ نیت رکھ کر کھودا تھا....."

وہ افسردہ ہو گئی۔ جس کی اپنی قیمت گالیاں تھیں۔ وہ بیش قیمت موتی ڈھونڈ چکی تھی۔ یہ وہ جواہر تھے جو وہ اپنے پیچھے بڑے شوق سے چھوڑ آئی تھی۔ ایک بار پلٹ کر ان کی طرف نہیں دیکھا تھا..... لیکن ہاں..... جب لٹانے والے اس کے حسن پر لٹاتے تھے تو اس نے سوچا تھا کہ اس کے حسن کے پلڑے میں ہر خزانہ بے وزن ہے۔ زمین خالی ہو جائے گی، لیکن اس کی قیمت نہیں چکا پائے گی۔

زمین اس کے تکبر کی قیمت، اس کی ہتھیلیوں سے چکوا رہی تھی۔ وہ اس سے پوچھ رہی تھی کہ حسن اگر ایسا ہی کارگر ہتھیار ہے تو پھر یہ کند کیسے ہوا۔ تمہاری پیٹھ پر کوڑا کیوں پڑا؟ تمہارا مول کم کیوں نہ لگا..... تکبر..... رائی کے دانے برابر، یہ زمین پر بڑا بھاری ہے۔ یہ روح پر بڑا کرب ہے۔

"دکھائی دینے والی ہر چیز کم حیثیت ہے۔ حیثیت والی سب چیزیں "پوشیدہ" ہیں، "باپردہ" ہیں۔" (کلام حق)

"تم نے کمال کر دیا۔ یہ بتاؤ تم نے کیسے نکالا۔" طون پوچھ رہا تھا تا کہ ان ہی خطوط پر باقیوں سے کام کروائے۔

"زمین کو جس نیت سے ہاتھ لگایا جاتا ہے، یہ ویسی ہی ہو جاتی ہے۔ قبر کھودنے کے لیے تو قبر کھود

https://reading.pakistanipoint.com

دیتی ہے۔ کنویں کے لیے تو پانی دے دیتی ہے۔ رزق کے لیے تو پھل، پھول، فصل سب دے دیتی ہے۔ خزانے کے لیے تو خزانہ دے دیتی ہے۔ میں نے ضعیف عورتوں کی جان کو تکلیف سے بچانے کے لیے کھودا تھا اور.....''

اس نے بہت سکون سے اپنی نیت، اپنی مشقت کی حقیقت بیان کی تھی۔ وہ اسے بتا رہی تھی کہ میں تمہارے لیے خزانہ نہیں، انسانوں کے لیے راحت کے کچھ لمحے ڈھونڈ رہی ہوں۔ میں اکیلی انسان ہوتی تو تم میرا سر کچل دیتے۔ میں تمہارے لالچ کا پیٹ نہ بھرتی۔

''مجھے نہیں پتا تھا کہ میرے غلام ایک درویش خرید لائے ہیں۔ تم تو طوائف نہیں ہو؟''

''سارا جہاں یہ یاد رکھے گا کہ میں طوائف ہوں، تم بھی یاد رکھو۔ بھلا مجھے تم جیسے انسانوں کی پرواہ ہی کہاں ہے۔''

اس نے بڑی بے نیازی سے کہا۔ اس جنگل میں قید ہو کر بھی وہ ڈرتی نہیں تھی۔ اسے کسی شے کی پرواہ نہیں تھی۔ تب بھی جب اس کی بولی لگائی جا رہی تھی۔ بھلا حیوانوں کی منڈیوں میں ''انسان'' کی بولی لگائی جا سکتی ہے۔ وہ اپنے دل میں پشیمانی کی کوئی بھی گرہ لگانے والی نہیں تھی۔ وہ دین حق پر، ایمان حق قائم کر چکی تھی۔ شہادت دے چکی تھی۔ اب بھلا دنیا ہاتھوں میں پتھر تھام لیتی یا پھر زبان پر گالی لے آتی..... وہ بے نیاز تھی.....

''لیکن تم لاپروانہ ہونا ..... اب تم ہر روز زمین کو اس نیت سے ہاتھ لگاؤ گی کہ اگر مجھے کچھ نہ ملا تو ان غلاموں میں سے کسی ایک کی انگلی کٹے گی، ہر روز کٹے گی۔ میں نے انسانوں سے بہت کام لیے ہیں، اب میں ایک اللہ والے سے کام لوں گا..... کل صبح تیار رہنا۔ آج رات دعا مانگ کر سونا، گڑگڑا کر۔ میں پیٹ بھرے بغیر رہ سکتا ہوں، خزانے کا صندوق بھرے بغیر نہیں۔''

''روح کو جس نیت سے جھنجھوڑا جائے، وہ اسی نیت پر عمل پذیر ہو جاتی ہے۔ روح، یہ ایسی فرماں بردار ہے۔

''عمل..... اس کا نیت پر ہی تو دار و مدار ہے.....'' (کلام حق)

☆☆☆

یہ غیر تراشیدہ پتھروں سے بنا ایک غار نما کمرہ تھا۔ کونے میں پانی کی صراحی رکھی تھی اور دوسرے کونے میں مراد کا بستر تھا۔ کمرے میں کھڑکی نہیں تھی کیونکہ وہ ہوا برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ روشنی بھی اسے تکلیف دیتی تھی۔ چراغ کی روشنی بھی حرام تھی۔ اس گھر کو..... اگر گھر کہنا جائز ہے تو اس کے باہر جہاں تک نظر جاتی تھی وہاں ٹیلے اور میدان تھے۔ دور..... بہت دور..... درختوں کے جھنڈ دکھائی دیتے تھے۔ ان تک چل کر جانے میں اتنا وقت لگتا تھا کہ واپسی پر انسان تھکن سے ہانپ جاتا تھا۔ اسے ہر روز صبح اس جھنڈ تک جانا ہوتا تھا۔ وہاں ایک درخت تھا جس کے تازہ سبز پتے توڑ کر، پانی میں ابال کر مراد کے زخم دھونے ہوتے تھے..... صبح و شام.....

نکاح کے بعد اس نے سب سے پہلے یہ کام کیا تھا۔ اپنی چادر الٹ کر..... اپنی شرم، اپنا لحاظ پرے رکھ کر..... مراد کے بھائی کی بیوی نے اسے راستہ دکھا دیا تھا۔ نئی نویلی دلہن نے وہ راستہ دیکھ لیا تھا، اور اسی وقت چل کر اتنی دور تک گئی تھی۔

کاروان حج سے باہر ہونے کے بعد، چور بازار میں فروخت ہونے کے بعد، اس کے پیروں میں چھالے نہیں پڑتے تھے۔ اس کے ہاتھ مشقت کرتے تھکتے نہیں تھے۔ لیکن دُور پیدل چل کر جاتے ہوئے..... مطلوبہ درخت کو ڈھونڈتے ہوئے..... پتے توڑتے..... چل کر واپس آتے..... لکڑیاں، اکٹھی کر کے آگ دہکاتے، پانی بھرتے..... بڑے برتن میں پتے ابالتے اور پھر زخموں کو دھوتے ہوئے وہ رو دی، وہ رو دی۔

وہ خود بھی خوب صورت تھی اور خوب صورتی کو پسند بھی کرتی تھی۔ وہ اس جیسے بیمار، زخم خوردہ انسان

کو اپنا شوہر بنے دیکھ کر، اپنے دل کے کاروان کا سوار کھول بیٹھی تھی۔ وہ اس جیسے انسان کی بیوی بننے کی تمنائی تو کبھی نہیں رہی تھی۔ جو چیز انسان خواب میں بھی نہیں سوچتا، وہی کیوں حقیقت بن کر سامنے آجاتی ہو۔

جنت..... وہ ایک دن کی دلہن تھی۔ جنت..... وہ زندگی کو بہار کے ساتھ یاد رکھتی تھی۔ قحبہ خانے میں رہتے ہوئے بھی وہ نکاح کے خواب دیکھا کرتی تھی۔ وہ سوچا کرتی تھی کہ کبھی، کوئی اتنی وفا ضرور دکھائے گا کہ وہ اس کے لیے ساری دنیا چھوڑ دے گی۔ پھر اسے معلوم ہوا، سب کچھ انسانوں کے لیے نہیں، اللہ کے لیے چھوڑا جاتا ہے، اور اس نے ایسا کیا..... لیکن اب وہ رو رہی تھی..... اس کا دل بھاری تھا۔

اور وہ بھی رو رہا تھا..... اس کی زبان تک پر زخم تھے۔ بولنے میں اسے کتنی تکلیف ہوتی تھی۔

''مجھے معاف کردو، میں خود غرض ہو گیا تھا۔ لیکن میں کیا کروں، میں اٹھ نہیں سکتا، چل نہیں سکتا۔ کھا نہیں سکتا، کما نہیں سکتا۔ میں بستر پر پڑا اپنی موت کا انتظار کر رہا ہوں۔ خود کو ختم بھی نہیں کر سکتا..... یتیم اور مسکین ہوں، سوتیلے بھائی نے اتنا بھی کر دیا بہت ہے۔ لیکن زندگی ایسی بھی مجبوری نہیں کہ اسے تم جیسی پھول لڑکی پر ظلم کر کے عذاب بنا لیا جائے۔ جاؤ..... میری طرف سے اجازت ہے۔ جاؤ..... میں تمہیں آزاد.....''

''کہاں چلی جاؤں؟'' وہ حیران اس بیمار کو دیکھ رہی تھی، جو آج ہی اس کا شوہر بنا تھا۔

''جہاں سے آئی ہو۔''

''میں طوائف رہی ہوں۔ کاروان حج کے ساتھ جا رہی تھی، پھر فروخت ہو گئی.....'' کہتے کہتے وہ پھر سے رو دی۔

''تم طوائف نہیں فرشتہ ہو جنت! بھلا مجھ جیسے بے بس لوگوں کی مدد کے لیے فرشتوں کے علاوہ کسے بھیجا جاتا ہے۔''

وہ سارا جہاں اس بات کو سن کر بھول گئی تھی۔

''کیا کہا.....؟''

''تم فرشتہ ہو جنت! تم نے اپنا سانس نہیں روکا، ناک پر ہاتھ نہیں رکھا، منہ نہیں بنایا۔ تم نے میرے زخموں کو ایسے صاف کیا..... ایسے..... ایسے کہ.....'' وہ پھر سے رو دیا۔ کتنی شرم سے رو رہا تھا۔

آمنہ نے طوائف، طوائف، طوائف کے بعد پہلی بار اپنے لیے ''فرشتہ'' کا لفظ سنا تھا۔ اس نے پہلی بار زمین کے کسی انسان سے اپنے لیے ''آسمانی'' لفظ سنا تھا۔ درویش کے بعد وہ پہلا انسان تھا جو اس کی حقیقت جان لینے پر بھی اس سے نفرت یا ناپسندیدگی سے مخاطب نہیں ہوا تھا۔ اس کے آنسو ایک دم سے تھم گئے۔ اس کے دل کا بوجھ ڈھل گیا تھا۔

''میرا سارا اسباب تو لینے والوں نے لے لیا، اب میری کل متاع میری بیماری ہے..... اور تم.....''

''اور تم..... کل متاع.....'' وہ کس مول پر بکی تھی، اب وہ کہتا تھا ''متاع''۔ وہ کہتا تھا فرشتہ..... وہ کہتا تھا..... کیا کمال کہتا تھا۔

''اگر میں تمہیں چھوڑ کر چلی جاؤں تو تم..... تم..... کیا کرو گے؟''

وہ جاننا چاہتی تھی کہ جو اسے فرشتہ کہہ رہا ہے، وہ خود کس درجے کا فرشتہ ہے۔

''کرنے والا کرے گا جنت! بھلا انسان بھی کبھی کچھ کر سکا ہے۔ پہلے بھی میں نے تو کچھ نہیں کیا۔''

دنیا جہاں کی تکلیفیں ایک طرف تھیں اور لاچاری ایک طرف تھی۔ اگر وہ اس کے زخم بھی نہیں دھو سکتی تھی، تو وہ دنیا کی تندرست لیکن لاچار ترین انسان تھی۔ بے بس وہ نہیں جو بستر پر ہے، معذور ہے۔ بے بس وہ ہے جو اپنے اندر انسانیت نہیں جگا پایا۔ وہ انسان ہو کر، انسانیت نہ دکھا سکتی تو پھر صاحب لبیک نہ رہتی۔

☆☆☆

صاحب کسوہ...... والدہ کسوہ...... آمنہ......

وہ اتنا بڑا محل نما گھر تھا کہ اسے محسوس ہوتا تھا کہ ساری دنیا اس گھر میں سما گئی تھی۔ ملازم بھاگے پھرتے تھے، پھر بھی اس محل کے کام ختم نہیں ہوتے تھے۔ وہ باغ کے کونے میں کسوہ کو لے کر بیٹھ جاتی تھی۔ وہاں اسے کھلاتی، نہلاتی، اور پھر سبز گھاس پر سلا دیا کرتی تھی۔

کسوہ کی نانی کا نکاح اپنی عمر سے بیس، بائیس سال چھوٹے معمولی حیثیت کے لڑکے سے ہوا تھا۔ وہ ایک بار پہلے بیوہ ہو چکی تھیں۔ بے اولادی کی مہر بھی ساتھ تھی، کوئی نکاح کرنے کے لیے راضی نہیں ہوتا تھا۔ جو ہوتے تھے، وہ والد کی دولت کے لیے ہوتے تھے۔ والد نے مرنے سے پہلے تھوڑی بہت شرافت دیکھ کر تو اس سے نکاح پڑھوا دیا تھا۔ دولت ملنے کے بعد شرافت خباثت میں بدل گئی تھی۔ ایک بیٹی کبریٰ ہوئی تو بے اولادی کی مہر زائل ہو گئی۔ لیکن بیٹوں کی خواہش میں اس نے تین اور شادیاں کر لی تھیں۔ گھر میں ان ہی تین بیویوں اور ان کی اولادوں کا ہجوم تھا۔

کسوہ...... ضعیفہ...... جنت...... انہیں اس محل میں کوئی بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ لیکن وہ محل ضعیفہ کا تھا۔ انہیں وہاں برداشت کرنا مجبوری تھی۔ ضعیفہ مرتی بھی نہیں تھی، جوانی میں آنکھوں میں خرابی ہوئی تھی۔ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ بیماری بڑھتی گئی اور پھر آنکھوں کا نور بالکل ہی بجھ کر رہ گیا تھا۔ لیکن اس کی زندگی کا چراغ نہیں بجھ رہا تھا بس۔ کسوہ کے والد بھی دوسری شادی کر چکے تھے۔ بیوی کو زمین میں دفنا کر، بیٹی کو نانی کی گود میں دبا کر فاتحہ پڑھ چکے تھے۔

اتنا بڑا گھر تھا لیکن دانے دانے پر لڑائی ہوتی تھی۔ آمنہ نے اپنا منہ سی لیا تھی، اگر وہ اس سے گھر کے کام کرواتی تھیں تو وہ کر دیا کرتی تھا۔ ضعیفہ نے منع کیا تھا کہ وہ کسوہ کے لیے آئی ہے، گھر کے کاموں کے لیے نہیں لیکن وہ نرمی سے ضعیفہ کو خاموش کروا دیا کرتی تھی۔ اس کے پاس حق ہی کہاں تھا کہ وہ حقوق اور انصاف کی بات کرتی۔ اس گھر میں دنیا جہان کی آسائشیں تھیں لیکن بس انسانیت نہیں تھی۔ وہاں سب آقا بنے ہوئے تھے کہ شیطان کے غلام بن گئے تھے۔ ملازموں کو جوتیوں سے مار لیتے تھے۔ انہیں کئی کئی دن بھوکا رکھتے تھے۔ کسی پر زیادہ غصہ آتا تو اس پر کوئی نہ کوئی الزام لگا کر نکال دیتے تھے۔

"اور برا یہ طوائفوں کو کہتے ہیں۔ صرف اس لیے کہ وہ اپنے گناہ کے لقب سے یاد کی جاتی ہیں۔ اور ان کا کیا، جو اپنے گناہ چھپا کر، شریف بن کر، گناہوں کی ادائیگیوں کے سب انداز یاد کر لیتے ہیں؟" وہ ضعیفہ سے کہہ رہی تھی۔ وہ نابینا تھیں لیکن شعور میں بیدار تھیں۔

"ٹھیک کہا آمنہ! بدنصیب ہے وہ انسان جس کی ساری انگلیاں دوسروں کی طرف اٹھی ہوئی ہیں، اور ایک بھی انگلی اس کے اپنے گریبان کی طرف اشارہ کرنے سے قاصر ہے۔ جب تک والد زندہ تھے، گھر میں رحمت کے فرشتوں کا آنا جانا تھا، اب تو گھر سے وحشت ہی ختم نہیں ہوتی۔ میں صلوۃ سے اس وحشت کو دور بھگانے کی کوشش کرتی ہوں، لیکن ایک میری صلوۃ سے وحشتوں کے اندھیرے کیسے کم ہوں گے...... تکبیر تو سب پر فرض ہے نا......"

تکبیر فرض ہے...... اور تعظیم دوسرا فرض۔

اس کے اپنے دل سے وحشتوں کے اندھیرے کم ہو رہے تھے۔ کسوہ کی والدہ حافظ قرآن تھیں، تو وہ بھی کسوہ کو گود میں لے کر صبح و شام قرآن پڑھتی رہتی تھی۔ کسوہ کے لیے وہ درس لینے لگی تھی۔ جو کچھ سمجھ کر، سیکھ کر آتی تھی، وہ کسوہ کو سناتی رہتی تھی۔ کسوہ کوئی بات نہیں سمجھتی تھی لیکن وہ اس کی شفاف پلیٹ پر "تحریر حق" لکھ رہی تھی۔ اسے کسوۃ الکعبہ بنانا تھا۔ اس جماعت کا حصہ بنانا تھا جس میں نیک اور پرہیزگار والدین کی اولادیں شامل ہوتی ہیں۔ جو زیر لب قرآن پڑھتے ہوئے، غلاف کعبہ بناتے ہیں۔ یہ ضروری تھا کہ اس کے دل و دماغ کو شفاف کیا جائے۔ روح کو نیک اور دل کو بیدار کیا

جائے..... رب کعبہ کے گھر کے، غلاف کعبہ کے لیے پہلے اسے "پاک" کیا جائے۔

وہ سب ملازموں میں سب سے خوب صورت تھی۔ وہ اپنا چہرہ ڈھانپ کر رکھتی تھی۔ گھر میں مرد ملازم تھے، ورنہ بڑی عمر کی عورتیں۔ اس کی عمر کی لڑکیاں نہیں تھیں۔

نواص کی بیویاں نہیں چاہتی تھیں کہ وہ وہاں رہے۔ اس کے وہاں قیام کو زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ خادموں میں چہ مگوئیاں ہونے لگی تھیں کہ جلد ہی نواص آمنہ سے بھی نکاح پڑھوالے گا۔ وہ اتنی خوف زدہ ہوگئی کہ حد نہیں۔ وہ اپنی جان پر سو سختیاں جھیل چکی تھی، لیکن یہ سختی نہیں جھیل سکتی تھی کہ ایسا ظالم اور بد نیت انسان اسے اپنے نکاح میں لے۔

لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی، اس کی تیسری بیوی نے، اس کے حسن سے خائف ہوکر، اپنی ہونے والی سوتن پر بہانے سے گرم تیل گرا کر اسے نواص کے نکاح سے خارج کروادیا۔ تڑپ تڑپ کر کروٹیں بدلتے، اس رات وہ بڑبڑا رہی تھی۔

"عزیزہ! تم نے کہا تھا قحبہ خانے سے باہر بہت سکھ ہیں۔ بہت عزت ہے۔ آؤ حق کی طرف کہ اس کے سوا کوئی راستہ نہیں۔ تم نے کہا تھا، آمنہ! اپنی قدر جاننا چاہتی ہو تو قحبہ خانے سے باہر نکل جاؤ، میں نکل آئی تھی۔ دیکھو..... دنیا نے میری کیا قدر کی۔ مجھے ماں یاد نہیں آئی، میں نے اسے دیکھا نہیں۔ مجھے..... ہاں مجھے اللہ یاد آتا ہے..... دیکھا تو میں نے اسے بھی نہیں۔"

وہ سسک رہی تھی۔ ہچکیاں لے رہی تھی۔

"اللہ..... کیا وہ جانتا ہے کہ آمنہ تکلیف کے پہاڑ سر کر رہی ہے۔"

"اللہ..... کیا وہ بھی میری اتنی ہی قدر کرتا ہے۔ جتنی دنیا نے کی۔"

☆☆☆

دنیا..... اس کا یہ مقام ہے کہ اس کو بنانا پسند کیا گیا۔

دنیا..... اس کی یہ اوقات ہے کہ اسے دھوکے کا گھر کہا گیا۔

زمین اپنے سارے خزانے الٹ دے اور انسان کی جھولی بھر دے، پھر بھی انسان کے لالچ کا پیٹ خالی ہی رہے گا۔ وحشت کی ایک ابتدا لالچ سے بھی ہوتی ہے۔ وحشت کی ایک ابتدا سب کچھ پالینے کی ہوس سے بھی آتی ہے۔

ان کی انگلیاں کٹتی جارہی تھیں۔ ان کی کمریں کوڑوں سے، ورنہ گرم سلاخوں سے داغی جارہی تھیں۔ جواہرات سے طون کا صندوق بھرتا جارہا تھا۔ آئے دن منڈیوں سے بچیاں خرید کر لائی جارہی تھیں۔ زہریلی، ولدلی زمینوں پر ہاتھ مارنے سے وہ عجیب وغریب بیماریوں کا شکار ہوچکے تھے۔ ان کے زخم کانٹے دار جھاڑیوں جیسے ہوچکے تھے۔ کانٹے تھے، چبھتے تھے، رستے تھے۔

تین مہینے گزر چکے تھے، ان کے ہاتھ کچھ نہیں آیا تھا۔ وہ سب کو قطار میں کھڑا کر کے، انگلیاں کاٹتے جارہا تھا۔ پنڈلیوں میں دہکتی سلاخیں پہلے ہی داغی جاچکی تھیں۔ خوف سے بچیوں کی ہچکیاں بندھی تھیں۔ کیسے کیسے گڑگڑا کر وہ اس سے رحم مانگ رہی تھیں۔ بے رحمی کا شکار عورتیں جب تھیں۔ وہ اتنی انگلیاں کٹوا چکی تھیں، اتنا گڑگڑا چکی تھیں کہ اب سمجھ چکی تھیں کہ گھنے جنگلوں میں آسمانی ہوائیں نہیں چلا کرتیں۔

عزیزہ قطار میں سب سے آخر میں کھڑی تھی۔ وہ چند موتی کھود نکالنے میں کامیاب ہوچکی تھی اور اسے بخش دیا گیا تھا۔ لیکن اس کے علاوہ ایک ایک کو سبق سکھانے کا ارادہ کرلیا گیا تھا۔ بچیاں خون کے آنسو رو رہی تھیں۔ درخت دیو بن گئے تھے اور جھاڑیاں ڈائنیں۔

ایک بچی تو بالکل آمنہ جیسی تھی۔ روتی تھی تو عزیزہ کا دل کھنچتا تھا۔ وہ انہیں اپنے نوالے دیتی رہی تھی۔ ان کے زخموں پر مرہم بنا بنا کر لگاتی رہی تھی۔ ماں..... ماں کی پکار کرتے ان کے دلوں کو اپنے سینے

https://reading.urduforum.net

ے لگاتی رہی تھی۔

وہ سب کی سب آمنہ تھیں...... جنت تھیں۔ عزیزہ تھیں۔

وہ اپنے دل کے ٹکڑے بازار میں فروخت ہوتے ہوئے دیکھ چکی تھی۔ وہ دیکھ چکی تھی کہ کس کس خصلت کے لوگوں نے انہیں خریدا ہے۔ اس کا دل جانتا تھا کہ وہ اب تک کیسے صبر کے گھونٹ بھر کر زندہ تھی۔ اب پھر سے وہ کیسے انہیں موتیوں کے مول پر جان سے جانے دیتی۔ وہ کیسے ان کی انگلیاں کٹتے ہوئے دیکھ لیتی۔

"طون! میری بات سنو...... رک جاؤ...... میں تمہیں ایک بڑا خزانہ ڈھونڈ کر دوں گی...... تم میری آمنہ کو چھوڑ دو۔"

بچی کی انگلی حبشی کے ہاتھ میں تھی، خوف سے بچی کی چیخوں سے جنگل گونج رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے لپک کر بچی کے پاس آئی تھی، اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"کیا کہا؟ خزانہ......" طون عزیزہ کی باتوں کو اتنی اہمیت تو دیتا تھا کہ اپنے فیصلوں پر نظر ثانی کرلیا کرتا تھا۔

"ہاں...... اللہ کی مدد سے...... مجھے چند دن دو۔ میں تمہیں خزانہ ڈھونڈ دوں گی۔ تم ان سب کو چھوڑ دو۔"

"تو آج کیوں نہیں ڈھونڈ دیا؟" وہ تمسخر سے ہنس دیا۔

"آج کی ناکامی کا سورج غروب ہو چکا ہے، کل کامیابی کا سورج بلند ہوگا۔"

"مجھے خزانہ چاہیے...... تمہاری نصیحتیں نہیں۔"

"تمہیں وہی ملے گا جو تمہیں چاہیے...... جو تمہارا ہے۔" (پتھر، سزا، اللہ کی ناراضی)۔

"اگر خزانہ نہ ملا تو تمہاری انگلیاں کٹیں گی، میں نے تمہیں چھوڑا ہوا تھا۔ ابتدا تم سے ہوگی۔"

ابتدا اس سے ہی ہوئی تھی۔

خزانے کے نام پر اس کے ہاتھ چند سونے کے سکے اور کچھ موتی آئے تھے، اور اس کے انعام میں اس کے بائیں ہاتھ کی دو انگلیاں جڑ سے کاٹ دی گئی تھیں۔ اس کی سسکیاں زمین کے ہر خزانے سے لپٹ گئی تھیں اور وہ ان سے کہتی تھیں۔

"جو دل کی زمین کھود کر، مقصود حقیقی کا خزانہ نہ نکال سکے، اس کے نصیب میں "زمین کے خزانے" ہی آتے ہیں اور ایسے لوگ بدنصیب کہلاتے ہیں۔" (کلام حق)

اس کی قسمت اچھی تھی، اسے کچھ نہ کچھ ملتا رہا تھا۔ وہ ایک جگہ اکٹھا کرلیا جاتا تو خزانہ ہی بنتا...... لیکن باقی کے لوگ...... وہ خالی ہاتھ رہ جاتے۔ وہ دن میں ملنے والی اپنی چیزیں ان میں بانٹتی رہی تھی۔ اس نے آمنہ، جنت کو بچالیا تھا، لیکن وہ خود کو نہیں بچا سکی تھی۔ اس نے ہر آزمائش پر لبیک کہہ دیا تھا۔ غلام بن کر اگر وہ کوئی عظمت دکھا سکتی تھی تو اس نے عظمت کا وہ تاج اپنے سر پر پہن لینا چاہا تھا۔ تو وہ رکھ چکی تھی...... کیونکہ بچیوں کی آہیں، سسکیاں، ماں ماں کی پکار پر اس کا دل چیر پھاڑ ڈالتی تھیں۔

"قربانی اپنی جان عزیز پیش کردینے کا نام ہے۔ کسی نے اپنی جان بچا کر بھی عظمت پائی ہے۔" (کلام حق)

☆☆☆

امیر کاروان نے دیوانوں کی طرح اپنے تین حاجی ڈھونڈے تھے۔ لیکن اسے ان کا کوئی نشان نہیں ملا تھا۔ وہ ہر اس عہدے دار سے ملا تھا، اس کی مدد لی تھی جس کی مدد سے ڈاکوؤں کا یا ان تینوں کا کوئی نشان مل سکتا۔ نشان ملا تھا تو بس اتنا کہ انہیں چور بازار میں سر بازار نیلام کیا گیا تھا۔ یہ بات سن کر وہ کھڑا کھڑا لڑکھڑا گیا تھا۔ وہ مرد تھا...... لیکن اس کی آواز بیٹھ گئی اور اس کی آنکھوں میں نمکین ستارے چمکنے لگے تھے...... یہ وہی کیفیت تھی جو والدہ کی شہادت کا سن کر ہوئی تھی۔

"کیا کہا......" حلق سے آواز نہیں نکلی تھی، اس نے بتانے والے کے شانے کا سہارا لیا تھا کہ وہ گرنہ

جائے۔

"وہ چور بازار میں نیلام ہوئی تھیں ابن موسیٰ!
ایک عرصہ یہ بات آس پاس بہت مشہور رہی ہے۔ کچھ کہتے تھے تین حاجی فروخت ہوئے...... کچھ کہتے تین طوائفیں۔ وہ کون تھیں ابن موسیٰ!؟"

"وہ...... وہ...... ہماری تین آزمائشیں تھیں......" ابن موسیٰ نے اپنی نم آنکھیں رگڑیں۔

"وہ حق تھیں...... جنہیں ہم نے باطل کیا۔"

وہ واپس مصر لوٹ گیا کہ شاید درویش تک کوئی خیر خبر پہنچی ہو۔ عزیزہ بہت ذہین اور تند تھی، شاید کوئی چارہ کرنے میں کامیاب ہو گئی ہو۔ لیکن درویش کی صورت دیکھتے ہی ابن موسیٰ سب سمجھ گیا۔ بھلا بازاروں میں بکنے والی چیزیں بھی کبھی واپس آئی ہیں۔

"مجھے معاف کر دو درویش! میں نے اپنا کاروان لٹوا دیا۔ اپنے حاجی گنوا دیے۔"

درویش خاموش رہا لیکن کوئی بھی دیکھ سکتا تھا کہ وہ کس تکلیف سے گزر رہا ہے۔ اس نے درویش سے چور بازار کی بات پوشیدہ رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ اس بزرگ کو اور تکلیف نہیں دے سکتا تھا۔

"مجھے معاف کر دو درویش! ابن موسیٰ کو معاف کر دو۔"

"امیر کاروان! میرا تم سے کوئی شکوہ نہیں۔" درویش نے "امیر" کو مخاطب کیا۔

"ہونا چاہیے...... ہونا چاہیے۔ جیسے ابن منصور نے دہائیاں دی تھیں، تم بھی دو۔ لعن طعن کرو۔"

"وہ میری بیٹیاں تھیں امیر! اللہ جانتا ہے کہ میں ہر سانس، آہ میں کاٹ رہا ہوں۔ ان کی سلامتی کی دعاؤں کو عبادت بنا لیا ہے۔ حاجیوں کی زبانی اس واقعہ کو سن کر میرا دل دنیا کی کم ظرفی پر بلبلا اٹھا تھا۔ میرے پھولوں کو صحرا میں لے جا کر مسل دیا گیا۔ میری تبلیغ کی خوشبو کو گناہ کہا گیا...... ان کی توبہ کو مذاق بنایا گیا۔ ان کے ماضی کو ان کی سزا بنا دیا۔ یہ دنیا، یہ لوگ...... میں حق پر قائم رہوں تو بد دعا کیسے دوں۔ میں بد دعا دوں تو پھر حق پر کیسے رہوں؟ کاش ایک پل کے لیے میں "حق" کو بھول جاؤں اور پھر اپنی جھولی میں آگ بھر بھر کر ان لوگوں کی طرف اچھال دوں۔ جن پر اللہ نے کوئی قہر نازل نہیں کیا، ان پر دنیا نے عذاب کیوں اتارا۔"

ایک باپ اپنی اولاد کے لیے کیسے تڑپ رہا تھا، ابن موسیٰ دیکھ سکتا تھا۔

امیر کاروان......

☆☆☆

امیر کاروان کو مصر میں حراست میں لے لیا گیا تھا۔ اس کی آمد کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ اس کے پیچھے شاہی دستے بھی بھیجے گئے تھے لیکن وہ سب کو جل دے چکا تھا۔ ابن منصور نے اس کے کھاتے میں سارے گناہ ڈال کر اسے عہدے سے برخاست کروا دیا تھا۔

وہ ہنس رہا تھا۔ اس نے یہ عہدہ رکھ کر اب کرنا بھی کیا تھا۔ جب وہ یہ ہی نہیں سیکھ سکا تھا کہ ایسے کاروانوں کے امیر نہیں بنتے، جو حق کی طرف سفر کرتے ہوں اور حق سے ہی نابلد ہوں۔ جو اس گھر کا طواف کرنے کا ارادہ کرتے ہوں، جس کا طواف عرب و عجم کرتے ہوں، گورے اور کالے کرتے ہوں، نیکوکار اور بھٹکے ہوئے بھی کرتے ہوں اور پھر وہ "حسب نسب" کی بات کرتے ہوں۔ بھلا عبادتوں میں حسب نسب ہوتے ہیں؟

"صرف اس لیے کہ میں نے طوائفوں کو کاروان میں سفر کی اجازت دی؟" وہ مجلس کے ارکان سے پوچھ رہا تھا۔

"نہیں...... اس لیے کہ تم نے اصولوں کی بے حرمتی کی۔"

"اصول؟ کون سے اصول؟ کہ غلاف کعبہ کے ساتھ گستاخ نہیں جائیں گے؟ کیا آستین کا سانپ ابن منصور گستاخ نہیں؟ یہ طوائف نہیں کہلاتا، لیکن یہ طوائفوں سے بدتر ہے۔" اس نے آواز کو بلند کر کے کہا تھا۔

''اصول، اصول ہوتے ہیں ابن موسیٰ! ہم پر ہمارے رب کے گھر کی حرمت فرض ہے۔''

''اس گھر کی حرمت سے پہلے اس رب کے ہر حکم کی حرمت فرض ہے۔ ہم پر...... سب پر اور یہ اس کا حکم ہے، عرب و عجم برابر ہیں۔ کسی کو کسی پر کوئی برتری نہیں۔''

''یہاں نسل کی نہیں عمل کی بات ہو رہی ہے۔''

''نہیں محترم! یہ کلمہ حق، دین حق کی بات ہو رہی ہے۔ مجھے بتا لینے دیں کہ میں نے اپنا کاروان، اپنے تین حاجی لٹا کر، دین کے حق کو سمجھ لیا ہے۔ وہ کسی کو یہ حق نہیں دیتا کہ کسی دوسرے سے اس کا جائز حق چھین لیا جائے۔ جو کسی ایک کے حق سے پھر گیا، وہ دین پر کامل کیسے رہا؟ جس نے کسی ایک کا حق چھین لیا وہ مومن کیسے رہا...... اس زمین کا ہر انسان اپنے عمل کا ذمہ دار خود ہے۔ گستاخ تو وہ ہے جو انسانوں پر ''حد'' لگاتا ہے۔

مجھے بتا لینے دیں کہ دین حق کو جرأت سے بلند کرنے کا نام ہے۔ مجھے قاہرہ سے، میدان کاروان سے ہی ان تینوں کو پورے اعزاز کے ساتھ شامل کرنا چاہیے تھا۔ پوری جرأت سے...... مجھے انہیں چھپانا نہیں چاہیے تھا۔ جو لوگ انہیں کاروان میں شامل کرنے سے انکار کرتے، ان کے خلاف جہاد کرنا چاہیے تھا۔ انہیں چھپا کر میں نے گناہ کیا۔ اسی لیے میرا کاروان لٹا۔ اسی لیے میں نے بدو کے جوتے کی نوک سہی۔ اسی لیے...... اسی لیے...... میں اس عہدے سے خود کو سبک دوش کرتا ہوں۔ جس امیر کاروان، امیر جماعت میں، کلمہ حق بلند کرنے کی جرات نہ ہو، اس پر حق پر چلنے والے کاروانوں کی امامت بھی جائز نہیں۔''

مجلس میں سناٹا چھا گیا تھا۔

''اگر مصر نے حق کو تسلیم نہ کیا، حق کو لاگو نہ کیا۔ تو پھر...... اس کے ساتھ بھی وہی ہوگا، جو میرے کارواں کے ساتھ ہوا۔ حج مدرس ہے اسباق کا۔ یہ طواف ہے امیر غریب، کالے گورے، مرد عورت، جوان بوڑھے، محرم، نامحرم، نسل، نسب، عمل...... ہر امتیاز مٹا کر، انسان ہو کر، بندگان ہو کر، برابر ہو کر، برابر سمجھ کر، لبیک کہنے کا۔

حج کیا ہے؟ کیا یہ برابری نہیں؟ تو پھر مومن اور گناہ گار کیوں نہیں۔ جب احرام جسم کو ڈھانپ لیتا ہے تو کیا اللہ کا رحم گناہ کو نہیں ڈھانپ لیتا۔ اللہ تک جانے کے راستوں پر کبھی دروازے نہیں ہوتے۔ ہر راستہ ہمیشہ کھلا ملتا ہے۔ اللہ نے سب کو اپنی طرف آنے کی اجازت دی ہے، پھر یہ اجازت ہم نے کیسے روک لی۔ یہ امیر کی، خلیفہ کی، فقیر کی، عالم کی عبادت نہیں ہے۔ یہ ''برابری'' کی عبادت ہے۔ جس نے اپنا نفس قربان نہیں کیا، باطل کی شہ رگ پر چھری نہیں پھیری، اس نے کچھ قربان نہیں کیا۔ جس نے اپنے اندر کے شیطان کو کنکریاں نہ ماری ہوں، وہ دکھاوے کی کنکریاں مار کر کیا کرلے گا؟''

''تم تقریر اچھی کر لیتے ہو ابن موسیٰ۔'' ابن منصور نے جل کر کہا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ ارکان مجلس متاثر ہو رہے ہیں۔

''میں یہ جرات پا چکا ہوں اور بلند بانگ کہتا ہوں۔ ''جس میں حق نہیں...... اس کا حج نہیں۔''

جس میں حق نہیں...... جسے حق کی سمجھ نہیں......

استاد محترم اور اس کے کچھ بااثر دوست مصر آچکے تھے۔ مہینوں یہ مقدمہ چلتا رہا تھا۔ اسے قید خانے بھیجنے کا ابن منصور کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکا تھا۔ اسے قید کر دیا جاتا تو بھی اسے پرواہ نہ ہوتی، لیکن اس نے صحرا میں سیکھے ایک سبق پر عمل کرنے کے بارے میں سوچ لیا تھا۔

''پہلے جماعت کے دشمنوں کا سر کچلتے ہیں، کیڑے مکوڑوں کو بچھو بننے کی مہلت نہیں دیتے۔''

بچھو کے لیے وہ سارے ثبوت اکٹھے کر کے لے آیا تھا۔ اس نے کاروان حج میں جاسوسوں کو جگہ دی تھی۔ وہ بدوؤں کے ساتھ ملا ہوا تھا۔ شراکت داری کی تھی۔ اس نے چور بازار میں فروخت ہونے

والیوں کی قیمت ابن منصور سے لی تھی۔

اتنا سب ہونے پر بھی وہ اس قابل نہیں رہا تھا کہ قاہرہ کی گلیوں سے گزر سکتا۔ وہ اپنا اسباب سمیٹنے جا رہا تھا۔ بچے کھیل رہے تھے اور وہ رک کر اس امیر کو دیکھ رہے تھے، جس کے بارے میں سال بھر عجیب و غریب باتیں گردش کرتی رہی تھیں۔ جسے بہت سے نئے لقب دیے گئے تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے اس امیر کو جس کے ساتھ جانے والے کاروان پر حملے کی کہانیاں، گناہ کی طرح بدنام ہوئی تھیں۔

وہ وقت کے بدلنے پر ہنس دیا تھا۔ اسے سلام کرنے والے اب اس سے سوال کرنا بھی پسند نہیں کر رہے تھے۔ وہ کاروان لٹا بیٹھا تھا۔ واقعی میں اپنا سب کچھ لٹا بیٹھا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ دنیا کا دوسرا رخ ہے۔ اس نے طلوع آفتاب دیکھا تھا، اب غروب آفتاب دیکھنا بھی ضروری تھا۔ وہ ہنس دیا، وہ مسکرا دیا۔

''کیا اب بھی تم امیر بننا چاہتے ہو؟''

گھر کی طرف جاتے ہوئے، کھیل کود میں مصروف بچوں میں سے وہ اس بچے سے پوچھ رہا تھا جس نے اس سے کہا تھا کہ وہ امیر بننا چاہتا ہے۔

بچے نے کچھ دیر سوچا اور پھر سر ہلا دیا۔ ''میں ابن موسیٰ بننا چاہتا ہوں.....''

''ابن موسیٰ.....کیوں؟''

''سنا ہے آپ ان لوگوں کو کاروان میں لے گئے تھے، جنہیں کوئی پسند نہیں کرتا تھا۔ میں بھی ایسا ہی کروں گا۔''

''کس لیے.....؟'' وہ بچے کی زبان سے، آسمان کا فرمان سننا چاہتا تھا۔

''والدہ کہتی ہیں، جسے ساری دنیا ناپسند کرے، اسے پسند کرنے کی نیکی ضرور کرنی چاہیے۔ جسے ساری دنیا دھتکار دے، اسے گلے سے لگانے کا کام ضرور کرنا چاہیے..... میں بھی یہ کروں گا امیر! میں بالکل آپ جیسا بنوں گا.....''

اس نے جھک کر بچے کے گال چوم لیے۔

''ہاں! بالکل! ایسا ہی کرنا۔ جسے ساری دنیا گالیاں دے، جس پر ساری دنیا تھوک دے۔ اس کے آنسو پونچھ کر، اسے سینے سے لگا کر، مخلوق خدا میں برابری کا علم بلند کرنے کا کام ضرور کرنا۔ اور اپنی محبت کا اعلان شجاعت سے کرنا، پھر تمہارا کاروان کوئی نہیں لوٹ سکے گا۔ تمہاری منزل کوئی نہیں چھین سکے گا۔''

اسباب سمیٹ کر وہ اپنے گھوڑے پر بیٹھ گیا۔

''خدا حافظ قاہرہ! میں حق کو واپس نہ لا سکا، تو خود بھی واپس نہیں آؤں گا۔''

''حق کی طرف'' ''خوش آمدید'' امیر کارواں۔ تم ناکام بھی رہے تو کامیاب ہو گے۔'' قاہرہ نے جواباً کہا۔

☆☆☆

زندگی کی مشقتیں ختم نہیں ہوتیں، انسان کی ہمت بھی تو کم نہیں ہوتی۔ اس کی ہتھیلیاں مراد کے زخم چرا بیٹھی تھیں۔ ان پر بلبلوں کی طرح زخم ابھر رہے تھے۔ اس نے خود کو اندھیرے میں پایا تھا۔ تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔ کئی دنوں سے بارش ہو رہی تھی۔ وہ ایسے دل دہلا دینے والے طوفان میں درخت سے تازہ پتے توڑنے کے لیے آئی تھی۔ جو صحرا کی ساری بجلیاں خود پر سہہ چکی تھی، اسے اب کسی طوفان سے ڈر نہیں لگتا تھا۔ وہ بھیگ چکی تھی، سردی سے کانپ رہی تھی۔ پتے توڑتے ہوئے اس کی نظر اپنے جسم پر بننے والے داغوں پر پڑی تو اس نے جھٹکے سے آستین کو اُدھیڑ کھینچا اور دیکھا..... گردن پر ہاتھ پھیرا..... وہاں بھی کچھ محسوس ہو رہا تھا..... وہ اتنی حواس باختہ ہو گئی کہ ہوا کے تیز جھکڑ کے ساتھ کئی قدم دور کھنچتی چلی گئی۔

آسمان کی کڑکتی بجلیوں میں، اس نے اپنی ہتھیلیوں کو دیکھنا چاہا۔ وہ ہاتھوں کو اوپر نیچے لہرا کر، آنکھوں کے سامنے لا کر دیکھ رہی تھی۔ وہ..... وہ..... مراد کی ہتھیلیوں جیسی تھیں۔ تازہ پتوں کا ڈھیر وہیں پڑا رہ گیا تھا اور وہ ساری دنیا کو پیچھے چھوڑ کر شہر کی طرف بھاگی تھی۔ ایسی طوفانی بارش میں، وہ سب

سارا جہاں بھلا کر بھاگ رہی تھی۔ وہ روئی جا رہی تھی۔ وہ کمزور تھی، وہ ناتواں تھی۔

"تم اتنی خوف زدہ کیوں ہو۔" ایسی طوفانی بارش میں، وہ جس حال میں طبیب کے پاس آئی، وہ اس پر ترس کھائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

"میری ہتھیلیاں مراد کے ہاتھوں جیسی کیوں ہو رہی ہیں؟"

"بیماری تم تک آئی تو ہے۔ بڑھ بھی سکتی ہے۔ اگر تم کچھ عرصہ اس گھر سے دور رہو تو یہ ٹھیک ہو سکتی ہے۔"

"دور...... کہاں؟" وہ ہونقوں کی طرح طبیب اور خود سے پوچھ رہی تھی۔

"اتنا زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، ان پتوں کو لیپ بنا کر ان پر لگا لو۔ ذرا احتیاط کرو، فائدہ ہوگا۔"

فائدہ تب ہوتا، جب پہلے ہی نقصان نہ ہو چکا ہوتا۔ مراد کے زخم صاف کرنے کے بعد اسے شہر میں چند لوگوں کے گھر جانا ہوتا تھا، وہاں کام کرنا ہوتا تھا۔ اس مشقت سے وہ اپنا اور مراد کا پیٹ پالتی تھی۔ نکاح کے چند دنوں بعد تک مراد کے سوتیلے بھائی کے گھر سے اناج آتا رہا تھا پھر اس نے آ کر سنا دیا کہ وہ مزید ان کا پیٹ نہیں پال سکتا۔ وہ چپ چاپ سنتی رہی۔ وہ چلا گیا تو مراد نے کہا۔

"میرا سارا حصہ میرا یہ بھائی ہڑپ کر چکا ہے۔ دیکھو اس کا دل اتنا تنگ ہو چکا ہے کہ یہ اناج کے چند دانے دینے پر بھی راضی نہیں ہے، حق دار کو حق نہ دو، تھوڑا رحم ہی دے دو۔"

رحم کی تلاش میں وہ شہر چلی گئی تھی۔ وہ اس کے سوتیلے بھائی سے ملی تھی کہ وہ اسے ایک چکی لے دے، وہ آٹا پیس کر اپنا پیٹ بھر لے گی۔

"تمہیں آٹا دے گا کون؟ جس جگہ تم رہتی ہو، وہاں سے کوئی ایک تنکا نہیں لے گا۔" اس کی بات ٹھیک تھی لیکن لہجہ بہت خراب تھا۔

وہ گھر گھر گئی، اسے تین جگہ پر کام مل گیا تھا۔

نہیں باغ کی صفائی کا، نہیں چکی پیسنے کا، نہیں پانی بھرنے کا۔ کنوئیں سے پانی بھرنے کا کام اس کے لیے سخت رہتا تھا۔ دور پچھواڑے سے کنوئیں سے پانی بھر کر، دور اندر لانا، پینے کے برتن بھرنا، استعمال کے برتن بھرنا۔ آرائش کے حوض صاف کرنا، انہیں بھرنا۔ پانی گرم کرنا، مردانہ، زنانہ حمام بھرنا۔ رات واپسی پر پہلے مراد کے زخم صاف کرنا۔ اسے کھانا کھلانا، اور پھر خود کھانا۔

"میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ میرا بوجھ تم پر سے آسان کر دے۔"

وہ جب نوالے بنا کر مراد کے منہ میں ڈالتی تھی تو وہ بے چارا آبدیدہ ہو جاتا تھا۔ ہر بار ہی ہو جاتا تھا۔ وہ کچھ ایسا حساس رہا تھا کہ جب جب اس کی طرف دیکھتا تھا، شرمندگی سے نظریں جھکا لیتا تھا۔ اور وہ، اپنی چادر سے اس کی نم آنکھیں صاف کیا کرتی تھی۔

"حالات کیسے بھی ہوں، خود کو بوجھ نہیں سمجھنا چاہیے مراد! جسم ناکارہ ہو سکتا ہے، لیکن روح سلامت رہتی ہے۔"

"بڑی شرم کی بات ہے، میری بیوی شہر میں گھر گھر......"

"کیسی شرم؟ کرم یہ تو نہیں کہ میں کسی بڑے گھر میں، آرام سے بیٹھ کر نعمتیں کھاؤں۔ کیا تب ہی میں خوش قسمت ہوں گی؟"

"تو کیا مجھ جیسے بیمار کی تیمارداری خوش قسمتی ہے۔"

"خود ہی تو کہا تھا میں فرشتہ ہوں۔ فرشتوں کو ایسی ہی خوش قسمتیاں نصیب ہوتی ہیں۔"

"اس کوٹھری میں سانس نہیں لیا جاتا، تم ناک پر ہاتھ تک نہیں رکھتیں۔ یہیں سو جاتی ہو۔"

"اس کوٹھری میں اللہ کی رضا ہے۔ بتاؤ ناک کیسے ڈھانپ لوں؟ اگر میں تمہارے بستر پر ہوتی، تو کیا پھر بھی میں اپنی ناک ڈھانپ لیتی؟"

"تمہارا صبر ستارہ ہے جنت! تمہارا تحمل

آفتاب ہے۔"

ستارہ آمنہ نے، تین سال اس کی تیمارداری، صبر و تحمل سے کی تھی۔ اپنے نفس کے میدانوں میں بھاگ دوڑ کر، عمل صلاح کی سعی کاٹی تھی۔ لیکن اب...... اپنی ہتھیلیوں پر بنے زخم دیکھ کر تڑپ اٹھی تھی۔ ایک دم، اسے لگا کہ وہ یہ برداشت نہیں کر سکے گی۔ کوئی اس کے اندر کہتا تھا کہ وہ بھاگ جائے، چلی جائے...... سب چھوڑ دے۔

وہ واپس آئی تو کونے میں زمین پر بچھے اپنے بستر پر چپ چاپ بیٹھ گئی۔ وہ رو رہی تھی۔ مراد نے اپنے بستر سے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بھیگی ہوئی تھی۔ وہ کانپ رہی تھی...... گھٹنے کھڑے کیے، وہ دنیا سے منہ چھپا کر، دنیا سے اپنا غم بھی چھپا رہی تھی۔ وہ اتنی ہمت بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اٹھ کر اپنی بیوی کے لیے لکڑیاں جلا کر، اس کی کپکپاہٹ کم کر سکتا۔ اس کے آنسو پونچھ سکتا۔

"جنت...... کیا ہوا؟" یہ سوال پوچھتے ہوئے وہ بے چارا بڑے کرب سے گزر رہا تھا۔

جنت نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور واپس اپنا سر جھکا لیا۔

"کیا ہوا جنت؟ میری جنت۔ بتاؤ مجھے۔"

"مجھے تمہاری بیماری لگ چکی ہے مراد! میں......"

"مجھے چھوڑ دو جنت! ابھی، اسی وقت۔ یہاں سے چلی جاؤ...... جاؤ...... نکل جاؤ اس عفریت سے۔" اس کی بات کاٹ کر وہ تیز تیز بولنے لگا۔ وہ اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اس تک آ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر دھکیل دینے کی خواہش رکھتا تھا۔

"بھاگ جاؤ جنت! میرا ایک دوست رہتا ہے شہر میں، شاید وہ میری کچھ مدد کر دے۔ شاید وہ ایک بیمار کی منت سماجت کی لاج رکھ لے۔ تم قاہرہ واپس چلی جانا، وہ تمہارے لیے انتظام کر دے گا۔ جاؤ، اسے بلا لاؤ اور دو اور گواہ بھی ساتھ لے آؤ۔ میرے بھائی کو نہ لانا، وہ مکر سکتا ہے۔ میں تمہیں طلاق دے رہا ہوں۔" وہ تیز تیز بول رہا تھا، اس کے لفظ آپس میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔ وہ ہکلا رہا تھا۔

وہ حیران مراد کی شکل دیکھنے لگی۔ جو اس کا دل کہہ رہا تھا، وہ اس کوٹھری کا فرشتہ بھی کہہ رہا تھا۔

"جاؤ جنت...... اس قبر میں میرے ساتھ نہ مرنا۔ میرے ہی بستر پر نہ آ جانا...... جاؤ۔"

وہ یک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔ کیسا انسان تھا، اپنا پہلا اور آخری سہارا بھی چھوڑ رہا تھا۔ سسکتی ہوئی موت کو، خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ کیسا انسان تھا...... ایسا انسان، آج تک اسے نہیں ملا تھا۔ ایسا انسان، ساری دنیا کا ہر انسان اس جیسا کیوں نہیں تھا؟

"تم ایسے بیمار ہو...... اکیلے اور لاچار ہو۔ تم کیسے جانے کے لیے کہہ سکتے ہو......؟" وہ اپنی حیرت مٹانا چاہتی تھی۔

"میں ہی تو کہہ سکتا ہوں۔ جو میں بھگت رہا ہوں، نہیں چاہتا کہ کوئی اور بھگتے۔ چلی جاؤ میری جنت! چلی جاؤ...... اس بیمار کی درخواست مان لو۔" کہہ کر وہ رونے لگا تھا۔ اس نے ہاتھ بھی جوڑ دیے تھے۔

"میں نے اپنے سوا، دنیا کے ہر انسان سے محبت کی۔ تم سے سب سے زیادہ کی۔ اس محبت میں تمہیں تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔ اس بیمار پر احسان کرو، مجھے اس اذیت سے بچا لو۔ بیماری میں بھگت لوں گا، تمہاری اذیت نہیں بھگت سکتا جنت! تمہیں قسم ہے میری...... جاؤ ورنہ میں رو رو کر مر جاؤں گا۔"

جنت چلی گئی، دور شہر کے کنارے پر اس کے دوست کے گھر کی طرف۔ پہلے مراد نے کسی بھی مدد کے لیے یہ گوارا نہیں کیا تھا کہ وہ اپنے دوست کے پاس اپنی بیوی کو بھیجے، لیکن اب اپنی ساری غیرت کو ایک طرف رکھ کر اس نے جنت کو بھیج دیا تھا کہ وہ بس اسے یہ پیغام دے دے کہ وہ ایک بار آ کر مراد سے مل لے...... صرف ایک آخری بار۔

وہ اس طرف پیدل جا رہی تھی۔ جہاں جانے کے بعد شاید وہ واپس قاہرہ پہنچ جانے والی تھی، وہ بار

http://Paksociety.com

اپنے زخموں کو دیکھ رہی تھی، وہ دیکھ رہی تھی کہ..... جس وقت اس نے دروازے پر دستک دی اس وقت تک بھی وہ تصور میں قاہرہ پہنچ چکی تھی..... کہ.....

''جو توبہ کرے، تائب ہو جائے، اس پر دین کا بار زیادہ آجاتا ہے۔ دیکھو! تمہاری طرف شیطان نے اپنا نشانہ باندھ لیا ہے۔ ان نشانوں کو خطا کرنا، لیکن خود خطا کار نہ ہو جانا۔''

''کون..... کیا چاہیے؟'' دروازہ کھل چکا تھا۔ مراد کے دوست کی بیوی پوچھ رہی تھی۔

''کون؟'' وہ خود سے پوچھ رہی تھی۔ ''کون ہوں میں؟ کیا چاہیے مجھے؟ کیا میں حج کے لیے نہیں نکلی تھی؟ روح کی سعی کے لیے..... میں لبیک کہنے۔ حج پالینے کے لیے۔ کیا زندگی، کیا ہر عمل، کیا ہر دکھ، ہر کوشش، ہر سفر، یہ عبادت کی کیفیت نہیں؟ حج صاحب حیثیت پر فرض ہے، کیا میرا ہر عمل میری حیثیت نہیں؟ کیا میرا احرام، میرا رنگ، میری روح کا نور نہیں ہے؟ کیا وہ..... میرے ہی اندر نہیں ہے۔

''اندر آجاؤ..... تم شاید مراد کی بیوی ہو۔'' دروازہ کھولنے والی کہہ رہی تھی۔

وہ پلٹی اور بھاگتی ہوئی مراد کے پاس واپس آئی۔

''اپنی قسم واپس لے لو مراد! میں اپنی لبیک واپس نہیں لے سکتی۔''

اس نے درخت سے پتے توڑے، لکڑیاں اکٹھی کیں اور آگ جلا کر مراد کے لیے اس کی دوا بنانے لگی۔ مراد..... وہ اسے چھوڑ کر چلی جاتی تو پھر دنیا کی ہر نعمت کو خود پر حرام کر لیتی۔ اگر وہ بھی مراد کو چھوڑ دے گی تو پھر دنیا میں کہیں کوئی نیکی نہیں کر پائے گی۔ کوئی عبادت قائم نہیں کر پائے گی۔ رکوع اور سجدے میں جھک نہیں پائے گی۔ اگر مراد کو چھوڑ دیا تو..... طواف پر طواف کر کے بھی حاضری نہیں لگوا پائے گی۔

''کل صبح میں دوسرے شہر جاؤں گی، ایک ایک کر کے ہر شہر جاؤں گی۔ تمہارے لیے طبیب ڈھونڈوں گی۔ تمہیں اللہ کے حوالے کر کے جاؤں گی۔ تم مراد! دوبارہ مجھے ایسی قسم نہ دینا۔ دوبارہ مجھ سے گواہ لانے کے لیے نہ کہنا۔ میں حج کے لیے نکلی تھی اور تم سے آملی۔ دیکھو مراد! تمہارے لیے رب نے ہواؤں کا رخ پھیر دیا۔ اس رب کے لیے میں اپنا دل کیسے نہ پھیروں۔ میری منزل کے راستے میں اس نے تمہیں رکھ دیا۔ اس منزل تک پہنچنے کے لیے میں تمہیں کیسے چھوڑ دوں؟ تم سے ہو کر ہی مجھے میری منزل ملے گی۔ میرا حج، میرا رب..... میں صاحب حیثیت ہو کر جانا چاہتی ہوں مراد! اور میری حیثیت تم ہو۔ میرے صاحب تم ہو..... پہلے تمہیں صبر کا گھونٹ بھر کر قبول کیا تھا..... آج تمہیں محبت سے قبول کرتی ہوں۔''

رب البشر کی محبت کا راز ''محب بشر'' میں پوشیدہ ہے۔ انسان..... یہ رب کی محبت کا مرکز ہے۔ اس سے محبت کرنے والا، رب کی محبت کا مرکز ہے۔

(کلام حق کی تحریر)

☆☆☆

اس کی حیثیت، اس کی شان، کسوہ تھی۔ وہ اتنی بڑی ہو چکی تھی کہ مدرسے جانے لگی تھی۔ وہ روز صبح و شام اسے مدرسے چھوڑنے اور لینے جاتی تھی۔ اس نے بہت تیزی سے قرآن حفظ کیا تھا۔ وہ دوسری بچیوں میں اس لیے بھی ممتاز تھی کہ ایک صرف اس کی والدہ ایسی تھیں جس کا آدھا منہ جلا ہوا تھا۔ جب والدہ مدرسے آتیں تو بچے اسے دیکھ کر سہم جاتے تھے۔ اکثر بچے مذاق کرتے کہ کسوہ کی والدہ چڑیل ہے۔ کسوہ کو کسی نے تنگ کیا تو وہ انہیں کھا جائے گی۔

''کیا آپ چڑیل ہیں؟'' کسوہ کے دل کو کتنی تکلیف پہنچتی تھی۔

''چڑیل ہونے میں برا کیا ہے کسوہ؟'' وہ اس کا منہ چوم چوم کر تھکتی نہیں تھی۔

''چڑیلیں بری ہوتی ہیں۔'' وہ منہ لٹکا لیتی۔

''نہیں میری بچی! جو برے ہوتے ہیں، وہ تو کوئی اور ہی ہوتے ہیں۔''

"وہ آپ کا مذاق اڑاتے ہیں۔"

"لوگوں کو معاف کرنا سیکھو..... ہر بار..... ہر روز۔"

"کیا لوگ ہمیں معاف کرتے ہیں؟"

"اللہ کرتا ہے، سب کو معاف کر دیتا ہے۔ پھر ہمیں لوگوں سے کیا لینا دینا۔ تمہارا امتحان آنے والا ہے، تمہیں عالموں اور استادوں کے سامنے پیش ہونا ہے، تمہاری آزمائش ہوگی۔ تمہیں اس پر دھیان دینا چاہیے۔ جلد ہی تم اپنی والدہ کا خواب پورا کرنے والی ہو، تم کسوۃ الکعبہ کی تیاری کی سعادت حاصل کرنے والی ہو۔"

"مرحومہ والدہ کی طرح آپ بھی یہی خواب دیکھتی ہیں۔"

"میں نے سات سال یہ خواب دیکھا ہے کسوہ! صدیاں گزاری ہیں اس خواب کی تعبیر میں۔ کیسے بتاؤں کہ کیسے کیسے دن گنے ہیں، جس دن تم اس مدرسے جاؤ گی، پھر وہ غلاف بیت اللہ جائے گا۔"

"اور آپ اور میں بھی جائیں گے۔ جائیں گی نا آپ؟"

"ہاں..... ان شاء اللہ۔ بس تم ہر امتحان میں پاس ہو جانا۔ اپنے سبق بھول نہ جانا۔"

☆☆☆

وہ اپنا کوئی سبق نہیں بھولی تھی۔ ہماری عزیزہ۔

وہ جنگل سے فرار ہونے میں کامیاب ہو چکی ہے۔ وہ یہ خواب کئی بار دیکھ چکی تھی لیکن جیسے ہی وہ جنگل سے باہر نکلتی تھی، اس کے پیچھے بھاگتی، جنت اور آمنہ رونے پیٹنے لگتی تھیں۔ وہ اس سے کہتی تھیں کہ ایک تم ہی تو ہماری ڈھارس ہو، ہماری ہمت ہو، ہماری تسلی ہو۔ تم بھی ہمیں چھوڑ رہی ہو۔ کہاں جا رہی ہو عزیزہ۔

عزیزہ کہیں نہیں جا پائی تھی۔ وہ ہمت کر کے بھاگ سکتی تھی لیکن وہ انہیں نہیں بھگا سکتی تھی۔ وہ سب حبشیوں اور طون سے ڈرتی تھیں۔ وہ ان خوف زدہ رہتی تھیں کہ ایک قدم اس کی مرضی کے بغیر اٹھانے کے لیے تیار نہیں تھیں۔

طون کے خزانے بھر گئے تھے، لیکن نیت نہیں بھری تھی۔ اس نے دلدل تک سے اسے جواہر سے بھرے صندوق نکال کر دیے تھے۔ ایک غار میں وہ پانچ دن تک پھنسی رہی تھی لیکن اس کے لیے خزانہ نکال کر ہی باہر نکلی تھی۔ وہ کئی بار موت کے منہ جا کر واپس لوٹی تھی، کسی نہ کسی کی جان کا تاوان بھرتی رہی تھی۔ پانچ سال..... آمنہ اور جنت کی زندگیوں کے تاوان۔

پانچ سال..... غلام بن کر.....

اس نے جنگل کو، درختوں کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا تھا۔ پیروں کی سات انگلیاں، ہاتھ کی تین، جسم پر کوڑوں کی ان گنت ضربیں..... اس نے زمین کو کھوکھلا کر کے، اپنا آپ قربان کر دیا تھا۔ ایک ایک کو بچانے کے لیے اس نے زمین کو اس شدت سے جھنجھوڑا تھا کہ اس نے اس کی ہر پکار پر کچھ نہ کچھ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا تھا۔

جیسے جیسے وہ خزانے نکالتی جا رہی تھی، ویسے ویسے طون اس کے گرد اپنا شکنجہ کستا جا رہا تھا۔ اس کے پیروں میں ایک لمبی زنجیر تھی۔ چار میں سے دو حبشی صرف اس کے نگران تھے۔ طون سے اس کی جرات اور ذہانت چھپی ہوئی نہیں تھی۔ اس کی درویشی اور عظمت بھی۔ جب بھی اسے لالچ زیادہ ہی ستاتا تو وہ اسے ڈرانے کے لیے باقیوں کو مارنے، پیٹنے لگتا تھا۔ اس کے دل کو چوٹ پہنچا کر، وہ اپنا پیٹ بھرتا تھا۔ وہ جانتا تھا، جب جب اس کے دل پر چوٹ پہنچتی ہے تب تب وہ کوئی بڑا خزانہ نکال کر لاتی ہے۔ سب سے بڑا خزانہ نیم دلدلی زمین سے نکلا تھا۔

ایک خزانہ اس کی روح میں قید تھا، اس کی روشنی سے جہاں منور تھا۔ طون جیسا کم عقل بھی دیکھ سکتا تھا کہ جس عاجز درویش کے پیروں میں اس نے زنجیر باندھ رکھی ہے، وہ درویش اسے زمین کے سب خزانے نکال نکال کر دے دینے والا ہے۔

وہ درویش چپ تھا۔ اس نے طون کو بددعا دینے کا ارتکاب نہیں کیا تھا۔ اس نے طون کے لیے ہدایت کی دعا کی تھی۔ ہر بار اسے خزانہ پکڑاتے ہوئے وہ اتنا ضرور کہتی تھی۔

''تمہارے صندوقوں میں بند دنیا جہاں کے خزانے بھی تمہیں موت سے نہیں بچا سکیں گے۔''

''تو کیا میں مرنے والا ہوں؟''

''ہم سب مرنے والے ہیں۔ کیا کوئی ہمیشہ زندہ رہا ہے۔''

''دیکھا جائے گا۔''

''دیکھ لیا جائے گا۔ ہر اس انسان کو، جس نے حدیں پار کیں۔''

بارشوں نے جنگل میں بہت سے حشرات کی بہتات کر دی تھی۔ حبشی تک عاجز آچکے تھے۔ لیکن طون باز نہیں آرہا تھا۔ وہ ایسی جنگلی اندوہ ناک بارشوں میں بھی تحمل رکھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ دس دن تک کچھ ہاتھ نہیں آیا تو وہ ایک ایک کو کوڑے مار، مار کر جنگل کی طرف ہانک رہا تھا، دھاڑ رہا تھا' چلا رہا تھا۔

اور پھر اسی وقت...... اس کی پنڈلی کے ساتھ ایک زہریلا سانپ لپٹ گیا۔ وہ ایسا زہریلا سانپ تھا کہ حبشی تک اسے دیکھ کر بدک کر پیچھے ہٹے تھے۔ آگے بڑھ کر عزیزہ نے ایک وزنی پتھر اٹھا سانپ کو مارا تھا لیکن وہ تب تک اس کی پنڈلی میں اپنا زہر اتار چکا تھا۔ اس کا رنگ نیلا پڑ چکا تھا، اور وہ بس ایک ہی بات ہکلا رہا تھا۔

''عزیزہ! مجھے بچا لو۔ مجھے...... اپنے اللہ کے لیے۔ اپنے اللہ سے کہہ کر مجھے بچا لو۔''

عزیزہ، حیران پریشان اس فرعون صفت انسان کو دیکھ رہی تھی، اسے اللہ یاد بھی آیا تو عزیزہ کا۔ اپنے اللہ کو وہ بھول چکا تھا۔

''سب کو آزاد کر دوں گا۔ وعدہ...... مجھے بچا لو۔''

حبشی اس کی ٹانگ میں خنجر سے کٹ لگا کر خون نکال رہا تھا، وہ بھاگی ہوئی گئی اور وہ ساری جڑی بوٹیاں اکٹھی کرنے لگی جو وہ اپنے زخموں پر لگاتے تھے۔ کسی زہریلے کیڑے کے کاٹ لینے سے، کسی زہریلے زخم کے پھیلنے اور ناسور بن جانے پر۔

ایک بچی نے اس کا ہاتھ منت سے پکڑ لیا۔

''خدا کے لیے عزیزہ! یہ ظلم نہ کرو۔ مر جانے دو اسے، یہ ہمیں آزاد نہیں کرے گا۔ یہ جھوٹا ہے، یہ مکر کر رہا ہے۔ موت کو دیکھ کر ڈر رہا ہے۔''

عزیزہ نے ایک لمحہ رک کر سوچا۔ وہ طون کی بند ہوتی آنکھوں کی طرف دیکھ رہی تھی اور پھر...... پھر...... حق کی طرف۔

''بروں کا حق ہے کہ وہ برے بنیں۔ جو چاہیں کریں اور جو حق پر ہوں ان پر فرض ہے کہ وہ صرف وہ کریں جس کا حکم ہے...... ''رحم......'' (کلام حق)

☆☆☆

ہاتھوں کے زخم چھپا کر رکھنے پر بھی اسے کاموں سے نکال دیا گیا تھا۔ چکی کا کام تو اس نے خود چھوڑ دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ یہ بیماری دبا بنے۔ پانی بھرنا بھی چھوڑ دیا تھا لیکن باغ کی صفائی...... گھاس کی کٹائی۔ پودوں کی دیکھ بھال...... کیا وہ یہ بھی نہیں کر سکتی تھی۔

نہیں...... کیونکہ باغ والے نہیں چاہتے تھے کہ وہ ایسا کرے۔ پھر اسے چند ایسے بیماروں کے کپڑے دھونے کا کام مل گیا، جن کے کپڑوں کو ان کے خونی رشتے بھی ہاتھ نہیں لگاتے تھے۔ وہ ضعیف اور قریب المرگ لوگ تھے۔ ان کے خونی رشتوں کو اس کی پرواہ نہیں تھی کہ اس کی بیماری انہیں بھی لگ جاتی ہے یا نہیں۔ وہ تو پہلے ہی چاہتے تھے کہ وہ مر جائیں۔

نہ مراد کی بھوک زیادہ تھی، نہ جنت کی کوئی خواہش تھی۔ دونوں دن میں ایک وقت کا کھانا کھاتے تھے۔ زندہ تھے، کافی تھا۔ سکے اسے مراد کی دوا کے لیے چاہیے تھے۔ ہر پندرہ دن بعد وہ کسی نہ کسی طبیب کی تلاش میں جایا کرتی تھی۔ مراد کو

اللہ کے حوالے کر کے، وہ دیوانوں کی طرح طبیب ڈھونڈا کرتی تھی۔ کوئی مل جاتا تھا تو اس کے ساتھ آنے کے لیے تیار نہیں ہوتا تھا۔ جو آنا چاہتا تھا وہ سفر خرچ کا مطالبہ کرتا تھا جو جائز بھی تھا۔ جو صرف دوا دے دیتا تھا، وہ دوا مراد پر کوئی اثر نہیں کرتی تھی۔ بیمار کا معائنہ ہی نہیں کیا جائے گا تو مرض کیسے پکڑا جائے گا۔ بے قراری کے عالم میں وہ یہاں وہاں، ادھر ادھر، بھاگی پھرتی تھی۔

''تم خود کو ہلکان نہ کرو جنت! میں خوش باش ہوں.....'' مراد ہنسنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔

''تمہیں ایسے دیکھ کر میں خوش نہیں ہوں.....''

''ابھی ہو جاؤ گی۔ اچھا ذرا بتاؤ عزیزہ اور آمنہ میں سے تمہیں سب سے زیادہ کس سے پیار ہے؟'' اسے خوش کرنے کے لیے وہ اکثر پوچھ لیتا تھا۔ دونوں اکثر رات کی اس کوٹھری میں، رات گئے تک باتیں کیا کرتے تھے۔

''بھلا پاگلوں سے بھی کوئی پیار کرتا ہے۔'' کہہ کر اس نے قہقہہ لگایا اور پھر..... پھر وہ رو دی۔

''وردیش نے کہا تھا کہ عزیزہ کی جرات ایسی ہے کہ اپنا دل بھی نکال کر رکھ دے گی..... اور آمنہ..... اس کا صبر ایسا ہے کہ پہاڑوں کا سینہ شق کر دے گا۔''

صابر آمنہ.....

☆☆☆

اس نے تدبر کا سینہ شق کر دیا تھا۔ کسوہ کے لیے اس نے غور و فکر کے سب غار، اہرام (بلند) کر لیے تھے۔ کسوہ کی تعلیم و تربیت میں اس نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ جہاں سے جتنی کتابیں ملی تھیں، وہ سب اس نے پڑھ لی تھیں۔ اس نے کسوہ کو ایسے تیار کیا تھا جیسے جہاد فی سبیل اللہ میں، مومن تیار ہوتا ہے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ آزمائش میں کسوہ کی سسکی ہو۔ یا کسوہ کو ہی یہ محسوس ہو کہ اس کی مرحومہ والدہ کا خواب آمنہ کی وجہ سے ادھورا رہ گیا۔ والدہ حیات ہوتیں تو وہ یہ مقام و مرتبہ ضرور پا لیتی۔

چار سال پہلے وہ خود بھی حافظ قرآن ہو چکی تھی۔ کسوہ کے امتحان کے مہینے میں اس نے رات دن، اٹھتے بیٹھتے قرآن پڑھا تھا۔ آزمائش کے دن اس نے نماز تہجد سے نماز فجر تک دعا کا راستہ نہیں چھوڑا تھا۔ والدہ کسوہ بھی یہی کرتی نا۔ اس نے شہر کے حاجیوں کو، شہر کے کاروان حج کو پیچھے سے خیر کی دعائیں دی تھیں۔ آج اسے اپنی بیٹی کی کامیابی کے لیے دعائیں چاہیے تھیں۔ شہر کی کتنی ہی بچیاں مدرسے میں آزمائش کے لیے تیاری کر رہی تھیں، وہ سب کی کامیابی کے لیے دعا کر رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کامیاب ہو جانے والے فلاح یاب بھی ہو جائیں۔ وہ بامراد بھی ہو جائیں۔

کسوہ کے بعد اس کی اپنی آزمائش بھی تھی۔ بچی کے ساتھ اس کی ماں کا ہونا ضروری تھا۔ ضعیفہ بہت بوڑھی ہو چکی تھیں۔ کسوہ کو آمنہ کے حوالے کر کے وہ تارک الدنیا ہو چکی تھیں۔ گھر بار سب کچھ سوتنوں پر چھوڑ دیا تھا۔ انہوں نے بھی گھر کے دو کمرے ان تین لوگوں کو دے کر، باقی کا سب کچھ سمیٹ لیا تھا۔ ضعیفہ کی عاجزی اور سخاوت، آمنہ کی لیاقت، شعور، نیک طبیعت لوگوں میں بہت مقبول تھی۔ لوگ اس کی عزت کرتے تھے۔ اسے کسوہ کی والدہ کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔ سب کا ماننا تھا کہ اگر کسوہ جیسی بچی مدرسے کے امتحان میں کامیاب نہیں ہوئی تو پھر کوئی بچی نہیں ہوگی۔

وہ اپنے امتحان میں کامیاب ہو چکی تھی۔ مدرسے کے عالم اور اساتذہ اس سے بہت خوش تھے۔ قرآت، تلفظ، خوش الحانی، دین کے بارے میں اس کی معلومات، کسوۃ الکعبہ سے عقیدت، حج کی بنیادی معلومات سے وہ متاثر ہوئے تھے۔ ہر بات کسوہ کے دل سے نکلتی تھی۔ اس نے کوئی سبق یاد نہیں کیا تھا، ہر سبق سمجھا تھا، جانا تھا، پہچانا تھا۔ اس کے پاس علم تھا، رٹا نہیں۔ پھر والدہ کا امتحان تھا۔ والدہ بھی تیار تھیں۔ غور و فکر..... اس کے پاس ایک یہ استاد ہمیشہ رہا تھا اور اس استاد نے اسے بہت کچھ سکھا

دیا تھا۔

استاد نے اسے ناکام نہیں ہونے دیا تھا۔ کسوہ کی طرح اسے بھی تعریفی سند ملی تھی۔ کسوہ کو غلاف کعبہ کی تیاری کے لیے مدرسے میں داخل کر لیا گیا تھا۔ وہ اتنی خوش تھی کہ خوشی سے کچھ کھا نہیں سکی، رات کو سو نہیں پائی۔ وہ آمنہ اور عزیزہ سے باتیں کرتی رہی تھی۔

"جس غلاف کعبہ کو دیکھنے کے لیے ہم تڑپ رہی تھیں، وہ غلاف میری بیٹی بھی بنانے والی ہے۔ اعزازی طور پر ہم کسوۃ الکعبہ کو قریب سے دیکھ سکیں گے۔ ہم کاروان کے ساتھ حج کے لیے بھی جائیں گے۔ تم نے دیکھا عزیزہ! وقت کیسے بدلا۔ دیکھا تم نے، میرا مقام اور رتبہ اللہ نے کیسے بدل دیا......"

☆☆☆

مقام اور رتبہ...... حسب اور نسب......

مخمل کے کپڑے پر لکھا ہوا حسب نسب......

والد، والدہ، دادا، دادی، نانا، نانی۔ کسوہ کا حسب نسب تیار تھا، وہ دے دیا گیا تھا۔ والدہ مرحومہ کے ساتھ والدہ آمنہ کا نام بھی لکھا تھا۔ آمنہ نے یہ حسب نسب خود استادوں کے سامنے رکھا تھا۔ وہ جانتی ہی نہیں تھی...... وہ جانتی ہی نہیں تھی کہ یہ سوال بھی ہوگا۔

"والدہ آمنہ کا حسب نسب؟"

"میرا حسب نسب؟" سامنے پانچ عالم دین بیٹھے تھے۔ دوسری طرف نامی گرامی استاد۔ سامنے آمنہ دوزانو بیٹھی تھی۔

"آپ نے تربیت کی ہے بچی کی...... اس کی حقیقی والدہ تو وفات پا چکی ہیں۔" وہ اپنی بات کی وضاحت کر رہے تھے۔

آمنہ نے گردن موڑ کر ضعیفہ کو دیکھا، وہ نابینا ضرور تھیں لیکن بہری نہیں۔ آمنہ کے دل کی دھڑکن پا گئی تھیں۔

"آمنہ میری بیٹی جیسی ہے......"

"بیٹی جیسی کا حسب نسب کہاں ہے؟ خادمہ نے ماں بن کر پالا ہے تو حسب نسب تو ہوگا۔ والد، والدہ کا نام، شہر۔" وہ چڑ گئے۔

آمنہ کو تو چپ ہی لگ چکی تھی۔ جس وقت ابن منصور طوائف، طوائف چلا رہا تھا، اس وقت اس کے دل میں ایسا وبال مچا تھا۔ وہ وبال پھر سے اس کے دل میں اٹھا تھا۔

"کیا آمنہ اپنی آزمائش میں کامیاب نہیں ہوئی؟ ہر سوال کا جواب نہیں دیا؟ ذہن کی سمجھ بوجھ ظاہر نہیں کی؟" ضعیفہ نے پوچھا۔

"خاتون! آپ کے لیے ایک سوال کتنی بار دہرانا پڑے گا کہ ہمیں ہر بچی کا حسب نسب چاہیے، اگر والدہ آمنہ نے پرورش کی ہے تو ان کا چاہیے۔"

"کیا غلاف کعبہ حسب نسب مانگتا ہے......؟"

سب نے حیرت سے اس نابینا عورت کو دیکھا۔ "آپ کا احترام جائز ہے لیکن گستاخی ہم سے بھی نہ کی جائے۔" غصے سے کہا۔

"کسوہ حافظ قرآن ہے، قابل بچی ہے۔ آمنہ کا علم اور تدبر کسی سے کم نہیں ہے۔ حسب نسب کی ضرورت ہی کہاں رہتی ہے۔"

"خاتون آمنہ! آپ اپنا حسب نسب دے رہی ہیں یا نہیں۔" اب غصے سے آمنہ سے پوچھا گیا۔

"کیا دینا ضروری ہے؟ کیا کسوہ کو اس کے بغیر۔" زبان اٹک گئی۔ آواز بند ہو گئی۔

"والد کا نام...... والدہ کا نام...... والد کا پیشہ۔" اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے یہ سوال کیا گیا تھا۔

آمنہ کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ سب اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ مدرسے کی اونچی چھت کے نیچے بہت چھوٹی ہو گئی۔ رنگین کھڑکیوں نے اس کے سارے رنگ نچوڑ لیے۔ قالین میں دھنسے اس کے پاؤں ریت کی دلدل میں دھنسنے لگے۔ یہ کہانی تو وہی پرانی تھی۔ تو کیا کہانیاں بھی لوٹ کر آتی ہیں۔

بھی اپنا آغاز اور انجام نہیں بدلتیں۔ اس کا صابر دل، اس کی انکسار روح...... وہ بڑی شدت سے رو دینے کو تھی۔ پیچھے دوسری بچیاں اور ان کی مائیں بیٹھی تھیں، اسے ان سے بڑی شرم آئی تھی۔

"خاتون آمنہ......" اس کی طرف سوالیہ دیکھ کر پکارا جا رہا تھا۔

کسوہ نے حیرت سے اپنی ماں کو دیکھا، اب تک تو وہ ہر سوال کا جواب دیتی آئی تھیں، وہ اب کیوں خاموش تھیں۔ اب تک انہوں نے کتابیں کھنگال کھنگال کر اسے کیا کچھ نہیں سکھا دیا تھا۔ اب یہ خاموش ہیں......

آمنہ نے کسوہ کی طرف دیکھا۔ اس کی مرحومہ ماں کا خواب، اس کی زندہ ماں کے ہاتھوں بکھرنے جا رہا تھا۔

"بتاؤ آمنہ! بتا دو سب کو۔ بتا دو کہ اس ہونہار، حافظ قرآن بچی کی تربیت تم نے کی ہے۔ مجھے تم پر فخر ہے آمنہ! کسوہ کو تم پر فخر ہے...... بتا دو......" نابینا ضعیفہ نے آواز بلند کی۔ وہ دیکھ سکتی تھیں وہ جو کم ہی لوگ دیکھ سکتے ہیں۔

آمنہ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ "میں والد کو جانتی ہوں، نہ والدہ کو...... میں ایک رب کو جانتی ہوں...... بس......"

"یتیم اور مسکین ہیں آپ؟ کیا جانتی ہیں ان کے بارے میں؟"

"کچھ نہیں جانتی...... کچھ بھی نہیں۔ بس اتنا جانتی ہوں کہ ہوش سنبھالا تو خود کو طوائف پایا اور دنیا کو تماش بین، گھر کو قحبہ خانہ اور جسم کو گناہ آلود۔ درویش ملے تو توبہ کی، قحبہ خانہ چھوڑ دیا پھر حج کے لیے کاروان کے ساتھ شامل ہو گئی۔"

اتنا سنا کس نے تھا۔ بس طوائف تک ہی سنا تھا سب نے...... بس۔

"طوائف۔" ان میں سے کسی ایک کی آواز بلند ہوئی تھی۔ پیچھے سے بھی...... دائیں، بائیں سے بھی۔

"آمنہ کی سچائی کا ثبوت یہ بچی کسوہ ہے، جس نے مدرسے کے امتحان میں سب سے امتیازی کامیابی حاصل کی ہے۔" کسوہ کی نانی دلیلیں دے رہی تھیں۔ لیکن انہیں سن کون رہا تھا...... سب تو دیکھ رہے تھے......

"طوائف" کو......

بھری دنیا میں، اللہ کی بنائی دنیا میں، اتنے انسانوں میں......

ایک اللہ کے لیے...... ایک اللہ والی...... اکیلی رہ گئی۔

☆☆☆

طون...... وہ زندہ بچ گیا تھا...... بستر مرگ سے وہ دوبارہ ان کے سروں پر آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ انہیں آزاد کرنے سے پہلے اس نے صرف چھ اور مہینے کام لیا تھا۔ اور جب وہ انہیں آزاد کر رہا تھا تو اس نے بس اتنا کہا تھا۔ وہ زبان سے پھرا نہیں تھا اور زبان پر قائم بھی نہیں رہا تھا۔ موت نے بس اسے اتنا ہی نرم دل رہنے دیا تھا۔

"عزیزہ! تمہیں تمہارے رب کی قسم ہے، پورے ایمان سے بتاؤ کیا تم ان لوگوں کو آزاد دیکھنا چاہتی ہو؟"

عزیزہ نے ناسمجھی سے طون کی سمت دیکھا۔ وعدے کے چھ مہینے پورے ہو چکے تھے۔ جتنا نکال کر دے سکتے تھے، اتنا وہ دے چکے تھے، اب یہ انسان اور کیا چاہتا تھا۔

"ہاں...... کیوں......؟"

"تو پھر یہ سب ایک شرط پر آزاد ہوں گے اور وہ شرط ہو تم...... میں ان سب کو آزاد کر دوں گا، کبھی کوئی غلام منڈی سے نہیں آئے گا، یہ جنگل کسی دوسرے انسان کی بو نہیں پائے گا...... اگر تم اللہ کو حاضر ناظر جان کر کہو کہ تم مجھ سے غداری نہیں کرو گی اور......"

عزیزہ کا سانس رک گیا۔ "کیا کہنا چاہتے ہو؟"

وہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ میں نے کہہ دیا تھا کہ میں آزاد کر دوں گا، اور میں آزاد کر بھی رہا ہوں۔ لیکن تمہیں بھی کروں گا، یہ نہیں کہا تھا۔ خزانے کی اصل چابی تم ہو، اب تک بھی سارے کام تم ہی کرتی رہی ہو، تو پھر اتنی بھیڑ کا تردد پالنے کی کیا ضرورت ہے۔ موقع ہاتھ آیا تھا تو وہ ان سب کی جانوں کے بدلے میں اس سے عہد لے سکتا تھا۔

''تم نے کہا تھا، تم ہم سب کو آزاد کر دو گے۔'' عزیزہ نے اس وعدہ خلاف انسان کو حیرت سے دیکھا۔

''کر تو رہا ہوں۔'' موت سے ڈر کر معافی مانگنے والا، زندہ رہنے کے بعد معافی سے مکر رہا تھا۔

''فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے، ان سب لوگوں کی جان، آزادی یا پھر ایک صرف تم؟ تمہاری غلامی...... جواب دو عزیزہ......''

عزیزہ نے ایک لمبی سانس کھینچی۔ ہاں آزادی اتنی جلدی ممکن نہیں ہوتی۔ ہاں...... فطرت اتنی جلدی نہیں بدلا کرتی۔ اس نے سب کی سب آمنہ اور جنت کی طرف دیکھا۔ معصوم چہروں اور زخموں سے چور چور جسموں کی طرف۔ چھ مہینے کے وعدے پر انہوں نے راتوں کو خواب کر دیا تھا، دن کو پرواز۔ ایسی درندگی، ایسی غلامی سے نجات کے خیال نے انہیں کیسے نیم دیوانہ سا کر دیا تھا اور وہ عورتیں...... مصیبت زدہ دکھی، بیمار، گیلا جنگل، گھنا جنگل، کیلا...... اور درندہ جنگل۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا۔ ''مجھے منظور ہے۔''

''تم کوئی چالاکی نہیں دکھاؤ گی...... تم بھاگو گی نہیں۔''

''میں بھاگوں گی نہیں۔''

''اپنی زبان کا عہد دو۔''

''اپنی زبان کا عہد دیتی ہوں۔''

''اپنے رب کے نام سے دو۔''

''اپنے رب کے نام سے دیتی ہوں۔''

سب آزاد ہوئے۔ وہ غلام ہوئی...... عزیزہ...... بنت درویش۔ وہ قربان سر عام ہوئی۔

☆☆☆

''اور تمہیں کیا چاہیے؟'' آمنہ عزیزہ سے پوچھ رہی تھی۔ وہ خواب دیکھ رہی تھی۔

''مجھے۔'' عزیزہ نے سوچا۔ ''مجھے ''حق'' چاہیے۔'' عزیزہ نے اس کے گال چھو کر کہا۔

دین حق ہے...... جیسے انسان کی پیدائش حق ہے۔ جیسے اس رب کی مرضی ''حق'' ہے۔

پھر ناحق کیا ہے؟ کسوہ کو مدرسے میں جگہ نہ دینا۔ صرف اس لیے کہ اس کی پرورش کرنے والی ماں کا حسب نسب عالی مرتبہ نہیں تھا۔ کسوہ کی ہم عمر بچیاں جو اس کے ساتھ مدرسے میں امتحان کے لیے گئی تھیں، وہ غلاف کعبہ کی تیاری میں شامل کر لی گئی تھیں۔ کسوہ نے افسردہ صورت والدہ سے اپنے بارے میں پوچھا تو والدہ رو پڑی۔

''مجھے معاف کر دو کسوہ! تمہاری ماں کا خواب، میری وجہ سے ادھورا رہ گیا۔''

کسوہ اور کبریٰ، آمنہ کو قصوروار سمجھنے کی گستاخی نہیں کر سکتی تھیں لیکن آمنہ نے خود کو معاف نہیں کیا۔ ان چھ سالوں میں وہ پہلی بار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ اس نے خود کو اتنا گرا ہوا تب بھی نہیں پایا تھا جب منڈی میں فروخت ہوئی تھی لیکن اب...... اب وہ بہت بے کل ہو گئی تھی۔ تو کیا انہیں ہمیشہ ذلیل کیا جائے گا۔ کیا انہیں کبھی عزت اور مرتبہ نصیب نہیں ہو گا؟ اسے ایسی چپ لگ گئی تھی کہ کسوہ تک اداس ہو کر اسے دیکھتی تھی۔

''آپ نے کہا تھا، لوگوں کو معاف کر دینا چاہیے۔ مدرسے کے استادوں کو معاف کر دیں۔''

''میں نے سب کو معاف کیا، دنیا نے مجھے معاف نہیں کیا۔''

''آپ نے کہا۔ ہمارا معاملہ اللہ سے ہونا ہے۔ ہمیں دنیا والوں سے کیا لینا دینا۔''

کچھ لینا دینا نہیں تھا لیکن وہ پھر بھی روتی رہتی

تھی۔ بات بے قدری کی نہیں تھی، اس زعم کی تھی کہ اب دنیا اس کی قدر کرنے لگے گی۔ بات شک کی تھی، اس وسوسے کی کہ کیا اللہ نے بھی اسے معاف کیا ہے یا نہیں۔ یہ جو سفر تھا، یہ کسی اور ہی گمان میں ہی تو نہیں کٹا۔ اتنا کچھ کھو کر، کچھ بھی نہیں ملا..... کیا کچھ بھی نہیں؟

"میں نے کبھی اللہ تجھ سے سوال نہیں کیا، کبھی کوئی جواب نہیں مانگا، لیکن میں ایک سوال کا جواب چاہتی ہوں..... اپنی قدر کا.....

آمنہ کی کیا قدر ہے یارب..... یا دکھا دے یا بتا دے....."

تین مہینے وہ یہ سوال، رات دن خدا سے کرتی رہی تھی۔

☆☆☆

سب جواب نہیں ملتے، تو سب سوال ادھورے بھی نہیں رہتے۔ بیماری جنت کے شانوں تک پہنچی تھی۔ بروقت علاج سے پھیلنے سے بچ گئی تھی۔ مراد کے لیے جو طبیب ملا تھا، اس کے لیے انہیں شہر چھوڑنا پڑا تھا۔ پھر اس شہر میں تھا ہی کیا۔ ایک کوٹھری..... بس..... اس نے بہت مشقتیں کاٹیں لیکن وہ مراد کو لے کر شہر سے ہجرت کر کے طبیب کے شہر چلی گئی تھی۔ اس شہر میں بھی کوٹھری نما گھر میں ہی رہنے لگی تھی لیکن اب کم سے کم یہاں طبیب اور دوا تو میسر تھی۔

ہجرت اسے راس آئی تھی۔ اس شہر میں اسے کرنے کے لیے بہت کام مل گئے تھے۔ وہ طبیب اور دوا کا خرچ اٹھا سکتی تھی۔ وہ مسکرا کر مراد کو دیکھ سکتی تھی۔ مراد روشنی اور ہوا کو سہنے لگا تھا۔ دوا اثر کر رہی تھی۔

"جب میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا تھا تو میں حیران رہ گیا کہ کوئی اتنا خوب صورت بھی ہو سکتا ہے۔"

"اور یہ بات تم مجھے اب بتا رہے ہو، اتنے سالوں بعد۔"

"مجھ جیسے بیمار کے منہ سے یہ بات سن کر تم کہاں خوش ہوتیں جنت! تعریف بھی بد بودار ہو جاتی۔"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ اسے کریہہ اور بدصورت ہی لگا تھا۔ کچھ چیزیں اور کچھ لوگ، شروع میں کتنے عجیب اور ناپسندیدہ لگتے ہیں۔ پھر..... پھر تو وہ جان عزیز ہو جاتے ہیں.....

☆☆☆

آمنہ اور جنت کی جان عزیز..... عزیزہ..... وہ ہڈیوں کا پنجر بن چکی تھی۔ سر کے بال اڑ چکے تھے؟ بچے دیکھتے تو ہنس دیتے۔ اس کا مذاق اڑاتے۔ حسن دلدل ہو چکا تھا۔ آنکھیں گڑھیوں میں دھنس چکی تھیں۔ زمین نے اپنا سینہ سی لیا تھا۔ وہ اسے ایک بھی موتی نکال کر دینے کے لیے تیار نہیں تھی۔ پہلے تو طون اسے برداشت کرتا رہا تھا، پھر وہ اسے کوڑے مارے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

"چال باز..... تم نے اپنے رب کے نام پر عہد لیا تھا کہ تم کوئی چالاکی نہیں کرو گی۔"

"میں کوئی چالاکی نہیں کر رہی طون! یہ تو زمین ہے جو مجھ سے ناراض ہے شاید....."

"مجھے اپنی انگلیاں کاٹنے پر مجبور نہ کرو عزیزہ! تمہاری درویشی پر میں نے ان سب کو آزاد کر دیا تھا، اب تم اپنی کمزوری دکھا کر میرے غصے کو دعوت نہ دو۔"

"میں کمزور نہیں، بے بس ہوں..... میرا زمین و آسمان پر کیا بس بھلا۔"

"اگر یہ بس آج بھی نہ چلا تو میں تمہاری انگلی کاٹ دوں گا..... جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دوں گا۔"

دس انگلیوں میں سے تین، تو ویسے ہی کاٹی جا چکی تھیں۔ باقی گنتی بچیں..... سات.....

☆☆☆

وہ سات لوگ تھے، جو اس سے سوال پوچھتے رہے تھے۔ لیکن اب صرف وہاں وہ ایک تھے۔ وہ ایک آخری بار پھر مدر سے آئی تھی۔ وہ اپنے ساتھ

https://reading.cafetolearn.net

اپنی پوری کہانی لائی تھی، لیکن وہ یہ کہانی سنانے والی نہیں تھی، اس نے بس ایک آخری بار درخواست کی تھی۔

"آپ بس یہ بھول جائیں کہ کسوہ کی پرورش میں نے کی ہے، میں اسے چھوڑ کر چلی جاؤں گی، آپ اس بچی کی مرحومہ ماں کی نیت کو تعبیر ہونے دیں۔ کسوہ کو اس سعادت سے محروم نہ کریں۔"

اس نے ہاتھ میں پکڑا پارچہ...... کپڑے کا ٹکڑا استاد محترم کی رحل پر رکھا...... کپڑا جو سیاہ تھا۔

"جب ہم حج کے لیے نکلی تھیں تو ایک پڑاؤ کے دوران، ایک دیوار کی کھوہ میں مجھے یہ رکھا ہوا ملا تھا۔ عزیزہ نے کہا تھا کہ جو جس کی چیز ہوتی ہے، وہ اسے ہی ملتی ہے۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ ہماری چیزوں کی حفاظت فرشتے ہمارے لیے کرتے ہیں۔ شاید وہ جذباتی تھی اور کم عقل بھی۔ میں نے بہت عجیب وغریب حالات دیکھے لیکن اپنے اس تحفے کو اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھا کیونکہ یہ میرے لیے تھا، یہ میرا تھا۔ عزیزہ نے اسے کلام حق کا نام دیا تھا۔ ہم نہیں جانتی تھیں کہ اس پر کیا لکھا ہے لیکن اس کا ماننا تھا کہ حج پر جانے والوں کو "حق" کے سوا دیا ہی کیا جا سکتا ہے۔ یہ تحریر حق ہے، یہ تحریک حق ہے...... یہ نصیب حق ہے...... لیکن وہ پاگل تھی۔ یہ کلام حق تحریر حق ہو سکتا ہے لیکن اس پر میرا حق نہیں ہو سکتا...... یہ سیاہ ہے...... پہلے ہم تینوں کو شک تھا، ہم کسی سے پوچھتے ہوئے بھی ڈرتی تھیں لیکن بعد میں، مجھے یقین ہو گیا کہ یہ غلاف کعبہ کا ٹکڑا ہے۔ جو کسی درویش بزرگ کو نصیب ہوا تھا، اور انہوں نے اس پر تحریر لکھ کر، اسے کھوہ میں اپنے جیسے کسی حاجی کے لیے تحفے کے طور پر رکھ دیا تھا...... کسی حاجی کے لیے۔ مجھ جیسی کے لیے نہیں...... تو یہ بھی آپ کا ہوا۔ آپ کا اس لیے کہ اسی مدرسے سے کسوۃ الکعبہ جائے گا تو یہ بھی اسی کا حصہ ہے۔ میں نے اپنی قدر جان لی، میں نے اپنے آپ کو پہچان لیا۔ اب آپ کسوہ کو پہچان لیں۔ اسے مدرسے میں جگہ دے دیں۔" کہتے کہتے وہ رو دی تھی۔

"تم کون ہو آمنہ؟" کلام حق استاد محترم، نگران محترم کے ہاتھ میں کانپ رہا تھا۔ وہ کتنے حیران تھے۔

"میں نے بتایا تو تھا کہ میں کون ہوں۔" اس نے بھیگی آنکھوں سے انہیں دیکھا۔

"تم جانتی ہو، یہ کس کا ہے؟"

"میں بس یہ جانتی ہوں کہ یہ میرا نہیں ہے۔"

کتنی ہی دیر تک سناٹا رہا تھا۔ استاد کا سر جھکا رہا۔

"میں نے مدرسے کے ہر رکن کو سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی آمنہ! میں تمہارے تدبر پر بہت حیران تھا۔ تمہارے شعور نے مجھے حیران کر دیا تھا، لیکن وہ پانچ تمہارے حسب نسب پر نہیں مانتے تھے۔ وہ بار بار کہتے جاتے تھے کہ کعبہ کا غلاف ایک ایسی بچی کے ہاتھ سے نہیں بن سکتا، جس کی پرورش ایک طوائف نے کی ہو......" کہتے کہتے ان کی آواز بھیگ گئی۔

"لیکن کسوہ...... میری کسوہ۔ اس کا کیا قصور ہے؟"

"قصور تمہارا بھی نہیں۔ قصور تو ہمارا ہے، قصور میرا ہے۔ جانتی ہو یہ کلام حق کس کا ہے۔ میرا...... یہ غلاف اسی مدرسے میں بنا تھا۔ یہ مجھے تحفے میں دیا گیا تھا۔ اس میدان کاروان میں بیٹھ کر میں نے یہ تحریر لکھی تھی، اور پھر اسے تحفے کے طور پر رکھ دیا تھا۔ والد کہا کرتے تھے، مسافر کو اپنے نشان چھوڑتے رہنا چاہیے۔ قلم، کتاب، ورنہ اخلاص...... جو جس کا ہو گا، وہ اسے مل جائے گا۔ یہ تمہیں ہی کیوں ملا آمنہ! کیوں؟

والد کہا کرتے تھے، دنیا میں کسی انسان کی کہانی اتفاق سے نہیں لکھی جاتی۔ جو ذرے ذرے کا واقف حال ہے، وہ اتفاق کیوں کرے گا؟ وہ طے کرے گا...... کوئی چیز، کوئی واقعہ، اتفاق نہیں...... وہ طے شدہ ہے، ورنہ معجزہ ہے۔

جس عورت کی بیٹی کو غلاف کعبہ بنانے کی سعادت سے محروم کر دیا گیا، سالوں پہلے اسی عورت کو ''غلاف کعبہ'' پہلے سے ہی عنایت کر دیا گیا تھا۔ جسے حسب نسب کا سوال کر کے، خارج کر دیا گیا، اسے تو پہلے سے ہی عالی مرتبہ بنا دیا گیا تھا۔ تم کون ہو آمنہ؟''

''میں کون ہوں؟ میری قدر کیا ہے۔ میں اللہ کے لیے کیا ہوں؟'' آمنہ کا سوال تھا۔

بے قرار بحر ہے..... بے قرار لہر ہے.....

تیرا رب رحیم ہے اور یہی تیری قدر ہے۔ یہی تیری قدر ہے۔

کلام حق پر لکھی تحریر..... آمنہ کے لیے لکھا حق۔

اس کا سوال قدر..... رب کا جواب قدر.....

☆☆☆

پیروں کی انگلیاں کاٹنے کے بعد، سلاخوں سے اس کا جسم داغنے کے بعد، وہ اس کی شہادت کی انگلی کو سختی سے دبوچے ہوئے کھڑا تھا۔ اس ایک انگلی کے لیے وہ پہلی بار سسک رہی تھی۔ اس کی منت کر رہی تھی کہ وہ اس ایک انگلی کو چھوڑ دے۔ اس کی شہادت کو چھوڑ دے۔ تائب ہوتے ہوئے اس نے اس انگلی کو اٹھا کر آسمان کی سمت بلند کیا تھا.....

''میں نے تم پر بھروسا کیا عزیزہ! تم نے میرا بھروسا توڑا۔''

''لالچ نے تمہیں اندھا کر دیا ہے طون! اللہ کا خوف کرو۔''

''اللہ کا خوف کر کے ہی میں نے سب کو آزاد چھوڑ دیا تھا..... لیکن تم.....''

''میں نے اپنا کوئی عہد نہیں توڑا..... لیکن تم توڑ رہے ہو۔''

وہ ہمیشہ اسے وہاں چوٹ پہنچاتا رہا تھا جہاں سے تڑپ کر وہ اسے خزانہ نکال کر دیتی رہی تھی۔ وہ اب بھی اسی جگہ چوٹ پہنچا رہا تھا، جہاں سے تڑپ کر وہ اسے خزانہ نکال کر دینے کا عہد کرنے والی تھی۔ وہ کہے گی کہ میں تمہیں سارا جنگل خزانہ کر دوں گی۔ سارا جہاں کھود ڈالوں گی..... میری یہ انگلی چھوڑ دو..... وہ کہے گی، ورنہ.....

''میری شہادت چھوڑ دو طون! بس یہ..... ایک.....''

☆☆☆

ابن موسیٰ نے اپنا کاروان بہت ڈھونڈا لیکن اسے اپنا ایک بھی حاجی نہیں ملا تھا۔ صحرا کے بدوؤں سے دو بدو جنگ ہو چکی تھی۔ خلیفہ نے اس کی سرپرستی کی تھی، بہت سوں کا صفایا کر دیا اس نے۔ لیکن جب تک دنیا قائم ہے..... چور، ڈاکو، لٹیرے، قاتل یہ پیدا ہوتے ہی رہیں گے۔ سانس لیں گے، سانسیں کاٹ دیں گے۔ کیونکہ اگر چور، لٹیرے نہ ہوں تو ''امیر اور راہبر'' بھی نہ ہوں۔

دنیا بری جگہ نہیں، دنیا بروں اور اچھوں سے بھری جگہ ہے۔

امیر کاروان نے اپنا نعرہ حق بلند رکھا تھا، وہ امام کعبہ سے مل چکا تھا۔ ان سے خطبوں میں ''دین حق'' کی تشریح کی درخواست کر چکا تھا۔

وہ خود بھی سرزمین حجاز میں رہنے لگا تھا۔ ہر سال حاجیوں کے لیے پانی، خیموں کا انتظام دیکھتا تھا۔ وہ کاروان کا امیر نہیں بن سکتا تھا۔ بننا بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ حاجیوں کا خدمت گار بن چکا تھا..... کیونکہ..... اسے یقین تھا، جو حاجی اسے ساری دنیا کھنگال کر بھی نہیں ملے تھے، وہ یہاں ضرور مل جائیں گے۔ جو حج کے لیے نکلے تھے، وہ حج کی سعادت ضرور پا جائیں گے۔

مل جانے کے لیے..... بچھڑ جانا ضروری ہے۔

☆☆☆

خوشی سے اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ وہ بھاگی ہوئی مراد کے پاس باغ میں آئی تھی، جہاں وہ پھلوں کی دیکھ بھال کا کام کرتا تھا۔

https://reading.cafetaria.live

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیئر آئل

SOHNI HAIR OIL

- گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- نئے بال اگاتا ہے۔
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے یکساں مفید۔
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

قیمت-/150 روپے

سوہنی ہیئر آئل 12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خریدا جاسکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف -/150 روپے ہے، دوسرے شہر والے منی آرڈر بھیج کر رجسٹرڈ پارسل سے منگوالیں، رجسٹری سے منگوانے والے منی آرڈر اس حساب سے بھجوائیں۔

2 بوتلوں کے لئے	-/350 روپے
3 بوتلوں کے لئے	-/500 روپے
6 بوتلوں کے لئے	-/1000 روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔

منی آرڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیئر آئل ان جگہوں سے حاصل کریں

بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔

فون نمبر: 32735021

لیکن بیماری جا چکی تھی۔ وہ اتنا تندرست تو ہو ہی چکا تھا کہ رزق حلال کما سکتا۔

"مراد! جس گھر میں، میں کام کرنے کے لیے جاتی ہوں...... انہوں نے قرعے میں میرا نام لکھ لیا اور تمہارا بھی......"

"کس لیے میری جنت؟"

"طواف محبت کے لیے...... لبیک کے لیے، اس کے گھر حاضری کے لیے مراد۔" کہتے کہتے وہ خوشی سے رو پڑی تھی۔

☆☆☆

کسوۃ الکعبہ کے لیے...... کسوہ کے لیے...... وہ مدرسے میں داخل کر لی گئی تھی۔ جو پہلے پیچھے رہ گئے تھے، وہ اب پیچھے نہیں رہے تھے۔ باقی بچیوں کے ساتھ وہ کسوۃ الکعبہ کی تیاری میں مصروف ہو چکی تھی اور آمنہ...... اس نے حج کی تیاری کرنا شروع کر دی تھی۔ اس نے سات سال اعمال حج جمع کیے تھے۔ سفر حج کے لیے، نیت حج میں، اس نے رب کی محبت کے طواف کیے تھے۔

طواف...... طواف عشق......

☆☆☆

وہ جنگل میں ہوش سے بے گانہ پڑی تھی۔ سارا جنگل پرندوں کی آوازوں سے گونج رہا تھا۔ ولدل زمین پر شور برپا تھا۔ ایسا لگتا تھا جنگل پر بدوؤں کا حملہ ہو چکا ہے۔ ہر چیز مٹ جانے کو ہے...... ہر چیز پھٹ جانے کو ہے...... ہر انسان ہلاک ہو جانے کو ہے۔

آمنہ اور عزیزہ...... وہ اس کے سر پر کھڑی تھیں...... اس کا منہ تھپک رہی تھیں۔

"میں نے تمہیں بہت یاد کیا۔ بہت......" وہ رو، رو کر کہہ رہی تھی۔

اس سے اٹھا نہیں جا رہا تھا، اس کے منہ میں پانی ڈالا جا رہا تھا۔ اس کی شہادت کی انگلی بچ گئی تھی۔ جس کی قیمت میں، اس نے اپنی غلامی دی تھی۔

وہ طلون سے ہاتھ چھڑا کر بھاگ گئی تھی۔ وہ اپنا

بھنبھناتے سے تیار تھی، ہر آنے کی مشقت جھیلنے کے لیے بھی تیار تھی لیکن ایسے نہیں۔ وہ تین دن تک جنگل میں بھاگتی رہی تھی۔ پھر نقاہت سے گر کر بے ہوش ہوگئی تھی۔

جنگل رات ہوا تھا، جنگل دن ہوا تھا، جنگل بارش ہوا تھا، جنگل دلدل ہوا تھا...... جنگل گواہ ہوا تھا اس عظمت کا جسے عزیزہ نے خود کو قربان کر کے پایا تھا......

گھنا جنگل...... دانا جنگل...... خزانوں سے بھرا جنگل۔

جن غلاموں کو اس نے آزاد کروایا تھا، ان غلاموں نے اسے بھی آزاد کروا دیا تھا۔ طون اور اس کے خزانے ضبط کر لیے گئے تھے۔ اسے شہر کے ایک دانا کے گھر میں رہنے کی جگہ ملی تھی۔ یہیں طون کے جنگل سے آزاد ہوئی آمنہ اور جنت بھی رہ رہی تھیں۔

وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوئی تو پھر سے اس جنگل میں گئی تھی۔ اب وہ آزاد اور تندرست تھی۔ اب وہ خود مختار اور دانا تھی۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھ کر، زمین میں ہاتھ ڈالا...... اس کی نیت بڑی شفاف تھی...... اس کی نیت بڑی پاک تھی۔

زمین...... اس نے بھی شفاف دلوں کے شفاف نیت ہاتھوں کو خالی ہاتھ نہیں لوٹایا۔

اس کی دس انگلیوں میں سے چار انگلیاں بچی تھیں۔ ان ہی سے وہ زمین کھود رہی تھی۔ دسویں دن، وہ شہر کے میدان کاروان میں، امیر کاروان کے پاس آئی تھی۔ وہ حج پر جانے والوں کے نام درج کر رہا تھا۔

"یہ ان لوگوں کا سفر حج کا خرچ، جو جانا چاہتے ہیں لیکن جا نہیں سکتے، جو نیت رکھتے ہیں لیکن زاد سفر نہیں رکھتے۔" اس نے ایک بیش قیمت ہیرا امیر کاروان کے سامنے رکھا اور پھر...... دوسرا......

"اور یہ...... یہ...... ان حاجیوں کے لیے جو جانا چاہتے ہیں لیکن کاروان سے نکال دیے جاتے ہیں۔ آمنہ کے لیے...... جنت کے لیے اور عزیزہ کے لیے۔ اب انہیں نہ نکالنا امیر! اب انہیں حج پر جانے دینا۔ انہیں ان کے رب کے گھر کا طواف کر لینے دینا۔ وہ نیک ہوں یا بد۔ اب انہیں ان کے گناہوں سے نہ پکارنا۔ اب کسی کو انہیں ٹھوکر نہ مارنے دینا۔ کاروان حج کے حاجیوں سے کہہ دینا، جو حج کرتا ہے، وہ رب کے لیے کرتا ہے اور اگر رب ہاتھ پکڑ کر باہر نہ نکالے تو تم بھی نہ نکالنا۔ انہیں بتا دینا امیر! کہ حج ہر صاحب چاہت پر فرض ہے۔ ہر آمنہ پر...... ہر جنت پر اور ہر عزیزہ پر...... وہ ہمارا رب ہے، اس کی محبت کا طواف، ہر بندے پر فرض ہے۔"

کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

☆☆☆

حج فرض ہے، صاحب چاہت پر، صاحب عمل پر، صاحب بے دار پر۔

یہ فرض ہے...... صاحب حق پر...... حق پر...... حق پر۔

سر زمین حجاز پر کاروان اور قافلے آرہے تھے۔ ہر طرف سوار اور سواریاں تھیں۔ ہر طرف حاجی اور ان کی نم آنکھیں تھیں۔

"جن کے نام لیے جا رہے ہیں، وہ اپنی سواری لے کر کاروان سے الگ ہو جائیں۔" ایک آواز بلند ہوئی۔

جنت نے سہم کر مراد کو دیکھا تھا۔

"تم گھبرا کیوں رہی ہو۔ کوئی خاص وجہ ہوگی۔" مراد نے تسلی دی۔

"خاص وجہ ہی ہوتی ہے جو کاروانوں میں صرف چند نام پکارے جاتے ہیں۔ انہیں الگ کیا جاتا ہے۔" اس کا رنگ زرد پڑ چکا تھا۔

"تم خواہ مخواہ وہم کر رہی ہو۔"

وہ وہم نہیں کر رہی تھی۔ اس کا نام پکارا جا رہا تھا۔

"جنت...... جنت...... جنت بنت درویش۔"

نیچے اتر کر مراد جنت کے اونٹ کی مہار تھام کر، کاروان میں سے دور...... آگے...... آگے لے کر جانے لگا۔

وہ بہت پیچھے تھی...... بہت پیچھے۔ دمشق سے آئی تھی کاروان کسوۃ الکعبہ کے ساتھ...... اس تک ایک آواز آئی تھی۔

https://reading.sarelolam.net

''آمنہ...... آمنہ بنت درویش...... ان کی سواری کہاں ہے؟''

کسوہ پیچھے دمشق میں رہ چکی تھی، وہ عالم اسلام کے دوسرے بڑے کاروان کے ساتھ اکیلی آئی تھی۔ اسے اعزازی طور پر بھیجا گیا تھا...... پھر...... پھر اتنی عزت پر بھی...... اس کا نام ایسے کیوں پکارا جا رہا تھا۔ اسے کاروان سے الگ کیوں کیا جا رہا ہے؟

سرزمین حجاز پر صبح و شام ہر حاجی کا استقبال کیا جاتا تھا۔ جس راستے پر کھڑے ہو کر ان کے لیے ہاتھ بلند کیے جاتے تھے، انہیں خوش آمدید کہا جاتا تھا۔

اس راستے پر ابن موسیٰ بھی کھڑا ہوتا تھا، اس کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ہوتے تھے۔ امام کعبہ کی اجازت سے وہ آنے والوں سے باآواز بلند یہ درخواست کرتے تھے، ہر سال کرتے تھے کہ جن کے نام پکار رہے ہیں، وہ حجاج کاروان سے الگ ہو جائیں۔

وہ حاجی...... وہ تین حاجی...... وہ امیر کے حاجی۔

امیر کاروان اپنا کاروان ڈھونڈ رہا ہے۔ امیر کاروان حج کرنا چاہتا ہے۔ امیر کاروان، وہ صاحب حق ہونا چاہتا ہے۔

''عزیزہ...... بنت درویش...... عزیزہ بنت درویش۔''

دور سے...... بہت دور سے، عہد کے سات سالوں سے۔ صبر کے سات جہاں سے، عزیزہ...... عزیزہ بنت درویش۔

سعی کی دوڑ سے، رضا کے وقوف سے...... ان کی سواریاں، کاروان سے الگ ہوئیں۔ سارا کاروان رکا ہوا تھا۔ ایک ان کے تین اونٹ چل رہے تھے۔

آمنہ...... جنت...... عزیزہ......

ہر سال ابن موسیٰ، ہر کاروان، ہر قافلے میں یہ نام بلند کرتا تھا۔ ہر سال وہ آنے والے حج کا انتظار کرتا تھا۔ تین اونٹ کاروان سے الگ ہوئے تو وہ...... چٹان جیسا مرد...... وہ ڈگمگا گیا...... وہ اپنی آنکھیں نہیں چھپک سکا تھا...... اس کا دل کیسے کانپ اٹھا تھا۔

''میرا حق آ گیا...... میرا کاروان آ گیا......''

آنکھوں میں نمکین ستارے تھے۔ ابن موسیٰ، امیر کاروان۔

وہ لپک کر تیزی سے اپنے کاروان کی طرف بڑھا۔ مراد کے ہاتھ سے جنت کے اونٹ کی مہار تھامی، اور پھر آمنہ کے اونٹ کی اور پھر عزیزہ کے اونٹ کی طرف بڑھ گیا۔ وہ تینوں ایک دوسرے کو رو، رو کر دیکھ رہی تھیں۔

''امیر حج...... امیر کاروان......'' عزیزہ نے یہ نام پکارا تھا۔

''میرا کاروان...... میرا کاروان......'' امیر کاروان نے اپنا لقب، اپنا مقام پا لیا تھا۔

ایک وہ کاروان تھا جس نے وہ اونٹ سے اتار دی گئی تھیں۔ ایک یہ کاروان تھا، اونٹ کی مہار امیر حج نے، امیر کاروان نے خود تھام رکھی تھی۔

وقت بدلتا ہے...... حق آتا ہے اور باطل مٹ جاتا ہے......

حق آیا...... حج ہوا......

امام کعبہ نے امیر کاروان ابن موسیٰ اور خاتون کاروان، عزیزہ کا نکاح پڑھوا دیا تھا۔ امیر کا فوت شدہ دل، عزیزہ کے قبول ہے میں دفن ہو گیا۔ اللہ کے ساتھ معاملات طے پا چکے تھے، امیر حیات نے، امیر کاروان کو عزیزہ کے لیے پسند کیا تھا۔ لیکن اس سے پہلے، امیر کاروان نے، اپنے تین حاجیوں کے ساتھ حج ادا کیا تھا۔

وہ تینوں اپنے رب کے گھر کا طواف کر رہی تھیں...... لبیک کہہ رہی تھیں......

اور لبیک کہہ رہا تھا کلام حق...... کہ......

''وہ جو ہمارا رب ہے، اس کی محبت کا طواف، ہر ذی روح پر فرض ہے۔''

نظیر فاطمہ

امّاں گھگی

''اف توبہ! ایسی بے شرمی کی بات...... ایسی بے غیرتی...... اللہ معاف کرے۔'' زینو تائی کرلائی۔

''بس جی، حشر آنے کی نشانیاں ہیں یہ۔'' نادرا چچی نے ہاتھ بلند کر کے دہائی دی۔

''اللہ معاف کرے...... کیسی بے حیائی پھیل گئی ہے آج کل کی عورتوں میں۔'' پھوپھی نصرت نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

''تف ہے ایسی اولاد پر جو ماں باپ کی عزت کا لحاظ نہ کرے۔'' تایا نے زہر خند لہجے میں کہا۔ ہر کسی کی اپنی بولی تھی...... اپنی رائے تھی...... اپنا فتویٰ تھا۔

''ہائے ابھی تو مرے ہوئے شوہر کا کفن بھی زیر زمین اجلا ہو گا اور یہاں کیا کیا منصوبے بننا شروع ہو گئے۔'' نندوں نے بھی گال پیٹ کر اپنا حصہ ڈالا۔

پوری حویلی میں بھنبھناہٹیں، سرگوشیاں عروج پر تھیں۔ سلمیٰ کی بات کو سمجھے بغیر، مکمل طور پر سنے بغیر اس پر فرد جرم عائد کر دی گئی اور اس کا مکمل بائیکاٹ کر دیا گیا۔ حویلی کی عورتوں نے اپنی جوان بچیوں کو سلمیٰ کے پاس جانے سے روک دیا تھا۔ اس سلمیٰ کے پاس جو کبھی ان کے ہر کام کا لازمی جز تھی۔ پڑھی لکھی سمجھ دار چاچی، ممانی، پھوپھو...... آج مجرم ہو گئی تھی۔

''خبردار! جو تم مجھے سلمیٰ کے کمرے میں نظر آئیں۔''

''ٹانگیں توڑ دوں گی تمہاری اگر اس کے آس پاس بھی دکھائی دیں تو۔''

''میں نہ دیکھوں تمہیں اس کے ساتھ جڑ کر بیٹھے ہوئے۔'' سب ماؤں نے اپنے اپنے انداز میں بچیوں کو تنبیہہ کی اور حویلی کی بچیوں کی مجال تھی جو وہ ماؤں کے حکم کے خلاف سانس بھی لے لیتیں۔ سب سلمیٰ کے خلاف کھڑے تھے۔ سوائے اس کے دیور شہود کے...... جو سلمیٰ کی بات کو سو فی صد درست سمجھتا تھا۔ وہ یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔ شہود، سلمیٰ کا دیور ہونے کے ساتھ ساتھ چچا زاد بھی تھا۔ دونوں کی عمروں میں دس سال کا فرق تھا مگر دوستی اور انڈر اسٹینڈنگ بہت تھی۔

''ارے مجھے تو سلمیٰ اور شہود کا چکر لگتا ہے۔ اسی لیے اتنی ہمت دکھائی سلمیٰ نے۔'' ایک دو نے تو دبے لفظوں میں یہ خدشہ بھی ظاہر کر دیا۔ مگر او نچی آواز میں کہنے کی ہمت نہ ہوئی کسی کو۔

☆☆☆

ہر کوئی سلمیٰ کو برا کہہ رہا تھا، سوائے امّاں گھگی کے۔ امّاں گھگی پھوپھی تھی اس گھر کے کرتا دھرتاؤں کی۔ خاموش، عبادت گزار، پر نور بوڑھا چہرہ۔ کھنڈرات بتاتے تھے کہ عمارت کبھی بہت ہی پر شکوہ اور خوب صورت رہی ہے۔ امّاں گھگی سلمیٰ کے خلاف ایک لفظ نہ بولی...... سب کی سنتی رہی اور تنہائی میں جا کر سلمیٰ کے سر پر ہاتھ رکھا۔

''بہت اچھا کیا دھی تو نے۔ اپنا حق مانگ لیا۔ بہت جی دار ہے تو، اب ڈٹی رہنا، میں تیرے ساتھ ہوں۔'' سلمیٰ کو سانپ سونگھ گیا۔

اسے امّاں گھگی کی خاموشی، صبر اور شرم کی مثالیں دے دے کر لفظوں کے پتھر مارے جا رہے تھے۔ جب سب اس کے خلاف کھڑے تھے تو ایسے میں امّاں گھگی اپنا کمزور وجود لیے اس کی طاقت بننے آئی تھی، حیرت کی بات تھی۔

امّاں گھگی اپنے کمرے میں آئی، الماری کھولی، اس میں سے ایک چھوٹا سا تالا لگا جستی صندوق نما

https://reading.saretolan.net

ہ نکالا اور اسے لے کر اپنی چارپائی پر آ بیٹھی۔ چابی لگا کر اس کا تالا کھول کر سائیڈ پر رکھا اور اسے کھول کر دیکھنے لگی۔ پھر ہاتھ بڑھا کر اس میں سے سونے کے دو بڑے بڑے بالے نکال کر شہادت کی انگلی میں پروئے۔ صندوق بند کر کے اپنے سامنے رکھا اور انگلی میں پروئے ان بالوں کو آنسو بھری آنکھوں سے دیکھنے لگی۔۔۔ پھر انہیں ہتھیلی پر رکھ کر ہونٹوں سے لگا لیا یوں جیسے کوئی بہت مقدس چیز ہو۔ رات بڑی ٹھنڈی تھی اور یخ بستہ ہواؤں کی سسکیاں اس کے سوئے دکھ جگانے لگی تھیں۔

☆☆☆

"ارے گھگی کا نکاح ہو رہا ہے۔" سولہ سال کی گھگی کی سکھیاں ایک دوسرے کو اطلاع دیتی بے حد خوش تھیں۔ گھگی کا گلاب چہرہ اور گلال رہنے لگا تھا۔

اپنی خالہ کے جیٹھ کے بیٹے سے اس کا نکاح ہونے جا رہا تھا۔ اٹھارہ سال کا قمر اس کی زندگی کا ساتھی بننے جا رہا تھا۔ ابھی نکاح تھا اور رخصتی دو سال بعد تھی جب قمر اپنی تعلیم مکمل کر لیتا۔ ایک خوب صورت سی شام گھگی اور قمر کا نکاح ہو گیا۔

پرانا زمانہ تھا۔۔۔ ماں باپ کی پسند پر سر جھکائے جاتے تھے۔ قمر نے گھگی کو نہیں دیکھا تھا مگر گھگی نے کسی رشتہ دار کی شادی پر قمر کی ایک آدھ جھلک دیکھ رکھی تھی۔ گھگی، قمر کی اسی ایک آدھ جھلک کے سہارے دن گزارنے لگی اور قمر وہ تو بس گھگی کے خیالی پیکر ہی تراشتا تھا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ گھگی بلا کی خوب صورت ہے اور یہ سچ بھی تھا، بہت ہی خوب صورت تھی گھگی۔

مگر گھگی کا نصیب اس کی صورت جیسا پیارا اور خوب صورت نہ ہو سکا۔ اس کی رخصتی میں چھ ماہ رہتے تھے، دونوں طرف تیاریاں عروج پر تھیں۔ نہ جانے کس کی نظر لگی کہ قمر کو تاپ نے آ لیا اور تاپ بھی ایسا مانو چھونے والے کو بھی جلا کر خاک کر دے۔ بہت علاج معالجے کروائے مگر تاپ تھا کہ بڑھتا ہی جاتا تھا۔

دم درود سب کروا لیا۔ جتنا ممکن تھا علاج کروایا مگر قمر کی حالت بگڑتی گئی۔۔۔۔ بگڑتے بگڑتے اتنی

بگڑی کہ جان کے لالے پڑ گئے۔

''لتاں! مرنے سے پہلے ایک دفعہ گھگی کو دیکھنا چاہتا ہوں۔'' قمر نے سوکھے لبوں پر زبان پھیر کر بمشکل یہ الفاظ ادا کیے۔ ماں سن کر تڑپ گئی۔ باہر جا کر بلک بلک کر روئی۔ بات کی تو کوئی راضی تھا۔ کوئی اعتراض کرنے لگا۔

''اس کی منکوحہ ہے گھگی..... ایک دفعہ ملنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔'' لتاں بھی بیٹے کے لیے ڈٹ گئیں۔

پھر گھگی رخصتی سے پہلے اپنے سسرال آئی، آنکھوں میں کسی انہونی کا خوف لیے..... ساس اسے قمر کے پاس چھوڑ کر باہر نکل گئیں اور دروازہ بھیڑ گئیں۔ گھگی نے منہ سے نقاب ہٹایا اور قمر کی حالت دیکھ کر پھپک پھپک کر رو دی..... قمر کی جگہ ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا جس پر زرد رنگ کی چمڑی تھی۔

''رونا مت گھگی! چپ کر جاؤ..... میں تمہاری صورت آنکھوں میں بسائے بغیر مرنا نہیں چاہتا تھا..... اس لیے تمہیں زحمت دی۔'' قمر بس اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا اور ٹکٹکی باندھے گھگی کو تکتا رہا۔

''ایسے مت کہیں۔'' گھگی کو کسی انہونی کا احساس رلائے دے رہا تھا۔

''یہ پکڑ لے..... یہ میں نے تیری منہ دکھائی کے لیے خریدے تھے..... اب منہ دیکھ لیا تو یہ تو رکھ لے۔'' قمر نے رک رک کر بات مکمل کی اور ایک مخملی تھیلی گھگی کی طرف بڑھائی۔ گھگی نے تھیلی پکڑ کر ہتھیلی میں دبا لی۔ باہر بادل یوں برستے تھے جیسے سات سمندر پی کر آئے ہوں۔

''اسے میری آخری نشانی سمجھ لینا۔'' گھگی تھیلی کو سینے سے لگائے گھر لوٹ آئی اور دو دن بعد قمر اپنے ابدی سفر پر روانہ ہو گیا۔

گھگی پر کوئی قیامت سی قیامت ٹوٹی تھی..... رخصتی سے پہلے ہی بیوہ ہو گئی تھی..... اٹھارہ سال کی عمر میں بیوگی کی سفیدی اس کا مقدر بن گئی تھی.....

ان کے خاندان میں بیوہ کی دوسری شادی کا رواج نہیں تھا..... اس کے اماں ابا لاڈلی دلاری کو دیکھ دیکھ کر آہیں بھرتے..... گھگی پر سب ترس کھانے لگے..... بڑے بہن بھائی پہلے ہی بیاہے ہوئے تھے۔ اس سے چھوٹے بھی بیاہے گئے۔ اس کی دوسری شادی کا خیال کسی کو نہ آیا کہ ان کی پشتوں میں کبھی کسی بیوہ کی دوسری شادی نہیں ہوئی تھی تو اب گھگی کی کیسے ہو جاتی۔

''ہماری گھگی کوئی بے شرم ہے جو اپنے منہ سے شادی کرنے کا کہے گی۔ ارے جانتی ہے ہماری گھگی کہ ہمارے خاندان میں ایسا نہیں ہوتا۔ شرم والی ہے ہماری بیٹی، کسی صورت روایات کے خلاف نہیں جائے گی۔'' کچھ خاندانوں نے گھگی کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس طرح کی تاویلیں دے کر منع کر دیا گیا اور گھگی واقعی شرم میں ماری گئی۔ وہ اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں اور خاندان برادری کا مان نہ توڑ سکی۔ وہ مان جو سراسر غلط اور بے جا تھا۔

اس مان کو سلامت رکھنے میں گھگی نے کیا کیا نہ سہا..... کیسے وقت کاٹا کوئی نہیں جانتا تھا۔ بس گھگی جانتی تھی اور اس کا اللہ جانتا تھا۔

وہ قمر کے دیے بالے ہر رات نکال کر دیکھتی، یہ بالے اس کی ہر تڑپ اور آنسو کے گواہ تھے۔ پھر گھگی نے قمر کی آخری نشانی کو سنبھال کر اللہ سے لو لگا لی..... اسی نے قرار بخشا اسے اس صحرائی سفر کو کاٹنے کا..... وقت گزرتا گیا۔ بہن بھائیوں کے بچے اور پھر ان کے بچے بھی بال بچوں والے ہو گئے اور وہ گھگی سے لتاں گھگی ہو گئی۔

سب بچے اماں گھگی کی عزت کرتے تھے مگر ان پر کیا بیتی، یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس کے سامنے کئی پیارے مٹی میں جا سوئے..... وہ سوچتی رہتی اسے اتنی لمبی عمر کیوں دے دی اللہ نے..... جلدی اپنے پاس بلا لیتا تو کیا تھا، اس کے پیچھے بھلا کون سی ذمہ داریاں تھیں..... مگر یہ سارے معاملے تو اس رب کی مرضی

ملتے ہیں، انسانوں کی مرضیاں تو نہیں چلتیں۔ سو وہ بھی جیے گئی اور اب تک جی رہی تھی۔

☆☆☆

اب سلمٰی بیوہ ہوئی اور عدت کے بعد اس نے نکاح کی خواہش ظاہر کی تو سب جیسے اس کے خلاف ہو گئے۔ ایسے میں لتاں گھگی نے سلمٰی کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اماں گھگی بے شرم بن کر اپنا حق نہ مانگ سکی تھی۔ مگر اب سلمٰی نے یہ جرات کر لی تھی تو لتاں گھگی اب اسے اس کا حق دلوائے گی اور اس پر سے بے شرمی کا ٹھپہ بھی مٹوائے گی۔

"میں آئندہ آنے والی گھگیوں کے بند راستے کھولوں گی۔" لتاں گھگی نے خود سے وعدہ کیا اور پرسکون ہو کر سو گئی۔

اگلے روز لتاں گھگی نے سامان سمیٹا اور اپنے بھانجوں کے گاؤں جانے کا اعلان کیا...... بہن بہنوئی تو کب کے مر کھپ گئے۔ اب اسی گھر میں ان کے بچے اپنی اولادوں کے ساتھ بستے تھے۔ لتاں گھگی دو دن وہاں گزار کر واپس آ گئی۔ جس خاموشی سے گئی تھی اسی خاموشی سے لوٹ آئی۔ کسی نے توجہ نہ دی کہ وہ اکثر وہاں جاتی تھی۔ لتاں گھگی کے واپس آنے کے دو دن بعد شاہ صاحب حویلی آئے۔

"شاہ صاحب تشریف لائے ہیں۔" پوری حویلی میں آوازیں ابھریں۔ شاہ صاحب کے گھرانے کا نسلوں سے اس حویلی میں آنا جانا تھا۔

حویلی والے شاہ صاحب کے مرید تھے۔ اب سید حیدر علی صاحب کے سر پر دستار تھی...... جو بہت پڑھے لکھے تھے۔ منزل پر کھڑے تھے۔ ان کا فیض اللہ کی مخلوق کے لیے عام تھا۔ وہ زمین پر بیٹھنے والے وہ بزرگ تھے جن کا آسمان پر رہنے والے سے بڑا گہرا اور قریبی تعلق تھا۔ زمین ان کا بچھونا تھی۔ کبھی ان کو کسی نے کرسی، پلنگ یا چارپائی پر بیٹھے یا سوتے نہیں دیکھا تھا۔ سادا شلوار قمیص، سفید براق، سفید یا سیاہ عمامہ، باریش پر نور چہرے والے شاہ صاحب سال میں ایک یا دو بار یہاں بھی تشریف لاتے تھے۔ حویلی والے ان کی راہ میں دیدہ دل فرش راہ کیے رکھتے تھے۔

☆☆☆

شاہ صاحب کے لیے حسب معمول حویلی کے بڑے کمرے میں زمینی مسند کا انتظام کر دیا گیا۔ حویلی کے سب مکین ان کی خدمت میں سلام کے لیے حاضر ہوئے۔ ایک سوائے سلمٰی کے، جسے اس کا مطالبہ سننے کے بعد کمرے میں بند کر دیا گیا تھا۔

"سلمٰی بچی نظر نہیں آ رہی...... کہاں ہے؟" شاہ صاحب نے شام کو کہا۔

"وہ جی اپنے کمرے میں ہے۔"

"طبیعت ٹھیک ہے اس کی...... تم لوگ اس کا خیال رکھا کرو...... دل جوئی کیا کرو۔ بڑا صدمہ سہا ہے اس نے' جوان شوہر کی اچانک موت کا۔" شاہ صاحب نے نرمی سے کہا۔

"کیسا صدمہ شاہ صاحب؟ ادھر عدت ختم ہوئی اس کی۔ اُدھر سب کے سامنے جا کھڑی ہوئی کہ اس کا نکاح کر دیا جائے۔ وہ بیوہ بن کر زندگی نہیں گزار سکتی۔" ساس نے گویا شکایت کی اس کی۔ شاہ صاحب اس کا انداز اور الفاظ سن کر مسکرائے۔

شاہ صاحب کو اب سمجھ میں آیا کہ حویلی میں داخل ہوتے ہی انہیں جس تناؤ کی سی کیفیت کا احساس ہوا تھا' وہ اصل میں اس بات کا تھا۔ شاہ صاحب نے سب گھر والوں کو طلب کیا۔ سب بڑے کمرے میں جمع ہو گئے۔ سوائے بچوں اور سلمٰی کے۔

"سلمٰی کی بات پر تم لوگوں کا رد عمل کیا ہے؟" شاہ صاحب نے سوال کر کے سب کے چہروں کی طرف دیکھا جن پر "رد عمل" صاف تحریر تھا۔

"سلمٰی کا یہ مطالبہ غلط نہیں ہے۔" سب کی خاموشی پر انہوں نے کہا۔

"مگر ہمارے خاندان میں بیوہ کی دوسری شادی کا رواج نہیں ہے شاہ صاحب۔" تایا نے ادب سے

کہا۔

''تمہارے خاندان میں نہیں ہے مگر تمہارے دین میں بیوہ کو دوسری شادی کرنے کا حق حاصل ہے۔'' اب شاہ صاحب نے نرمی مگر سنجیدگی سے کہا۔ شاہ صاحب کی دلیل سے بھلا کسے انکار تھا مگر بعض اوقات ہم لوگ اپنے رواجوں کو دین کے بنائے ہوئے قوانین پر فوقیت دے دیتے ہیں۔ یہاں بھی ایسا ہی معاملہ درپیش تھا۔ سب خاموش تھے۔

''سلمٰی کو بلاؤ۔'' شاہ صاحب نے حکم دیا۔ سلمٰی کو بلاوا بھیجا گیا۔ وہ چادر میں لپٹی آئی۔ سلام کر کے شاہ صاحب کے سامنے سر جھکا کر پیار لیا اور ایک کونے میں مجرموں کی طرح بیٹھ گئی۔

''اِدھر آؤ بیٹی..... اِدھر آ کر بیٹھو۔'' شاہ صاحب نے اسے اپنے سے کچھ فاصلے پر دائیں طرف بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ سلمٰی نے وہاں بیٹھ کر ڈبڈبائی آنکھوں سے سب کو دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔

''کیا چاہتی ہو بیٹی؟'' سلمٰی خاموش تھی۔

''میں تمھارے منہ سے سننا چاہتا ہوں۔'' شاہ صاحب کی آواز میں بہت نرمی تھی۔

''نکاح..... نکاح کرنا چاہتی ہوں۔'' شاہ صاحب نے سب کے چہروں کی طرف دیکھا جن پر ناگواری ہی ناگواری تھی۔

''تم سب سن لو اور سلمٰی کے نکاح کا بندوبست کرو۔ خیر دار کسی نے اس بات کو اس کی بے شرمی یا بے غیرتی پر محمول کیا۔ جس چیز کا حق اللہ نے اسے دیا ہے اسے چھیننے کا کسی کو کوئی حق نہیں ہے۔'' شاہ صاحب کی نرم مگر پر جلال آواز پر کمرے میں سناٹا چھا گیا۔

''کتنی جگ ہنسائی ہو گی ہماری۔'' تائی تلملا کر بولی۔

''جگ ہنسائی کا خوف ہے تم لوگوں کو..... اللہ کی نافرمانی سے ڈر نہیں لگتا تمہیں؟'' شاہ صاحب قدرے رعب سے بولے۔

''اگر تم لوگ نہیں کر سکتے تو یہ کام میں خود کروں گا۔'' شاہ صاحب نے فیصلہ سنایا۔

''شاہ صاحب! اس کام میں، میں آپ کے ساتھ ہوں۔'' ان سب میں سے صرف ایک شہود تھا جو اٹھا تھا۔ کئی نظریں معنی خیز انداز میں ادھر اُدھر گھومی اور ساکت ہو گئیں جب شہود کی اگلی بات سنی تو۔

''سلمٰی میری بہنوں جیسی ہیں۔ میں انھیں بھائی بن کر رخصت کروں گا۔'' شاہ صاحب مسکرائے۔

''تم جاؤ بیٹی۔'' اُنھوں نے سلمٰی کو جانے کا اشارہ کیا۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر کمرے کی دہلیز عبور کر گئی۔ باقی سب کو ابھی تک سانپ سونگھا ہوا تھا۔

''اپنا حق مانگنے والا بے شرم نہیں بہادر ہوتا ہے اور بے غیرت وہ ہوتا ہے جو کسی حق دار کو اس کا حق دینے پر تیار نہ ہو۔'' شاہ صاحب نے بات مکمل کر کے سب کے چہروں کی طرف دیکھا۔ شہود کے علاوہ باقی تقریباً سب کے چہروں پر دبا دبا غصہ تھا۔ مگر اللہ والے خالق کی فرمانبرداری میں مخلوق کی ناراضی کی پرواہ نہیں کرتے۔ سو شاہ صاحب نے بھی نہ کی اور سب کو کمرے سے جانے کا اشارہ کر کے تسبیح پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔

لتاں کھگی نے دور سے ہاتھ جوڑ کر شاہ صاحب کا شکریہ ادا کیا اور برآمدے سے گزر کر کھلے صحن میں آ گئی۔ اس نے شاہ صاحب کو ساری صورت حال بتا کر اپنی مدد کرنے کا کہا تھا اور اُنھوں نے اسے مایوس نہیں کیا تھا۔ وہ اتنی خوش تھی جیسے سلمٰی کے بجائے کھگی آباد ہونے جا رہی ہو۔ لتاں کھگی نے اپنی آئندہ نسلوں کو بے نام جھوٹی زنجیروں سے آزاد کرا دیا تھا اور خود سالوں بعد کھلی ہوا میں سانس لی تھی۔

وہ مسکراتے ہوئے آسمان کو دیکھتی تھی اور گہرے گہرے پرسکون سانس بھرتی تھی۔ آج اسے اس سوال کا جواب بھی مل گیا تھا کہ اسے اتنی لمبی زندگی کیوں دی گئی تھی۔

☆

شبانہ شوکت

آئینہ ہوں میں

شہلا نے چھوٹی سی فراک کے ساتھ کڑھائی والا ٹراؤزر پہنا ہوا تھا اور ایک کندھے پر پٹی نما دوپٹہ لٹکائے ٹھمک ٹھمک چلتی لاؤنج میں آئی تھی۔

"کیسی لگ رہی ہوں؟" ردا اور امی نے ایک ساتھ گردن موڑی اور اس کا حلیہ دیکھ کر بڑی مشکل سے اپنے تاثرات چھپائے تھے لیکن بیا...... اسے کون روک سکتا تھا۔ اچھی بھلی لیپ ٹاپ پر جھکی ہوئی تھی کہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"اف بھابھی! یہ کیا پہن لیا آپ نے؟ یہ تو کوئی اسمارٹ لڑکی پہنے تو شاید سوٹ کرے آپ تو ایک دم غبارہ لگ رہی ہیں۔"

"تمہیں تو بات کرنے کی تمیز ہی نہیں ہے۔" شہلا بھنا گئی۔ ساڑھے پانچ ہزار کا ریڈی میڈ فراک شاپ میں دیکھ کر اس کی رال ٹپک پڑی تھی، کس مشکل سے اس نے فہد کو منایا تھا وہی جانتی تھی۔ اب اپنی بھتیجی کی سالگرہ میں جا رہی تھی تو پہنا تھا۔ جیولری اور میک اپ کے بعد تو اسے پریانکا چوپڑا بھی اپنے آگے پانی بھرتی محسوس ہو رہی تھی۔ بیا کے اس تبصرے نے آگ لگا دی تھی۔ اس پر مزید فرمان......

"اُف بھابھی! اپنی کمر کے بل تو دیکھیں، کیسے سائیڈوں سے باہر نکلے آ رہے ہیں؟ بالکل اچھی نہیں لگ رہیں۔"

"کوئی نہیں، اتنی تو پیاری لگ رہی ہے ماشاءاللہ۔ شہلا! تم اسے رہنے دو، ردا سے پوچھو کتنی پیاری لگ رہی ہو۔ اللہ پہننا اوڑھنا نصیب کرے۔"

امی نے ہمیشہ کی طرح آگے بڑھ کر اس کی تباہ کن پرفارمنس پر پردہ ڈالنے کی ایک اور کوشش میں کامیابی حاصل کی، ردا نے بھی حصہ بٹایا۔

"بہت اچھی لگ رہی ہیں بھابھی! واقعی لیٹسٹ فیشن کے مطابق جو چیز استعمال کی جائے بھلی لگتی ہے۔" اس نے جٹھانی کا دل رکھا ورنہ اس کی ہیئت کذائی پر ہنسی تو بہت آ رہی تھی۔ شہلا کے تنے ہوئے چہرے پر بالآخر مسکراہٹ پھیلی تھی۔ اس کے جانے کے بعد جب ردا کچن میں چلی گئی تو امی بیا کی طرف مڑیں۔

"تمہیں کب عقل آئے گی؟ کیوں خود پر قابو نہیں تمہیں؟"

"اس میں عقل کی کیا بات ہے، انہوں نے پوچھا کیسی لگ رہی ہوں؟ میں نے کہہ دیا جیسی لگ رہی تھیں، اب جھوٹ تو نہیں......"

"چپ کرو جھوٹ نہیں بول سکتی، تمہاری یہ

زبان کوئی مصیبت لاکر چھوڑے گی۔"

امی شدید برہم تھیں، اس نے سر جھٹکا اور پھر سے لیپ ٹاپ پر جھک گئی، امی کی ڈانٹ تو معمول کا حصہ تھی۔

☆☆☆

بریرہ عرف بیا سفاکی کی حد تک صاف گو تھی، کہیں مصلحت سے کام لینا پڑتا تو اس کی صاف گوئی معاملہ خراب کرنے کی وجہ بن جاتی تھی، یہ تو شکر تھا کہ وہ اپنی پڑھائی میں مگن رہتی تھی ورنہ تو گھر میں ہی ہر قت جنگ و جدل کی صورتحال بنی رہتی۔ خاندان میں ہی کئی لڑکے اس قابل تھے کہ اسے ان کے لیے مانگ لیا جاتا لیکن اس کی صاف گوئی سے سب گھبراتے تھے ورنہ تو اس میں ذہانت و خوب صورتی کا بہترین امتزاج تھا۔ ابھی کوئی رشتہ مانگ نہ پایا کہ امی کی دیرینہ سہیلی اپنے بیٹے کے لیے چلی آئیں۔ عدن کا کویت میں آٹو پارٹس کا کارخانہ تھا، دو بھائی دو بہنیں تھیں۔ ایک بہن کی شادی عدن کے ساتھ ہی ہوئی تھی اور چھوٹی ابھی کالج میں تھی۔ خوب صورت، تعلیم یافتہ اور برسر روزگار لڑکا کسی بھی طرح نظر انداز کرنے کے قابل نہ تھا سو امی ابو نے باہمی مشاورت کے بعد ہاں کہہ دی تھی۔

منگنی کی تقریب منعقد کی گئی، جس میں سسرال والوں کا لایا ہوا شاکنگ پنک کلر کا لہنگا سوٹ اسے بالکل پسند نہیں آیا اور اس نے برملا اظہار بھی کر دیا یہ تو شکر کہ پاس دونوں بھابیاں ہی تھیں۔ انھوں نے اسے وہیں خاموش کروا دیا۔ لیکن بعد میں خوب بول کر دل کی بھڑاس نکالی۔

"آج کل اتنے منفرد کلر ان ہیں اور یہ چیختا چلاتا کلر لے آئے، اب کون پہنتا ہے ایسے کلر؟"

"زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں، کسی کے سامنے ایسا کچھ بولنا بھی مت۔ ذرا سی بات کا فسانہ بن جاتا ہے، پھر شادی کے بعد اپنی پسند کے بنوانا، ابھی جو بھی وہ اپنی خوشی سے لے آئے وہی اچھا ہے۔" امی نے سختی سے گھرکا۔

وہ برے برے منہ بناتی پیر پٹختی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

☆☆☆

عدن کی بہنیں سارا، زارا امی سے اجازت لینے آئیں کہ عدن فون پر بیا سے بات کر سکتا ہے؟

امی نے ابو سے مشورہ کر کے ہاں میں جواب دیا۔ ظاہر ہے دو ماہ بعد شادی تھی تو کیا منع کرتے، بس بیا کی طرف سے خطرہ تھا کہ وہ کچھ الٹا سیدھا نہ بول دے۔ لگام تو تھی نہیں اس کی زبان میں، بولتی تو پھر بس اللہ معافی۔ خوب سمجھا بجھا کر فون اس کے ہاتھ میں دیا گیا۔ پہلی بار تو وہ جھجکتی، شرماتی رہی پھر رفتہ رفتہ عدن کے مہربان، نرم لہجے نے اسے بھی بے تکلفی سے بات کرنے پر مجبور کر دیا۔ وہ بہت سلجھا ہوا لڑکا تھا، بمشکل دس منٹ بات کرتا، اس میں بھی نہ بلاوجہ ایسی ویسی بات نہ چھچھورا پن، ہلکی پھلکی سی گفتگو، بیا کے مشاغل وغیرہ۔

"گھر کے کاموں میں دلچسپی ہے آپ کو؟" سرسری سے لہجے میں پوچھا۔

"دلچسپی تو نہیں، لیکن کر لیتی ہوں۔" اس کے جواب پر عدن کو ہنسی آ گئی۔

"کھانا کیسا بناتی ہیں؟"

"توبہ کریں۔" وہ دہل کر بولی۔ "مجھ سے چائے ڈھنگ سے نہیں بنتی۔"

عدن کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

"کیا کہہ رہی ہیں آپ؟"

"صحیح کہہ رہی ہوں، مجھے کھانا بنانا نہیں آتا بلکہ مجھے کچن میں جانا ہی پسند نہیں۔"

اس نے اپنی مشہور زمانہ صاف گوئی سے کام لیا، عدن کو چپ لگ گئی۔

"ہیلو ہیلو....." وہ بھی کال کٹ چکی۔ وہ ہلکا سا کھنکارا۔

"تو گھر میں کھانا کون بناتا ہے؟"

https://reading.sarctorian.net

''بھابیاں زندہ باد۔'' اس نے ازلی سچ بولا۔ ''ناشتہ امی بناتی ہیں اور کھانا ایک ایک وقت کا دونوں بھابیاں۔''

''تو اس کا مطلب ہے آپ کچھ بھی نہیں کرتیں۔'' عدن مایوس ہوا۔

''کرتی ہوں، بچوں کے لیے نوڈلز اور فرنچ فرائز وغیرہ میں بناتی ہوں۔'' اس کی فخریہ کاوشوں نے عدن کو متاثر نہیں کیا۔

''لیکن مجھے سادہ کھانا پسند ہے، یہ سب تو ہوٹل میں بھی مل جاتا ہے۔''

''وہ تو سادہ کھانا بھی مل جاتا ہے۔'' بے اختیار بیا کے منہ سے نکلا۔

''ہاں مل جاتا ہے لیکن گھر جیسی بات کہاں۔'' عدن نے ٹھنڈی سانس لی۔

''مجھے تو ہوٹل کے کھانے زیادہ اچھے لگتے ہیں۔'' بیا نے جس جوش سے کہا۔ عدن کی امیدوں کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔ بہت مایوس ہوکر اس نے پوچھا۔

''تو آپ کا سیکھنے کا بھی ارادہ نہیں ہے؟''

''سچ پوچھیں تو میرا تو بالکل نہیں ہے لیکن امی بہت پیچھے پڑی ہیں کہ اب شادی ہونے والی ہے تو سب کچھ سیکھو۔ اتنی مشکل ڈشز بنوانے پر لگایا ہوا ہے کہ گھنٹوں کے حساب سے کچن میں گھسے رہو۔'' اپنی حالت زار بیان کرتے ہوئے وہ روہانسی ہوگئی۔

عدن نے دل کی گہرائیوں سے شکر کا کلمہ پڑھا تھا، ورنہ بیا نے اسے گھما کر رکھ دیا تھا۔ وہ جو بیا سے فرمائشی کھانے بنوانے کی خواہش میں کیسے کیسے خواب دیکھ چکا تھا ان کی تعبیر نے اسے ڈرا ہی دیا تھا۔

☆☆☆

''اللہ جھوٹ نہ بلوائے تو......'' تہمینہ آنٹی نے اپنے مخصوص انداز میں بات شروع کی ہی تھی کہ وہاں موجود بیا نے ٹوکا۔

''اللہ کبھی جھوٹ نہیں بلواتا، ہم خود بولتے ہیں جھوٹ۔''

امی نے آنٹی کے منہ کے بگڑے زاویے دیکھ کر اپنا سر پیٹ لیا تھا۔

''اٹھو یہاں سے، چائے بنا کر لاؤ۔'' انہوں نے گھور کر اسے دیکھا تو وہ کچن کی طرف بڑھی۔

''بہت منہ کھلتا جارہا ہے اس کا، چھوٹے بڑے کی تمیز کیے بغیر جو منہ میں آتا ہے بول دیتی ہے۔'' آنٹی کا مزاج ہنوز برہم تھا۔

''تم چھوڑو اسے، ثانیہ کا بتاؤ کیا بتارہی تھیں۔'' امی نے موضوع تبدیل کیا۔

''ہاں، دیکھو اپنی ماں کو فون کر کے میری برائیاں کررہی تھی کہ امی کو میرے دیر سے اٹھنے پر اعتراض ہوتا ہے، بچوں کی شرارتوں پر بھی اعتراض۔ یہ تو میں ہوں جو برداشت کرتی ہوں، ہوتی کوئی اور تو پتا لگ جاتا۔''

امی نے تعجب سے انگلی ٹھوڑی پر رکھ لی۔

''میں نے پھر سنائیں، کہا جب بھلے کو ٹوکتی ہوں تو اتنا اعتراض، مجھے جو صحیح نہیں لگے گا میں تو ٹوکوں گی، جسے برا لگتا ہے لگے میری بلا سے۔ مجھے کون روک سکتا ہے میں دیکھتی ہوں۔''

''لیکن اس طرح تو اسے الگ ہونے کا بہانہ مل جائے گا۔'' امی کو خدشہ ہوا۔

''ارادے ہی یہی ہیں اس کے، مجھے علم ہے اور میرے جیتے جی یہ نہیں ہونے والا۔ یہ بھی یاد رکھے۔''

''ان شاءاللہ اور علینہ کی سنائیں کیسی ہے؟ آئی نہیں ڈھائی ماہ ہوگئے؟''

''میں نے ہی روکا ہے اسے، وہ جو نند بیوہ ہوکر بیٹھ گئی اس کے سر پر، خوب کان بھرتی ہے اشعر کے۔ علینہ صبح دیر سے اٹھتی ہے، پہلے اشعر چائے کے ساتھ سلائس کھا کر آفس چلا جاتا تھا، یہ اریشہ آئی تو اسے پراٹھے بنا بنا کر دینے لگی اور ساتھ علینہ کی چغلیاں بھی۔ میں نے علینہ کی کھنچائی کی، اب الارم لگا کر

سوتی ہے اور اشعر کو ناشتا دے کر دفتر بھیج کر پھر سونا ہو تو سو جاتی ہے۔ اشعر کے آنے پر سارا وقت اسے دیتی ہے۔ اریشہ کو موقع ہی نہیں دیتی کہ وہ بھائی کے پاس بیٹھ کر اس کی چغلیاں کر سکے۔"

بیا چائے لے کر پاس آچکی تھی اور شدید صدمے میں گھری ان کی باتیں سن رہی تھی۔ امی بھی باتوں میں مگن ہو کر اسے بھلا بیٹھی تھیں ورنہ اس کے قریب پہنچتے ہی چوکنا ہو چکی ہوتیں۔

"اریشہ کے دونوں بچے پڑھ رہے ہیں نا؟"

"ہاں ان کے خرچے بھی اشعر کے اوپر۔ کھانا، پینا، پہننا، اوڑھنا سب کا بوجھ اشعر ہی اٹھا رہا ہے۔ میری علینہ کا حوصلہ ہے جو یہ سب برداشت کر رہی ہے۔" ان کی آواز میں زمانے بھر کے دکھ سمٹ آئے تھے اور بیا کی برداشت ختم ہو چکی تھی۔

"انس بھائی کی دو دکانوں کا کرایہ بھی تو آتا ہے نا اور انس بھائی کی وفات پر اچھی خاصی رقم ملی تھی، وہ سب کہاں کر دیا اریشہ آپی نے؟" تہمینہ نے ناگواری سے اسے دیکھا تھا۔

"اسی کے پاس ہے، کسی نے کیا کرنا اس کے پیسے کا؟"

"لیکن سنا تو یہی تھا کہ اشعر بھائی نے وہ سارا پیسہ....."

"میں نے کبابوں کا مسالا تیار کر دیا تھا، اس میں انڈے مکس کر کے ان کی ٹکیاں بنا کر فریز کر دو۔" امی نے صورت حال کی سنگینی بھانپتے ہی اسے چلتا کیا ورنہ وہ سارا ماحول برباد کر دیتی، پیر پٹختی وہاں سے کچن کی طرف گئی۔

"کس قدر چالاک عورت ہیں یہ تہمینہ آنٹی! اپنی بیٹی کے فائدے کے لیے اسے کیسی کیسی پٹیاں پڑھائی ہیں اور بہو پر کتنی پابندیاں۔" ان کے جاتے ہی وہ شروع ہو گئی۔

"تمہارا کیا کام ہے بیچ میں یا بعد میں بولنے کا۔" امی نے سختی سے کہا۔

"او کے، میرا کام نہیں تو آپ ہی ٹوک دیتیں انہیں، کتنی غلط بات بلکہ بہتان طرازی کر رہی تھیں وہ۔"

امی کو طیش آ گیا۔

"اب تم سمجھاؤ گی مجھے کہ کیا صحیح ہے، کیا غلط۔ ہر بات میں مت بولا کرو، کیا ضرورت تھی اس بکواس کی کہ اریشہ کا پیسہ اشعر نے لے لیا، ہمیں کیا۔ وہ آپس میں کچھ بھی کریں، ان کا اپنا مسئلہ ہے اس طرح کی غلطیاں پکڑنے لگی تو میں تو ان کی ہم سائیگی سے گئی، مصلحت سے کام لے کر رشتہ داریاں اور محلے داریاں نبھائی جاتی ہیں۔ ایسی بک بک سے نہیں، میں کہے دے رہی ہوں بیا! تم نے اپنے رنگ ڈھنگ نہ بدلے تو بہت نقصان اٹھاؤ گی۔"

"اب سچ بولنا جرم ہو گیا۔" امی کے ڈر سے ہلکی سی آواز میں بڑبڑائی تھی۔

امی نے زور سے ہاتھ جوڑے تھے۔

"اللہ کو مانو بیا! اپنے سچ اپنے پاس رکھو، نہیں ضرورت کسی کو تمہاری سچائی کی۔"

وہ بہت غصے سے وہاں سے واک آؤٹ کر گئی تھی۔

☆☆☆

"جی آپی! جی ایگزامز کی تیاری تو ساتھ ہی چل رہی ہے، جی بہت اچھی تیاری ہے ان شاء اللہ۔ نیکسٹ ویک اسٹارٹ ہیں پیپرز جی جی۔" اس کی نند کا فون تھا، وہ بات کرتے کرتے لاؤنج میں آ گئی، جہاں امی ننھے فہد کو کاغذی بادام چھیل کر دے رہی تھیں، اس نے چند دانے منہ میں ڈال لیے اور اب ہوں ہوں کرتی جواب دے رہی تھی۔ امی نے از حد ناگواری سے اسے دیکھا، اس نے انہیں دیکھے بغیر مزید دانے اٹھا کر منہ میں ڈالنے چاہے۔ تو امی نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا، ساتھ ہی ناگواری سے اسے گھورا بھی۔ انہیں سخت ناپسند تھا کہ کسی سے بات چاہے سامنے یا فون پر کی جا رہی ہو اور منہ برابر چل

ہا ہو۔ تہذیب کے خلاف کہلایا جاتا تھا بلکہ تھا ہی تہذیب کے خلاف، پھر ایسے نازک رشتے میں بے احتیاطی؟ وہ بھنا گئیں، ان کے تاثرات نے اسے سہا دیا باقی کی بات اس نے بہت تمیز سے کی تھی۔

☆☆☆

"امی! بریرہ کا رویہ آپ کے ساتھ کیسا ہے؟" عدن نے سرسری لہجے میں پوچھا تھا۔

"ماشاءاللہ، ماشاءاللہ، جیسی صورت ویسی سیرت، پہلے تو ذرا جھجکتی تھی اب تو خوب گپ شپ کرتی ہے۔"

امی نے تو تعریفوں کے پل باندھ دیے تھے۔ عدن کی عقل چکرا گئی تھی۔ اس دن اس نے بیا سے ذکر کیا کہ...... "مجھے کم از کم چار پانچ ماہ لگ جائیں گے تمہیں یہاں بلانے میں، تم اتنا عرصہ میرے گھر والوں کے ساتھ رہ لینا اور بہت اچھے طریقے سے رہنا، یہ سوچ کر کہ تم وہاں مہمان ہو اور تمہیں یہاں آنا ہے۔"

"ایسے ہی رہ پاؤں گی ورنہ تو میرا ان کے ساتھ بالکل گزارا نہیں ہے۔"

ازلی منہ پھٹ انداز میں کہہ دیا بغیر یہ سوچے کہ اس کے تلخ جملے عدن کے دل میں ترازو ہو چکے ہیں، کیونکہ جن کے متعلق اس نے یہ کہا تھا وہ عدن کی ماں بہنیں تھیں۔ اس نے بظاہر رسان سے پوچھا۔

"وجہ پوچھ سکتا ہوں، کیوں گزارا نہیں ان کے ساتھ؟"

"بہت تیز اور نکتہ چیں ہیں وہ لوگ، ہر بات میں کیڑے نکالتی ہیں۔"

سدا کے بدلحاظ لہجے میں کہتے ہوئے اندازہ نہ ہوا کہ دوسری طرف موجود عدن کو کتنا بڑا شاک لگا ہے۔ جو لڑکی اس کی ماں بہنوں کے لیے ایسے خیالات رکھتی ہے وہ آنے والے وقت میں ان کے ساتھ کیا رویہ رکھے گی۔ یہ اندازہ لگانا مشکل تو نہیں تھا۔ وہ شدید ذہنی دباؤ سے گزر رہا تھا کہ بریرہ نے ان کے لیے اتنے سخت الفاظ استعمال کیے تھے کہ وہ اس رشتے کے حوالے سے تحفظات کا شکار ہو گیا تھا اور اسی لیے امی سے پوچھا تو وہ کہہ رہی تھیں کہ وہ ان سے خوش اخلاقی سے پیش آ رہی ہے تو کیا وہ ڈبل پالیسی چل رہی ہے، منہ پر ہنس کر ملنا اور پیٹھ پیچھے برائی، یعنی دوہری فطرت؟ اسے شدید مایوسی ہو رہی تھی۔ بریرہ اس کی امیدوں کے برعکس ثابت ہو رہی تھی، اس کی بھولی بھالی، معصوم صورت نے اسے جتنا متاثر کیا تھا وہ اس کے خیالات جاننے کے بعد مایوسی میں تبدیل ہو رہا تھا، لیکن امی کی بات نے اسے پھر سے الجھا دیا تھا۔ اگلے ہفتے اس نے بیا سے بات کی تو وہ بھی اس کی امی کی تعریف میں رطب اللسان تھی۔

"آپ تو کہہ رہی تھیں کہ میری امی اور بہنیں بہت تیز ہیں۔"

"مجھے غلط فہمی ہو گئی تھی۔" اس کی آواز دھیمی اور معذرت خواہانہ تھی۔ عدن نے لمبی سانس لی تھی۔

"بہتر ہوتا غلط فہمی دور ہو جانے تک آپ کوئی تبصرہ نہ کرتیں۔"

"اتنی عقل مند ہوتی تو امی سے ہر وقت ڈانٹ کھاتی؟" اس نے جس بے بسی سے کہا عدن کو ہنسی آ گئی۔

"چلو، میرے لیے اتنی بدل جاؤ کہ اچھے اچھے کھانے بنانے سیکھ لو، آنا تو یہیں ہے نا، ہوٹل کے کھانے کھا کھا کر تنگ آ چکا ہوں۔"

"وہ تو سیکھ رہی ہوں نا۔" وہ اتنی تیزی سے بولی کہ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا تھا۔

"سچ بولنا اتنا برا ہوتا ہے کیا۔"

"سچ بولنا کبھی برا نہیں ہوتا لیکن منہ پھٹ ہونا اور کسی کے جذبات کا خیال کیے بغیر کچھ بھی کہہ دینا جو اس کے لیے دل آزاری کا باعث بنے، ضرور برا لگتا ہے۔ مصلحت اسی کا نام ہے۔" عدن نے نرم لہجے میں سمجھایا تھا۔

"اب میں خیال رکھوں گی۔" اس نے دل سے وعدہ کیا تھا۔ عدن نے تشکر کا لمبا سانس ہوا کے سپرد کیا تھا۔

☆

رخسانہ نگار عدنان

شام کی حویلی میں

کشف اپنے پرانے طرز کے گھر سے شدید بے زار ہے اور وہ اپنی آنی سے ہزار بار کہہ چکی ہے کہ وہ اس گھر سے جان چھڑا لیں لیکن وہ ہر بار اس کی بات ہنس کر ٹال دیتی ہیں۔ کشف گلیوں سے گزرتے خوانچا فروشوں سے بھی سخت بے زار رہتی ہے اور انہیں حسب توفیق بد دعاؤں سے نوازتی رہتی ہے۔

طاہرہ بیگم کا اپنے گھر پر کافی ہولڈ ہے۔ ان کی بہو سونیا اور بیٹا آزر دونوں ہی ان کے فرماں بردار ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ ان کی پوتی کا رشتہ ان کی مرضی سے طے ہو۔

جبکہ ردا اپنے آفس میں کام کرنے والے جبران سے محبت کرتی ہے اور اسے کہتی ہے کہ وہ اس کا رشتہ لے کر آئے۔

دوسری جانب کشف کا اسے پڑوسی چھیڑتا ہے اور وہ اس کے پاؤں پر اینٹ دے مارتی ہے۔ بعد میں اسی لڑکے کی ماں سے بھی خوب جھگڑا کرتی ہے۔

زینب شاعری کرتی ہے اور ساتھ ہی ایک اسکول میں بھی پڑھاتی ہے وہ اپنا مسودہ حیدر کے پاس لے کر جاتی ہے تاکہ وہ سرفراز سے بات کر کے اسے چھپوا سکیں۔

آفس سے واپسی پر اس کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے اور وہیں تیز برستی بارش میں اس کا ایکسڈنٹ ہو جاتا ہے۔

MOMIN.08

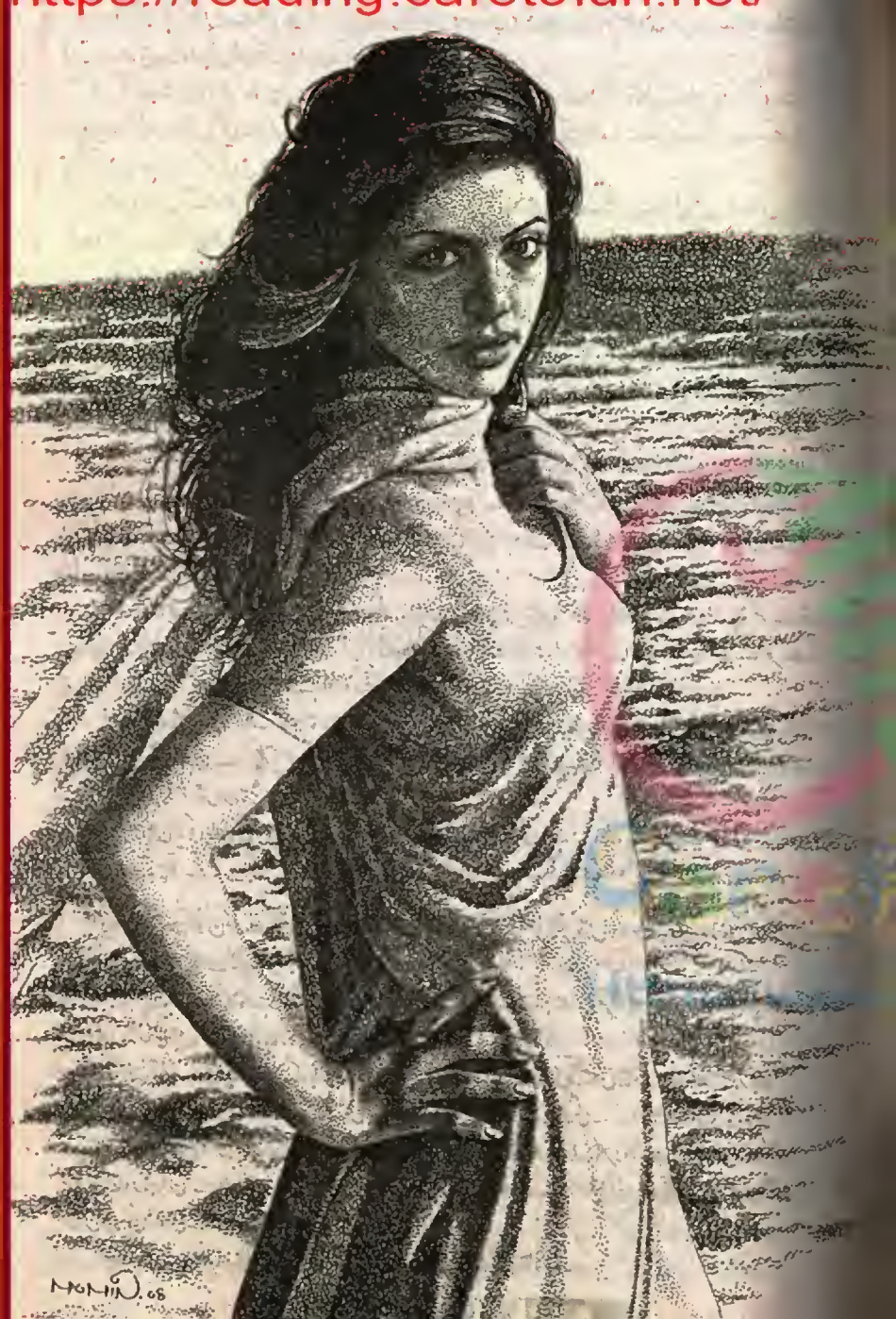

آڈیٹوریم لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہے جہاں ڈاکٹر موحد تین بڑی بیماریوں کو کنٹرول کرنے کے حوالے سے لیکچر دے رہے ہیں۔ اور ہال میں تمام لوگ ساکت ہو کر سن رہے ہیں۔

کشف ناہید کو دیکھ کر اس سے بے اختیار لپٹ جاتی ہے۔ ناہید کو زینب کی فکر ستاتی ہے اور وہ بارش سے بھی خوف زدہ ہیں۔ کشف انہیں کہتی ہے کہ زینب فون نہیں اٹھا رہی ناہید اس سے بتول خالہ سے کیے گئے جھگڑے کے بارے میں پوچھتی ہیں اور اسے سمجھاتی ہیں۔

میر و خزاں کے موسم میں اپنی گاڑی میں موجود ہے اور کسی کی یادیں جو اسے گھیرے ہوئی ہیں۔ وہ اس سے کہتی ہے کہ وہ اس سے اگر کبھی ناراض ہوئی تو میر و اسے منا لے۔ وہ ان سوچوں میں الجھا چلتا چلا جاتا ہے۔

موحد راستے میں رش دیکھ کر اترتا ہے اور سامنے بے ہوش پڑی زینب کو دیکھ کر اسے ہاسپٹل لے جاتا ہے۔

آذر کو ایک فون کال آتی ہے اور وہ عجلت میں آفس سے باہر نکلتا ہے۔ زینب کے بارے میں کوئی بھی معلومات نہ پا کر کشف شدید پریشان ہو جاتی ہے۔ سہیل اپنے طور پر پتا کروا لیتا ہے اور اسکول بھی چکر لگا آتا ہے۔ لیکن وہ وہاں بھی موجود نہیں ہوتی۔ وہ حیدر کو فون کرتی ہے وہ بھی پریشان ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد اس کے فون پر موحد کی کال آتی ہے۔ اور وہ اسے زینب کے بارے میں بتاتا ہے۔

دوسری طرف زینب کو ہوش آتا ہے اور موحد اسے جانا پہچانا لگتا ہے۔ وہ اس کا شکریہ ادا کرتی ہے اور گھر جانے کا کہتی ہے۔ اور موحد سے اس کے باپ کا نام بھی پوچھ لیتی ہے۔ موحد اسے اس کے گھر چھوڑ کر آتا ہے۔ جہاں کشف کے ساتھ بلال بھی موجود ہوتا ہے۔ باتوں کے دوران بتول خالہ آجاتی ہیں اور ماں بیٹی کے کردار پر الزام تراشیاں کرتی بکتی جھکتی بلال کے ڈرانے پر گھر سے نکل جاتی ہیں۔

آذر، ردا کو لے کر گھر پہنچتا ہے جہاں پورا گھر ردا کی غیر حاضری کے باعث پریشان ہے۔ ردا اپنے کمرے میں جاتی ہے جہاں رمشا اس سے بات کرنے کی کوشش کرتی ہے لیکن وہ اسے ڈانٹ کر بھگا دیتی ہے۔ سونیا اس کے کمرے میں آتی ہیں اور اس سے پوچھتی ہیں کہ کیا ہوا ہے اور وہ کمرے کا دروازہ بند کر دیتی ہے۔ ردا حیران رہ جاتی ہے۔

میر و دیوار میں کیل ٹھونک رہا ہوتا ہے جب وہ عورت چیختے ہوئے آتی ہے اور اس سے جھگڑتی ہے۔ اس حسین عورت کی طرف میر و شرمندگی سے دیکھتا اس کی بڑبڑاہٹ سنتا ہے۔ تبھی ان کی بیٹی آتی ہے اور اس کا سرخ لباس دیکھ کر وہ عورت پھر سے چیخنا چلانا اور آخر میں رونا شروع کر دیتی ہے۔

وہ نوجوان لڑکی ماں کی اس حالت سے شدید الرجک ہے اور کہتی ہے کہ اسے پاگل خانے بھیج دیا جائے۔ جبکہ وہ عورت چلاتے چلاتے میر و کے گریبان میں چہرہ چھپا لیتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ وہ اس سے دور نہ جائے۔

دادی شائستہ کو فون کر کے کہتی ہیں کہ آذر اور سونیا کو اس رشتے پر اعتراض نہیں۔ وہ بیس دن بعد نکاح رخصتی کی تاریخ رکھ لیتی ہیں جبکہ دروازے میں کھڑا آذر یہ سن کر ساکت رہ جاتا ہے۔

آذر اپنی ماں سے کہتا ہے کہ انہیں رشتہ طے کرنے سے پہلے کم از کم ردا کی مرضی ضرور معلوم کرنی چاہیے۔ لیکن وہ بات کو یوں گھماتی ہیں کہ آذر چپ رہ جاتا ہے۔

کشف آنی سے اپنے باپ کے بارے میں پوچھتی ہے۔ وہ اسے ساری تفصیل بتاتی ہے۔ میر منصور باہر گیا اور وہاں جا کر دوسری شادی کر لی۔ کشف ضدی لہجے میں کہتی ہے کہ وہ ان سے ضرور ملے گی۔

سونیا ردا سے پوچھتی ہے کہ برسات میں کیا ہوا تھا۔ وہ کہتی کہ کچھ نہیں ہوا۔ پھر وہ اسے بتاتی ہے کہ وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے اور جبران سے ہی شادی کرے گی۔ سونیا اسے زوردار تھپڑ مارتی ہے۔ سونیا آذر کو ڈھکے چھپے لفظوں میں بتاتی ہے کہ اس کی بیٹی شادی کے لیے راضی نہیں۔

حیدر زینب سے ملتا ہے تو اسے کشف کے رویے کے بارے میں بتاتی ہے۔

http://readingpakistan.net

کشف خیالوں میں گم بس میں بیٹھی رہ جاتی ہے۔ اڈے پر پہنچ کر وہ چونکتی ہے اور گھبرا کر رہائشی علاقے کی طرف جاتی ہے۔ جہاں حمزہ اسے سونیا کے گھر ڈراپ کر دیتا ہے۔ کشف کی موجودگی سے آزر بے سکون ہوتا ہے۔

میر منصور ایما کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ بدتمیزی کرتی ہے جواباً وہ اسے تھپڑ مار دیتا ہے۔ ایما پولیس بلا لیتی ہے۔ گھر پر اس کی ماں ایک پرتکلف ڈنر تیار کر کے اس کا انتظار کرتی ہے۔ ایما ماں کو خوشی خوشی بتاتی ہے کہ اس نے باپ کو پولیس کے حوالے کر دیا ہے۔

کشف سونیا سے بھی اپنے باپ کے بارے میں پوچھتی ہے اور اس کے سامنے اس عزم کا اظہار کرتی ہے کہ وہ ضرور امریکہ جائے گی۔

زینب بتول خالہ سے معافی مانگنے جاتی ہے جہاں وہ اسے کشف کی شادی کا مشورہ دیتی ہیں۔

ڈاکٹر موحد گاؤں میں ہونے والی ایک فوتگی پر جاتے ہیں اور وہاں نہ صرف جنازے میں شریک ہوتے ہیں بلکہ قبر کھودنے میں بھی مدد کرتے ہیں جس پر گاؤں کے لوگ حیران رہ جاتے ہیں۔

سونیا زینب کو فون پر کشف کی وجہ سے بہت سناتی ہیں۔ زینب کشف سے اس بارے میں پوچھتی ہے تو وہ کہتی ہے کہ ہاں وہ سونیا کے پاس اپنے باپ کی معلومات لینے گئی تھی۔ اسے سونیا کا عجیب رویہ یاد آتا ہے۔

آزر جبران سے ملتا ہے اور اسے بے عزت کرتا ہے، ردا غصے سے باہر نکل جاتی ہے۔

موحد کو زینب ڈنر پر انوائیٹ کرتی ہے۔ کشف کو بہت غصہ آتا ہے۔ وہ ڈنر پر موحد سے بدتمیزی کرتی ہے۔

میر جیل میں بیٹھا شدید غم میں ہوتا ہے۔ اسے اپنی بیٹی سے اس حرکت کی توقع نہیں ہوتی ردا کو جبران الزام دیتا ہے۔ اور پھر اسے کہتا ہے کہ وہ کل ہر اس صورت اس سے ملاقات کر لے جبران ردا کو ایک انجان جگہ لے جاتا ہے۔

چھٹی قسط

آزر کے لیے طاہرہ بیگم کا یہ ردعمل بہت پریشان کن تھا۔

وہ ماں کا ہاتھ اپنے سر سے ہٹاتے ہوئے انہیں بٹھانے کی کوشش کرنے لگا مگر وہ تو اس وقت کوئی بھی رعایت دینے کے لیے تیار نہیں تھیں۔

''آزر! تمہیں معلوم ہے میں ہر چیز برداشت کر سکتی ہوں۔ جھوٹ اور غلط بیانی نہیں۔'' وہ قطعیت سے سخت لہجے میں تنبیہ کر رہی تھیں۔

''میں کیوں بولوں گا آپ سے جھوٹ اور کوئی غلط بیانی نہیں کی کبھی بھی، کر ہی نہیں سکتا۔ دل سے آپ کو چاہتا بھی ہوں اور آپ کا احترام بھی کرتا ہوں اور کبھی برداشت نہیں کر سکتا کہ میرے گھر میں آپ کی عزت احترام آپ کے مقام میں کوئی کمی آئے پھر آپ کیوں اتنی بدگمان ہو رہی ہیں۔ پلیز بیٹھ جائیں اماں جان اور یقین کریں — میں آپ سے جھوٹ نہیں بول رہا۔'' اب کے اس نے زبردستی ماں کا — ہاتھ کھینچ کر اپنے ساتھ بٹھایا تھا۔

''تم جانتے ہو میں نے شائستہ کو زبان دی ہے۔ زبان کا مطلب ہمارے لیے جان دینے سے بھی بڑھ کر ہے۔'' وہ جذباتی پن سے بولیں۔

''میں سمجھ سکتا ہوں، سمجھتا ہوں یہ آپ کی ہی نہیں میری بھی عزت کا سوال ہے اور میں کیوں اس سے پھروں گا۔'' وہ ماں کو یقین دلا رہا تھا۔

اور وہ ابھی بھی بے یقین نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

ردا بہت سمجھ دار ہے پڑھی لکھی ہے، مجھے اپنی بیٹی پر پورا یقین اور بھروسا ہے وہ کبھی کچھ ایسا نہیں کرے گی جو مجھے یا

ہماری فیملی کو کوئی نقصان پہنچائے۔'' وہ رک رک کر جیسے طاہرہ کے ساتھ خود کو بھی یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔
ماں کو یقین دلاتے ہوئے اس کے اپنے اندر کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔
''سونیا کہاں گئی ہے کیا واقعی ردا کی وجہ سے۔'' وہ مضطرب سا والد کلاک کن انکھیوں سے دیکھ رہا تھا۔
''سونیا میری چچیری بہن کی بیٹی تھی اور خوب صورت تو اتنی تھی کہ میں نے اس کا رشتہ کمسنی میں ہی تمہارے ساتھ جوڑتے ہوئے کبھی کوئی دوسری بات سوچی ہی نہیں اور اس کی معصومیت اور حسن کو دیکھ کر کوئی دوسری بات سوچ بھی کیسے سکتا تھا پانچ سال منگنی رہی تم دونوں کی'' طاہرہ اپنے ماضی میں کھو رہی تھیں۔
آزر کچھ بھٹکے ذہن کے ساتھ انہیں سن رہا تھا۔ اسے کچھ الجھن بھی ہو رہی تھی کہ یہاں سے فوراً اٹھے اور سونیا یا ردا کو کال کرے مگر اماں جان!
''ہم جدہ میں رہے اور تم دو سال لندن میں، پاکستان آئے تو سونیا کے باپ کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان کے گھر کے حالات بہت برے تھے۔ نوکری کر رہی تھی اس زمانے میں لڑکیوں کا نوکری کرنا بہت معیوب سمجھا جاتا تھا اگر چہ سب جگہ نہیں لیکن ہمارے خاندان میں تو سخت ناپسند کیا جاتا تھا اور سچ پوچھو مجھے بھی بہت برا لگا تھا۔ اس کی ماں نے کبھی بتایا ہی نہیں تھا کہ سونیا جاب کر رہی ہے۔ شادی سے پہلے بلکہ کافی پہلے چھوڑ دی تھی اس نے نوکری۔ لیکن ان ماں بیٹی کی غلط بیانی میرے دل میں گڑ کر رہ گئی۔ آزر نے بے دھیانی میں ماں کو چونک کر دیکھا۔
''پھر سونیا بہت سعادت مند ہو گئی تھی۔'' وہ اپنے دھیان میں گم بول رہی تھیں۔ آزر بھی اب ماں کو دھیان سے سن رہا تھا۔
''جب میں تمہاری منگنی کرنے گئی تھی تو یہ بڑی شوخ اور منہ زور تھی مجھے کچھ خوف بھی تھا کہ جذبات میں آ کر کچھ غلط فیصلہ تو نہیں کر بیٹھی مگر شادی کے بعد میرا دل مطمئن ہو گیا۔ سونیا بہت اچھی بہو ثابت ہوئی۔''
آزر کا سینے میں اٹکا سانس بحال ہوا تھا۔
''لیکن آزر! پھر بھی میں میرے دل میں کوئی پھانس ہے جو گاہے بگاہے یوں چبھتی ہے کہ میں بل کھا کر رہ جاتی ہوں، سونیا۔''
''السلام علیکم پاپا! داد کیسی ہیں۔'' رمشا کھلے دروازے سے شور مچاتی آ رہی تھی۔ دونوں سے لپٹ کر سلام کرتی بیگ ایک طرف ڈالتی بیٹھ کر جوتے اتارنے لگی۔
آج آپ جلدی آ گئے گھر پاپا؟'' وہ باپ کو گھر میں بے وقت دیکھ کر پوچھنے لگی۔
''ہوں بس۔'' آزر مبہم سے انداز میں یہی کہہ سکا۔
''ماما بھوک لگی ہے بڑے زوروں کی آج میں نے کچھ بھی نہیں کھایا فٹافٹ کھانا دے دیں مجھے۔'' وہ جوتے اور بیگ ہاتھ میں لیے جاتے ہوتے زور زور سے بولنے لگی۔
گھر میں نہیں ہے تمہاری ماں اللہ جانے کن چکروں میں کہاں نکلی ہے، مجھے کوئی سچ بتائے تو میرے دل کو ڈھارس بندھے۔'' طاہرہ بیگم پھر شروع ہو گئیں۔
آزر کے ماتھے پر بل پڑے تھے مگر وہ منہ پھیر کر اٹھ گیا۔
''میں کال کرتا ہوں سونیا کو۔'' وہ تحمل سے کہہ کر جانے لگا۔
''بیوی کو نہیں، بیٹی کو کرو۔'' یہ معاملہ اتنا سیدھا نہیں جتنا تم سمجھ رہے ہو یا تمہاری بیوی اور بیٹی ظاہر کر رہی ہیں۔
''طاہرہ بیگم اللہ جانے کس جرم کا بدلہ لینے پر تلی تھیں سونیا سے، آزر کو خواہ مخواہ ہی غصہ آ گیا۔ جواب تو دے نہیں سکتا تھا سو تیزی سے باہر نکل گیا۔

https://reading.pakistan.net

☆☆☆

''کوئی ہاسپٹل نہیں، ڈاکٹر ڈسپنسری کچھ تو ہوگا خان صاحب۔'' موحد اس پینتالیس سالہ شخص کی رپورٹس دیکھ کر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

''ایک ڈسپنسری تھی وہاں کوئی ڈاکٹر ہی نہیں آتا تھا۔ تھوڑی سی دوائیاں تھیں۔ وہ بھی دو عملے کے لوگ تھے کبھی کبھار آتے۔ دوائیاں نکال کر لے جاتے پھر ایک دن وہ ڈسپنسری بھی بند ہوگئی۔'' وہ کھینچ کھینچ کر سانس لیتے ہوئے بمشکل بتا رہا تھا۔ موحد پریشان سا اس کی رپورٹس پھر سے دیکھنے لگا۔

''پہلے کسی ڈاکٹر کو دکھایا۔'' وہ گہرا سانس لے کر پھر سے پوچھنے لگا۔

''دو ایک بار جب پنڈی آتا تو اپنے چاچا کے بیٹے کے محلے میں جو ڈاکٹر تھا۔ اس کو دکھاتا تھا وہ اس دن کی دوائی دے دیتا وہ کھاتا اور پھر اس سے جا کر یا کسی کے ہاتھ کچھ دنوں کی دوائی اور منگوا لیتا۔'' اب اس سے مزید بولنا مشکل ہو رہا تھا اس کے چہرے کی رنگت ہلدی سے بھی پیلی تھی۔ دیکھ کر خوف آ رہا تھا جیسے کوئی مردہ قبر سے اٹھ کر آ گیا ہو۔

موحد بے بسی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

اسے پھیپھڑوں کا سرطان تھا۔ وہ بھی کینسر آخری اسٹیج ہوگا کیونکہ یہ تو عام سے ٹیسٹ اور رپورٹ تھیں مزید ٹیسٹ ۔۔۔ ہوتے تو معلوم ہوتا۔ یہ اپنی اس حالت کے ساتھ مزید اور کتنے دن اس زمین کے اوپر سانس لے سکتا ہے۔

''ہمیں کیا ہوا ہے ڈاکٹر صاحب رات رات بھر تکلیف سے سو نہیں ہو سکتا لگتا ہے ٹی بی، دی بی ہے پر ہمیں کھانسی کے ساتھ خون تو نہیں آتا۔'' وہ کتنی معصومیت سے پوچھ رہا تھا۔ موحد کا دل کٹ سا گیا۔

وہ اسے کیا بتائے اور کیسے بتائے کہ اس کے پاس مہلت کے شاید چند ہی دن بچے ہوں گے۔

''ڈاکٹر صاحب! کوئی دوائی ایسی لکھ دو، جس سے ہمیں آرام آ جائے اور بار بار ڈاکٹروں کے پاس نہیں جانا پڑے۔'' وہ اب بری طرح سے تھک گیا تھا۔ اس سے اسٹول پر بیٹھنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔

''اگر تم پہلے کسی ڈھنگ کے ڈاکٹر کے پاس گئے ہوتے تو آج یہ حالت نہیں ہوتی۔'' موحد منہ میں بڑبڑایا۔

اب اس حالت میں وہ اسے پین کلر کے سوا کیا دیتا۔ جنہوں نے اب اس کی تکلیف پر ذرا بھی اثر نہیں کرنا تھا۔

''بہتر ہے ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہو جاؤ۔'' اگرچہ اس مشورے کا بھی کچھ خاص فائدہ تو نہیں ہونا تھا لیکن شاید اسے قدرے آسان موت مل جاتی۔ موحد نے نسخہ پر یونہی قلم چلاتے ہوئے مشورہ دیا۔

''توبہ توبہ! ہاسپٹل میں تو نہیں رہ سکتا ہم۔ امارا والدہ صاحب کہتا تھا خان اسپتال کبھی داخل نہیں ہونا وہاں ہمارے کاندان کا جو بھی بندہ گیا مر کر ہی نکلا۔'' وہ بدک کر کانوں کو ہاتھ لگا کر بولا۔

''اور جو اسپتال میں داخل نہیں ہوتے کیا وہ نہیں مرتے؟'' موحد طنز سے بولا۔

''اور امارا تو چار بیٹیاں ہیں اکیلا گھر میں، امارے سوا ان کا کوئی بھی نہیں، ان کی ماں اندھی ہے۔ دکھتا نہیں اسے آنکھوں سے، خدا جانے کیا بیماری آیا دو چار ہفتے بخار آیا تھا تو ٹھیک ہو گیا۔ اس کی آنکھوں کی بینائی چلا گیا۔ نظر نہیں آتا اسے بوڑھی بھی تو ہو چکی ہے۔'' وہ ہنسا تھا۔

موحد ساکت سا اسے دیکھ رہا تھا۔

''کبھی اللہ اس طرح سے بھی انسانوں کو آزماتا ہے باپ کی زندگی کے گنتی کے چند دن رہ گئے ہوں ماں ضعیف اور اندھی ہو اور گھر میں چار جوان لڑکیاں ہوں اور معاشرہ.....'' موحد کانپ کر رہ گیا۔

''کسی بیٹی کی شادی کی۔'' نسخے پر لکھنے کو اب کچھ بھی نہیں تھا۔

''تم دعا کرو، ڈاکٹر صاحب! میرا ایک بھتیجا دبئی گیا ہے۔ دو سال ہوئے بڑی والی کا اس کے ساتھ جوڑ ہے بھائی تو منہ سے کچھ نہیں پھوٹا، خود ڈھیٹ بن کر اسے جوان بھتیجیوں کا احساس دلا کر بڑی والی کا رشتہ دیا تھا۔ اس نے قبول کر لیا تھا اب لڑکا باہر سے آئے تو شادی کرے۔ اس کے بعد ہی تین کا باری آئے گی۔'' موحد اسے دیکھتا رہ گیا۔

''کچھ پڑھایا وڑھایا بیٹیوں کو یا نہیں؟'' کہیں کوئی روشنی کی کرن ہو۔

''چھوٹی دو نے پانچ پانچ جماعتیں پڑھ لی — آگے اسکول ہی نہیں تھا گاؤں میں تو کہاں آگے پڑھتیں — گھر میں رہتی ہیں سلائی کڑھائی کرتی ہیں، میری تھوڑی سی زمین ہے آلو بوتا ہوں اس میں، پر جب سے بیماری بڑھی ہے زمین داری بھی مشکل ہو گئی ہے۔ وہ چاروں میرے ساتھ کام تو کرتی ہیں۔ پر عورت ذات میں وہ طاقت کہاں جو مرد کے بازوؤں میں اللہ نے رکھی ہے۔ فصل بھی نہیں ہوئی اس بار کرارے لائق وہ، بہت دکھی تھا۔

بیٹے کی تمنا دل میں ساری عمر رہی ہوگی اور اس عمر میں بیٹیوں کو دیکھ کر کس شدت سے اسے بیٹے کی ضرورت محسوس ہوتی ہوگی، موحد اس کی اندر دھنسی آنکھوں میں حسرت کی تحریر بخوبی پڑھ رہا تھا۔

''گاؤں کہاں ہے تمہارا نوبت خان؟'' موحد یہ سوال پوچھنا نہیں چاہتا تھا۔ جانے کیسے اس کی زبان سے پھسل گیا۔

''ایبٹ آباد سے آگے۔ مانسہرہ سے پیچھے جہاں زلزلہ نہیں آیا تھا بالاکوٹ اس کے بیچ میں پہاڑوں کے پچھلی طرف ہمارا گاؤں بہت خوب صورت ہے ڈاکٹر صاحب جیسے قدرت نے جنت کا ٹکڑا زمین پر اتارا ہو آپ آنا ہمارے گاؤں آؤ گے؟'' وہ ایک دم سے وطن کی محبت میں سرشار موحد کو دعوت دینے لگا۔

''ہاں ضرور نوبت خان اگر میرے نصیب میں تمہارے گاؤں آنا لکھا ہوا تو میرے قدم ضرور وہاں بڑھیں گے۔'' وہ خود بھی نہیں جانتا تھا اس کے دل میں کیا ہے اور وہ اس سادہ لوح انسان سے کوئی جھوٹا وعدہ بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''بجا فرمایا نصیب میں ہوا تو..... سارے کھیل ہی تو نصیب کے ہیں، نصیب میں ہوا تو میں آپ کو اپنے گاؤں میں دیکھ لوں گا ورنہ.....''

موحد جانتا تھا یہ الفاظ نوبت خان نے نہیں بولے تھے۔ یہ تو اس کی اجل نے کہے تھے جو اس سے چند ہی گز کے فاصلے پر کھڑی بے دردی سے مسکرا رہی تھی۔

☆☆☆

''میں آ رہی ہوں آزر گھر..... وہ زینب کی کال آئی تھی اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی ہاسپٹل میں تھی تو میں گھبرا گئی تھی ایک دم سے۔''

سونیا انک انک کر فون پر آزر کو بتا رہی تھی اور دروازے سے چائے اندر لاتی زینب لمحہ بھر کو ٹھٹھکی تھی پھر بے تاثر چہرہ لیے اندر آ کر چائے میز پر رکھنے لگی۔

روا ایک طرف سپاٹ چہرہ لیے سامنے دیوار پر لگی سینری کو دیکھتی جا رہی تھی جس میں دریا میں طوفان کے بعد بادبانوں والی کشتی ڈوبتی جا رہی تھی۔

زینب اس کے دل کی حالت سے واقف تھی۔

وہ خاموشی سے چائے بنا کر ان دونوں کو دینے لگی۔

''بس میں نکل رہی ہوں۔ آدھے گھنٹے میں گھر پہنچتی ہوں۔'' سونیا کا انداز بہت صفائی پیش کرنے والا تھا۔

"ردا تو آفس میں ہو گی ابھی تو۔" اس نے ادھورے جملے کے ساتھ خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور فاصلے پر بیٹھی ردا کو دیکھا۔

"نہیں مجھے تو نہیں معلوم کوئی فون نہیں آیا اس کا تو مجھے، کیا آپ کو کال آئی تھی اس کی۔" سونیا کے چہرے سے پریشانی جھلکنے لگی تھی۔

"ٹھیک ہے میں آتی ہوں تو اماں جان سے خود بات کرتی ہوں۔ بس پہنچتی ہوں تھوڑی دیر میں۔" سونیا نے جان چھڑانے والے انداز میں فون بند کر دیا اور عجلت میں کھڑی ہو گئی۔

"چلو ردا! اس سے پہلے کہ تمہارے پاپا زینب کو دیکھنے کے لیے نکل پڑیں۔" وہ سخت گھبرا گئی تھی۔

اس وقت ردا کا فون بجنے لگا۔ اس نے بے بسی سے فون دیکھا۔

"پاپا کی کال ہے ماما!" وہ گھٹی ہوئی آواز میں بولی۔

سونیا اسے کال ریسیو کرنے کا اشارہ کرنے لگی۔

"میرا انہیں بتانا بلکہ کچھ بھی نہیں۔ تم آفس میں ہو اور تھوڑی دیر میں نکلنے والی ہو۔" سونیا جلدی جلدی اسے ہدایت کرنے لگی۔ زینب اسی طرح بیٹھی دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

"سونیا! چائے لے لو۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔" سونیا زور زور سے انگلیاں چٹخاتی ردا کو بے حد مدھم آواز میں باپ سے بات کرتے دیکھ رہی تھی۔

اس نے زینب کو شاید سنا بھی نہیں تھا۔

"ٹھیک ہے پاپا! میں بس نکلتی ہوں ابھی آفس سے جی سب مٹ کرا دیا ہے۔" کہہ کر باپ کی اگلی بات سنے بغیر ردا نے فون بند کر دیا تھا۔ اور اب پھر سے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بے حس ہو کر بیٹھ گئی تھی۔

"ردا چائے لے لو۔" زینب کو اس سے کہنا پڑا۔

"چلو ردا! ابھی گھر جانا ہے ہمیں۔" سونیا پاس آ کر اسے بازو سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہنے لگی۔

ردا کی آنکھوں میں نمی آ گئی اس نے بے بسی سے ماں کو دیکھا۔

"کیا ابھی مزید کوئی ڈراما کرنا باقی ہے یا میری جان لو گی تو تمہیں سکون ملے گا۔" سونیا کا لہجہ ردا کو بے سکون کرنے کے لیے کافی تھا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

زینب شاید ان دونوں کے نزدیک اس کمرے میں موجود ہی نہیں تھی۔

وہ اپنا کوئی الجھا ہوا معاملہ نپٹا کر خاموشی سے چل پڑی تھیں۔

"چلتی ہوں زینب! تمہیں پتا تو ہے آزر کا کس طرح وہ اماں جان کی زبان بولنے لگتے ہیں اور ردا نے جو کچھ آج کیا ہے۔" وہ دروازے کے پاس جانے کس خیال سے رکی تھی اور پلٹ کر زینب کے پاس آئی تھی۔

"اور تمہارا شکریہ بہت اگر تم آن ٹائم نہیں پہنچتیں تو شاید آزر تو کیا میں بھی خود کو عمر بھر معاف نہیں کرتی۔" وہ آنکھوں کے کنارے صاف کرتے ہوئے دل سے زینب کا شکریہ ادا کر رہی تھی۔

"ردا کا رشتہ طے کر دیا ہے اماں جان نے اپنی بھتیجی شائستہ کے بیٹے سلیمان کے ساتھ، اسی مہینے وہ آ رہے ہیں پاکستان امریکہ سے تو شادی بھی فوراً ہے۔" وہ رک کر جیسے بادل نخواستہ اسے شامل حال کر رہی تھی۔

"دیکھ لو پھر کہیں سے جمایا ہوا کھیل تمہاری کسی خود غرضی کی بھینٹ چڑھ جائے۔ جو لڑکی کورٹ جا سکتی ہے اپنی مرضی کی زندگی کا انتخاب کرنے کیا اس طرح شادی کے لیے راضی ہو جائے گی۔ جس طرح تم اس کی شادی کرنے جا رہی ہو۔"

زینب کے لہجے میں کیا نہیں تھا جس نے سونیا کے دل کے پرانے گھاؤ ادھیڑ کر رکھ دیے۔ وہ زخمی نظروں سے زینب کو دیکھتی رہی تھی پھر مڑ کر روا کی کلائی سختی سے پکڑ کر پیچھے مڑ کر کچھ کہے بغیر باہر نکل گئی تھی۔

زینب چائے کی ان تین بھری پیالیوں کو دیکھتی رہ گئی، اس کی نظروں میں چائے کی وہ دو پیالیاں آ گئیں۔ جو اس شام اس نے میرو کے لیے بھری تھیں اور وہ پوری شام وہ دو کپ اپنے سامنے رکھے بیٹھی رہی تھی اور وہ نہیں آیا تھا اور پھر بعد میں آنے والی کتنی ہی شامیں وہ اس طرح اکیلی اپنے سامنے دو چائے کی بھری پیالیاں لیے گھنٹوں بیٹھی رہتی، وہ چائے پیالیوں میں پڑی سرد ہو جاتی اور وہ ہتھیلیوں کے کٹورے پر اپنا چہرہ دھرے ان بھری پیالیوں کو خالی دل کے ساتھ تکے جاتی۔

اس کی بائیں آنکھ کے کنارے سے ایک آنسو ٹپک کر دروازے کی دہلیز پر گرا تھا۔

شاید سونیا کے پاس میرو کا کوئی نمبر ہو کیا پتا۔ اس کا اپنے بھائی کے ساتھ کوئی کانٹیکٹ ہو، اس نے کبھی بھی مجھے اپنے کسی راز میں شامل نہیں کیا۔ آج کل جس طرح کشف مضطرب ہے مجھے اس کی تشفی کے لیے کچھ تو کرنا چاہیے۔

''اس وقت موقع تھا میں سونیا سے پوچھ سکتی تھی اسے کرید سکتی تھی اپنے لیے نہیں کشف کے لیے۔''

وہ بے چین سی دروازے تک آ گئی تھی۔

''نہیں میں پاگل ہوں کیوں ایسا سوچ رہی ہوں۔ کشف کو مجھے ایسا کوئی کلیو نہیں دینا جو اسے منصور تک لے جائے ورنہ میرے پاس کچھ نہیں بچے گا۔ میں خالی ہاتھ رہ جاؤں گی نہیں مجھے میرو سے کبھی کوئی رابطہ نہیں کرنا۔'' وہ دل میں قطعی فیصلہ کر کے اندر پلٹ گئی۔

☆☆☆

''خدا کے لیے کشف بات کرو، آنی سے وہ پریشان ہو رہی ہوں گی تین بار فون کر چکی ہیں وہ پلیز۔'' بلال ساتھ بیٹھی کشف سے منت بھرے انداز میں کہہ رہا تھا۔

وہ بے حس نظروں سے باہر دیکھتی جا رہی تھی۔

''آخر مسئلہ کیا ہے تمہارے ساتھ؟'' وہ زچ ہو کر بولا۔

''ابھی تمہیں مسئلے کا ہی نہیں پتا ہے؟'' وہ تپ گئی۔

''دیکھو، تمہارے جو بھی ایشوز ہیں تمہیں گھر جا کر آنی کے ساتھ سٹارٹ آؤٹ کرنا چاہیے یوں بغیر بتائے گھر چھوڑ کر نہیں آنا چاہیے، پلیز ٹرائے ٹو انڈر اسٹینڈ کشف، یہ سب ٹھیک نہیں ہے یار۔'' وہ آخر میں بے بسی سے بولا۔

کشف کی آنکھوں میں دھند سی اترنے لگی۔

''پلیز اب رونا نہیں شروع کر دینا۔'' بلال اس کی تیاری دیکھ کر عاجزی سے بولا۔

''میں اتنی کم زور نہیں ہوں کہ یوں بات بے بات رونا شروع کر دوں۔'' وہ آنکھیں رگڑ کر تلخی سے بولی۔

''خیر وہ تو تم ہو، اقرار نہیں کرو تو الگ بات ہے۔'' وہ اسے چھیڑ کر بولا۔

''پلیز اچھے بچوں کی طرح گھر جاؤ تمہیں جو بھی ٹینشن ہے تم اپنی ماں سے کہو جا کر، ماؤں کے پاس ہر مسئلے، ہر پرابلم کا بہترین حل ہوتا ہے یار۔'' وہ اسے سمجھا رہا تھا۔

کیا تم بھی اپنا ہر مسئلہ ثمینہ آنی سے Solve کراتے ہو۔'' وہ طنز سے بولی بلال نے ایک دم سے ہونٹ بھینچ لیے۔

پھر وہ کافی دیر تک کچھ نہیں بول سکا۔

https://reading.pakistanipoint.com

''سوری!'' کشف اس کی خاموشی پر معذرت کرتے ہوئے بولی۔
''ہم تمہارے گھر جارہے ہیں۔'' وہ اسے اطلاع دینے والے انداز میں بولا۔ کشف کچھ نہ بولی۔
''زینب اس کے لیے کتنی فکرمند ہوگی۔ اسے اب احساس ہورہا تھا۔ وہ شروع سے ایسی تھی پہلے غصے اور جذبات میں قدم اٹھالیتی پھر شرمندہ ہوتی۔
''بلال کیا تم میری ہیلپ نہیں کرسکتے؟'' کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ گہرا سانس لے کر بولی۔
''مطلب؟'' بلال اس کی طرف دیکھ کر رہ گیا۔
''میں اپنے پاپا کے پاس جانا چاہتی ہوں۔ ان سے ایک بار ملنا چاہتی ہوں اور یہ کوئی اتنا مشکل کام نہیں ہے آج کل کے دور میں جب پوری دنیا آپ کی انگلیوں کی پوروں کے نیچے آچکی ہو۔ پلیز ہیلپ می۔'' وہ عجیب لہجے میں بولی۔
''پھر بھی تمہیں میری مدد کی ضرورت ہے۔'' وہ طنز سے بولا۔
''تو تم میری مدد نہیں کرو گے؟'' وہ ناراض لہجے میں بولی۔
''یار! کوئی کلیو بھی تو ہو۔ ہاتھ میں۔ ہم انہیں جانتے بھی نہیں ہے۔ ان کی تصویر تک تو آنی نے گھر میں نہیں لگا رکھی۔'' وہ سوچتے ہوئے بولا۔
''کئی بار اس بات پر بھی جھگڑ چکی ہوں وہ جس بات کا فیصلہ کرلیتی ہیں۔ اس پر ایک انچ بھی انہیں کوئی نہیں ہلا سکتا۔'' وہ بے بسی سے بولی۔
''تو پھر تم ان کے دل کی بات معلوم کرنے کی کوشش کرو۔ وہ تمہیں اپنے باپ سے ملنے دینا چاہتی ہیں یا نہیں، اگر وہ ایسا نہیں چاہتیں تو پھر تم لاکھ کوشش کرلو کچھ بھی حاصل نہ کرسکو گی۔'' یہ بات تو اس نے سوچی نہیں تھی۔
''دیکھو اگر ایسا کرنا ہوتا تو وہ بہت پہلے خود ہی تمہارے بابا سے کانٹیکٹ کرچکی ہوتیں، کچھ بھی ہو، وہ ان کے شوہر ہیں، تمہارے فادر اتنے سارے سالوں میں کئی بار انہیں ان کی کمی محسوس ہوئی ہوگی تو انہوں نے ایسا کیوں نہیں چاہا۔'' وہ اسے سمجھا رہا تھا۔
''جو بھی ہو بلال! انہوں نے چاہا یا نہیں یا مگر میں ایسا چاہتی بھی ہوں اور کرکے بھی دکھاؤں گی کیوں کہ مجھے اپنے بابا سے بہر حال ملنا تو ہے۔'' وہ اسی ضدی اکھڑپن سے بولی۔
اسی وقت بلال کا فون بجنے لگا۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول
شائع ہوگئے ہیں

☆ فصل غم کا گوشوارہ — رضیہ جمیل — قیمت: -/300 روپے
☆ زرد موسم — راحت جبیں — قیمت: -/1000 روپے
☆ حساب دل رہنے دو — نبیلہ عزیز — قیمت: -/400 روپے

خوبصورت سرورق
خوبصورت چھپائی
مضبوط جلد
آفسٹ پیپر

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

فون اٹھاتے ہوئے وہ کچھ حیران سا ہوا۔
"ماما کی کال اس وقت؟" وہ کال ریسیو کرتے ہوئے حیرانی سے بولا۔
"ہم دونوں کی مائیں بیک وقت پریشان ہوتی ہیں کہ ہم دونوں کہیں گھر سے بھاگ تو نہیں گئے۔" وہ شرارت سے بولی۔
"مجھے تم سے کسی سیدھی بات کی امید بھی نہیں تھی۔" وہ سر ہلا کر بولا۔
"جی ماما!" وہ دوسری طرف متوجہ ہوا۔
"گھر آجاؤ جلدی۔" "کوئی کام ہے آپ کو؟"
"ایک گھنٹے میں پہنچ جاؤں۔ ماما میں کوشش کروں گا۔"
"بلال تم نے ہر حال میں ایک گھنٹے میں گھر پہنچنا ہے۔ یہ میرا حکم ہے۔" دوسری طرف سے ثمینہ تحکم آمیز لہجے میں کہہ رہی تھیں۔
"کمال ہے۔ یہ ماما کو کیا ہو گیا انہیں یکا یک میری یاد کیوں ستانے لگی۔ آرڈر ملے ہیں گھنٹے تک گھر پہنچوں۔ وہ کندھے اچکا کر بولا۔
"چلو اسی بہانے ثمینہ آنٹی کو تمہاری یاد تو آئی۔" وہ اسے چھیڑ کر بولی۔
"فی الحال تم میری جان بخشو تو میں کہیں اور جانے کے قابل ہو سکوں گا۔" وہ چڑ کر بولا۔
"اور اگر میں تمہیں کہیں نہ جانے دوں تو۔" اسے دھمکا کر بولی۔
"جانے ہی نہ دوں۔" اس کی آنکھوں میں کچھ تھا بلال اس کو دیکھ کر رہ گیا۔
"اگر تم ایسا چاہو گی تو میں کبھی بھی کہیں نہیں جاؤں گا۔" وہ مدھم بھاری آواز میں بولا۔ کشف کچھ سٹپٹا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔
"تم ایسا چاہتی ہو تو میں بھی ایسا ہی چاہتا ہوں کشف کہ تم مجھے کہیں بھی جانے نہ دو اور میں تمہیں کہیں نہ جانے دوں۔" وہ اس کی طرف جھک کر جن نظروں سے دیکھتے ہوئے کشف سے کہہ رہا تھا۔ وہ خائف سی ہو کر رہ گئی۔
اسی وقت پھر زینب کی کال آئی ۔ جو کشف کو غیبی مدد ہی تو لگی وہ کال ریسیو کرنے لگی۔
"پلیز اس وقت نہیں۔" بلال اسی مدھم بھاری لہجے میں منت کرتے ہوئے بولا۔
"پلیز بلال! مجھے آنی سے بات کرنے دو میں ان سے بات کروں گی تو ہی انہیں تسلی ہو گی۔" کہہ کر وہ فون پر زینب سے بات کرنے لگی۔ بلال اسے دیکھ کر رہ گیا۔

☆☆☆

"ظاہر ہے غلطی سراسر تمہاری ہے۔" زینب میز پر کھانا لگاتے ہوئے مصروف انداز میں بولی۔
کشف نے ناراضی سے لیپ ٹاپ ایک طرف کھسکایا۔
"میری غلطی، جو اس نے بکواس کی۔" وہ تڑپ کر بولی۔
"کشف یہ بات کتنی بار ہو چکی میرے بچے! خالہ بتول ایک ایسی عورت ہے جس کے پاس کوئی مصروفیت نہیں ہے۔ ایک دکان سے کرایہ آجاتا ہے جس سے اس کا گھر اس طرح سے چل رہا جس طرح وہ چاہتی ہے۔ ایک بیٹا وہ بھی نکھٹو آوارہ جس کے پاس ساری دنیا کے لیے ٹائم ہے اور ماں کے لیے نہیں ہے تو ایسے میں وہ دوسروں سے الجھ کر اپنے لیے کوئی نہ کوئی مصروفیت تو نکالے گی نان اور تم ہر بار اسے یہ موقع دے دیتی ہو۔"
زینب کے نزدیک کشف اتنی بے وقوف تھی کہ ہر بار بتول کو یہ موقع آسانی سے فراہم کر دیتی تھی اور یہ سراسر اس کی غلطی تھی۔

https://reading.[illegible].net

"اور جو وہ بکواس کرتی ہے۔" وہ تپ کر بولی۔

"بولنے دو جو بھی کہتی ہے۔ تم خاموشی سے سر جھکا کر گزر جاؤ گی تو وہ مزید کتنی دیر تک بولتی رہے گی۔"

زینب نے سالن اس کی پلیٹ میں نکالا۔

"آنی! وہ بہت گندے الزام لگاتی ہے آپ پر، مجھ پر جو مجھ سے برداشت نہیں ہوتے۔" وہ غصے میں تھی۔

زینب اسے دیکھنے لگی۔

"تم جانتی ہو ہمارے اردگرد ہمسائے میں کوئی بھی بتول خالہ کے ساتھ منہ ماری نہیں کرتا اگرچہ وہ ان کے بارے میں کبھی بہت گھٹیا الزام لگاتی ہے وہ سب جانتے ہیں کیچڑ میں پتھر پھینکنے سے اپنے ہی کپڑے گندے ہوتے ہیں خالہ بتول کا کچھ نہیں بگڑتا۔" زینب ہر بار والی نصیحت اسے بڑی دل جمعی سے کر رہی تھی جو اس بار بھی اس کے سر کے اوپر سے گزر گئی تھی۔

"اور صرف اس خوف سے کہ اس عورت کا کچھ نہیں بگڑ سکتا۔" وہ نخوت سے کہنے لگی زینب کو ایک دم سے یاد آیا۔

"تم موحد سے ملنے گئی تھیں ایکسکیوز کرنے۔" کشف ایک دم سے چپ ہو گئی۔

"اف! اب میں انہیں کیا بتاؤں اور جو یہ میرا یقین کریں گی۔" وہ دل میں کہہ کر رہ گئی۔

اسی وقت زینب کا فون بجا۔

"لو موحد کا خود ہی فون آ گیا۔ پہلے بھی مسڈ کال دیکھی تھی میں نے ٹائم ہی نہیں مل سکا۔ ری کال کرنے کا سونیا اور ردا کے جھگڑے میں۔"

کہتے ہوئے اس نے موحد کی کال ریسیو کی۔

"سونیا اور ردا کے جھگڑے میں۔" کشف ٹھٹک کر رہ گئی۔

"کیوں کیا ہوا۔ کوئی جھگڑا ہوا ہے تمہارا۔" زینب اونچی آواز میں پوچھ رہی تھی۔ "مارے گئے اب کہاں بچت ہو گی۔ عورتیں تو چغل خور سنی تھیں یہ آج کل مرد چغلیاں کھانے لگے ہیں بھائی اپنے پروفیشن کا ہی کچھ خیال کر لو مگر کہاں۔" وہ اونچا اونچا بڑبڑاتی جا رہی تھی۔ زینب دوسری طرف کی بات سنتے ہوئے کشف کو گھور رہی تھی۔

کشف زینب کے کال ختم کرنے سے پہلے اٹھ کر اندر کمرے میں چلی گئی۔

"کشف......" فون بند کر کے زینب نے پکارا۔

کشف اسی وقت باہر آ گئی اور مٹھی کھول کر موحد کا چیک اس کے سامنے ڈال دیا۔

"یہ کیا ہے؟" زینب ناسمجھی سے بولی۔

"دیکھ لیں آپ خود پھر تو آپ کو میری بے گناہی کا یقین آ جائے گا اور آنی! ہر بار ونیا والے سچے نہیں ہوتے کبھی اپنی سگی بیٹی کی بات پر بھی یقین کر لیا کریں۔ ہمیشہ زیادتی میری ہی نہیں ہوتی آپ کے ڈاکٹر موحد صاحب نے یہ کھانے کا بل میرے نام بھیج کر جس طرح مجھے تپایا شکر کریں میں اس کا سر پھاڑ کر نہیں آ گئی۔ اتنا پڑھا لکھا شخص ہو کر ایسی گری ہوئی حرکت کرے گا تو کیا مجھے غصہ نہیں آئے گا حالانکہ آپ کی قسم میں اس کے پاس معذرت کرنے جا رہی تھی مگر اس کی اس حرکت کے بعد ایکسکیوز کرتی ہے میری جوتی۔"

وہ تیز تیز بغیر رکے بولتی گئی اور جواب میں زینب کو سنے بغیر پیر پٹختی وہاں سے چلی بھی گئی۔ زینب سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

"میں کیا کروں اس لڑکی کا، اگر یہ اسی طرح ہر ایک سے الجھتی جھگڑے کرتی رہی تو کون اس کا طلب گار ہو گا پھر اسی محلے میں رہتے ہوئے کوئی بھی اچھی فیملی اس کو اپنانے کے لیے اگر بھولے بھٹکے آ بھی گئی، اس کا سامنا اس بتول خالہ سے ہو گا تو؟ نہیں، مجھے یہ فیصلہ سوچنا چاہیے کشف غلط نہیں، ہمیں یہاں سے کہیں موو کرنا چاہیے۔" وہ

سر پکڑے اس چیک پر نظریں جمائے سوچ رہی تھی۔
''اور اگر وہ آ گیا؟ میرو آ گیا اور میں اسے یہاں نہیں ملی۔'' برسوں پرانا دھڑکا پھر سے جاگا۔
''کیا مجھے ابھی بھی اس کا انتظار ہے۔'' اس گھر کی دہلیز پر کھڑی زینب ہاتھ ہلاتے آنکھوں میں الوداعی بوسے لیتی اس سے پوچھ رہی تھی۔
''اتنے سال ہو گئے رابطہ نہ رکھنے کے باوجود اس نے مجھے اپنا انتظار ختم کرنے کو بھی تو نہیں کہا۔'' بے بس سی سسکی اس کے اندر سے ابھری تھی۔
''اب تو معاملہ انتظار کی حد سے بھی بہت دور نکل چکا تو پھر میں اس کے بارے میں کیوں سوچ رہی ہوں۔ مجھے اب صرف کشف کے بارے میں سوچنا ہے جیسے ہی چار چھ ماہ میں اس کا فائنل سمسٹر ختم ہوتا ہے۔ مجھے اس کی شادی کر دینی چاہیے۔'' وہ دھیرے دھیرے ڈائننگ ٹیبل — سے برتن سمیٹنے لگی۔
''کیا میں حیدر بھائی سے بات کروں۔ کشف اور بلال کے رشتے کے لیے۔
وہ تو مان بھی جائیں گے مگر ثمینہ بھابھی وہ تو مر کر بھی یہ رشتہ نہیں ہونے دیں گی۔ بلال اور حیدر کے منہ سے کر بھی لیا تو وہ میری کشف کی زندگی کو دوزخ بنا دیں گی نہیں نہیں مجھے ایسا سوچنا ہی نہیں۔ بلکہ اگر حیدر بھائی بولیں گے بھی تو میں انہیں صاف منع کر دوں گی مجھے کشف کے لیے کہیں اور دیکھنا ہوگا۔'' وہ برتن کچن میں لا کر سنک کے نیچے ڈھیر کر چکی تھی۔
''سونیا سے بات کروں؟'' ایک دم سے اسے خیال آیا تھا اور وہ برتن وہیں چھوڑ کر تیزی سے نکل گئی۔
فون پر نمبر ملاتے اس کے ہاتھ سست پڑ گئے۔
''کیا میں یہ کہوں کہ اگر وہ اس رشتے کے لیے راضی نہیں تو وہ کشف کی بات کرے۔ پاگل ہوں میں بھی۔'' وہ خود کو جھڑکنے لگی۔
''اس میں پاگل پن کی کیا بات ہے جو بھی سہی کشف کا بھی تو کوئی حق ہے نا سونیا پر، بھتیجی ہونے کے ناتے ہی سہی۔''
دوسری بات نے اسے حوصلہ دیا تھا اس نے سونیا کا نمبر ملا لیا۔ دوسری طرف مسلسل بیل جانے کے بعد بند ہو گئی۔
''شاید قدرت چاہتی ہے کہ میں کچھ اور سوچ لوں اس بات پر ابھی جلد بازی نہیں کروں۔'' وہ پھر سے نمبر ملاتی رک گئی تھی۔
''اگر اس نے دوٹوک انکار کر دیا تو۔''
اسی وقت زینب کا فون بج اٹھا۔
سونیا اسے اتنی جلدی جوابی فون کر لے گی۔ اسے امید نہیں تھی۔
''خیریت تھی زینب! تم نے کال کی تھی؟'' سونیا کا لہجہ نارمل تھا۔ دوپہر والی بے چینی اور پریشانی نہیں تھی۔
''ہاں خیریت تھی یوں ہی ایک خیال آیا تو سوچا تم سے مشورہ کر لوں۔'' یوں تو زینب نے سوچ لیا تھا مگر بات کرنا اتنا مشکل ہوگا، اسے اندازہ نہیں تھا۔
''کیسا خیال؟'' سونیا کو کوئی اور پریشانی ہوئی۔
''میرو نے تمہیں بھی کال کی ہے کیا؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی ایک دم سے اس کے منہ سے نکل گیا۔
زینب کے ہاتھ سے فون گرتے گرتے بچا۔
''کک..... کیا میرو کی کال آئی تھی تمہیں؟'' اسے خود اپنی آواز جیسے کسی گہرے کنویں سے آتی محسوس ہوئی

https://reading.caretofun.net

تھی۔

''نہیں...... وہ میں تو یونہی پوچھ رہی تھی کیا اس نے تمہیں فون کیا ہے زینب؟'' سونیا لمحے کے چوتھائی حصے میں سنبھلی تھی۔

''پلیز سونیا مجھ سے کچھ نہیں چھپاؤ اب' میں ویسے ہی کتنی مشکلوں میں گھری ہوں اگر اس کا فون آیا تھا تو...''

زینب کو خود بھی اندازہ نہیں تھا وہ سونیا کے آگے میرو کی کال کا سن کر یوں گڑگڑانے لگے گی۔

''کیوں تم نے میرو سے کیا کہنا ہے؟ کیا آس ہے تمہیں اب اس سے' وہ شادی کر چکا ہے۔ جوان بچے ہیں اس کے' وہ اپنی لائف میں سیٹلڈ ہے' بہت خوش ہے۔ ہمیں حق نہیں پہنچتا اب ہم اسے اتنے سالوں بعد ڈسٹرب کریں۔''

دل چاہا اگر سونیا سامنے ہو تو زینب اسے مار ہی ڈالے۔

''حق نہیں پہنچتا' کیا میرا حق نہیں ہے۔ اس نے جو میری زندگی برباد کی کھلواڑ کیا میرے ساتھ' میں اس کا گریبان پکڑ کر پوچھوں اس سے؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی وہ تلخ ہو گئی تھی۔

''بس کر دو زینب! بھول جاؤ گزرے وقت کو گزری باتوں کو' اب لکیر پیٹنے سے کوئی فائدہ نہیں۔'' سونیا بہت خود غرضی سے اسے مشورہ دے رہی تھی۔

اور یہ مشورہ سونیا ہی دے سکتی تھی!

''تمہاری طرح جیسے تم بھول گئیں......'' زینب کے لہجے میں پھنکار تھی سونیا پل بھر کو گنگ۔ رہ گئی۔

''میں یہ سب نہیں دہرانا چاہتی۔'' زینب کو گفتگو کی تلخی کا احساس ہوا تو اس نے خود ہی کہہ دیا۔

''کوئی بھی نہیں دہرانا چاہتا زینب اور یہ کسی کے بھی حق میں اچھا نہیں ہے۔ وہ کچھ اور وقت تھا یہ کچھ اور ہے زمانہ بدل گیا ہے۔'' سونیا یک لخت نرم پڑ گئی تھی جیسے زینب کی دل جوئی کو بولی۔

''نہ وقت بدلا ہے سونیا میرے لیے نہ زمانہ۔ سب کچھ ٹھہرا ہوا ہے اتنے سالوں سے' جب سے میرو مجھے چھوڑ کر گیا ہے مجھے تو لگتا ہے یہ اکیس سال اس ایک شام میں ہی ٹھہر گئے ہیں جب وہ میری ہتھیلی پر اپنے انتظار کا دیا جلا کر اسے نہ بجھنے کی تاکید کرنے صرف چند دنوں کا کہہ کر مجھ سے دور گیا تھا۔ یاد ہے نا تمہیں وہ شام؟'' زینب بہت پیچھے ـــ ماضی میں جا چکی تھی۔

''بھول جاؤ زینب؟'' سونیا نرمی سے منت بھری سرگوشی میں بولی۔

''عمر بھر کا حساب بھول بھی جاؤں سونیا تو اس شام کا حساب نہیں بھولوں گی۔ یہ میرا خود سے وعدہ ہے' میرو اگر مجھے اس دنیا میں نہیں ملا تو اس دنیا میں حشر کے میدان میں میرا اس سے صرف یہی ایک سوال ہو گا اس شام جو اس نے مجھ سے وعدہ کیا۔'' زینب کو پتا ہی نہیں چلا اس کی آواز کب آنسوؤں میں بھیگتی چلی گئی۔

''وہ مجبور تھا زینب!'' سونیا کے لہجے میں میرو کی بے بسی تھی۔

''مجھ سے زیادہ مجبور تھا وہ۔ میں نہیں مان سکتی کوئی بھی مرد عورت سے زیادہ مجبور نہیں ہو سکتا۔''

نہ اس کا دل نہ وہ خود ایسی کوئی بھی دلیل کو ماننے کو تیار نہیں تھی۔

''تم نے فون کس لیے کیا تھا زینب؟'' سونیا نے نرمی سے اسے یاد دلایا اور دل میں اس لمحے کو کوسا جب اس نے زینب کی کال دیکھ کر کال بیک کی کہ کہیں دوپہر والے معاملے کی کوئی ضروری بات زینب نے نہ کرنی ہو اس سے۔

''ایک بات میرے دل میں آئی ہے سونیا! اگر تم کشف کے لیے بھی ویسا ہی سوچو جیسا ردا کے لیے سوچ رہی ہو تو تمہیں بھی یہ بات اچھی لگے گی۔'' وہ لحہ بھر رک کر خود کو سنبھال کر کچھ جھجکتے ہوئے کہہ ہی گئی۔

سونیا کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

''کیا مطلب؟'' وہ واقعی زینب کی اس مبہم سی درخواست کا مطلب نہیں سمجھی تھی۔

''میں یہ کہہ رہی تھی اگر ردا اس رشتے کے لیے ایگری نہیں ہے جو ردا کے لیے آیا ہے تو تم کشف کے لیے بات کرو اور ردا کا رشتہ وہاں کرو جہاں وہ چاہتی ہے۔'' اٹک اٹک کر اس نے دل کی بات کہہ ہی دی تھی اور پیچھے کھڑی کشف نے ایک دم سے ماں کے ہاتھ سے فون جھپٹ کر بند کیا تھا۔
اور کشف ایسا نہ کرتی تو بھی سونیا اس سے پہلے فون بند کر چکی تھی کشف کی نظروں میں جو کچھ تھا۔ زینب اس سے نظریں نہیں ملا پا رہی تھی۔

☆☆☆

موحد اپنے کمرے میں کافی کا مگ ہاتھ میں لیے اکیلا بیٹھا تھا۔
کبھی اس کے کانوں میں نوبت خان کی فریاد بھری گفتگو گونجتی اور کبھی کشف کا چیختا غصیلا انداز۔
نوبت خان کو سوچتا تو اس کا دل چاہتا وہ اڑ کر اس گاؤں میں پہنچ جائے جہاں کے رہنے والے اتنے بے بس تھے کہ انہیں اپنی بیماری کے دوران علاج کا حق بھی حاصل نہیں تھا۔
اور زمین پر خدا کی جنت کے اس ٹکڑے کو ایک بار ضرور دیکھ لے اور پھر۔۔۔۔ شکرانے کے طور پر باقی کی زندگی وہیں اس زمینی جنت میں ہی گزار دے۔
اور جب وہ کشف کی باتوں کو سوچتا تو اس کا جی چاہتا وہ اگلی صبح سے پہلے یہ ملک چھوڑ جائے۔
اور جب زینب کو سوچتا تو اسے اپنے رویے کی زیادتی کا احساس ہوتا مجھے اس مہربان محبت کرنے والی خاتون کی خاطر اس پاگل لڑکی سے الجھنا نہیں چاہیے تھا۔ جسے یہ بھی ہوش نہیں ہوتا کہ غصے میں بولتے ہوئے بول کیا رہی ہے اور کس سے بول رہی ہے۔
''زینب آنٹی کہتی ہیں کہ اس نے زندگی میں بہت محرومیاں دیکھی ہیں لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ ان محرومیوں کا انتقام دوسروں سے لینا شروع کر دے۔'' وہ کوفت سے کافی کے بڑے بڑے گھونٹ بھرنے لگا۔ اسی وقت اس کا فون بجنے لگا۔
شاید زینب آنٹی کا ہو۔ اس نے تیزی سے فون اٹھایا۔ نمبر دیکھ کر اس کے منہ میں موجود کافی کا گھونٹ کچھ اور بھی کڑوا ہو گیا، کئی لمحے چاہنے کے باوجود وہ اس گھونٹ کو حلق سے نیچے نہیں اتار سکا۔
فون مسلسل بجے جا رہا تھا۔
ایک بار بجنے کے بعد پھر سے بجنے لگا تھا۔
اور اسے معلوم تھا جب تک وہ کال ریسیو نہیں کرے گا یا اس فون کو مکمل بند نہیں کر دے گا یہ فون بجتا ہی رہے گا۔
اس نے گہری سانس لے کر کال ریسیو کر ہی لی۔
''تم کب واپس آ رہے ہو؟'' اگر اسے کسی کی خیریت مطلوب نہیں تھی تو شاید کسی کو بھی اس کی خیریت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔
چھوٹتے ہی منصور نے اس سے پوچھا تھا۔
''ابھی کوئی پلان نہیں ہے۔'' وہ جواب میں اس سے بھی زیادہ کھردرے لہجے میں بولا تھا۔
''نہیں ہے تو پھر بنا لو...... یا پھر'' وہ تلخی سے بولا۔
''یا پھر کیا؟'' بھنویں اچکا کر پوچھا۔
''ایما کو کسی بھی طرح اپنے پاس بلا لو یا آ کر اسے اپنے ساتھ لے جاؤ اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو شاید تم...... ہم اسے ہمیشہ کے لیے کھو دیں گے اور اتنا میں جانتا ہوں تمہیں اور کسی کی پروا ہو یا نہیں مگر تم ایمان کی فکر ضرور کرو گے جو بھی کرنا ہے جلد سے جلد کر لو ورنہ وقت ہاتھ سے نکل جائے گا، مجھے یہی کہنا تھا خدا حافظ۔'' اس کا

جواب سنے بغیر فون بند کر دیا گیا تھا۔
عجیب سی توہین یا ذلت کے احساس نے اس کے کانوں کی لوئیں سرخ ہو گئی تھیں۔
اس نے ایک دم سے اٹھ کر باقی بچی ہوئی کافی سنک میں الٹ دی تھی۔
اس کا دل ایک دم سے گھبرانے لگا تھا اگر وہ چند لمحے اور اس بند کمرے میں ٹھہرا تو اسے ابکائی آجائے گی۔
وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔
فون پھر سے بج رہا تھا لیکن وہ کمرے سے باہر جا چکا تھا۔

☆☆☆

''آپ کیا سمجھتے ہیں میں آپ کی بلیک میلنگ میں آجاؤں گی کبھی نہیں نیور۔'' ایما کو تو گویا پتنگے لگ چکے تھے۔
وہ پاگلوں کی طرح الماری سے اپنے کپڑے نکال کر اپنے بیگ اور سوٹ کیس میں رکھ رہی تھی۔
''آپ دونوں کو کہیں بھی جانا ہے ہنڈرڈ ٹائم جائیں مگر مجھے آپ دونوں کے ساتھ کہیں نہیں جانا اس بیک ورڈ کنٹری میں تو بالکل بھی نہیں۔'' وہ تیزی سے اپنی پیکنگ مکمل کر رہی تھی۔
زری بے بسی سے اسے دیکھے جا رہی تھی۔
یہ قدرت کا کیسا انتقام ہے ایک وقت میں اسے بے پناہ اختیار قوت اور ارادہ دے کر اسے کیسا کروفر والا بنایا جاتا ہے اور پھر کسی دوسرے وقت میں اس کروفر والے با اختیار طاقت والے کی ساری طاقت نکال کر اسے بونا بنا دیا جاتا ہے عاجز، لاچار، بے بس!
زری کو اس وقت یہی محسوس ہو رہا تھا۔
ایما کی حرکتوں کے ساتھ ادھر اُدھر حرکت کرتی اس کی آنکھیں تھکنے لگی تھیں۔
تھکنے تو اس کا وجود بھی لگا تھا بلکہ تھک چکا تھا۔ جانے وہ کس آس میں اسے گھسیٹے جا رہی تھی۔
میرو باہر لاؤنج میں بیٹھا تھا۔
اس کے اور ایما کے درمیان ابھی بھی سرد جنگ چل رہی تھی۔
دونوں نے کئی دنوں کے بعد آج اب سے چند منٹ پہلے بات کا آغاز کیا تھا جو ایما کو اتنا ناگوار گزرا کہ اس نے ان دونوں کی کوئی بھی وضاحت سنے بغیر وہاں سے جانے کے لیے اپنا سامان پیک کرنا شروع کر دیا تھا۔
اور یہ زری اور میرو کی بے بسی تھی کہ وہ لاکھ چاہنے کے باوجود اس کو روک نہیں سکتے تھے۔
''ایما میری جان! تھوڑا سا وقت دو خود کو بھی اور ہمیں بھی' یوں اتنی جلدی میں گھر چھوڑنے کا فیصلہ مت کرو۔'' بہت لجاجت بھرے لہجے میں زری نے گڑگڑا کر اس سے کہا۔
وہ سوٹ کیس اور بیگ بھر چکی تھی اور اب اپنے بیگ میں میک اپ کا سامان سمیٹ کر رکھ رہی تھی۔
عجلت میں واش روم میں جا کر ٹوتھ برش' پیسٹ' فیس واش' ماؤتھ واش ایک ایک کر کے وہ ساری چیزیں اٹھا کر اندر بیگ میں لا کر رکھ رہی تھی۔
آخر میں جوتوں کی باری آئی۔
اس نے اپنے بہت عزیز اور تقریباً نئی حالت کے چھ جوتوں کے جوڑوں کو پولی تھین کے بڑے بیگ میں ڈالا اور سیدھی ہو گئی۔
''یہ فیصلہ نہ تو میں جلد بازی میں کر رہی ہوں اور نہ کسی پریشانی میں' آپ نے آج بات کی مجھ سے جانے کی جب کہ میں یہ سب ایک ویک پہلے پلان کر چکی ہوں بلکہ اس پلان کو کئی بار جانچ پرکھ چکی ہوں۔''
وہ ساری پیکنگ مکمل کرنے کے بعد بڑی تسلی سے آئینے کے سامنے کھڑی تیار ہونے لگی تھی۔

زری اس کے عین پیچھے بیڈ کے کنارے لگی آئینے کے عکس میں صاف دیکھی جاسکتی تھی۔
ایک ایسی دودھ اور میدے میں گھلی شہابی رنگت والی بوڑھی عورت جس کے چہرے پر بڑی سلوٹوں اور بے چارگی کو ہٹا کر نرم ملائم ریشم جیسی جلد اور زعم غرور اور طنطنے کو جگہ دی جائے تو زری کی جگہ ایمان بیٹھی نظر آئے گی۔
اور زری خود کو ایما کی جگہ رکھ کر ٹک ٹک دیکھتی جارہی تھی۔
''ہمیں تمہاری ضرورت ہے ایما!'' آخری ترپ کا پتا زری نے اسی بے چارگی سے ایمان کے سامنے پھینکا تھا۔
''سوری مگر مجھے آپ کی ضرورت نہیں' ایکچوئلی مام میری بھی مجبوری ہے مجھے لگتا ہے میں کچھ دن اور آپ دونوں کے ساتھ رہی تو آپ دونوں کو شاید کسی سائیکو کلینک میں ایڈمٹ ہوں یا نہیں۔ میں کسی پاگل خانے میں ضرور پہنچ جاؤں گی اور پلیز ایسا تو آپ بھی نہیں چاہیں گی مام! اتنی محبت تو کرتی ہوناں مجھ سے۔'' وہ جھک کر چٹ چٹ ماں کے دونوں گالوں پر ہوائی بوسے لیتی اسے کندھوں سے مس کرتے پیچھے ہٹ گئی۔
''ایما مت جاؤ میری جان! ہم دونوں پہلے ہی بہت اکیلے ہیں۔ پہلے موحد چلا گیا ہمیں چھوڑ کر اور اب تم.....'' زری سچ مچ رونے لگی۔
''تو سوچو ناں، مام کیا خرابی ہے آپ دونوں میں کہ کوئی بھی آپ دونوں کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتا۔'' وہ اپنے ریڈ ڈائی بالوں کو جھٹکتے ہوئے نخوت و غرور سے پوچھ رہی تھی۔
''اگر مجھ سے یا میرو سے کوئی غلطی ہوگئی ہے تمہیں برا لگا ہے تو میں تم سے ایکسکیوز کرتی ہوں یا اگر تمہیں کچھ چاہیے ایسا کچھ بھی ہو جو ہم تمہیں لے کر دے سکیں اور تم ہمیں چھوڑ کر نہیں جاؤ تو پلیز۔''
زری کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ وہ پریشانی گھبراہٹ اور بے بسی میں کیا کچھ بولتی جارہی ہے۔
ایما نے سوٹ کیس کے وہیل نکالے اور ٹرالی گھسیٹتی بیگ دونوں کندھوں پر ڈالتی جیسے زری کی بات سن ہی نہیں رہی تھی۔
ایک آخری نظر کمرے پر ڈالی کہ کچھ بہت ضروری چیز یہاں رہ تو نہیں گئی یا وہ کچھ بہت خاص بھول کر تو نہیں چھوڑے جارہی مگر ایسا کچھ نہیں تھا۔ وہ ماں کو الوداعی ہاتھ ہلاتی باہر نکل گئی۔ سامنے ہی صوفے پر میرو سر جھکائے اس کی سیاہ سینڈل کی اسٹریپس پر نظر جمائے بیٹھا تھا۔
ایما لمحہ بھر اس کے قریب آکر رکی تھی۔
وہ شاید زری کی منتوں کا حال دیکھ چکا تھا اس لیے اس نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے تھے۔
''او کے ڈیڈ! بائے۔ میں جارہی ہوں اینڈ ڈونٹ وری میں ہمیشہ کے لیے نہیں جارہی' مہینے میں ایک یا دو بار آپ دونوں سے ملنے' آیا کروں گی اور ڈینیئل کا اپارٹمنٹ تو آپ نے دیکھ رکھا ہے کسی دن دل چاہے تو آپ آسکتے ہیں مجھ سے ملنے۔ مگر صرف ملنے مجھے برا بھلا کہنے یا الٹی سیدھی نصیحتیں یا منتیں کرنے کے لیے نہیں۔ ورنہ پھر میں آپ دونوں سے کبھی نہیں ملوں گی۔''
یہ کہہ کر اس نے جھک کر میرو کے بالوں کا سرسری سا بوسہ لیا اور دوسرے لمحے کھٹ کھٹ کرتی ایما سوٹ کیس گھسیٹتی باہر نکل گئی۔ پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر۔
کاریڈور کے ننگے فرش پر اس کی ہیل کی ٹک ٹک اور ٹرالی کے گھسیٹنے کی آواز کچھ لمحوں تک آتی رہی پھر معدوم ہوتی چلی گئی۔ دونوں اسی طرح بیٹھے رہے اور اپارٹمنٹ ایما کے جانے سے خالی ہونے کے بجائے سناٹے اور خاموشی کے بوجھل وجود سے بھر گیا۔ اتنا بھر گیا کہ ان دونوں کا سانس لینا محال ہوگیا۔

https://reading.urdulab.net

یہ کیفیت صرف میر وکی نہیں تھی چند منٹوں بعد اسے زریں کی اونچی اونچی بے ہنگم کھنچتی سانسوں سے احساس ہوا جیسے وہ کوئی بھاری چیز کھینچتی بلڈنگ کی آخری سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ رہی تھی۔

وہ اس آواز کو پہلے اپنا وہم سمجھا پھر ایک دم سے اٹھ کر اندر بھاگا تو زریں کی آنکھیں باہر ابل رہی تھیں اور وہ بمشکل زبان باہر نکالے سانس لیتے ہوئے ہانپ رہی تھی۔

وہ اسے اس حالت میں دیکھ کر حواس باختہ سا کھڑا رہ گیا۔ اسے لگا وہ موحد اور ایمان کے ساتھ زری کو بھی کھو چکا ہے۔

☆☆☆

''بوجھ نہیں ہو کشف میری جان! اللہ نہ کرے تم میرے لیے کبھی بوجھ بنو۔'' زینب کو اسے سمجھانا مشکل ہو رہا تھا۔

وہ بہت بری طرح سے بکھری تھی۔

''تو آپ نے آنی اتنا حقیر اتنا گرا پڑا بنا دیا مجھے سونیا پھپھو کے سامنے کہ وہ اپنی بیٹی کا ریجیکٹ کیا ہوا رشتہ میرے لیے... اتنی تنگ آ گئی ہیں مجھ سے تو کہہ دیں میں خود چلی جاؤں گی آپ کی زندگی سے نکل جاؤں گی دور چلی جاؤں گی۔''

''وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی تھی۔ زینب کو لگا کسی نے اس کے دل میں کسی تیز دھار آلے سے وار کیا ہو۔ وہ تڑپ کر رہ گئی۔

مت رو ؤ ایسے کشف میری جان خدا کی قسم میری ایسی کوئی نیت کوئی ارادہ نہیں تھا جو کچھ تم سمجھ رہی ہو' سوچ رہی ہو میں نے وہ نہیں چاہا تھا میں تو۔'' اسے اپنے ساتھ کھینچ کر سینے سے لگائے ہوئے وہ بے ربطی سے کہے جا رہی تھی۔

''آپ جو چاہتی ہیں۔ وہ میں جان چکی ہوں پلیز اب مجھے آپ سے اور کوئی بات نہیں کرنی' آنی آپ جہاں کہیں گی میں آنکھیں بند کر کے وہاں کے لیے ہاں کر دوں گی۔''

وہ جذباتی پن میں بولتی چلی جا رہی تھی۔

زینب بے بسی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

اور ہمیشہ ایسا ہی کیوں ہوا کہ اس کی نیت پر شک کیا گیا اور اس کو مورد الزام ٹھہرایا گیا جبکہ وہ تو کسی کا بھی برا نہیں چاہتی تھی اور کشف کا تو وہ اپنی جان پر کھیل کر بھی برا نہیں چاہ سکتی تھی۔

اس کا دل چاہا وہ خود بھی رونے لگے۔

مگر یہ وقت رونے کا نہیں تھا کم از کم زینب کے لیے۔

''ٹھیک ہے تمہیں مجھ پر شک ہے، میری نیت پر، میرے ارادے پر تو میں کوئی صفائی نہیں دوں گی۔ مائیں صفائی نہیں دیا کرتیں اگر مائیں ایسا کرنے لگ جائیں تو پھر کوئی بھی رشتہ بھروسے و اعتبار کے قابل نہیں رہ جائے گا اور کشف میں نے کچھ غلط نہیں کیا نہ مجھے اس پر کوئی شرمندگی ہے کیونکہ میں صرف اتنا چاہتی ہوں میری بیٹی کو اپنی اصلی زندگی میں ہر وہ آسائش، وہ خوشی، سکون، محبت، دولت سب کچھ ملے جو کچھ میں اسے نہیں دے سکی۔'' بولتے ہوئے اس نے اپنے آنسوؤں پر قابو پا لیا تھا۔

''اور سونیا جہاں بیٹی کا رشتہ کر رہی ہے۔ وہ لوگ ایسے ہیں جو میرے دل نے کہا وہ کشف کے لائق ہیں تو میں نے اس سے یہ بات کر دی اور سونیا کوئی غیر نہیں تمہاری پھپھی ہے۔ یہ رشتہ نہ سہی تو کوئی اور... اس کو یہ احساس تو ہونا چاہیے کہ کچھ حق تمہارا ابھی اس پر ہے۔''

''آپ جانتی ہیں نا مجھے یہ مانگے کا حق' مانگے کی محبت اور مانگے کے رشتے نہیں چاہئیں۔'' وہ تڑپ کر بولی۔

زینب اسے فخر بھری نظروں سے دیکھنے لگی اور پھر گہرا سانس لے کر مسکرانے لگی۔

''میں نے آپ کو کوئی لطیفہ نہیں سنایا ہے اور میں سچ کہہ رہی ہوں اگر آئندہ آپ نے ایسا کچھ کیا تو.....'' وہ غصے اور ناراضی سے ماں کو دیکھ کر بولی۔

''تو کیا مجھے پھانسی لگا دے گی' میری کشف کے بس میں ہو تو قسم سے آدھے شہر کو واقعی یہ پھانسی چڑھا دے میری جان تیرے اندر اتنا غصہ، اتنی وحشت سی کیوں ہے؟'' وہ اسے بانہوں میں بھر کر پیار کرتے ہوئے بولی۔

''یہ تو آپ کو پتا ہوگا آپ میری ماں ہیں میں ایسی کیوں ہوں۔ وہ ڈاکٹر موحد کا بچہ وہ بھی تو یہی فرما رہا تھا کہ میری تربیت کرنے والے ہاتھ تو بہت اچھے اور قابل ہیں۔ میری نیچر، میری فطرت بہت بری ہے تو کیا میں اسے اتنی بکواس پر بخش دیتی۔'' وہ غصے سے بولے گئی۔

''اوہ تو اس نے یہ کچھ بولا میری بیٹی کو، انجان سمجھ کر معاف کر دو۔ اس نے میری بیٹی کا ہیرے جیسا دل اور محبت بھری فطرت نہیں دیکھی اس لیے ناں۔

''بس رہنے دیں اب اتنا ڈیل کرنے کے بعد مکھن لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ ٹھنکی۔

''میں جھوٹ نہیں کہہ رہی' میری بیٹی ہے ہی اتنی پیاری اس کا دل جتنا پیارا ہے اسے وہی جان سکے گا جو میری بیٹی کو سچے دل سے چاہے گا۔''

زینب کو ناراض ناراض سی کشف پر ٹوٹ کر پیار آ رہا تھا۔ وہ اس کے بال سنوارتی اسے اپنے ساتھ لگائے سینے میں چھپا کر تھپکنے لگی۔

''کیا سونیا کو میرو نے کال کی تھی؟'' وہ پھر سے اس الجھن میں الجھ گئی۔ کشف بھی جیسے تھک کر آنکھیں موند کر اس کے ساتھ لپٹ کر آنکھیں بند کیے شاید سو گئی تھی اور زینب کی نیند مدت ہوئی اس کی آنکھوں سے روٹھ چکی تھی۔

☆☆☆

''دل جو ٹھہرا نہیں۔'' بینر پر بڑا بڑا نیلی روشنائی سے لکھا تھا اور بینر شام کے اس پہر چلنے والی تیز ہوا سے پھڑ پھڑا رہا تھا۔

اسٹیج پر ڈائس کے آگے کھڑا تقریب کا منتظم اعلیٰ زینب کی کتاب کا تعارف کراتے ہوئے کچھ منتخب لائنیں بھی پڑھ رہا تھا۔

سامنے سبزے سے بھرے وسیع لان میں کرسیاں لگی تھیں جہاں کشف اور بلال کے علاوہ حیدر اور زینب کے کچھ کولیگز تھے۔

زینب کو اندازہ نہیں تھا اس کی شاعری کو اس کی تحریروں کو لوگ اتنا پسند کرتے ہیں۔ وہ بہت مشہور نہیں تھی مگر کچھ ایسی بے نام بھی نہیں تھی۔

شہر کی لٹریری سوسائٹی کے چیدہ چیدہ مشہور نام اس کی شاعری پر اس کی کہانیوں پر بات کر رہے تھے۔

اور اس کے دل میں جیسے بھنور سے پڑ رہے تھے۔

وہ سب سوچیں، وہ گرداب وہ ان کہی کہانیاں وہ چھوٹی سوچیں جو اس کے دل میں یوں محفوظ تھیں جیسے سیپ میں موتی۔

وہ سب لفظوں کی شکل میں کتاب کے سانچے میں ڈھلے سب کے ہاتھوں میں تھے اور سب اس کے اشعار کو اس کی سوچوں کو اس کے لفظوں کے چناؤ کو سراہ رہے تھے اور زینب کی آنکھیں نم ہوتی جا رہی تھیں۔

مائیک پر اس کا نام پکارا گیا تھا۔

اگرچہ اس نے حیدر سے لاکھ کہا تھا کہ وہ مائیک پر آ کر کچھ نہیں بولے گی۔ وہ بول ہی نہیں سکتی لیکن اس کے

https://reading.oaretotain.net

اور حیدر بھائی کا ایک ہی اصرار تھا کہ وہ چند الفاظ سہی مگر کچھ بولے ضرور......
پبلشر کو کتاب پہنچتی تھی اور حیدر بھائی کو اس کا نام بتانا تھا۔
دونوں کے محبت بھرے اصرار کے سامنے اس نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔
''دل جو ٹھہرا نہیں'' ٹھہر جاتا اس روز جس لمحے محبت نے
الوداع کہا تھا اور اسے ٹھہر ہی جانا چاہیے تھا۔
تقاضہ الفت تو یہی تھا
مگر وائے زمانہ
اور زمانے کی زنجیریں
سانسوں کے زنداں خانے میں
عمر قید کی سزا تو سہی مگر صلیب پر نہ لٹکیں
جینے کی رسم جیت گئی
اور محبت مر کر بھی ہار گئی

یہی اس کتاب کا عنوان ہے اور یہی اس کا نچوڑ زندگی دستور بھی زمانے کی رسم بھی یہی ٹھہری محبت لاکھ مرے مگر آپ کو جینا ہے سانس ان ہی کانٹوں پہ لینی ہے جن پر چل کر آبلہ پا محبت زخم زخم ہوگئی۔ بہانہ ہو تو ہجر میں مٹھاس نہیں بھرتی۔ نارسائی کا دکھ کھو دینے کا ہمہ وقت اذیت دیتا احساس ہم انسانوں کو زندگی کے میدان میں کسی برق رفتار گھوڑے کی طرح دوڑاتا رہا ہے۔ محبت کو پالینا مقصد نہیں' محبت کو کھو کر مقصد حیات کو پالینا میرے نزدیک بہت بڑی کامیابی ہے۔''

وہ رک رک کر سوچ سوچ کر بولتی موحد کو کسی اور ہی دنیا کی مورت لگی تھی وہ۔
صبح زینب کا دعوتی فون آیا تھا۔ دعوت کسی اور مقصد کے لیے ہوتی تو شاید وہ صاف منع کر دیتا لیکن کتاب کی رونمائی کا سن کر شام کے ٹائٹ شیڈول کے باوجود وہ ہامی بھرنے سے رہ نہیں سکا۔
اور اب وہ زینب کو سنتے ہوئے سوچ رہا تھا اگر وہ آج کی تقریب مس کر دیتا تو واقعی میں محروم رہ جاتا۔
زینب کے پھر سے کرسی پر جا کر بیٹھنے کے دوران بجنے والی تالیوں کے شور میں بلند آواز اس کی تالیوں کی بھی تھی' جس پر کشف نے گردن موڑ کر باقاعدہ اسے تمسخرانہ اور نخوت بھری نظروں سے گھورا تھا۔
اور موحد کو اس کا یوں گھورنا ناگوار گزرنے کے باوجود بہت برا نہیں لگا تھا۔ وہ عادتاً مسکرایا تو کشف تپ کر رہ گئی۔
''جان بوجھ کر یوں مسکرا کر میرا مذاق اُڑا رہا ہے سمجھتا کیا ہے خود کو یہ، ہونہہ'' وہ منہ میں بڑبڑائی تھی۔
''اب کس کی شامت آئی ہے تمہارے ہاتھوں؟'' بلال اسے یوں منہ کے زاویے بناتا دیکھ کر جیسے مزہ لے کر پوچھ رہا تھا۔ وہ سر جھٹک کر رہ گئی۔
ویسے مجھے اندازہ نہیں تھا۔ آپی اتنا اچھا بول لیتی ہیں۔''
وہ زینب کو اسٹیج پر لوگوں میں گھیرے دیکھ کر بولے بنا رہ نہ سکا۔
''ابھی تو تمہیں بہت سے اندازے اور بھی لگانے ہیں۔'' وہ سائیڈ پر رکھا شولڈر بیگ اٹھا کر کندھے پر لٹکتے ہوئے بولی۔
''کیا مطلب؟'' وہ ناسمجھی سے بولا۔
''تم نہیں سمجھو گے اور بیٹا جن باتوں کا مطلب سمجھ میں نہیں آئے ناں تو انہیں وقت پر چھوڑ دیتے ہیں' یہ

مسٹر ٹائم آپ کو ایسی ناسمجھ میں آنے والی باتوں کا خوب مطلب سمجھا دیتے ہیں۔'' وہ دور سے زینب کو ہاتھ ہلا رہی تھی۔

اس کی اتنی دقیق بات کے جواب میں بلال کندھے اچکا کر رہ گیا۔

''افوہ آئی کب فری ہوں گی میں نے گھر جا کر اسائنمنٹ بنانی ہے۔'' وہ زینب کے گرد بڑھتے رش کو دیکھ کر جھلائی۔

''وہ اتنی خوش ہیں اتنے ٹائم کے بعد میں نے آئی کو اتنا خوش دیکھا ہے اور تمہیں جلن کے مارے اپنی اسائنمنٹ یاد آ رہی ہے۔'' وہ اسے تپانے کو بولا' وہ اسے گھور کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

موحد کچھ لوگوں کے ساتھ کھڑا باتیں کر رہا تھا۔

''اس کی ہائٹ کتنی زبردست ہے اور کھڑے ہونے کا انداز جیسے کوئی بادشاہ ہو کسی سلطنت کا۔'' وہ بے اختیار سوچنے لگی۔

''لاحول ولا قوۃ'' بلال نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا تو بے اختیار اس نے اپنی سوچ پر لاحول پڑھی اور زینب کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

سونیا بری طرح سے آگے رکھے کپڑوں کے ڈھیر میں الجھی ہوئی تھی۔ جہیز وغیرہ کے لیے تو شائستہ آپا نے منع کر دیا تھا کہ وہاں انہیں کسی بھی چیز کی کمی نہیں تھی تو پھر کپڑے اور زیور تو بنانا ہی تھا۔

اگلے ہفتے کے آخر میں وہ لوگ آ رہے تھے تو ایسے میں وقت بہت کم رہ گیا تھا۔

ردا لاپروائی سے سامنے ٹی وی میں جانوروں کی ڈاکومنٹری اتنے انہماک سے دیکھ رہی تھی جیسے اس سے بڑی دنیا میں کوئی مصروفیت ہو ہی نہیں سکتی۔

''ردا! کیا مسئلہ ہے؟ اٹھ کر ادھر آؤ مجھے کچھ مشورہ دو ان کپڑوں کے بارے میں' کڑھائی کروالوں اس پر یا دوسرا کوئی کام۔'' وہ رہ نہ سکی تو ردا کو ٹوکتے ہوئے بولی۔

''کچھ بھی کروالیں۔'' اس نے گردن موڑنے کی بھی زحمت نہیں کی' اسکرین پر نظریں جمائے بولی۔

''ردا!'' سونیا کو بہت برا لگا۔ ''تمہاری شادی ہے تمہیں کچھ احساس ہے۔'' وہ بمشکل غصہ دبا کر بولی۔

''جانتی ہوں۔ شادی ہے میری' کب انکار کر رہی ہوں میں۔''

وہ پھر سے اسی لاپروائی سے بولی تھی۔

سونیا غصے کا گھونٹ بھر کر رہ گئی۔

اماں جان دو دن کے لیے اسلام آباد گئی تھیں اور بہت سارے کاموں کی لسٹ اسے تھما گئی تھیں۔

وہ جوان کے جانے سے خوش ہو رہی تھی کہ اس کو یہ دو دن کھل کر سانس لینے کے لیے ملیں گے مگر اب اتنی مصروفیت میں تو جیسے وہ سانس لینا بھی بھول گئی تھی۔

''ادھر آؤ میرے پاس۔'' وہ اسی تحمل سے پھر بولی۔

ردا نے بادل نخواستہ ریموٹ رکھا اور اٹھ کر ماں کے پاس آ گئی۔

''جی!'' وہ ابھی بھی اکتائی ہوئی تھی۔

''اگر تم دل سے قبول نہیں کرو گی اس رشتہ کو تو آنے والی زندگی تمہارے لیے خدانخواستہ کسی مصیبت سے کم نہیں ہو گی۔ ردا! اللہ کے لیے سمجھنے کی کوشش کرو۔'' وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے سمجھانے لگی۔

اس دن کے بعد دونوں میں اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ صرف اتنا ہوا تھا کہ سونیا نے آدھی رات

https://reading.[illegible].net

لاؤنج میں آکر سونا شروع کر دیا تھا بلکہ سونا تو نام کا تھا۔ اس نے جائے نماز سنبھال لی تھی۔

جب عزت کے لالے پڑتے ہیں تو آدمی ساری چوکڑی بھول جاتا ہے ردا کے اس دن والے قدم نے دنیا کے دل کو سنکھیے لگا دیے تھے' ایک پل کو چین نہیں آتا تھا اور نہ وہ کسی بھی لمحے ردا کو اپنی نظروں سے اوجھل ہونے دیتی۔ ردا کی شکایتی نظروں کو محسوس کرنا بھی اس نے چھوڑ دیا تھا۔

''اگر آسانی سے قبول کرلوں گی تو کیا مصیبت آسان ہو جائے گی۔'' وہ طنزیہ پوچھ رہی تھی سونیا اسے دیکھ کر رہ گئی۔

''اس طرح کرو گی تو کیا ہوگا' خود پر ظلم کرو گی؟'' وہ پھر سے بولی۔

''خود پر کروں گی آپ پر تو نہیں۔'' وہ کٹھ مارنے والے انداز میں بولی۔

سونیا اسے دیکھتی رہ گئی۔

''اور ظلم تو آپ خود پر کر رہی ہیں۔ یوں راتوں کو اٹھ کر لاؤنج میں آجاتی ہیں' فکر نہ کریں آپ کی بیٹی اتنی بزدل نہیں کہ رات کے اندھیرے میں خدانخواستہ یہ گھر چھوڑ کر جائے گی' اگر مجھے جانا ہوگا تو میں دن کے اجالے میں...''

سونیا کا ہاتھ بے اختیار اس پر اٹھ گیا۔

ردا ششدر سی گال پر ہاتھ رکھے ماں کو دیکھتی ایک دم اٹھ کر وہاں سے چلی گئی۔ اس نے منہ سے ایک آواز نہیں نکالی اور سونیا کو لگا وہ اس کا دل نکال کر ساتھ لے گئی ہے۔

وہ بے بسی سے رونے لگی۔

اس وقت رمشا فون پر مصروف اندر آتے ہوئے ٹھٹک کر رک گئی۔

''کیا ہوا! آپ رو رہی ہیں؟'' وہ ماں کے آنسو دیکھ چکی تھی۔

سونیا نے جلدی سے چہرہ جھکا کر آنسو صاف کیے۔

''نہیں...... کیوں رؤوں گی میں۔'' وہ پھیکے سے لہجے میں بولیں۔

''اور میری تو یہی سمجھ میں نہیں آرہا اتنے سے ٹائم میں تیاری کیسے ہوگی' بھلے کپڑے ہی کرنے ہیں ردا تو ذرا بھی دلچسپی نہیں لے رہی ہے اکیلی کیا کیا کروں۔'' وہ بے بسی سے رمشا کی طرف دیکھنے لگی۔

''تو کیا مسئلہ ہے آپ آنی کو بلا لیں اور اس تک چھٹی کشف کو بھی' وہ آپ کے ساتھ گھر کے کام بھی سنبھال لیں گی اور شاپنگ۔ بھئی' میں آپ کی ہیلپ ضرور کرتی مام مگر سوری میرے مڈ ٹرم چل رہے ہیں۔'' وہ کہہ کر کندھے اچکاتی چلی گئی۔

''مشورہ تو برا نہیں لیکن۔'' سونیا کسی سوچ میں گم ہو گئی۔

☆☆☆

''ایکسکیوز می!'' وہ گاڑی کا آٹومیٹک لاک کھول کر دروازہ کھولنے لگا تھا کہ پیچھے سے آتی آواز نے اس کے قدم جکڑ لیے۔

وہ ڈرائیور کے بغیر آیا تھا اب اسے اس اجنبی شہر کے رستے پتا چلتے جا رہے تھے گویا اجنبی شہر اسے اپنانے کے لیے تیار تھا۔

وہ اس سے دو قدم کے فاصلے پر چہرے پر کچھ جھجک اور کچھ شرمندگی سی لیے کھڑی تھی۔

جتنا وہ کشف کو اب تک جان چکا تھا اس کو شرمندگی ہو یا جھجک کسی معاملے میں تو یہ ماننے والی بات نہیں تھی۔

''کیا واقعی پتھر کا دل پگھل گیا ہے۔'' اس نے مسکرا کر دل میں سوچا۔

"اور میں کیوں چاہتا ہوں کہ پتھر کا دل پگھل جائے۔" اس نے الٹا دل سے سوال پوچھ لیا۔
جواب میں صرف کندھے اچکائے گئے تھے۔
"فرمائیے!" وہ سنجیدگی سے بولا اس سے زیادہ مسکراتا تو وہ پھر سے مشتعل ہو کر اسے پاگل کا خطاب تو کم سے کم دے ہی دیتی۔
"مجھے آپ سے کچھ کام تھا" وہ بڑے مہذب انداز میں بول رہی تھی جو آج کی تاریخ میں موحد کے نزدیک کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔
"مجھ سے۔ مجھ سے کیا کام ہو سکتا ہے آپ کو؟" وہ سینے پر ہاتھ باندھے اسے دلچسپ نظروں سے دیکھ کر بولا۔
جو اس کے اس انداز پر جز بز ہوئی تھی۔
"کام مگر یہاں نہیں بتا سکتی میں۔" وہ اس کی مسکراہٹ کو دیکھ کر بمشکل خود پر جبر کرتے ہوئے نارمل لہجے میں بولی۔
"تو کہاں بتائیں گی۔ مطلب آپ کے گھر آ جاؤں؟" وہ سوالیہ لہجے میں پوچھنے لگا خود کشف کے چہرے کے تاثرات بدلے تھے۔
"نن، نہیں گھر تو بالکل بھی نہیں۔" غیر ارادی طور پر اس نے کچھ گھبرا کر ذرا سی گردن موڑ کر اس طرف دیکھا تھا جہاں زینب ہجوم میں گھری کھڑی آٹوگراف دے رہی تھی۔
"تو پھر کہاں؟" اس نے کچھ مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔
"میری مجبوری نہ ہوتی تو کبھی اس خبیث کو منہ نہیں لگاتی میں' کیسے اترا رہا ہے جیسے پوری دنیا اس کی مٹھی میں ہو۔" کشف اس کی دلچسپ نظروں پر دل میں کھول کر خود سے بولی۔
"دنیا نہ سہی اس وقت کشف بی بی تو اس کی مٹھی میں ہے ناں۔" یہ دل بڑا کمینہ، دغا باز ہوتا ہے ہمیشہ ایسے ہی موقع پر بے وفائی دکھاتا ہے۔
"میں کل اگر آپ مطلب جس وقت میں فری ہوں آپ کے ہاسپٹل آ جاؤں۔" وہ ضبط بھرے انداز میں مہذب لہجے میں پوچھنے لگی۔
"اس دن کی طرح؟" وہ شوخی سے اس کی طرف جھکا۔
"پلیز میں سیریس ہوں۔" وہ اس دن والا منظر دہرانا نہیں چاہتی تھی ورنہ موحد کے سارے انداز تو اسے اکسانے والے تھے۔
"ٹھیک ہے آپ کل کال کر کے معلوم کر لیجیے گا میں جس وقت فری ہوں گا آپ کو بتا دوں گا۔" وہ اس کی خفگی کے خیال سے فوراً ہی سنجیدہ ہو کر بولا۔
"اب مجھے اجازت ہے۔" وہ بڑی فرماں برداری سے پوچھ کر مڑنے لگا تھا۔
"پلیز اس بات کا آنی کو پتا نہیں چلنا چاہیے کہ میں آپ سے ملنے کے لیے آئی تھی۔" اس کی پیچھے سے آتی درخواست نے لمحہ بھر کے لیے موحد کو ٹھٹکا دیا۔
"وجہ پوچھ سکتا ہوں اس راز داری کی؟" وہ ان ہی قدموں پر گھوما تھا۔
"نہیں۔" وہ قطعی انداز میں کہہ کر مڑی۔
"اور مجھے کس کس کو اس ملاقات کے بارے میں نہیں بتانا۔" وہ شوخی سے بولا تو کشف کو جیسے آگ سی لگ گئی جی چاہا فوراً اسے صاف منع کر دے اوقات سے زیادہ ان ڈاکٹر صاحب کو لفٹ کرا دی ہے تو دماغ ہی خراب ہو گیا ہے۔

https://reading.pakistanipoint.com

''بھئی، تم یہاں ہو اور میں تمہیں وہاں تلاش کر رہا ہوں، آنی بلا رہی ہیں تمہیں' کیا گھر نہیں چلنا یا اس سبزہ زار میں چہل قدمی کرتی رہو گی۔ رات بھر۔'' بلال بھی جب بولنے پر آتا تھا تو بقول کشف کے کئی عورتوں کو مات دیتا تھا۔

کشف صرف اسے گھور کر رہ گئی اور کوئی جواب دیے بغیر زینب کی طرف بڑھ گئی جو اسے بلا رہی تھی۔

☆☆☆

ایما روم کا دروازہ لاک کرنے لگی تو ڈینئل ایک دم سے درمیان میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ ایما نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

''اگر تم یہ روم لاک کر لو گی تو میں رات میں کہاں سوؤں گا کل بھی مجھے لاؤنج کے فرش پر سونا پڑا۔'' وہ اس کو عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''تو کیا تم میرے روم میں سو گے؟'' وہ اچنبھے سے پوچھنے لگی۔

''کم آن بے بی..... یہ میرا تمہارا کیا ہوتا ہے دو دن میں نے صرف اس لیے تمہیں یہ روم پورے کا پورا دے دیا کہ تم ہوم سکنیس فیل نہیں کرو، وہ بھی صرف تمہاری اور اپنی دوستی کی خاطر۔'' وہ اس پر ٹھیک ٹھاک احسان جتاتے ہوئے بولا۔

''تم نے خود ہی کہا تھا جان رات میں نہیں آتا اس کی نائٹ ڈیوٹی ہوتی ہے تو تم آرام سے اس کے روم میں ایڈجسٹ ہو سکتے ہو۔''

وہ اس کے یوں دروازے کے بیچ میں کھڑے ہونے سے اکتاہٹ کا شکار ہونے لگی۔

''یہی تو پرابلم ہو گئی ہے یار! اس کی نائٹ ختم ہو گئی ہے کل بھی وہ رات کو آ گیا تھا اور مجھے اس نے اپنے بیڈ سے آؤٹ کیا۔'' وہ اس کی شارٹ شرٹ سے جھانکتے خطوط پر نظریں گاڑ کر بولا۔

''اب تم کیا چاہتے ہو ڈینئل مجھے سخت نیند آ رہی ہے اور میں کسی دوسرے کی موجودگی میں نہیں سو سکتی۔'' وہ دوٹوک بات کرتے ہوئے اسے جتا کر بولی۔

''اوہ دوسرا؟ دو دن پہلے تم مجھ سے میرج بنانے کے لیے بھی تیار تھیں۔'' وہ اس کے یوں دوسرا کہنے پر بھڑکا تھا۔

''وہ بات اور تھی پلیز اب سو جاؤ جا کر۔'' وہ ناگواری چھپا کر بیزاری سے بولی۔

''اگر تمہیں سپیرٹ روم چاہیے تو پھر تمہیں اس کے لیے شیئرنگ کرنا ہو گی تو ہی جان مجھے اپنے روم میں میٹرس لگانے دے گا جب اسے کم پیسے دینے پڑیں گے۔'' وہ کمینگی سے بولا۔

ایما اسے چند لمحے گھورتی رہی۔

پھر تیزی سے آگے بڑھ کر اس نے اپنے پرس میں سے کچھ رقم نکال کر ڈینئل کے آگے کی۔

ابھی یہ رکھو۔ کل حساب کتاب کریں گے شیئرنگ اگر کرنی ہے تو کون کتنا دے گا۔ اب مجھے ڈسٹرب نہیں کرنا پلیز۔ گڈ نائٹ۔'' کہہ کر اس نے ڈینئل کو تقریباً دھکا دے کر دروازے سے باہر کیا تھا جو نوٹ گننے میں مصروف تھا۔

''گڈ نائٹ بے بی..... سی یو سون۔'' وہ ہوائی بوسا اچھالتے ہوئے اونچی آواز میں بولا۔

ایما نے جواب نہیں دیا۔

''وہ دروازے پر نظریں جمائے مسکرانے لگا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

مصباح علی سید

کوئی شام اپکا رکھنا

"یہ دیکھیں یہ ہے وہ......۔"

آسیہ نے اپنا بھاری بھرکم وجود نفیسہ بیگم کے قریب ٹکاتے ہوئے ایک تصویر ان کی جانب بڑھائی۔ نفیسہ جن میں ہر طرح کی نفاست پائی جاتی تھی سوائے یادداشت کے۔ تصویر ہاتھ میں پکڑے آنکھوں کو عجیب سے انداز میں گھمانے لگیں۔

"سر منہ تو دکھائی نہیں دے رہا۔ کیا دیکھوں، منہ نہ متھا جن پہاڑوں لتھا؟"

ناک چڑھا کر وہ بدمزا ہوئیں۔ پہلے تو ان کی مثال پر آسیہ کی آنکھیں پھٹیں پھر جلد ہی نگاہ ان کے گلے میں جھولتی عینک پر گئی، آگے بڑھ کر پکڑائی۔

"اماں پہلے یہ ناک پر ٹکائیں، منہ متھا بھی دکھائی دینے لگے گا۔"

اپنی غلطی پر پشیمان تو وہ کبھی نہ ہوئی تھیں اس لیے مسکرا کر عینک جمائی۔

"کس کام کی بہو ہو تم میری، ایک عینک کا دھیان نہیں رکھ سکتیں۔ بھئی بھول جاتی ہوں لگا نا، تم بتا بھی نہیں سکتیں کیا۔"

"اماں بتا تو دیا ہے، اب دیکھ لیں۔"

اماں کے لمبے سے "ہوں ں ں ں۔" پر وہ اکتاہٹ کا شکار ہوئیں۔

"کیسا لگا آپ کو۔"

مکمل ناول

*ANWER

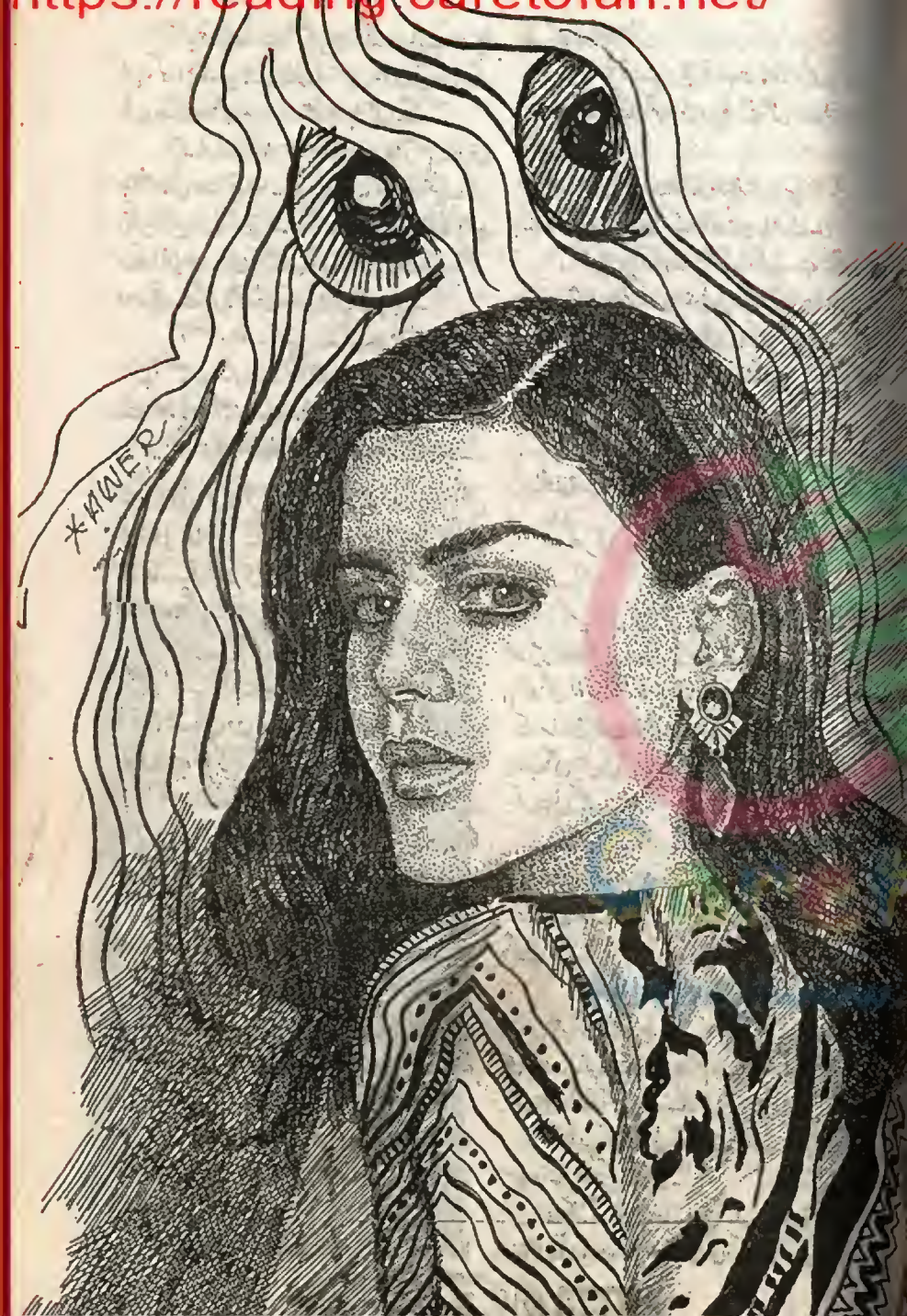

لمبا، گورا چٹا۔ یہ بڑی بڑی آنکھیں، بس تیوری کے بل رہ گئے وہ بھی عمر۔ بڑھتے پڑ جائیں گے۔"

ایک تو اماں کو ہر خوبصورت بندہ اعظم سے ہی ملتا محسوس ہوتا تھا، اونچے لمبے تک تو بات ٹھیک تھی لیکن آسیہ نے آج تک اعظم بھائی کو گورا چٹا نہیں دیکھا تھا، اور بڑی آنکھیں توبہ۔! ان کی تو ایک آنکھ دوسری سے نہیں ملتی تھی، آسیہ بول ہی پڑیں۔

"استغفراللہ۔ آپ نے کب دیکھ لیں ان کی بڑی آنکھیں، میں نے تو انہیں جب بھی دیکھا غصے سے سکوڑی آنکھیں کیے دیکھا۔"

"اعظم کا غصہ غلط نہیں تھا۔ نہ کھاتے تمہارے بہن بہنوئی اس کا حق، پھر کس بات کا غصہ کرتا، پاگل تھوڑی تھا، پورے کنبے میں اس کی ذہانت کا ڈنکا بجتا تھا۔ یہ تو بات ہی ایسی جگہ آ کر ٹھہری، کھا تم گئے، بدنام وہ ہو گیا۔"

"اماں۔" آسیہ کی حیرت سے آنکھیں پھیل گئیں "آپ تو ایسے کہہ رہی ہیں، کہ میں کھا گئی، میں تو آج تک اپنی دی ہوئی چیز کسی سے نہیں مانگتی، میں کہاں سے کھا گئی۔"

آسیہ نے اتنی معصوم شکل بنا کر کہا تھا، جیسے ساس صاحبہ اس اداپر واری ہوتے انہیں سینے سے لگا لیں گی۔ نفیسہ بیگم تیوری چڑھا کر بولیں۔

"بڑی ہی کوئی اعلا عادت ہے، اپنی چیز کا تقاضا نہ کرنا۔ انسان کی بُری فطرت کو تمہارے جیسے منافق لوگ ہی پختہ کرتے ہیں، بھئی پتا ہونا چاہیے، کیا تمہارا کیا دوسرے کا، اپنے حق پر حق، مروت میں پہلے مانگو نا پھر بعد میں سارے میں بدنام کرتے پھرو۔"

آسیہ نے گہری سانس لی، وہ کیا موضوع لے کر آئی تھیں، اماں جانے کس طرف مڑ گئیں۔ آسیہ کوفت کا شکار ہوئیں۔

"اچھا اماں! اس بات کو چھوڑیں۔ آپ لڑکا بتایا تو ہے، بچہ تو بہت بھلا مانس لگ رہا ہے۔ اب پتا نہیں تمہاری ربیکا کے حلق سے اترتا ہے یا نہیں۔"

"اماں حلق سے نہیں اتارنا، ربیکا کا رشتہ کرنا ہے۔" آسیہ نے صحیح کے ساتھ تمہید باندھی۔

"عمران کو تو بہت پسند آیا، کہہ رہے تھے ایک دو دن میں جا کر گھر بار دیکھ آتے ہیں، جاب بہت اچھی ہے، ماسی سعیدہ بتا رہی تھی نئی سوسائٹی میں گھر بھی اچھا خاصا ہے، لوگ بہت اچھے ہیں اور شریف بھی۔"

"تو پھر کس دشمنی کا بدلہ لے رہی ہو بہن ان شریفوں سے۔ پتا ہے نا اپنی ربیکا کا، ان کے سارے گھر کو اجاڑ کے رکھ دے گی، ان کی شرافت سمیت۔"

آسیہ ان کے قیاس پر ہمیشہ کی طرح بد دل ہوئیں حالانکہ اسے سرچڑھانے میں سب سے زیادہ ہاتھ بھی نفیسہ بیگم کا ہی تھا۔ کسی کی مجال نہیں تھی ان کے سامنے اسے کوئی ذرا سا بھی کچھ کہہ دے لیکن جب بھی اس کی کسی حرکت پر غصہ آتا۔ آسیہ کو رکھ رکھ کر سناتی تھیں۔

"میں تو پہلے دن سے کہہ رہی ہوں لڑکی ذات ہے، اسے کچھ سکھاؤ، سمجھاؤ۔ آخر کل کلاں رشتہ بھی کرنا ہے، اب آ گیا نا وقت۔ پر میری یہاں سنتا ہی کون ہے۔"

"ماں جی کیا ہو گیا، کون نہیں سنتا آپ کی؟"

عمران کہیں جانے کے لیے کمرے سے نکلے ہی تھے۔ اماں کے ہمیشہ نہ ختم ہونے والے شکووں پر مخل ہوئے تو آسیہ کے لہجے میں تلخی بھر گئی۔

"آپ کی لاڈلی، جس نے آج تک کوئی کام سیدھا نہ کیا، نہ کرے گی۔"

وہ کہہ کر اٹھ کر جانے لگی تھیں۔ انہیں یقین تھا اب ان کی بات خطا ہو جائے گی، کیوں کہ جیسا مزاج

نفیسہ بیگم کا تھا، تم وہیں بیٹے کا بھی ویسا ہی تھا، بات سے بات، چاہے اصل بات اس طرح سے ختم ہو جائے کہ خورد بین لگا کر بھی محسوس نہ ہو، مگر آسیہ کے کچن کی جانب بڑھتے قدم نفیسہ کے جملے نے روک دیے۔

''اس میں بچی کا کیا قصور، اس کی کون سی ماں بیٹھی ہے جو سیدھے کام سکھاتی، بتاتی، اور تم کیوں سکھانے لگیں بھئی، تم تو غیروں کی طرح چھوڑ کر آ رہی تھیں اسے، میں لائی تھی ماں بن کر، میں نے سنبھالا، ورنہ جانے کہاں رل رہی ہوتی۔''

''اوہو ماں جی۔'' عمران بولتے ہوئے ان کے قریب ہی بیٹھ گئے۔ ''سب سے زیادہ تو آپ ہی اس کی حمایت کرتی ہیں۔ یاد ہے نا اس دن بریانی بناتے ہوئے اس کا ہاتھ جل گیا تھا، تب کتنا غصہ کیا تھا آپ نے آسیہ پر۔ پھر جب وہ فرش دھوتے پھسلی دو گھنٹے کس نے اس کی کمر مسلی تھی آپ نے یا آسیہ نے، حالانکہ وہ کہہ رہی تھی گرنے سے اتنا درد نہیں ہوا جتنا آپ کے مسلنے سے ہوا۔''

ان کا انداز نفیسہ بیگم کو ذرا نہیں بھایا تھا۔

''بن ماں باپ کی بچی پر میں ترس نہیں کھاؤں گی تو اور کون کھائے گا۔ تم تو مفت میں ماں باپ بن گئے اس کے۔ دیکھ ریکھ کس نے کی، میں نے۔'' انہوں نے ہاتھ جما کے اپنے سینے پر رکھا تھا۔ ''اب رشتے کے وقت یاد آیا تمہاری بیگم کو کہ وہ خالہ ہے۔ وہ رشتہ ڈھونڈے، میں تو گئی جہنم میں، جیسے مجھے تو رشتے کرنے آتے ہی نہیں۔''

''اوہ۔۔ تو یہ وجہ ہے۔'' آسیہ نے دل میں سوچا۔ بولی کچھ نہیں مگر عمران بول پڑے۔

''اس میں کیا مسئلہ ہے۔ لعنت بھیجیں اس رشتے پر، آپ بتائیں جو آپ کو پسند ہے، پہلے وہ دیکھ لیتے ہیں۔''

''نہ نہ نہ۔'' نفیسہ یک دم بولیں ''تم خالہ خالو ہو پہلا حق تمہارا، ورنہ تمہاری بیگم تمہارے کان بھرتی پھرے گی، بڑھیا کے کہنے میں آ گئے۔'' کچھ توقف سے انہوں نے مزید وضاحت بھی کر دی۔

''لیکن یہ سن رکھو اگر میری کو پسند نہ آیا، میرے جیتے جی اس پر زور زبردستی نہیں ہو سکتی۔''

''اُفف!'' عمران نے وہاں سے اٹھنے میں عافیت سمجھی، انہیں آج تک سمجھ میں نہیں آیا تھا اماں آخر حمایتی کس کی ہیں، اتنے بیان ہمارے پارلیمنٹ میں منتخب ہوئے ممبر نہیں بدلتے ہوں گے جتنے وہ ایک منٹ میں بدلتی تھیں۔

☆☆☆

آسیہ کی بھانجی تھی۔ جب ربیکا پانچ سال کی تھی، ماں معمولی بیماری میں ہی چل بسی، لیکن ابا دس سال کی طویل علالت کے بعد وفات پائے تھے۔ جوان بچی کو تن تنہا چھوڑنا وہ بھی گاؤں میں آسان نہیں تھا۔ پھوپھیاں دو تھیں۔ دونوں ہی ملک

سے باہر، فوتگی پر آنا مشکل ہو گیا، بعد میں کس نے آنا تھا۔

ایک تایا ضرور تھے اور قریبی شہر میں بھی، لیکن مراسم کچھ ایسے تھے کہ بھائی کی میت پر بھی منتیں کر کے بلایا گیا تھا، برسوں سے دل میں پڑی رنجش پرانی گرد کی طرح ایسے جگہ بنا چکی تھی جیسے دل کی رگیں ہوں، نکال دو تو دل رک جائے، صفائی میں تکلیف بہت۔ اگر سوچو تو دل کا علاج صرف صفائی میں ہے نکالنے میں نہیں اور اب ان کی صفائی کرنا بہت مشکل کام تھا، بھائی کا سن کر اکیلے آئے تھے، گھر کے لوگ تو پہلے بھی کسی نے نہیں دیکھے تھے سو اب بھی سب اس شرف سے محروم ہی رہے، خود بھی جنازہ اٹھنے کے بعد قبرستان سے گھر یہ دیکھنے بھی نہ آئے کہ اکلوتی بھتیجی کا کیا حال ہوگا۔ ہمراہ لے کر تو کیا ہی جاتے۔

آسیہ کا دل ربیکا کے پاس سے آتے کٹ کٹ رہا تھا، بڑی بہن کی اکلوتی بیٹی، پھر کم عمر، کئی بار دل میں آیا میاں سے بات کریں۔ اب ایسے حالات نہیں تھے کہ وہ ایک بچی کا بھی بوجھ نہ اٹھا سکیں، ان کے میاں عمران انکم ٹیکس کے محکمے میں اچھی پوسٹ پر تھے اور اپنی اولاد بھی نہیں تھی، مگر مسئلہ نفیسہ بیگم کا تھا، میاں کی وفات کے بعد بھی گھر پر ان کی حکمرانی ویسی ہی تھی جیسی ایک مضبوط ساس کی ہوتی ہے۔ آسیہ آنکھوں کی نمی پلکوں کی تیز جنبش سے جھاڑ کر خود میں مضبوطی پیدا کرتی میاں کے پاس دو ٹوک بات کرنے آئی تھیں، کہ کیا اٹھارہ سال ایک گھر میں گزار کر بھی میرا اتنا حق نہیں کہ صرف ایک مہمان چند سال کے لیے اپنے پاس ٹھہرا سکوں، مہمان بھی وہ جو سگی بھانجی ہو، خرچہ تو اس کے باپ کے ترکے سے ہو جائے گا، صرف اس کی عزت کی حفاظت کا مسئلہ تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ میاں سے بات شروع کرتیں نفیسہ بیگم یک دم کمرے میں داخل ہوئیں۔ بہو کو جانے کے لیے تیار دیکھ کر حیرت کا جھٹکا لگا۔ منہ کھل گیا انگلی گال پر رکھی۔

''ہائیں! تم جانے کے لیے تیار کھڑی ہو۔ حد ہوتی ہے آسیہ، خون کے سفید ہونے کی بھی۔ اف قیامت کی نشانیاں ہیں قیامت کی، سب کو اپنی اپنی پڑی ہے۔''

وہ دھپ سے سامنے بیٹھ گئیں۔ آسیہ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تھا۔

''تایا تو منہ اٹھائے چلتا بنا۔ ایسے بھی کون سا قتل ہو گیا تھا۔ دو گھڑی بیٹھتا میں ہی سمجھا دیتی پر نہ جی۔'' انہوں نے ہاتھوں کے اشارے سے خوب تمہید باندھی تھی۔

''ایسوں کو تو بیگموں کی سمجھ میں آتی ہے، وہ کیا جانیں خاندان کے بڑے چھوٹے کو۔ اور تم۔'' اب توپ کا رخ آسیہ کی جانب تھا۔

''میت کو دیکھ کر خوب ڈرامے لگائے، اب آنسو جھاڑ چلتی بنیں، بس یہی محبت تھی بہن سے وہ مر گئی، ٹلی بلا۔''

آسیہ کی حیرانی سوا تھی۔ نفیسہ، ربیکا کو اپنے ساتھ لپٹائے، روتے ہوئے جھول رہی تھیں۔

''میری بھانجی ہوتی، بھی اکیلا چھوڑ کر نہ جاتی۔ یہاں اسی وقت، فساد ڈال لیتی میاں کے ساتھ، اور اللہ بخشے تمہارے سسر کو، ان کو دھمکی کے لیے حق مہر کا مطالبہ ہی بہت تھا۔''

یہ سن کر آسیہ کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔

☆☆☆

یہ اندازہ مشکل تھا کہ اب نفیسہ مزید کیا کہنے والی ہیں۔ نفیسہ کی پرانی عادت، بات کو بنا سر پیر کے جانے کہاں سے کہاں جوڑتی — جاتی تھیں۔ انہیں بس، شاعر کی طرح اپنا کلام سنانے کے لیے بندہ دستیاب ہو، میاں ہی سے کیا، اپنی بات منوانے پر آتیں تو ٹرمپ تک کو چھٹی کا دودھ یاد کروا دینے کا حوصلہ رکھتی تھیں۔ وہ تھیں ہی ایسی دبنگ، اسی وقت ربیکا کی جانب منہ کر کے کہا۔

''چلو جو دو چار جوڑے اٹھانے ہیں اٹھاؤ۔ آج سے میں تمہاری دادی، تم میری پوتی، لعنت بھیجو

https://reading...net

ایسے رشتوں پر۔'' چہرا خصوصاً آسیہ کی جانب تھا۔
''جو وقت پڑے کام نہ آئیں، آگے پیچھے منک منک جائیں۔''

یہ دادی کے اپنے فرمودات، یا محاورے تھے جو موقع محل کے حساب سے ایسے منہ سے ابلتے تھے، کہ پوری گرائمر تیار ہو سکتی تھی۔ ''چل شاباش اٹھ۔ جب تک میں زندہ ہوں کوئی کچھ کہہ کر دکھائے' سینے سے لگا کر نہ رکھا تو نام نفیسہ کے بجائے بدسلیقہ رکھ دینا۔''

آسیہ کی آنکھیں تشکر اور تحیر سے بھری تھیں کہ ''خوب ہے میرا رب جو دل کے بھید کس خاموشی سے سنتا اور حل کرتا ہے'' وہ کچھ نہیں بولیں بس خاموش تھیں۔

''اور یہ نہ سمجھنا جائیداد کے لالچ میں لے جا رہی ہوں۔ بھاڑ میں جائے ایسی دولت جس کے شکوے مرنے پر بھی ختم نہ ہوں۔ ڈنکے کی چوٹ پر خود خرچہ کروں گی، پڑھاؤں لکھاؤں گی۔ خود بیاہوں گی۔''

یہ باقاعدہ آسیہ کی جانب منہ کر کے باآواز بلند سنایا گیا تھا اور پھر انہوں نے ایسا کر کے بھی دکھایا، جب وہ خالہ کے گھر آئی نویں کلاس میں تھی۔ یہی کوئی پندرہ سال کی، سب سے پہلے تو نفیسہ نے اس کی مسہری اپنی مسہری کے ساتھ جوڑی، کپڑے اپنی الماری میں سیٹ کروائے، پھر تو ایسے جیسے وہ حقیقتاً ان کی سگی پوتی ہو، اس کے اسکول جانے، آنے، کھانے پینے ہر چیز کا آسیہ سے پہلے خیال رکھا تھا، آسیہ کو یاد نہیں پڑتا تھا کبھی اس نے کہا ہو۔

''سیزن بدل رہا ہے، ربیکا کی شاپنگ کرنی ہے۔''

ربیکا کوئی غریب ماں باپ کی بیٹی نہیں تھی، کہ ترس کھا کر یہ سب ہو رہا تھا، باپ نے ترکہ میں اتنی جائیداد چھوڑی تھی، اگر اس کے تعلیمی و معاشی اخراجات نکال کر بھی دیکھا جائے تو چند ہزار بہت آرام سے ان کرایوں سے بچ جاتے تھے، لیکن نفیسہ نے اس کا ایک روپیہ بھی لینا حرام ہی گردانا تھا۔ اپنی سگی نسل تو تھی نہیں تو کیا اللہ کے دیے، پُر رحمت تحفے پر وہ کچھ بھی خرچ کرنے کے قابل نہیں تھیں۔ اس کا تمام خرچا اپنے پاس سے ایسے کرتیں جیسے اپنی اولاد پر کیا جاتا ہے اور اس کا پیسہ آنے والے وقت کے لیے بینک میں اکاؤنٹ کی صورت جمع ہو رہا تھا، اب وہ یونی ورسٹی میں بی ایس کر رہی تھی اور دادی کے دل پر ایسے حکمرانی کر رہی تھی، جیسے کوئی سگی پوتی کرتی ہے دن میں اگر آٹھ بار لڑائی ہوتی تھی تو دس بار صلح۔ نہ تو ربیکا کو کبھی احساس کمتری ہوا وہ کسی غیر کے گھر پل رہی ہے، چیزوں پر ملکیت نہ جمائے، نہ نفیسہ نے اسے سر چڑھانے میں یہ جانا وہ کوئی اجنبی ہے۔ ہنسی ٹھٹھول، ہلا گلا، ہر وقت شرارت کے موڈ میں اور اس کے بگڑتے موڈ کو نفیسہ اپنے ہاتھ میں پکڑی چھڑی سے ذرا سا قابو رکھتی تھیں، اِدھر سوئی پڑی نہیں، اُدھر ربیکا، ناک کی سیدھ میں چلی نہیں، وقت اپنی موج میں تھا۔

☆☆☆

یہ تھی کہانی ربیکا کے خالہ کے گھر آنے کی، اور دادی کے دل پر حکمرانی کی، ماں کی وفات کے بعد باپ کی لاڈلی تو پہلے ہی تھی یہاں آ کر لاڈ سوا ہو گئے، نفیسہ جن کے اکلوتے بیٹے عمران تھے۔ شادی کو اٹھارہ سال بیت گئے اولاد کی نعمت سے تاحال محروم تھے، شروع کی کمد بد، پریشانی میں تب ڈھلی جب شادی کو دو سال گزر گئے، بات دائیوں مائیوں سے ہو کر، ڈاکٹرز تک جا پہنچی، روز کسی ملنے والی سے نئی ڈاکٹر کا سن کر آسیہ کے پیچھے پڑ جاتیں، آسیہ کے مسلسل کترانے پر لڑ جھگڑ کر اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاتیں، سب کا ایک ہی جواب۔

''اللہ کے ہاں دیر ہے۔''

پھر اس دیر کا بھی پتا چل گیا، جب ایک ڈاکٹر نے بیٹے کے چیک اپ کا کہا۔ عمران تو سن کر پاس سے اٹھ ہی گئے البتہ آسیہ نے پہلی بار انہیں بہت جم کر کہا تھا۔

”اماں میں اور عمران بہت اچھی ازدواجی زندگی گزار رہے ہیں، لیکن اگر کسی ٹیسٹ سے میرے میاں کا سر جھکتا ہے، تو مجھے ایسے ٹیسٹ میں کوئی دلچسپی نہیں۔“

سنتے ہی نفیسہ کی آنکھیں جس طرح سے پھیلی تھیں ظاہر سی بات تھی وہ ایک ایک لفظ بمع مطلب سمجھ چکی تھیں۔ وہ الگ قصہ تھا انہوں نے کبھی زبان سے یہ بات تسلیم نہیں کی۔ نہ بہو کے سامنے احسان مانا۔ ان کے بیٹے میں کمی کے باوجود وہ اس کا گھر ویسے ہی بسائے ہوئے ہے، جیسے ایک مطمئن عورت۔ بلکہ رویہ ایسے ہی رکھا جیسا سدا سے ایک ساس کا ہوتا ہے، بھلے دل میں آسیہ کی کتنی مشکور تھیں، مگر انداز عام۔ ویسے ایک بات یہ بھی ہے، اپنی کمزوری پر خود ہی غیر معمولی جھکاؤ، دوسرے میں غرور پیدا کرتا سو کرتا ہے۔ اپنی خودی کو بھی ملیامیٹ کر دیتا ہے، وہ ساس تھیں، نسل نہ سہی گھر تو تھا اور اس گھر کو خود ملیامیٹ کیوں کریں؟ کچھ ایسا رویہ رکھا ہمدردانہ بھی، حاکمانہ بھی۔ گھر ایک بہترین سلطنت کی طرح بھاگا نہیں تو رکا بھی نہیں، چوری چھپے منت، سماجت سب کی، مگر ذکر کسی سے نہ کیا۔ وقت اپنی روانی میں رہا، اٹھارہ سال بعد اللہ نے ربیکا کی صورت ایسی کمی پوری کی، گمان بھی نہیں گزرتا تھا اس گھر کے در و دیوار نے کبھی قلقاری نہ سنی ہو، یا کھلونے نہ ٹوٹے ہوں۔ اللہ نے پلی پلائی بیٹی ایک رونق کی صورت گھر میں اتار دی تھی، تمام منتیں مرادیں، جیسے سود سمیت لوٹ آئی ہوں۔ اب اسی رنگینی کو رخصت کرنے میں دونوں ساس بہو سرگرم تھیں۔

☆☆☆

جانے کب سے نفیسہ بیگم اسے آوازیں دے رہی تھیں، اسے پتا ہی نہ چلا، ان کے برابر مسہری پر لیٹی تھی، بس چہرا دوسری جانب تھا، پتا چلتا بھی کیسے، کانوں میں ہینڈز فری اڑسے فل والیم پر گانے سن رہی تھی نا۔ اچھلی تو تب جب انہوں نے پاس رکھی اپنی سوٹی (چھڑی) اٹھا کر اس کی ٹانگوں پر زور سے ماری تھی۔

”او دئی، دادی۔“

وہ میکانکی انداز میں صرف پلٹی ہی نہیں بلکہ اٹھ کر بھی بیٹھ گئی۔ چہرے پر خفگی کا اظہار اور درد کی شدت واضح تھی۔ ہینڈز فری کی تار کھینچ کر کانوں سے نکالتے کہا۔

”دادی۔ کیا وا ہگہ بارڈر پر پیدا ہوئی تھیں، ہر وقت بمباری کر کے مخاطب کرتی ہیں۔ بھلا کوئی بات بندہ آرام سے بھی کہہ دیتا ہے، پر نہیں۔“ ٹانگ سہلاتے ہوئے روہانسی ہو گئی

”آوازیں ہی دے رہی تھی۔ لیکن مجھ بڑھیا کی آواز تم تک کیسے پہنچے، کانوں میں تو بہرے پن کے آلے فٹ کر رکھے ہیں نا۔“

اس نے شکایتی نگاہ سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

”نعت سن رہی تھی۔“

”پتا ہے مجھے کتنی نعتیں ہیں تمہارے موبائل میں۔ چھوڑو اب اس بات کو، یہاں آؤ، میرے پاس۔“

وہ نہ چاہتے ہوئے اٹھی اور دھپ سے ان کے قریب اتنی زور سے بیٹھی کہ نفیسہ کے جوڑ جوڑ ہل گئے تھے۔ ان کا شدت سے دل چاہا، اسے ایک سوٹی اور لگائی جائے مگر یتیم مسکین سمجھ کر معاف کر دیا۔ نوجوان لڑکوں کی چار پانچ تصویریں جو دادی بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھیں اس کے سامنے رکھ دیں۔ ربیکا کا حیرت کے مارے آنکھوں سمیت منہ بھی کھل گیا، کہاں دادی کی عمر، کہاں یہ نوجوان لڑکے، مانا انہیں کئی دن سے دادا بہت یاد آ رہے تھے، اٹھتے بیٹھتے ”اللہ بخشے تمہارے دادا۔“ کہہ کر شروع ہوتیں، صبح سلیپر ڈھونڈ کے دینے سے، کھانا پکانے، سبزی ترکاری، مہنگائی، شام کی چائے، اور رات کی بے وقت بجلی جانے پر ہونے والی تمام لڑائیاں دن میں کسی دوائی کی طرح تین بار دہرا رہی تھیں۔ اب تک تو اسے بچوشن ڈائیلاگز سمیت ازبر ہو چکی تھی، لیکن

یہ کہاں کی حکمت ہے اس یاد کو جوان لڑکوں کی تصویریں دیکھ کر بہلایا جائے وہ بھی رات کے اس پہر وہ ہکلا گئی۔

''دا...... دادی...... آپ...... پ...... رات کے وقت...... یعنی اس وقت۔ یہ کیوں دیکھ رہی ہیں۔ قسم سے بہت ہی عجیب لگ رہا ہے۔

نفیسہ بیگم کی بوڑھی ہوتی آنکھیں ہلکی سی چندھیائیں، سمجھ نہیں پائیں، بہت آرام سے سہہ لفظی وضاحت دی۔

''شادی کے لیے۔''

قریب تھا بے ہوش ہو کر گر جاتی، دادی نے مزید بم پھوڑنے شروع کر دیئے۔ ''یہ دیکھ یہ والا ڈاکٹر ہے، ذہن تو اعظم جیسا ہی ہوگا، بس عینک لگی ہوئی ہے، کوئی نہیں لینس لگا لے گا، باقی تو اچھا خاصا ہے، اس والے کا سپر اسٹور ہے، راجہ بازار میں، رنگ اعظم جیسا گورا ہے، مگر ناک چپٹی ہے اور یہ دیکھ۔''

اب سب سے نیچے والی تصویر نکالی اور توصیفی نگاہ و لہجے میں کہتے ''اس کی گارمنٹس کی فیکٹری ہے، چکلالہ اسکیم میں بنگلہ بھی اپنا ہے، نین نقشہ گزارے لائق ہے ہی، گزر ہو جائے گا گزارا، اعظم نے بھی تو کاٹ ہی لیا اپنی نکٹی چپٹی عورت کے ساتھ وقت۔''

ربیکا صدماتی کیفیت میں دادی کا اعظم نامہ سنتی سر ہلاتی رہی۔

''پھر کون سا زیادہ اچھا ہے؟''

دادی کے سوال کے جواب میں اس نے یکسر الگ سوال ہی کیا۔

''یہ سب بھی راضی ہیں، شادی کرنے کے لیے؟''

''ظاہر ہے۔ تب ہی تصویریں ماؤں نے رشتے والیوں کو دی ہیں۔'' دادی نے مزید بتایا۔ ''سعیدہ کو میں نے کہہ دیا تھا، اچھی طرح دیکھ بھال کر سوچ سمجھ کر فیصلہ کر دوں گی۔''

ربیکا الجھن کا شکار تھی۔

''دادی عمران خالو راضی ہو جائیں گے اور دادا۔ ان کو برا نہیں لگے گا۔''

دادی کو اس کی ذہنی حالت پر شبہ ہوا تھا، گھورتے ہوئے بولی تھیں۔

''اچھا، برا تانے کے لیے وہ بیٹھے ہیں یہاں؟ دنیا سے گئے دس سال ہو گئے انہیں، دس سال، کن خیالوں میں ہو تم۔''

''لیکن آپ کو یاد تو دس پل کی طرح آتے ہیں۔'' وہ شاک میں تھی۔

''دادا کو چھوڑ دو۔ یہ بتاؤ جو پوچھ رہی ہوں۔ اب بتاؤ کون سا اچھا ہے اس میں؟''

وہ کچھ توقف سے بولی۔

''دادی۔ عمران خالو، آسیہ خالہ کس کس کو جواب دیں گی۔ دادی یہ لڑکے آپ سے آدھی عمر کے ہیں، پلیز رحم کریں، میری سہیلیاں بھی مذاق اڑائیں گی، کچھ تو خیال کریں۔''

نفیسہ بوڑھی ضرور ہوئی تھیں لیکن پاگل نہیں تھیں کہ اب بھی ربیکا کی بات سمجھ نہ پاتیں، ان کی آنکھیں یک دم اتنی پھیلیں ماتھے کی جھریاں سر تک پہنچ گئیں، گال ٹھوڑی تک، اور شدت سے دل نے کہا تھا اب ربیکا پر سوٹی پڑنا واجب نہیں عین فرض ہے اور وہ کم از کم فرائض سے غفلت برتنے والوں سے نہیں تھیں، پھر کیا تھا جناب، کئی گھنٹے بیٹھ کر ربیکا نے اپنی کمر بازو کی ٹکور کی۔

کچھ وقت گزرنے پر جب ہڈیوں کو آرام ملا تو اس نے روتے ہوئے کہا تھا۔

''آپ نے کون سا کہا تھا، میری شادی کی بات کر رہی ہیں۔''

انہوں نے دانت جما کر استفسار کیا۔

''اپنا نام لیا تھا؟ جو فوراً میرے رشتے بنانے شروع کر دیئے؟''

دادی اپنی جون میں تھیں، ایک سوٹی اور لگائی۔

''سوری غلطی ہوگئی۔''

''دفع ہوجاؤ یہاں سے، بالکل اپنی خالہ پر گئی ہو، آدھی بات سنتی ہے، وہ بھی غلط۔''

''اچھا ناں، اب معاف کردیں۔''

''کردیا۔'' احسان جتا کر بولیں اور لیٹتے لیٹتے پھر سے پوچھا۔ ''اب بتاؤ کون سا پسند ہے؟''

وہ کچھ دیر تو انہیں شکوہ کناں انداز میں دیکھتی رہی، پھر بول ہی پڑی۔

''ہر ایک میں اعظم چچا کی خصوصیت گنوا رہی ہیں، اپنی تو ان میں ایک بھی نہیں۔ آپ جانتی بھی ہیں اعظم چچا کو اگر میں پسند نہیں تو مجھے بھی وہ قطعاً پسند نہیں۔''

''یعنی انکار کردوں آسیہ کو؟''

وہ فوراً سمجھ کر بولی۔ ''آسیہ خالہ کو کیوں، ان لڑکوں کو کریں، اگر خالہ کو کردیا، سڑک پر نکال دیں گی مجھ یتیم مسکین کو، ماں باپ مرگئے۔ بہن بھائی ہیں نہیں۔ جو مرضی آئے، لوٹ کا مال سمجھ کر اٹھا لے جائے۔''

''ہائے۔'' نفیسہ کے سینے پر ہاتھ پڑا تھا۔ یہی پتا تھا جو وہ دادی پر تاک کر پھینکتی تھی اور نفیسہ پوری کی پوری اس پر نچھاور ہوجاتی تھیں، اب بھی زور سے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

''یہ کیسے سوچ لیا تم نے۔ میرے جیتے جی کس کی اتنی جرأت ہے تمہیں گھر سے نکال سکے، اسے نہیں نکال دوں گی میں۔''

ساری رات دادی کی بغل میں لیٹ کر ہمدردیاں سمیٹیں اور ان کے دکھائے رشتوں سے جان خلاصی ہوئی۔ اب ایسا بھی نہیں تھا ربیکا کے من میں شادی کا لڈو کھانے کی خواہش نہ ہو، خواہش تو ایسی تھی کہ الامان۔ لیکن سہیلیوں کے قصے کہانیاں سن کر دل عجب سی فرمائش کرنے لگا تھا، شادی کے لیے ایک چھوٹا موٹا افیئر ضرور ہونا چاہیے لیکن اس کی زندگی میں دور دور تک ـــــ چانس بن نہیں رہا تھا۔

ایسا بھی نہیں تھا کہ ربیکا پیاری نہیں تھی، اگر حسن کے لیے سینہ کا لفظ فٹ کیا جائے تو ملکہ حسن تھی، لیکن رشتوں کے معاملے میں خالی دامن۔ فرسٹ کزنز کی اس نے شکل نہیں دیکھی تھی کہ ننھیال میں صرف ایک خالہ تھیں، آسیہ، جو بے اولاد اب اسی کی اماں کے فرائض انجام دے رہی تھیں۔

ددھیال میں، دو پھوپھیاں تھیں مگر ملک سے باہر اور تاحیات ان کا واپسی کا ارادہ نہیں تھا، انہیں فون پر خیریت پوچھتے ہوئے ہی پاکستانی مکھیاں مچھر کاٹنے لگتے تھے۔ گاڑی کا ٹائر پھٹنے کی آواز چوک تک جائے نہ جائے ان کے نیویارک میں ضرور جاتی تھی۔ بھلے وہاں پھوپھا کسی گورے کا کتا نہلا رہے ہوں، اسے شیمپو لگا چھوڑ کر پاکستان فون کر کے یہ پوچھنا نہیں بھولتے تھے، کتنے لوگ مرگئے، کتنوں کا چانس ہے، ایک واحد چچا تھے، جن کا ذکر دن میں گھڑی کی سوئیوں کی طرح دادی کے منہ سے سنتی رہتی تھی، مگر انہوں نے اپنا رخ روشن کبھی دکھانا پسند نہیں کیا تھا، سنا تھا ان کے دو تین بچے ہیں، اب ٹوٹل کتنے ہیں کہاں اور کیسے ہیں، یہ کسی کو نہیں معلوم تھا۔ ربیکا ہی اتنی بڑھ چکی تھی، کبھی ربیکا کے متعلق نہیں پوچھا تھا۔ آخر بھائی کی اولاد ہے، ماں باپ کے بعد گئی کہاں۔

☆☆☆

اڑوس پڑوس میں اس کا جانا منع تھا، اگر کبھی چلی جاتی تو دادی ساتھ ساتھ ہوتیں، اس کی طرف پیش قدمی کرنے کا سوچنے سے بھی پہلے دادی کی میزائل جیسی آنکھیں نظر آجاتی تھیں، کئی فٹ دور سے ہی لڑکے ہدف سے رخ بدل لیتے، اسکول کالج میں تو لڑکیوں کے جمگھٹے میں رہی، کسی سہیلی کا بھائی قابلِ بھروسہ نہیں تھا۔ کمسنی عمر میں بڑے ہوکر بھی اسے ''آپی آپی'' کہتے تھے۔ وجہ دادی ہی تھیں جو سہیلی کے گھر تک ساتھ ساتھ جاتی تھیں، یونی میں کوئی چانس بن سکتا تھا، ڈاکٹر انجینئر بننے کا اسے قطعاً شوق نہیں

تھا، ذہنی صلاحیت ہی کم تھی، بس فرسٹ ڈویژن لینا تھی۔ کسی طرح اتنا گریڈ بن جائے کہ یونی میں باآسانی داخلہ مل جائے، وہ مرحلہ بھی طے تو ہوا مگر اس کی مراد بر نہ آئی، دادی نے ایڈمیشن پراسپکٹس آنے سے پہلے ہی عمران خالو کو کہہ دیا۔

"وہ جو اسلامیات یونی ورسٹی نہیں ہے۔"

عمران خالو حیرت زدہ ہوئے۔ "اسلامیات یونی ورسٹی۔ یہ کون سی یونی ورسٹی بنی ہے، مجھے تو نہیں پتا۔"

"پھر دینیات ہوگی۔"

دادی کے فوراً کہنے پر خالو الجھن میں تھے مگر دادی نے ہی الجھن حل کردی۔ "وہی جو عربیوں نے بنوائی ہے۔ لڑکے لڑکیوں کی الگ الگ۔ جس کا ہیڈ کہہ رہے تھے کوئی عربی ہے، منہ پر جو مرضی کہہ دو، سمجھ میں نہیں آتی جسے۔ وہ لمبی گاڑی والا۔"

دادی تو جانے چانسلر کی کتنی نشانیاں یاد کرواتیں، خالو نے دونوں ہاتھوں سے انہیں بریک لگائی۔

"ہاں ہاں۔ آپ اسلامک یونیورسٹی کی بات کررہی ہیں۔"

"ہاں۔ وہاں داخلہ کروادو اپنی ربیکا کا۔ جوان جہان ہے، کیا ضرورت ہے لڑکوں کے ساتھ پڑھنے کی۔"

لو جی آخری امید بھی دم توڑ گئی۔ چاہتی تو وہ رونا دھونا مچا کر وہاں داخلہ رکوالیتی مگر کوئی خاطر خواہ بہانہ نہیں مل رہا تھا، جتنی بھی سرچڑھی سہی مگر اتنی نہیں تھی کہ یہ کہہ دیتی۔

"بھئی سیدھی صاف بات ہے لڑکوں کے ساتھ پڑھنا ہے، جینے کے لیے ـــــ دل بہانہ مانگتا ہے۔"

ایسا ٹرک چھاپ بہانہ مانگنے پر دادی اس منگتی کے ہاتھ پیر توڑ کر باقاعدہ کسی چوک پر بیٹھا دیتیں، اس لیے ربیکا نے دادی کی معلومات پر آٹھ دس حرف دل میں ہی بھیج کر داخلہ لے لیا اور صرف تھکاوٹ اور جلد خراب ہونے کے سوا کوئی فائدہ نہیں ہوا، اتنی بڑی یونی، ایک ڈیپارٹمنٹ سے دوسرے تک جانے کے لیے دھکے بسوں ٹیکسیوں میں کھاؤ، نہیں تو پیسے بچالو، اور جلد زیادہ تلے پاپڑ جیسی کروالو، اللہ اللہ کر کے آخری سمسٹر تک پہنچی، اب لگ گئی خالہ اور دادی کو پیا دیس سدھارنے کی۔ نہ بھئی نہ۔ ایسے ہرایرے غیرے کا رشتہ کس دل سے قبول کرتی، دل تو گیا بھاڑ میں، دیکھا نہ بھالا، قربان جائے خالہ، بلکہ دادی۔

اُس نے انکار کیا، دادی نے اعلان۔ ایسا رشتہ دیکھا جائے جس کی اعظم سے ذرا شباہت نہ ہو، کیوں کہ اس کے انکار میں جو بات دادی ـــ کی سمجھ میں آئی وہ شاید چچا کے لیے دل میں گرہ تھی، گرہ بھی اپنی جگہ درست تھی، اچھے بھلے سے پڑ جاتی ہے، کیا جاتا اگر عید بقر عید پر ہی ملنے آجاتا، لیکن ربیکا کو آج تک وہ وجہ پتا نہیں چلی جس سے گرہ مشین کی سلائی سے زیادہ پائیدار ہوچکی تھی۔

☆☆☆

آسیہ نے سنا وہ تو حیران رہ گئیں، کہ ایسا رشتہ وہ بھلا کیسے ڈھونڈیں نفیسہ کو تو ہر اچھے شخص میں اعظم کی کوئی نہ کوئی خوبی جھلکتی محسوس ہوتی ہے۔ نفیسہ کے بغیر وہ فیصلہ نہیں کرسکتی تھیں، اعظم کوئی ایسی ملکوتی شخصیت نہیں تھی جس میں ہر خوبی پیدائشی موجود ہو۔ بلکہ آسیہ تو دل سے ہی نہیں زبان سے بھی اکثر کہتی تھیں۔

"مجھے تو ان میں نہ کل کوئی خوبی دکھائی دیتی تھی نہ آج۔"

عمران کیا ہر دوسرا شخص یہی بات کہہ سکتا تھا سوائے نفیسہ کے، کیوں کہ ان کا مسئلہ بڑا عجیب سا اور برسوں پرانا تھا۔ جب عمران اور اعظم ایک ہی اسکول، ایک ہی کلاس میں تھے، بہت محنت کرنے کے باوجود عمران کبھی پہلی پوزیشن پر نہیں آسکے۔ ہر رزلٹ پر نفیسہ کی ٹیچرز کے ساتھ اچھی خاصی منہ ماری ہوجاتی اور ٹیچرز کا ایک ہی جواب۔

"بے شک عمران لائق ہے، مگر اعظم امتحانوں میں زیادہ محنت کر لیتا ہے، اب ہم کیا کر سکتے ہیں۔"

نفیسہ کو اس کی بات سے قطعاً اتفاق نہیں تھا بڑبڑاتی ہوئی گھر آ گئیں۔

"سفید جھوٹ بول رہی ہے، میرے عمران سے زیادہ محنتی تو نہیں ہو سکتا، یقیناً ٹیوشن پڑھتا ہوگا، مس کے پاس، یا بوٹیاں لے جاتا ہوگا، ہے تو پیدائشی ہوشیار۔"

ایک بار کسی اخبار میں بچوں کی تصاویر پر مقابلہ ہوا تھا، خوب صورت بچے کو انعام دیا جائے گا، ہر ماں کی طرح نفیسہ نے بھی عمران کی تصویر فوٹو گرافر سے بنوا کے ادارے کو بھیجی۔ انعامی نتائج میں جب اعظم کا نام پڑھا، کتنی دیر تو سکتہ ہی نہیں ٹوٹا، ہر ہر زاویے سے تصویریں چیک کی۔ ہر بار عمران سب سے زیادہ خوب صورت محسوس ہوا۔ ادارے والوں کو تا حیات موتیا اترنے کی بد دعائیں دیتی، اخبار پڑوسن کے پاس لے گئیں، ہم خیال مل جائے تاکہ اجتماعی بھڑاس نکلے، اس نے بھی شاید قیاس لگایا، یا ہو سکتا ہے اس وقت اعظم واقعی خوب صورت ہو، عمران کی تصویر کو پڑوسن نے یہ کہہ دیا۔

"عمران سب میں پیارا تو لگ رہا ہے، لیکن بھنویں اس والے بچے کی (اعظم پر انگلی رکھ کر) ناک بہت تیکھی ہے، گال ذرا بھرے بھرے ہیں۔"

اس وقت عمران دبلے بچوں میں تھا۔ اعظم اچھا خاصا بھاری بچہ تھا، دل کے لاکھ انکار کے باوجود ایک گرہ پڑ گئی اعظم خوب صورت بھی ہے، وقت کچھ گزرا اعظم کا اسکول کسی بھی وجہ سے تبدیل ہوا اسی سال عمران کلاس میں اول آ گیا، وجہ جو بھی تھی، لیکن نفیسہ کو نا چاہتے ہوئے بھی یقین سا آ گیا۔ وہ منحوس نکلا تو میرا بیٹا فرسٹ آیا، جانے ماں نے کیا کھا کر پیدا کیا، ہر معاملے میں ہی آگے۔

☆☆☆

اعظم دور پار کے کسی گھر ایک ہی خاندان کے تھے، کوئی خیر خبر مل جاتی تھی۔ ان دنوں نفیسہ اپنے بیٹے عمران کی دلہن دیکھنے میں سرگرم تھیں، کہ اعظم کی منگائی بھی آ گئی، پھر تو جیسے اندر کا یقین پختہ ہو گیا کہ، اعظم خوب صورت، اعظم، ذہین، اعظم خوش قسمت، مانا وہ قبول صورت انسان تھے لیکن اب ایسا بھی نہیں تھا کہ دنیا کا پہلا اور آخری شاہکار ہو، اور یہ بات اکثر ہی آسیہ جتا بھی دیتیں۔ ان کی بہن کے جیٹھ تھے، کئی رنجشیں ایسی پڑی تھیں سب کی نگاہ میں ان کی خوب صورتی۔ ہوا ہو گئی سوائے نفیسہ کے، لیکن جب اندازہ ہوا ربیکا کو چچا پسند نہیں تو رشتہ ڈھونڈنے کے لیے نفیسہ کو خود پر کنٹرول کرنا تھا، جو بہت مشکل لگ رہا تھا۔

☆☆☆

موسم کافی اٹھکیلیاں کر رہا تھا، ٹھنڈی ہوا بادلوں کو اڑاتی ادھر سے ادھر آسمان پر پھیلنے سمیٹنے کا کام کر رہی تھی، ربیکا کا شدت سے دل چاہا، آج شکر پڑیاں جایا جائے۔ خالو سے کچھ دن پہلے بھی ذکر کیا تھا، لیکن ان کی وہی لگی بندھی روٹین "ہاں ہاں چلیں گے" ان کی ہاں، ہاں ہی نہیں ہو رہی تھی، آج موسم دیکھ کر آسیہ خالہ سے فرمائش کی۔

"خالہ۔ کہیں آؤٹنگ پر چلیں۔"

"گھر گرد سے اٹا پڑا ہے، تمہیں آؤٹنگ کی پڑی ہے۔"

وہ گھر ہی چمکانے میں لگی رہیں، بہت سوچنے کے بعد کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو دادی کے پاس بیٹھ گئی، ایک آدھ ہی درست بات کی ہوگی، پھر ہونقوں کی طرح انہیں دیکھ کر کہنے لگی۔

"دادی! آپ کی طبیعت ٹھیک ہے، دل تو نہیں گھبرا رہا آپ کا۔"

"ہاں اللہ کا کرم، ٹھیک ہوں، بالکل نہیں گھبرا رہا۔"

رسالہ پڑھتی دادی نے رخ موڑ کر دوسری جانب کر لیا، ربیکا ادھر کو کھسکی، ہاتھ سے رسالہ لے لیا۔

"کوئی ٹریجڈی ناول پڑھ رہی ہیں، کیا؟"

https://www.readingbooks.com

''نہیں۔ ضرورت سے زیادہ ہی رومانٹک ہے۔''

''ہائے میں مر گئی۔۔''

اس نے کہتے ہوئے رسالا اچک لیا۔ ''مت پڑھیں، رومانس پڑھتے ہوئے رنگت سرخ ہونے کے بجائے اس قدر پیلی۔ اُف، آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی، یہ دیکھیں، یہ دیکھیں۔'' ان کی کن پٹی پر ان کی انگلی رکھتے کہا تھا ''کیسے پھڑک رہی ہے رگ۔''

''زندہ ہوں تو رگیں پھڑکیں گی، مری تھوڑی ہوں، چل ہٹ، اپنا کام کر۔''

دادی نے اس کا ہاتھ ہٹا کر، رسالہ لینا چاہا مگر وہ ربیکا کیا جسے وہم ڈالنے میں کمال نہ ہو۔ جب وہم ڈالنے پر آئے تو اس قدر ڈال دے بندہ ایمان کی حد تک یقین لے آئے۔ پچھلے سال کی بات تھی، نفیسہ کو فوڈ پوائزننگ ہو گئی تھی صرف ایک دن طبیعت خراب رہی تھی۔ اگلے دن ربیکا کے دماغ نے ایسا کام کیا، حقیقت پتا چلنے پر دادی اس کی تخریبی ذہانت کی قائل ہو گئی تھیں۔ حالانکہ اس نے صرف اتنا کہا تھا۔

''دادی، قے کے ساتھ، آپ کو چکر بھی آ رہے ہیں ناں، اور پیٹ میں درد بھی۔''

نفیسہ نے نقاہت سے اثبات میں سر ہلایا، اور ربیکا نے پوری آنکھیں پھاڑتے تاسفانہ ہوکا بھرا۔ ''یہ تو کالے یرقان کی علامتیں ہیں، پیٹ میں ہی تو جگر ہوتا ہے، اس میں درد ہو رہا ہے آپ کے۔''

دادی نے لاحول پڑھتے اسے گھورا، وہ پورے وثوق سے بولی۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں، دادی۔ پچھلے ہفتے آپ کو بخار بھی ہوا تھا۔ یاد کریں۔''

نفیسہ سوچ میں پڑ گئیں، اس نے مشورہ دے دیا۔ ''میری سہیلی ہے ناں، وہ سدرہ ایبٹ آباد والی، وہ بتا رہی تھی، وہاں ایک حکیم ہیں، بہت پکا علاج کرتے ہیں یرقان کا، شہر کے ڈاکٹروں کی طرح تھوڑی، ٹیسٹوں میں ہی بندہ پھڑکا دیں۔ میری مانیں کھلی فضا میں ہوا بدل بھی ہو جائے گی، علاج بھی، کچھ زیادہ فیس نہیں ہے اس کی۔''

''نہ نہ۔'' نفیسہ سوچ کر بولیں۔ ''عمران حکیموں کو نہیں مانتا، ڈاکٹر کے پاس ہی چلی جاؤں گی۔''

ربیکا نے منہ بگاڑ کر کہا۔

''ہائے بھولی دادی، خالو کیوں مانیں گے، وہ تو چاہتے ہوں گے ان کی بیوی پر ہر وقت کی پہرے داری ختم ہو۔ چھوڑیں آپ خالو کو۔ کسی بہانے سے ادھر چلتے ہیں۔ اگر زیادہ حالت بگڑ گئی، حکیم جی بھی جواب دے دیں گے۔''

لو جی کیا کرنا تھا، نفیسہ کو تو یقین ہو گیا ان کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے، الٹی بعد میں آتی جگر میں درد پہلے محسوس ہوتا، بہو بیٹا کیوں چاہیں گے میں ٹھیک رہوں، انہوں نے بہو بیٹا کی ٹیسٹ، لیبارٹری، ڈاکٹر کچھ نہیں مانا، اپنی منوا کر، ربیکا کو ساتھ لیے سدرہ کے گھر چل پڑیں۔ وہاں چار دن رہے، جانے کسے حکیم بنا کر دوا دلاتی، کیلشیم کی گولیاں، ہاضمے کی پھکی، دادی کو پھنکواتی، وہ تو دادی نے اسے سدرہ سے باتیں کرتے سن لیا۔

''یار! مجھے ایبٹ آباد دیکھنے کا بہت شوق تھا، اگر دادی کو وہم میں نہ ڈالتی یقین مانو، دنیا سے یوں ہی رخصت ہو جاتی بنا یہ فضائیں دیکھے۔''

یہ سننے کی دیر تھی، دادی نے مہمان داری کا بھی خیال نہیں کیا، اور اپنی چھڑی سے اس کی ایسی دھنائی کی تھی کبھی مشین والے نے روئی بھی ایسی نہیں دھنی ہو گی، اسی دن اسے لے کر گھر آ گئیں لیکن یہ دادی کا کم ظرف تھارات گئی بات گئی، جلد ہی بھول گئیں۔ ایک عرصہ گزر جانے کے بعد آج پھر اپنی اسی تخریبی صلاحیت کو بروئے کار لاتے، بھرپور وثوق سے بولی۔

''لگتا ہے، آپ کا بی پی، شوگر کچھ گڑبڑ کر رہا ہے، آرام کریں یا ایسا کریں، ڈاکٹر کو چیک کروا لیں۔''

اس کی بات پر نفیسہ کو شبہ سا گزرا، ایسے لگا جیسے طبیعت صبح سے بوجھل سی تھی، سر میں درد، متلی کی کیفیت بلڈ پریشر کی مریضہ تو بہت عرصہ سے تھیں۔ عمران نے بی پی آپریٹس ان کی وجہ سے مستقل گھر میں رکھا ہوا تھا۔ آسیہ باقاعدگی سے ان کا بی پی چیک کرتی تھیں، انہوں نے آسیہ کو آواز دے کر بلایا کہ آکر چیک کرلیں، ربیکا نے بہت منع بھی کیا آواز دینے سے مگر دادی کو اپنی صحت کی پڑ گئی تھی، جب آسیہ نے چیک کر کے بتایا۔

''امی بالکل نارمل ہے، ویسے ہی طبیعت بوجھل ہو رہی ہوگی''

جانے کیوں انہیں یقین نہیں آیا، مسلسل چکر سے محسوس ہو رہے تھے، ان کے اٹھ جانے کے بعد، اپنی تسلی کے لیے ربیکا سے پھر چیک کروایا۔

''ربیکا تم چیک کرو، کیا پتا ساس کو ٹھکانے لگانے کی خواہش میں آسیہ کمی بیشی بتائے ہی نا۔''

وہ ربیکا تھی، ایک نمبر کی ڈرامے باز، جس کا اپنا دل آج باہر جانے کو کر رہا تھا، چلو کسی پارک میں نہ سہی بندہ ہاسپٹل کا چکر ہی لگا آئے۔ اللہ کی رنگ برنگی دنیا دیکھنے کو ملے گی، استغفار کے ساتھ خود پر شکرانہ الگ۔ اس نے پوری ہمدردی دکھاتے ہوئے بی پی چیک کرنا شروع کیا، ہلتی سوئی دیکھ کر چہرہ ایسا بنا لیا جیسے خدانخواستہ نفیسہ، ہارٹ اٹیک کے قریب ہوں۔

''اف دادی۔ کیا کھایا ہے آپ نے؟''

اس نے اسٹیتھو اسکوپ اتارتے، آپریٹس کی بیلٹ کھولی ''اتنا زیادہ ہائی، ضرور کچھ غلط کھایا ہے آپ نے۔''

اتنی سنگین صورت حال میں بھی نفیسہ نے ہر چیز گنی جو آج کھائی تھی۔

''بریڈ کے دو پیس، فرائی انڈا، لیکن وہ تو آدھا کھایا تھا، چائے میں ملکی گر گئی تھی، دوبارہ میرا دل نہیں کیا، ہاں لسی۔''

اور کچھ یاد آیا کہ نہیں وہ لسی یاد آ گئی جو آسیہ نے کچھ گھنٹے پہلے بنا کر پلائی تھی۔

''مجھے تو پہلے ہی شک تھا، جو یہ بار بار کہہ رہی ہے امی پی لیں، پی لیں۔ اس میں کچھ ملایا ہوگا، اوپر سے بی پی کہہ رہی ہے ٹھیک ہے۔ وہ کیوں چاہے گی میں ٹھیک ٹھاک رہوں۔''

''چہ چہ چہ۔ بس دادی قسمت سے ملتی ہیں اچھی بہوویں بھی۔''

وہ پوری نفیسہ کی ہمدرد بنی ہوئی تھی۔ ''لیکن بے فکر رہیں، آپ کی پوتی ابھی آپ کے پاس ہے، اگر آپ کو چیونٹی نے بھی کاٹا، اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی، میں آپ کو ابھی اسی وقت ڈاکٹر کے پاس لے کر جاتی ہوں، دیکھتی ہوں کون روکتا ہے۔ اٹھیں شاباش۔''

نفیسہ کو سوچ میں پڑتے دیکھ کر ربیکا کو اپنا مشن کامیاب ہوتا نظر آیا۔ ربیکا جھٹ سے۔ تیار ہو کر سامنے کھڑی ہو گئی، آسیہ کو پتا چلا تو دوڑے ربیکا کے۔

''شرم نہیں آتی دادی کو وہم میں ڈالتے۔ اوپر سے مجھے بدنام کرتی ہو۔''

''وہم تھوڑا ڈال رہی ہوں۔ سات آٹھ سو سے اوپر جا رہا ہے، ان کا بی پی۔ اب بھی ڈاکٹر کے ہاں نہ لے کر جاؤں۔''

''ہیں ل ل ل۔''

دادی کی آنکھیں کم نکلیں آواز زیادہ اور رسالا اٹھا کر ربیکا کے دے مارا۔ ''غضب خدا کا، اتنا جھوٹ، دو سو ہو جائے تو میرا دماغ پھٹنے کو ہو جاتا ہے، سات آٹھ سو۔ کبھی سنا بھی ہے کسی کا تم نے۔''

''اچھا! تھوڑا کم کرلیں، پانچ، چھ سو ہو رہا ہوگا، مگر ڈاکٹر کے پاس تو چلیں۔ علاج نہیں کروائیں گی کیا۔''

''کرواؤں گی، مگر تمہارے دماغ کا۔''

اب کے دادی نے ہاتھوں کے بجائے چھڑی سے کام لیا تھا، چھڑی پڑتے ہی وہ رونے کی اداکاری کرنے لگی، دادی کا دل پگھل گیا۔

"باہر جانے کو دل کر رہا ہے، تمہارا؟"
اس نے زور و شور سے سر ہلایا تھا۔
"پھر اس کے لیے ضروری ہے، میرے لیے ایمبولینس منگواؤ، کہہ نہیں سکتی تھیں سڑکیں ناپنے کو جی چاہ رہا ہے۔"
"کہا تھا آپ کے بیٹے اور بہو سے، صاف انکار کر دیا، مصروف لوگ ہیں بھئی، مجھ یتیم مسکین کے لیے کہاں سے وقت لائیں۔ میرے کون سا اماں ابا بیٹھے ہیں، جو فرمائش پوری کریں۔"
دنیا کا مظلوم ترین انداز بنا کر ایسا درد لہجے میں سمویا تھا، ہٹلر بھی سن لیتا تو رونے لگ جاتا۔
"ہائے۔" دادی کا دل پسیج گیا سوچنے میں لمحہ نہیں لگایا، مسہری سے اتر کر جوتا پہنا، پرس اٹھایا۔
"چلو پھر چلتے ہیں۔"
"کہاں؟"
ربیکا نے ایسے دادی کو دیکھا جیسے اس کی تو سمجھ میں ہی نہ آیا ہو۔
"ہائے میری بچی، جہاں تمہارا دل کر رہا ہے، بتاؤ، میں لے چلتی ہوں۔"
دل تو اس کا کر رہا تھا، ایبٹ آباد، ٹھنڈیانی جائے، واپسی پر سرینہ سے ڈنر کرے، سینچوریس سے شاپنگ کر کے گھر واپس آئے، لیکن اسے بہت اچھی طرح اندازہ تھا، دادی افشاں کالونی کی گلیوں میں گھما کر، نکڑ والے کے گول گپے کھلا کر واپس لے آئیں گی۔ اس وقت جتنا شدت سے باہر پھرنے کو دل کر رہا تھا یہ بھی چلے گا، وہ فوراً دوپٹا اوڑھ کر دادی کے ساتھ ہی باہر نکل گئی۔ خالہ آسیہ گھورتی رہ گئیں۔

☆☆☆

موسم کی اٹھکیلیاں جاری تھیں، سورج ذرا عمارتوں کے پیچھے کیا ہوا، مارگلہ ہلز سے ٹکرا کر آتی ٹھنڈی ہوا نے گلیوں میں چہل قدمی کا لطف بھی دوبالا کر دیا تھا، پھر کیا تھا علاقے کی سڑکیں تھیں اور ربیکا اور دادی۔ دادی نے اسے بیکری سے ایک کارنیٹو لے دی تھی اور وہ چھوٹے سے بچے کی طرح زبان سے چاٹتی ایک گلی سے نکل، دوسری گلی۔ سڑک پر چڑھ فلائی اوور سے پھر نیچے، بنا مقصد کے سڑکوں پر پھرنے کا لطف اسے پہلی بار پتا چلا تھا، دادی کو بھی اس سیر گشت میں خوب لطف آیا ہے، سورج ڈھل جانے کے بعد بھی لگتا نہیں تھا کہ واپسی کا ارادہ رکھتی ہیں۔

☆☆☆

آفس میں کلوزنگ چل رہی تھی، وہ تھکا ہارا گھر میں داخل ہوا ہی تھا، ندا جو بہت دیر سے اس کے آنے کی منتظر تھی اسے دیکھتے ہی کھل گئی، ٹھنڈا پانی دے کر ہی فوراً چائے بنا لائی تھی، کمال یہ تھا چائے کے ساتھ پکوڑے بنا رکھے تھے۔ بہن سے ایسی خاطر مدارت کی توقع عام حالات میں کم از کم بسیم نہیں کر سکتا تھا۔ بسیم نے پہلے چائے اور لوازمات پھر اسے دیکھا تھا۔
"خیریت؟"
"کیا مطلب ہے۔ میں اپنے بھائی کی خدمت نہیں کر سکتی۔"
اس کے نروٹھے پن پر بسیم لگی لپٹی رکھے بغیر بولا۔
"مہینے کا آخر چل رہا ہے، ایکسٹرا پیسے ویسے ہی نہیں ہیں میرے پاس۔"
ندا نے شکوہ بھری نگاہ سے بچوں کی طرح اسے دیکھا تھا
"اکلوتی بہن ہوں میں آپ کی۔ اگر کوئی چھوٹی موٹی چیز مانگ لیتی ہوں، اس کے بھی طعنے دیتے ہیں۔ ٹھیک ہے، دے دیں یہ، واپس۔"
پکوڑوں کی پلیٹ جو اس نے ابھی تھمائی ہی تھی فوراً سے جھپٹی، بسیم نے بچاؤ کے لیے ہاتھ پیچھے کیا۔
"ارے ارے، اتنی بے مروتی، چکھنے تو دو۔"
پلیٹ چھوڑ کر اس کے کندھے پر جھول گئی۔
"اتنی گرمی میں، میں نے آپ کے لیے پکوڑے بنائے، آپ مجھے ایک سینڈل نہیں

دلا سکتے۔"

"ابھی پچھلے مہینے تو لیا تھا نیا جوتا۔"

روٹھی ہوئی بہن کو کلائی سے پکڑ کر سامنے کیا اور بولا۔ "کیا ہار بنانا ہے؟"

"پلیز۔" وہ منمنانے لگی۔ "سدرہ کی شادی پر بھی وہی پہن لوں گی اور میں کون سا کوئی اتنا مہنگا لے رہی ہوں، میٹرو پر فنفٹی پرسنٹ سیل لگی ہے۔"

اس نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"امی سے پوچھ لیا؟"

امی کے ذکر پر اس کی ناک نخوت سے سمٹ گئی۔

"ان سے پوچھتی ہے میری پیدائش سے لے کر اب تک کے سارے جوتے یاد کروا دیتیں، یہ پہن لے وہ پہن لے۔ ہماری امی کبھی بھول نہیں سکتیں کسی چیز کو۔"

امی کی نقل پر بسیم کو اچھو لگا تھا، اس نے کپ نیچے رکھتے ہی زور سے ہانک لگائی تھی۔

"امی۔"

"امی کو کیوں بلا رہے ہیں۔"

وہ اسے روکتی رہ گئی اور شاکرہ فوراً آ گئیں۔

"کیا ہے، اتنی زور سے چلا رہے ہو، جیسے پڑوس سے آنا ہے مجھے۔"

وہ اپنی مبہم سی ہنسی دباتے، معصومیت سے بولا۔

"ایسے چاہئیں۔"

شاکرہ کے پیچھے کھڑی ندا اشاروں سے بھائی کو منع کر رہی تھی مگر وہ دیکھتے ہوئے جان کر انجان بن گیا۔

"کیوں۔ خیریت ابھی تو آئے ہو، آفس سے۔ کیا لینا ہے؟"

"جوتا۔"

ندا کے اشارے اچھلنے کی حد تک تیز ہو گئے تھے۔ اسے یقین تھا اب امی انہی جوتوں سے اس کی مرمت کریں گی، جو اس نے ڈھیر لگا رکھے تھے۔

"دو تین بوٹ تو ہیں، تمہارے پاس۔ کسی اور موقعے پر لے لینا۔"

"میرے پاس۔ بوٹ تو۔۔۔ ہیں۔"

وہ رک رک کر بولا، اور ندا اشاروں سے معافیاں مانگتی اسے چپ کروا رہی تھی۔ "لیکن سلیپر ٹوٹ گیا ہے، فارغ بیٹھا ہوں، میں نے سوچا لے آتا ہوں۔"

ندا کا رکا سانس بحال ہوا اور آنکھوں میں پیار بھری خفگی بھی، دور دور سے بلائیں لیں۔

"حد کرتے ہو بسیم۔۔ تمہارے والٹ میں دو تین سو نہیں ہیں۔ بچوں کی طرح مانگ رہے ہو۔"

والٹ کھول کر جھانکتے بسیم کے چہرے پر لطف اندوز سی مسکراہٹ تھی، تسلی کرتے ہوئے اٹھا۔

"ہاں ہیں تو۔" پھر ندا کو دیکھ کر کہا۔

"چلو۔ تمہیں بھی بائیک کے جھولے دے لاؤں۔ کیا یاد کرو گی۔"

وہ دوپٹا لپیٹ آگے آگے تیار تھی، شاکرہ اسے روکتی رہ گئیں۔

"اسے کہاں لے جا رہے ہو، ہنڈیا، تمہارے ابا بنائیں گے۔"

انہوں نے پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا، شاکرہ بڑبڑا کر رہ گئیں۔ "ماں ایک روبوٹ ہے ناں، باپ نے لا کر چھوڑ دیا گھر میں، ٹکرائی جاؤں چیزوں کے ساتھ۔" اپنے مخصوص انداز میں بڑبڑاتے جلتی کلستی کچن کی جانب بڑھیں۔

☆☆☆

آج دادی پھر سے فل موڈ میں تھیں، ٹیکسی کروا کر صدر لے گئیں، ان کی ٹیکسی میٹرو سے کچھ فاصلے پر رکی تھی، وہاں اچھا خاصا رش دیکھ کر ریکانے پوسٹرز غور سے پڑھے۔

"میٹرو پر فنفٹی پرسنٹ ڈسکاؤنٹ۔ واہ۔"

"ہر چیز کو دیکھ کر، رال نہ ٹپکا لیا کرو، حوصلہ رکھا کرو، ابھی بڑی زندگی پڑی ہے۔"

"دادی۔۔"

https://reading...

ربیکا کا منہ لٹک گیا۔ "سدرہ کی شادی آرہی ہے، اگر ننگے پاؤں جاؤں گی لوگ یتیم سمجھ کر چندہ دینے لگیں گے۔"

نفیسہ گھور کر بولیں۔

"پہلے تو جیسے تم چندے پر پل رہی ہو۔ میرے پرس میں صرف ہزار بارہ سو ہیں، چلو شاباش گھر۔"

"اب ایسی بھی بات نہیں ہے دادی۔"

اس نے صفائی پیش کی۔ "دیکھنے میں کیا ہرج ہے، اگر مہنگا پسند کروں، آپ ہلکا سا کھنکھار دینا، یا کہنی مار دینا، میں سمجھ جاؤں گی۔ پیسے نہیں ہیں۔"

"اچھا۔"

جس انداز میں نفیسہ نے کہا تھا، اسے اچھا خاصا شرمندہ ہونا چاہیے تھا مگر وہ ڈھیٹ بنی ہنستی رہی۔ "تمہارے سامنے بندہ کھانس کھانس کر مر جائے، مجال ہے تمہاری سمجھ میں آجائے۔ تمہیں کہنی نہیں سوئی سمجھ میں آتی ہے اور آج میں سوئی گھر بھول آئی۔"

"دادی۔"

وہ لاڈ سے ان کا بازو کھینچتی، شاپ میں داخل ہو ہی گئی تھی۔

☆☆☆

مخصوص ریکس اور اسٹالز پر سیل کے جوتے لگے تھے، آج پہلا دن تھا اور خواتین کی ایسی بھرمار تھی اچھے بھلے بندے کا سانس رک جائے۔ دادی پھر بوڑھی، لیکن ربیکا کی خوشی کی خاطر میدان۔ نہیں دکان میں کود پڑیں، ربیکا کے ہاتھ میں پکڑی پانی کی بوتل سے دو گھونٹ پی کر تازہ دم ہوئیں اور اس بھیڑ کا حصہ بن گئیں۔ ربیکا جوتے دیکھ رہی تھی، دادی ساتھ ساتھ قیمت، ربیکا نے دو تین جوتے پاؤں میں پھنسا کر دیکھے، پسند نہیں آئے پھر ریک سے ایک نگوں والی سینڈل اٹھا کر دیکھی وہ اچھی لگ رہی تھی پہننے میں پوری بھی تھی۔ اس نے وہ اتار کر پاس رکھی، ایک اور اٹھا کر پہننے لگی، ندا بھی ان ہی اسٹالز پر جوتا پسند کر رہی تھی، بسیم اس کے ساتھ ذرا پیچھے تھا، نگوں والی سینڈل جو ربیکا نے اٹھا کر پاس رکھی ہوئی تھی، ندا نے اپنے پاؤں میں پہنی، اسے وہ بہت پسند آئی تھی، پاس کھڑے بسیم کی رائے لے کر، ربیکا سے پوچھا تھا۔

"ایکسکیوزمی، اگر آپ نے یہ نہیں لینی تو میں لے لوں، مجھے یہ بہت پسند آئی ہے۔"

ربیکا نے ندا کو کم بسیم کو زیادہ دیکھا تھا، ہینڈسم، اسمارٹ اور ڈیشنگ۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی جوتوں کی سیل میں ایک عدد ہیرو بونس میں مل جائے گا۔ اس کے خیالوں میں ڈوبے اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس سے پہلے کہ اس کے لبوں کو گویائی ملتی، دادی نے سینڈل ندا کے ہاتھ سے جھپٹنے کے انداز میں واپس لی۔

"ایہہ۔ کیوں نہیں لیتی، میری پوتی کو پسند ہے، تب ہی پاس رکھی ہے۔"

"اماں جی آپ چھین کیوں رہی ہیں، آرام سے لے لیں۔"

بسیم کی آواز پر جہاں وہ خواب نگری سے باہر نکلی وہاں "اماں۔" کہنے پر نفیسہ اچھی خاصی خفا ہوئی تھیں۔

"اتنی عمر نہیں ہے، میری جتنی لگتی ہوں۔ پانچ چھ نہیں تو دس سال ہی بڑی ہوں گی تم سے، کس رشتے سے اماں بنا دیا۔"

بسیم کی آنکھیں پھیل گئیں، دادی کی قیامت خیز خوش فہمی پر ربیکا کا منہ کھلا رہ گیا۔ انہیں مزید کچھ کہنے کے بجائے، بسیم نے ندا کا بازو پکڑا تھا۔

"چلو، کہیں اور دیکھ لیتے ہیں۔"

"نہیں، نہیں آپ یہ لے لیں، میں اور دیکھ لوں گی۔"

ربیکا کی پیشکش پر ندا ضرور پھسل جاتی۔ اگر دادی سینڈل ہاتھ سے چھوڑتیں۔

"ایسے ہی یہ لے لیں، اتنی مشکل سے تو تم نے پسند کیا ہے، یہ خود ڈھونڈیں اپنے لیے۔"

ربیکا کو دادی سے اس حرکت کی قطعاً توقع نہیں

تھی، اس نے بھی نگاہ ایسے اٹھائی جیسے کہا ہو۔ "کیا ہو گیا دادی، انہیں لینے دیں۔" مگر نفیسہ دیکھتا تو کیا اس وقت وہ سن بھی نہیں رہی تھیں۔ دراصل انہوں نے سینڈل پر قیمت پڑھ لی تھی اٹھارہ سو اور فوراً ففٹی پرسنٹ کا حساب لگا لیا۔ اس وقت ان کی جیب اسی سینڈل کی متحمل ہو سکتی تھی۔ اگر ربیکا کو کوئی مہنگی سینڈل پسند آ جاتی، انکار کی صورت میں اس کا لٹکا منہ نفیسہ سے برداشت کہاں ہونا تھا۔ اقرار کی صورت میں پیسے نہیں تھے، ربیکا کے نفی میں سر ہلانے کے باوجود انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

"کیا للچائے بچوں کی طرح، ہر جوتے میں پاؤں پھنسا رہی ہے، بس یہ ٹھیک ہے، جو لے لیا، سو لے لیا۔"

وہ اس کا ہاتھ پکڑے کاؤنٹر کی جانب بڑھیں، بسیم ندا کا ہاتھ پکڑ کر اسے سمجھاتا باہر کی جانب نکلا۔

"سیل کے جوتوں کا گلو ایکسپائر ہوتا ہے، میں تمہیں دوسری جگہ سے لے دیتا ہوں۔"

ندا منہ بناتی بھیڑ سے باہر نکل آئی تھی۔ نفیسہ نے سینڈل کی قیمت ادا کی اور وہ بھی باہر نکلیں۔ نفیسہ اور ربیکا دکان کی سیڑھیاں اتر رہی تھیں، نگاہ بائیک کے قریب کھڑی ندا پر گئی۔ بسیم بائیک اسٹارٹ کر رہا تھا، ندا بیٹھنے کو تھی یک دم اسے چکر سا آ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ گرتی نفیسہ نے جوتے کا شاپر چھوڑ لپک کر اسے تھام لیا۔

"کیا ہو گیا بچی۔"

بسیم بھی گھبرا کر اترا، زمین پر ڈولتی بہن کو قابو کیا اور سیڑھیوں پر بٹھا دیا۔

"ندا کیا ہوا۔ کیا بات ہے، ٹھیک ہو۔"

وہ ایسے آنکھیں بند کر رہی تھی جیسے شدید بی پی لو ہو رہا ہو، اور بسیم کے پسینے چھوٹ گئے، اس نے اِدھر اُدھر پانی کے لیے نگاہ دوڑائی۔ نفیسہ نے جھٹ سے اپنی بوتل سے ہاتھ میں پانی بھر کر اس کے منہ پر چھینٹے مارے۔ اس نے پلکیں جھپکی تھیں، نفیسہ نے بوتل اس کے منہ سے لگا دی۔ چند گھونٹ پانی پی کر جیسے اسے ہوش آیا تھا۔ نفیسہ کے سابقہ رویّے سے ایسی توقع کی تو نہیں کی جا سکتی تھی، مگر حیران ہوتے بسیم نے خوش دلی سے شکریہ ادا کیا تھا، ندا بھی گھبرائی ہوئی سی تھی۔

"کیا ہوا تھا تمہیں۔ اب ٹھیک ہو۔"

بسیم پریشان ہو رہا تھا، نفیسہ نے ندا کا ماتھا چوما۔

"ایک جوتی کو دل پر ہی لے گئیں۔"

دادی کے ایسے بے تکے ڈائیلاگ کو سمجھنے کے لیے ربیکا کی ناگواریت سے آنکھیں پھیلیں، لیکن ان کی اگلی کارروائی نے آنکھیں معمول پر کر دیں، جب ربیکا کے ہاتھ سے شاپر لے کر ندا کو تھمایا۔ "لو پکڑو۔ اپنی پسند تھی پہلے بتا دیتیں۔ مجھے کیا پتا میری ندیدی پوتی کی طرح سب لڑکیاں ہی جوتوں کے پیچھے جان دینے کو آ جاتی ہیں۔"

ربیکا کو اس وقت خود پر کیے جانے والا دادی کا طنز بھی معیوب نہیں لگا تھا۔ پچھلی نیکی کا ازالہ ہو گیا تھا، کچھ فکر ندا کی بھی ہو رہی تھی۔ ندا اب کچھ بہتر محسوس کرتی ہوئی سنبھلی اور کھسیانا سا مسکرائی۔

"نہیں آنٹی، بس ویسے ہی دل گھبرا گیا۔"

"اندر رش دیکھا کتنا تھا، تم لڑکیاں سیل کا سنتے ہی مکھیوں کی طرح ٹوٹ پڑتی ہو، ایسے جیسے پیدا ہونے سے اب تک ننگے پاؤں اسی سیل کے انتظار میں بڑی ہو رہی تھیں۔"

نفیسہ کے بے لاگ تبصرے شروع ہونے پر ربیکا منمنائی اور انہیں روکنے کے لیے ہاتھ آہستہ سے دبایا۔ "دادی۔"

"کیا دادی، دادی لگا رکھی ہے۔ غلط کہہ رہی ہوں، ابھی کہیں اور سیل کا سن لیا، ایسے ہی گرتی پڑتی وہاں بھی پہنچ جاؤ گی۔ خواہشوں کی بھی حد ہوتی ہے۔"

"اچھا۔ باقی گھر جا کر کہہ لینا۔"

بسیم کے محظوظ ہوتے انداز پر ربیکا کو مزید خجالت کا احساس ہوا، اس نے آگے بڑھ کر ندا کو

اٹھنے میں مدد دی۔

"تھینک یو۔۔۔"

"کوئی بات نہیں۔"

بسیم نے والٹ سے پیسے نکال کر نفیسہ کی جانب بڑھائے، مگر نفیسہ ڈپٹ کر بولیں۔

"یہ بھی میری پوتی جیسی ہے، یہ پہنے، ربیکا پہنے ایک ہی بات ہے۔"

"ربیکا" مختلف سا نام، یک دم بسیم کو اچھا لگا، منہ ہی منہ میں ہی دہرا لیا بھی گیا۔

"نہیں، ایسے تو ہم ہرگز نہیں لیں گے۔"

اس نے شاپر ربیکا کی جانب بڑھایا۔ "لیں ربیکا میم، اپنا جوتا۔" نفیسہ نے گھور کر دیکھتے پیسے جھپٹنے کے انداز میں تھامے تھے۔

"اب تم چاہتے ہو بچی پھر سے گر جائے۔ رنگ دیکھو کیسا پیلا کر لیا، صدمے سے۔"

بسیم کچھ نہیں بولا، جوتے کا شاپر ہینڈل پر لٹکا کر ہندا کو بائیک پر بیٹھنے کا کہا تھا، مگر وہ نفیسہ کیا ہر ایرے غیرے کو غلطی پر ڈپٹ نہ دیں۔

"رکو۔ پہلے بہن کی حالت تو دیکھ لو، بائیک پر بٹھانے والی ہے کہ نہیں، تم بائیک اڑاتے لے جاؤ بھلے وہ پیچھے کھڈے میں گری پڑی چلاتی رہے۔"

اب بسیم کو حقیقت میں کوفت ہوئی تھی "ہم بھی ٹیکسی میں جائیں گی، اسے ساتھ بٹھا لیتے ہیں، پہلے اسے اتار دیں گے پھر ہم اتر جائیں گے۔ تم پیچھے آتے رہنا بائیک پر۔"

بسیم کو اچنبھا ہوا تھا، اب وہ اتنی بھی ہمدردی نہیں چاہ رہا تھا، اس نے فوراً نفی میں سر ہلایا تھا۔

"قطعاً نہیں۔ میں کسی اجنبی کے ساتھ اپنی بہن کو کیسے بھیج سکتا ہوں۔"

"اجنبی۔" سنتے ہی نفیسہ کی آنکھیں اور منہ کھل گئے۔ گرتی کو پکڑا، پانی پلایا، اپنی پوتی کی پسند کا جوتا تک دے دیا، ابھی بھی اجنبی۔ نفیسہ کے ہاتھ ہینڈل پر لٹکتے شاپر کی جانب بڑھنے سے پہلے ربیکا نے روکا۔ "خدا کے لیے دادی۔" اس نے دادی کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے ہٹانے میں عافیت جانی، ہم ہو کر سے کہتے سنا تھا۔

"چلو، بیٹھو۔ مجھے پیچھے سے پکڑ لینا۔"

اس کے کہتے ہی وہ بیٹھی اور زن سے بائیک اڑتی چلی گئی۔

"چہ چہ چہ۔۔۔"

نفیسہ افسوس میں تھیں "کیسا بے اعتباری کا دور آ گیا۔ ایک ہمارا دور تھا، گلی محلے کے ہر مرد کو چاچا، پھوپھا، خالو، ماموں کہتے۔ انگلی پکڑ چیز لینے چلے جاتے تھے۔"

"دادی، پہلی بات، اب حالات پہلے سے نہیں، دوسرے ہم اس کے گلی محلے میں نہیں رہتے، جو وہ آپ کو چاچی، پھوپھی، خالہ، مامی ۔ بنا کر اپنی بہن پکڑا دیتا۔"

بسیم کے سامنے ہونے والی خجالت کو خوامخواہ ہی ربیکا دل پر لے گئی تھی۔

☆☆☆

اس بات کو کتنے دن گزر گئے تھے مگر نفیسہ بھولی نہیں تھیں، باتوں باتوں میں سینڈل والے کا ذکر نکل ہی آتا۔ نفیسہ کی اس نئی اصطلاح "سینڈل والا" پر پہلی بار تو وہ اچھی خاصی چونک گئی، جب دادی نے رات کو ہی لیٹے لیٹے کہا تھا۔

"کتنا نخرہ تھا، اس میں۔"

"کس میں دادی؟"

اس نے کانوں سے ہینڈز فری کھینچ کر فوراً حسِ سماعت قائم ہونے کا ثبوت دیا تھا، بیشتر اس کے کہ لاٹھی کھانے کے بعد دے۔

"اسی سینڈل والے کی بات کر رہی ہوں، لو دیکھو بھلا، میں شکل سے اغوا کار لگتی ہوں، لوگ گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر دعا کرواتے ہیں مجھ سے، اور اس نے کیسا منہ توڑ جواب دیا تھا، اجنبیوں کے ساتھ بہن نہیں بھیج سکتا۔"

ربیکا نے اگلی بات نہیں سنی تھی۔ اس کا دماغ سینڈل والے پر ہی اٹک گیا۔ آنکھیں حیرت سے

ابل پڑیں۔

"دادی۔ اس لڑکے نے سینڈل پہنی ہوئی تھی۔ مطلب ایڑی والی؟"

"کبھی بات پوری سمجھ بھی لیا کرو۔"

نفیسہ نے گھرکا "تمہاری سینڈل کے پیچھے ہی نہیں اس کی بہن عشق کھا کر گر رہی تھی۔"

"اوہ عشق بہن کو آیا اور سینڈل والا بنا وہ۔"

اسے پورا یقین تھا۔ جیسے اعظم چچا ایک دو واقعے کی بنا پر دادی کے دماغ پر ہمیشہ کے لیے تشہیر کی حیثیت پا گئے ویسے، وہ لڑکا بھی اب ہمیشہ کے لیے سینڈل والا ہو جائے گا۔ چند دن بعد پھر نفیسہ نے اسی طرح اس کا ذکر کیا۔

"وہ سینڈل والا، تھا بڑا ہی کوئی اکڑو۔"

"دادی۔ آپ بار بار اسے سینڈل والا، سینڈل والا کہتی ہیں، ذرا سوچیں وہ ڈیشنگ سا لڑکا، لڑکیوں کی ایڑی والی سینڈل پہنے بازار میں پھرتا، کیسا لگے گا؟"

"بتاؤں میں تجھے، ڈیشنگ کی کچھ لگتی۔"

لفظ "کچھ لگتی" پر اس کے دل میں لمبے سے کاش کے ہزاروں لڈو پھوٹے تھے، اس سے پہلے کہ لڈو کی خوشبو پھیلے آسیہ نے بات کو ختم ہی کر دیا۔ کیوں کہ چند دنوں سے مسلسل ایک ہی قصہ سن کر وہ اکتا گئی تھیں۔

"اماں آپ بھی حد کرتی ہیں، اچھا سمجھ دار بچہ ہوگا، ایک ملاقات پر کون یوں فری ہوتا ہے۔"

"ہاں بھئی تم کیوں میری بات سے اتفاق کرو گی۔ آج تک کیا ہے کبھی۔

کل کہا تھا، کریلوں میں گوشت ڈال لو، کریلوں تک ہی بات مانی، دال ڈال کر کر دیے ناں پھیکے۔"

اب آسیہ کیسے سمجھاتیں کل منگل تھا اور گوشت کا ناغہ، کہہ بھی دیتیں تو انہوں نے ان کو قصوروار ٹھہرانا تھا۔ آسیہ نے ہتھیار پھینکنے میں ہی عافیت جانی۔ ربیکا نفیسہ نے رازدارانہ انداز میں

کہا تھا۔

"سچ کہوں آسیہ۔ لڑکا تھا ویسے بہت خوب صورت، لمبا چوڑا، انداز، گفتار سے پڑھا لکھا بھی لگ رہا تھا۔"

"اعظم بھائی جتنا؟"

آسیہ کی ۔ استہزائیہ کارروائی پر انہوں نے تائیدی سر ہلایا تھا۔

"ہو بہو۔ اعظ....."

اعظم کا میم منہ میں ہی رہ گیا تھا، ربیکا اپنے ہینڈز فری اٹھانے آ گئی تھی اور انہوں نے قسم اٹھائی تھی، اس کے سامنے اعظم کا نام نہیں لینا بچی کا دل دکھتا ہے۔ اپنی قسم پر پوری طرح سے ابھی تک کاربند تھیں، لیکن وہ ہینڈز فری اٹھانے کے ساتھ آسیہ خالہ کو بھی اندر لے گئی، کیوں کہ اس کا وہ سوٹ نہیں مل رہا تھا جو آسیہ سلوا کر لائی تھیں۔

☆☆☆

ایک معمول کے واقعے کی طرح بسیم اس واقعے کو بھی بھلا دیتا اگر دوبارہ اس سے ملاقات نہ ہو جاتی۔ دوسری ملاقات بھی سرِ راہ اچانک ہی ہوئی تھی، اس دن بھی ندا، بسیم کے ساتھ تھی، فرق اتنا تھا آج وہ لیک کی جگہ اپنی گاڑی میں تھے، ندا کی یونی میں کوئی فنکشن تھا جس کے سبب آج بس ذرا لیٹ چلنی تھی۔ ندا فنکشن ضرور اٹینڈ کرتی اگر اس کی طبیعت اچانک خراب نہ ہو جاتی۔ سر میں شدید درد تھا، کچھ بے چینی گھبراہٹ، اس نے بسیم کو فون کر دیا آفس سے واپسی پر اسے اپنے ساتھ گھر لے جائے۔ ان کی گاڑی یونی روڈ سے ذرا ہی آگے بڑھی تھی۔ فٹ پاتھ پر کھڑی ربیکا کو خاصے فاصلے سے ہی ندا نے پہچان لیا۔ پہچانتی کیسے نہ ہزار بار تو اس واقعے کو گھر میں دہرا چکی تھی۔ پہلے تو اس نے گھر آ کر الف سے ے تک ماں کو تفصیل سنائی، شاکرہ ہمیشہ کی طرح پوری بات سن کر غصیلے انداز میں بولیں۔

"پہلے تو یہ بتاؤ۔ جوتا بھائی لینے گیا تھا، یا تم؟ ذرا شرم نہیں آئی بلاضرورت اپنے لیے پسند کرتے۔

"امی تو اسٹیبلشمنٹ والوں کی کچھ لگتی ہیں، خاموشی سے سن کر، ناگوار فیصلہ دینے والی۔"

ندا نے دل میں سوچا تھا، زبان سے بولنے کی جسارت تب کرتی جب شاکرہ سانس لینے کو ہی سہی تھم رکتیں تو "کیا مستقبل میں پرانے جوتوں کا ٹھیلا لگانے کا ارادہ ہے۔ ملیں نہیں چل رہیں تمہارے باپ کی، نہ ان کو ابا کی وراثت سے کوئی دھیلا ملا، جو کمایا اپنے خون پسینے سے کمایا، بیٹا میرا سارا دن مارا مارا پھرتا ہے، اور یہ مہارانی جوتوں پر ہی ساری کمائی ختم کرنے کے درپے ہے۔"

"اوہو امی کیا ہوگیا۔"

ان کے مزید جملوں کو بسیم نے بریک لگایا تھا۔

"میرے سائز کا — ملا ہی نہیں اور ندا کو تو میں نے کہا تھا جوتا لے لو، ورنہ اس بے چاری نے کہاں لینا تھا۔ آپ بھی بس شروع ہی ہوجاتی ہیں۔"

ماں کے جملوں پر بُرا منہ بناتی ندا بھائی کی حمایت پر یک دم کھل گئی اور دل میں کہا تھا۔ "سب سے اچھا میرا بھائی۔" یہی بھائی دنیا کا سب سے برا شخص ٹھہر جاتا تھا اگر کسی چیز کو لانے سے انکار کردے۔ بھلے وہ دس روپے والے گر گرے ہی کیوں نہ ہوں۔ کمرے کی جانب بڑھتے بسیم نے شاکرہ کے الفاظ سنے تھے۔

"سب جانتی ہوں تمہیں اور تمہاری اس بے چاری، دکھیاری بہن کو۔ اور جس دادی کا ذکر کر رہے ہو، اس عمر کی عورتیں ایسے ہی مزاج کی ہوتی ہیں۔ شکر کرو وہی سینڈل تمہیں لگا نہیں دیں۔"

یعنی موضوع چکر لگا کر دادی پر آ گیا۔ "اور اسی لیے اکیلے نہیں بھیجتی ندا کو، یہ تو مان لیتی اس بڑھیا کی بات، اب منہ پر تھوڑا لکھا تھا، مزاج ایسا ہے یا انداز بنا رہی ہیں، پتا نہیں کیسے کیسے آج کل واقعات ہو رہے ہیں۔"

"چھوڑیں اب اس قصے کو۔"

مسلسل ایک ہی بحث سے بسیم کو کوفت ہونے لگی تھی، لیکن قصہ کمرے میں جا کر بند نہیں کچھ ایسے

عمل کیا۔ غور میں دادی سے زیادہ ربیکا میڈم اٹکی رہیں۔ دادی کے ڈپٹنے پر اس کے چہرے پر پھیلتا شرم ساری کا رنگ اور دادی کی گھوریوں پر الجھی انداز میں دیکھنا وہ ابھی بھولا نہیں تھا۔ کہ آج پھر سڑک کنارے وہ کچھ الجھی پریشان سی کھڑی تھی۔ ندا نے سر کا ورد بھلا کر فوراً بسیم کی توجہ اس جانب مبذول کروائی۔

"بھائی وہ، وہ دیکھیں، یہ وہی لڑکی۔ دادی والی۔"

بسیم کی — گردن باہر کی جانب گھومی، گرمی میں پسینہ، پسینہ ہوئی ربیکا، آسمانی رنگ کی چھتری تانے کسی بس کے انتظار میں — تھی۔

"وہی ہے ناں۔ کیا نام تھا بھلا اس کا۔"

"ربیکا۔" بے ساختہ — نام ادا ہونے پر وہ خود بھی حیران تھا، لیکن ندا اتنی آسانی سے اسے چھوڑنے والی ہرگز نہیں تھی، فی الوقت اس نے معنی خیز نظروں سے گھور کر دیکھا اور گاڑی روکنے پر اصرار کیا تھا۔

"کیا مطلب ہے گاڑی روکوں۔ جان نہ پہچان ایسے ہی خوامخواہ۔"

"بنا جان پہچان کے کسی کا نام ایسے یاد نہیں رہتا؟ روکیں گاڑی، ہوسکتا ہے اسے کوئی ہیلپ چاہیے ہو۔"

ریورس میں اپنی جانب آتی گاڑی دیکھ کر وہ کچھ حیران ہوئی اور جب نیچے ہوتے شیشے کے پیچھے سے ندا نے با آواز "ایکسوزمی" کہا۔ ربیکا کی حیرت میں ڈوبی آنکھوں کا بادامی رنگ پل بھر کے لیے بسیم کے کہیں اندر تک اترا تھا۔

"آپ کو کہیں جانا ہے۔۔ ہم ڈراپ کردیتے ہیں۔"

اگر تو اس وقت دادی موجود ہوتیں تو اپنی سبکی کا بدلہ لینے کے لیے، ایسے — لگا کر بسیم کو جواب دیتیں۔ آئندہ وہ زندگی میں کسی کو لفٹ دینے کا سوچتا

کہتے ساتھ چھتری لپیٹ، دروازہ کھول پیچھے بیٹھ گئی۔

ایک تو گرمی کی شدت سے اس کا حلق سوکھا جارہا تھا، دوسرے اسمارٹ ڈرائیور، اس کی دیرینہ خواہش پوری ہوئی تھی، اس خواہش کو وہ کسی طویل سفر تک پورا کرنے کا مصمم ارادہ رکھتی۔ اگر دادی کی سوئی کا خوف کسی اژدھا کی مانند نہ لپکتا۔ کچھ ہی دیر بعد اسے اپنی اس حماقت کا اندازہ ہوا۔ اس سے پہلے کہ وہ ایک خوبرو ہیرو کے ہاتھوں اغوا ہو یا دادی کو بتا کر ان کی سوئی سے فیض یاب ہو، اس نے اترنے کا شور مچادیا۔

"میں نے کہاناں آپ کو، پلیز گاڑی روکیں مجھے اتار دیں۔ میرا گھر قریب ہے، میں چلی جاؤں گی۔"

"مین روڈ پر۔" بسیم کو اچنبھا ہوا۔ "لیکن یہاں تو کوئی گھر دکھائی نہیں دے رہا۔"

"صحیح کہہ رہے ہیں بھائی، یہاں تو کوئی آبادی نہیں ہے۔"

"ہے بس۔ پلیز آپ مجھے اتار دیں۔ میں ادھر ہی رہتی ہوں۔"

"سڑک پر رہتی ہیں۔" بریک پر پاؤں کا وزن ڈالتے بسیم شوخ ہوا تھا۔ "کہیں آپ بھکارن تو نہیں۔"

"واٹ۔ آپ کو میں بھکارن لگتی ہوں۔ کبھی اپنی شکل دیکھی ہے آئینے میں، چہرے سے صرف ایک ناک اتار دی جائے، نیا بل چلے کھیت جیسی شکل ہے آپ کی۔"

دروازہ دھاڑ سے بند کرتے ہوئے ربیکا یہ جا وہ جا۔ بسیم اس کی عجیب تشبیہ پر پل بھر کو حیرت میں آگیا۔ اسلام آباد میں رہنے والی لڑکی اور تشبیہ دیتی ہے نئے ہل چلے کھیت کی۔ "واہ کیا بات ہے۔" بسیم کو یاد نہیں پڑتا تھا کبھی اُس نے کھیت خود اپنی آنکھوں سے دیکھے ہوں، ہاں امی سے جلا کٹا ذکر ضرور سنا تھا، کہ دادا ابا کی بہت بڑی زمین تھی، لیکن

اس زمین پر جانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوسکا، اتفاق ٹھہرانے کے لیے اپنی جڑوں سے وابستگی اتنی ہی ضروری ہے جتنی پچھلے قدم کو اٹھا کر اگلے کے برابر لانے کی۔ لیکن ابا اور ان کے بھائی کے قدموں کے درمیان اتنا زمینی فاصلہ آچکا تھا، جو آخرت کے سفر پر جا کر بھی مٹائے نہ مٹ سکے۔

☆☆☆

شاکرہ کا کہنا تھا، بسیم کی پیدائش ان کے لیے سونے کی چڑیا ثابت ہوئی تھی، برسوں سے روزگار کی تلاش میں جوتیاں چٹخاتے محمد اعظم کو ایک نامور ملٹی نیشنل کمپنی سے جاب کی آفر ہوئی تھی، بھائی کی اس جاب کے لیے صدیق نے جتنی بھی کوشش کی اس کا احسان ماننا تو ایک جانب، شاکرہ نے سرے سے اس بات کو کبھی قبول ہی نہیں کیا تھا۔ ان کے نزدیک بیٹا خوش نصیب اور میاں کا تعلیمی ریکارڈ ہی ایک ایوارڈ کی حیثیت رکھتا ہے۔ کئی بار تو جیٹھانی کو باتوں باتوں میں واضح سنا دیا تھا۔

"اعظم کو جاب تو بہت پہلے ہی مل جاتی، اگر صدیق بھائی خوامخواہ اعظم کا وقت، زمینوں پر برباد نہ کرواتے۔ جب انٹرویو دینا ہو، تب ہی اماں بیمار پڑ جاتی ہیں، یا کوئی جھگڑا زمین پر اٹھا ہوتا ہے۔"

فرخندہ کو دیورانی کی یہ بات اچھی خاصی چبھی تھی، لیکن میاں کا مزاج جانتی تھیں، شکوہ کرنے پر انہوں نے صاف کہہ دیا تھا۔

"تم عورتوں کو رائی کا پہاڑ بنانے کی عادت ہوتی ہے، اگر شاکرہ نے کچھ کہہ ہی دیا، تم بڑی ہو رفع دفع کردو۔"

میاں سے بے عزت ہو کر رفع دفع کرنے سے بہتر تھا، وقع دور ہی کردے اور ایسا ہی ہوا۔ محمد اعظم کو جاب کمپنی کے ہیڈ آفس اسلام آباد میں ملی تھی، جہلم کے چھوٹے سے علاقے سے فوراً اسلام آباد شفٹ ہونا اتنا بھی آسان نہیں تھا، جب کہ بچہ ابھی چند دن کا تھا، فرخندہ نے تو شاکرہ کو جھوٹے منہ اپنے پاس رکنے کا نہیں کہا تھا، ساس خود اس کی نخریلی عادت سے

عاجز تھیں، البتہ صدیق کو خیال آگیا تھا۔ بھائی کو بٹھا کر سمجھایا۔

"چھوٹے بچے کے ساتھ کہاں جاتے ہی گھر ڈھونڈتے پھرو گے۔ پہلے جا کر تم سیٹ ہو جاؤ، پھر بیوی بچے کو لے جانا۔"

صدیق کا یہ مشورہ اعظم کو تو پسند آیا تھا، لیکن شاکرہ اور فرخندہ نے ناچاہتے ہوئے قبول کیا، تقریباً چار پانچ ماہ شاکرہ کو جہلم رہنا پڑا تھا اور ان کے پاس چار دہائیوں جتنے دکھ اکٹھے ہو گئے تھے۔ اس عرصے کے دوران، جب جب اعظم، شاکرہ سے ملنے آئے، وہ مسلسل ایک ہی رٹ لگائے رکھتیں۔

"بھابھی کی اپنی تو اولاد ہے نہیں، کنواروں والا حساب ہے، کبھی اس کے گھر، کبھی اِس کے گھر، شادی، بیاہ، مرنا جینا کوئی موقع نہیں چھوڑتیں۔ میں تنہا گھر بھی دیکھوں، بچہ بھی پالوں، پھر تمہاری بیمار اماں۔"

"کیا ہو گیا بیگم، گنتی کے تو افراد ہیں، گھر میں۔"

"ہاں ان گنتی کے افراد کے کام گننے بیٹھو تو صبح سے شام ہو جائے، جب سارا دن تنہا کام میں ہی گزارنا ہے تو اسلام آباد تمہارے ساتھ رہنے میں کیا حرج ہے۔ مجھ سے نہیں رہا جاتا اس کچی چھت، کچے فرش کے گھر میں، ہر وقت یہی دھچکا لگا رہتا ہے، چھت اب گری کہ تب گری۔"

بیگم کے بڑھتے شکووں اور ماں کے سمجھانے پر اعظم نے جیسے تیسے کر کے ایک فلیٹ لے لیا، اور شفٹ ہو گئے۔ وہ وقت ایسا تھا جب ابا کی زمین جائیداد کے لیے بہتر فیصلہ کیا جا سکتا تھا، اماں کی خواہش بھی یہی تھی وراثت ان کے سامنے تقسیم ہو جائے جس کا حصہ وہ خود سنبھالے، بہنیں بیاہ کر دور پردیس تھیں، انہیں پاکستان میں رکھی جائیداد کا فی الوقت کوئی فائدہ نہیں تھا۔ تخمینہ لگایا گیا، زمین اور ابا کا گھر جتنی مالیت کا بنتا تھا، زمین دونوں بہنوں کو اور گھر دونوں بھائیوں کا، یہ اماں کا فیصلہ تھا، جو بلاچوں و چرا سب نے مان لیا۔ زمین کی فروخت کے بعد رقم بہنوں کے پاس ٹرانسفر کر دی گئی، مکان کے بارے میں اعظم نے خود ہی کہہ دیا۔

"صدیق بھائی ابھی اماں موجود ہیں، اور آپ رہ رہے ہیں، جب ضرورت ہو گی تقسیم بھی کر لیں گے۔"

یہ ایک ایسا معاملہ تھا جس میں بیوی بڑھ چڑھ کر جتنا میاں کو فورس کر سکے کرتی ہے، بھئی بیچ کر اپنا حصہ لیں، مزے کریں، لیکن شاکرہ اس بات پر بالکل چپ تھیں، انہیں پلٹ کر تو کبھی جہلم آنا ہی نہیں تھا، لیکن وہ پھر بھی میاں کی ہم خیال بن گئیں۔

"اعظم صحیح کہہ رہے ہیں ابھی سے حصے بخرے کرنے کی کیا ضرورت، رکھی جائیداد کی قیمت بڑھتی ہی ہے، پھر صدیق بھائی نے بھی تو کہیں رہنا ہے کہ نہیں۔"

ان کے ذرا سے میٹھے جملے سے ساس، نندوں کے دل میں پرانی رہ جانے والی سب باتیں ہی ڈھل گئیں، بلکہ پورے خاندان میں ان کی دھاک بیٹھ گئی۔ فرخندہ صدیق بھی حیران تھے، لیکن شاکرہ کی دور اندیش نگاہ تک کس کی رسائی تھی۔ صدیق بھائی کی اولاد نہیں، تو اس مکان کو بلاوجہ فروخت کیا ہی کیوں جائے، کچھ وقت گزرے گا، نا صرف مالیت بڑھے گی، بلکہ خود بخود ان کی اولاد کے حصے میں آجائے گا، یہ صرف ایک انسان کی سوچ تھی۔ صدیق کی اولاد تھی نہیں لیکن اللہ کے ہاں ایسا نہیں لکھا تھا کہ کبھی ہو گی نہیں، جب بسیم تین سال کا تھا، اماں نے صدیق کے گھر آنے والی خوشی کی دیسی گھی کی مٹھائی سب سے پہلے اعظم کو بھجوائی تھی، شاکرہ کے دل پر اس وقت کیا گزری یہ تو صرف اللہ ہی جانتا تھا، یا وہ خود۔ کچھ عرصے بعد، اعظم اپنی فیملی کے ساتھ اس خوشی کو دیکھنے آ گئے تب شاکرہ کو اتنے بڑے گھر میں تنہا جیٹھانی کا راج کچھ کھٹکا سا تھا۔

☆☆☆

سدرہ کی شادی کے لیے ربیکا نے جتنا ہنگامہ کر

رکھا تھا، دادی نے ترتیب دیئے پردگرام سے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا، دادی نے صاف کہہ دیا تھا۔
''مہندی کی رات کو کھانے کے وقت تک پہنچ جائیں گے اور شادی کا کھانا کھاتے ہی واپسی کرنی ہے، کوئی ضرورت نہیں ہے، رخصتی تک پھیلنے کی۔''
یہ سنتے ہی ربیکا کی بھنویں سکڑیں منہ کھلا۔
''دادی اب شادی بیاہ پر یہ حرکتیں نہیں چلتیں، عین کھانے کے ٹائم پر پہنچو اور ٹوٹ پڑو۔ ڈرون کیمرے سے مووی بنتی ہے۔ بعد میں لوگ بہت مذاق بناتے ہیں۔''
دادی نے اپنی چھڑی قریب کرتے پوچھا تھا۔
''کیا مطلب ہے تمہارا۔''
حفظِ ماتقدم کے طور پر ربیکا نے اپنے پیر جو چھڑی کے ذرا قریب ہی تھے کرسی پر سمیٹتے ہوئے کہا تھا۔
''مطلب صاف ظاہر ہے، دو گھنٹے کا سفر صرف کھانا کھانے کے لیے تو نہیں کروں گی ناں، کوئی غیر تھوڑی ہے سدرہ، میری کزن اور پرانی سہیلی ہے، پھر شادی کے گھر میں سو کام ہوتے ہیں بھئی۔''
''کیوں تم سے انہوں نے چاول صاف کروانے کا عہد لیا تھا یا مردوں کے ساتھ شامیانے لگوانے ہیں۔'' اس کا منہ بننے پر دادی بڑبڑائیں۔
''سو کام ہوتے ہیں۔ تم کسی کے دو کردو ناں، وہ ساری زندگی شکرانے میں گزار دے۔'' ربیکا منہ ہی منہ میں بدبدا رہی تھی۔
دادی نے محسوس کرتے زور دے کر کہا۔ ''بس کہہ دیا میں نے، کوئی پہلے وہلے نہیں جانا، وقت کے وقت جائیں گے، بات ختم۔''
''خالہ۔'' اس نے مدد کے لیے خالہ کی جانب دیکھا وہ بھی ساس کی ہم نوا بنی تھیں۔
''اماں ٹھیک کہہ رہی ہیں۔۔۔ میں تو پہلے ہی وہاں جانا نہیں چاہ رہی، پتا نہیں کون کون آیا ہوگا، ناچاہتے ہوئے بھی ملنا پڑ جاتا ہے۔''
لفظ ''کون کون۔'' پر آسیہ کے چہرے کی

رشتہ داری تھی اور عین ممکن تھا۔ اس کی شادی میں وہ لوگ بھی شامل ہوں جن کی برسوں سے شکل نہ دیکھی، نہ دیکھنے کی کبھی خواہش ظاہر کی، حالانکہ ایک ہی شہر میں رہ رہے تھے۔

☆☆☆

وقت اور رشتے سوچ سمجھ کر برتنے چاہئیں، ورنہ ان کے دیے چھوٹے چھوٹے زخم مندمل ہونے کے بجائے ناسور بننے لگتے ہیں، جن کی ٹیسیں جسم میں پھیل کر دل میں اترتی ہیں، ایسے ہی آسیہ کا دل ابھی تک دکھی تھا۔ اعظم بھائی کی ربیکا سے قطع تعلقی تو اب عام سی بات تھی لیکن ان کی بے حسی سے لگے پرانے دکھ محسوس بہت ہوتے تھے، آسیہ کو آج بھی یاد تھا جب فرخندہ باجی نے اپنے علاج کے لیے اسلام آباد جانے کا قصہ روتے ہوئے سنایا تھا۔
فرخندہ کو بریسٹ کینسر ہو گیا تھا۔ جہلم میں ہر طرح کا علاج ہونے کے باوجود، مرض تھا کہ بڑھتا جارہا تھا۔ ڈاکٹرز کے مشورے پر انہیں اسلام آباد لے جایا گیا، جہلم تو شاکرہ کو ہمیشہ ہی دور محسوس ہوا تھا۔ خوشی غمی میں آنا تو درکنار فون پر عیادت کرتے ہوئے بھی صاف کہہ دیتی تھیں۔
''بھابھی بڑے شہروں میں دن کا پتا ہی نہیں چلتا کیسے بیت گیا، سارا دن گھر کے کام کاج، شام کو بچوں کی پڑھائی لکھائی، اب گاؤں تو ہے نہیں، فارغ ادھر اُدھر تاکا جھانکی کرتے پھرو۔''
اور جب علاج کے لیے فرخندہ اسلام آباد گئیں، شاکرہ کے ماتھے کے بل دور ہی سے نظر آتے تھے، کچن میں کھڑے ہو کر اتنی آواز میں میاں سے بات کی کہ لاؤنج میں بیٹھے صدیق اور فرخندہ بھی سن لیں۔
''جانتے بھی ہو بھابھی کو کتنی خطرناک بیماری ہے، ڈاکٹرز کتنی احتیاط بتاتے ہیں اس کی، منہ اٹھا کر یہاں آگئیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں

میرے، خدانخواستہ کوئی وارث نکل آیا تو۔
"آہستہ بولو۔ صدیق بھائی سن نہ لیں۔"
اعظم کی منمناہٹ پر انہیں مزید شہ ملی۔ "یہ آہستہ آہستہ بولنے کی منافقت، میاں مجھ سے نہیں ہوتی اور ویسے بھی یہ سب صدیق بھائی کے کیے کا خمیازہ ہے، یہاں سے نہیں تو وہاں سے نکل تو رہا ہے ناں پیسہ۔ کسی کا حق کھائیں گے یہ تو ہوگا۔"
"بس بھی کر جاؤ، خدا کے واسطے۔"
"کردی بس۔ اب انہیں بھی کہیں بس کر جائیں، ایک تو سارے حصے پر قبضہ کیے بیٹھے ہیں۔ اوپر سے ان کی بیمار بیوی کی سیوا بھی میں کروں۔ کیوں؟"
فرخندہ کا جگر اتنا یرقان نے نہیں دہکایا تھا جتنا شاکرہ کے الفاظ کی تپش محسوس ہوئی۔ مزید وہاں رکنے کے لیے وہ تیار نہیں تھیں۔ اسی لمحے میاں سے کہا تھا۔
"میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں، اگر تو سیدھا ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہے تو ٹھیک ہے، نہیں تو ابھی اسی وقت گھر واپس چلیں۔"
"اوہو۔ میں اعظم سے بات کرتا ہوں، تم کیوں فکر کر رہی ہو۔"
"اعظم بھائی سے بات نہیں کریں، خدا کے لیے ان کا حصہ انہیں دیں۔ شاکرہ کے جملے مجھے اندر تک چھلنی کرتے ہیں صدیق۔"
شاکرہ کی خود پرست عادت سے صدیق پہلے سے واقف تھے، اب الفاظ سے ہتک کا احساس بڑھ گیا، وہ غصے میں اٹھے۔
"اب صرف حصہ ہی دوں گا، جو میں تھوڑا بہت سوچ رہا تھا۔ اب قطعاً نہیں۔"
صدیق ایسے حتمی انداز میں کہہ کر اٹھے، کہ پھر اعظم کے روکنے کے باوجود نہ رکے تھے۔ اس وراثتی حصے کا بھی عجب معمہ بن کر رہ گیا تھا، جو دونوں جانب کے دلوں میں چھید کا سبب بنا۔ کتنی بار یہ مسئلہ اٹھایا گیا، کسی بھی موقع پر دونوں بہنیں اکٹھی ہوتیں تو

بھائیوں کی ...
صورت حال یہ بن چکی تھی سمجھ میں نہیں آتا تھا حق پر کون سا بھائی ہے، اسی مسئلے کو سلجھاتے سلجھاتے، رشتوں کے سرے الجھ کر گم ہو گئے۔ شروع شروع میں تو جیسے تھا ویسے چلتا رہا، پُررونق علاقے میں پرانا مکان تھا، مسلسل بارشوں سے چھتیں کئی جگہ سے ٹپک رہی تھیں۔ مکان گلی سے پہلے ہی کچھ نیچا تھا، نئی گلی بننے سے مزید نیچے ہوگیا۔ بارش کے دنوں میں زندگی عذاب بن جاتی تھی۔ چھت سے بارش کا پانی آتا، سڑک سے گٹروں کا، ان دنوں صدیق کے معاشی حالات کچھ بہتر نہیں تھے، ماں نے اعظم کو بلا کر ساری صورت حال بتائی، شاکرہ اس وقت چاہتی تھیں مکان بک جائے اور اپنا اپنا حصہ لے کر جہاں مرضی رہیں لیکن سرکاری دفاتر میں رہنے کی وجہ سے اعظم کے علم میں تھا کہ گھر کے بالکل قریب سے ہی ہائی وے کی منظوری ہو چکی ہے۔ سڑک بننے میں تھوڑا وقت لگے گا اور مکان کی قیمت کئی گناہ بڑھ جائے گی، وہ تو مکان کی فروخت کے حق میں بالکل بھی نہیں تھے اور پیسہ لگانے کے نام پر صاف کہہ دیا تھا۔
"صدیق بھائی کے استعمال میں ہے، پیسہ بھی انہیں ہی لگانا چاہیے، ہمارے لگے بندھے خرچ میں اتنی گنجائش نکلتی کہاں ہے۔" دونوں بھائیوں کی کچھ دیر کی بحث کے بعد ماں نے یہی کہا۔
"صدیق یا تو اسے بیچ دو یا جس کے پاس پیسہ ہے وہ لگا لے۔" جب سے اعظم نے سڑک کا بتایا تھا بیچنے کے حق میں صدیق بھی نہیں تھے۔ فرخندہ کا اچھا خاصا زیور تھا، کچھ بینک سے قرض لے لیا اور مکان کی بہترین شکل نکل آئی، وقت گزرتا رہا، بینک کا قرض کچھ صدیق نے کچھ فرخندہ نے سلائی کا کام کر کے اتارا تھا۔ اماں کی وفات کے بعد اعظم نے اپنے حصے کا کہنا شروع کر دیا۔ دومنزلہ مکان کی قیمت کئی گنا بڑھ چکی تھی اور جھگڑا بھی اسی بات کا تھا، صدیق پرانی تعمیر کے حساب سے۔ بھائی کو قیمت دینا چاہتے تھے، اعظم اس بات پر برہم ہو گئے۔

بڑے بھائی کے سامنے خود اپنے منہ سے کچھ کہتے نہ تھے۔ بہنوں کو بیچ میں ڈال دیا۔ وہ جس بھائی کے پاس بیٹھتی اس کو سمجھاتیں، مگر دونوں کے پاس اپنی دلیلیں تھیں۔

"یہ کیا بات ہوئی اگر صدیق بھائی نے تعمیر کروایا، اتنا عرصہ رہے بھی تو وہ ہی ہیں۔" اعظم نے بڑی بہن کے سمجھانے پر اسے قائل کیا۔

"وہ بھی یہاں آ کر رہ لیتا، میں نے تو کبھی نہیں روکا اسے۔" صدیق کا جواب فوراً حاضر تھا۔

"آپ نے آٹھ لاکھ لگائے تھے، میں اسے سمجھاتی ہوں آدھے، وہ آپ کو دے دے گا۔"

"میری بات سنو سارہ، اس وقت کے آٹھ، آج کے اٹھائیس بن چکے ہیں، تب تو اس نے دھیلا بھی لگانے سے صاف انکار کر دیا تھا، میری بیوی کا زیور بکا، میں نے قرض لے لے کر سب بنایا، آج بنے بنائے پر اسے ملکیت یاد آ گئی۔"

بات ہلکی پھلکی رنجش سے باقاعدہ ضد پر اتر آئی، دونوں ہی اپنے موقف پر ڈٹے تھے۔ یہاں تک کہ صدیق نے وقت کے مطابق خالی پلاٹ کی قیمت لگوا کر چیک، بہنوں کے سامنے اعظم کو تھمایا۔ موجودہ قیمت سے وہ تیسرا حصہ بن رہا تھا۔ شاکرہ تپی، سوتیں، اعظم ان کے سامنے ہی چیک پھاڑ کر اٹھ گئے۔

"لوں گا تو پورا لوں گا، نہیں تو آئندہ یہاں تھوکوں گا بھی نہیں۔"

وہ دن اور آج کا دن اعظم اپنی بات کے اتنے پکے نکلے اس گھر میں جھانک کر نہیں دیکھا تھا۔ فرخندہ بیمار ہو کر فوت ہو گئیں، تب جاب کے سلسلے میں ملک سے باہر گئے ہوئے تھے۔ شکر کیا ملک میں ہوتے تو جانا ہی پڑ جاتا، بعد میں فون پر افسوس کر لیا، بھائی فوت ہوا، جنازے میں باہر سے باہر شامل ہوئے۔ فرخندہ چلی گئیں، صدیق چلے گئے، لیکن بے جان گھر اور اس کی چاہت میں بنی رنجش اپنی جگہ برقرار رہی، وقت کی گرد نے اس رنجش میں اتنی گرد بھر دی۔ جس کی صفائی آسانی سے ممکن نہیں تھی، بہنوں کی شامت آ گئی تھی، جس سے ملتیں، دوسرے کی بدگوئی، کو سنے سننے کو ملتے، انہوں نے آنا جانا ہی چھوڑ دیا تھا، فون پر خیر خیریت پتا چلتی رہتی تھی۔ صدیق کے بعد ربیکا کو خالہ لے گئیں، اعظم کے علم میں یہ بات تھی لیکن کیا کیا جائے، اس ضد اور انا کا، جو اب نفرت کا روپ دھار چکی تھی۔ اسلام آباد میں پتا ہونے کے باوجود کبھی فون تک نہ کیا، شاکرہ روز جلتی کلستی رہتیں۔

"صدیق بھائی کی وفات کے بعد تو اس گھر پر آپ کا حق اور بھی بڑھ گیا، ان کا کون سا بیٹا ہے، پتا کریں مکان کے کاغذات کس کے پاس ہیں۔"

زندگی میں پہلی بار اعظم شاکرہ پر چلائے تھے۔

"لعنت بھیج دی میں نے اس گھر پر، جس کی وجہ سے میرے خونی رشتے ختم ہو گئے اور آئندہ اگر تم نے ذکر کیا تو تمہیں اسی گھر میں چھوڑ آؤں گا۔ آئی سمجھ۔"

چل سو چل زندگی پانچ سال آگے بڑھ گئی تھی، گھر کے مکین رنجشوں کو پالتے، اِدھر اُدھر زندگی گزارتے رہے۔

☆☆☆

اعظم کو دفتر سے تین چار دن کی چھٹی ملنی مشکل تھی، ندا کسی صورت ٹلتی نہ تھی، شادی کے بہانے اسے ایبٹ آباد کی سیر کرنا تھی، شاکرہ نے ہر وقت کی بحث یہ کہہ کر سمیٹ دی۔

"ایبٹ آباد ہی تو جانا ہے، بسیم، ندا کو لے جائے، اعظم کو اگر چھٹی مل گئی تو ہم شادی میں شامل ہو جائیں گے۔"

مارچ کے پُر بہار دن اور ایبٹ آباد کا قدرتی پُر فضا مقام، اچھی خاصی ٹھنڈ کے باوجود بھی تین دنوں میں بسیم نے ایبٹ آباد کے تمام قریبی مقام ندا کو گھما پھرا کر دکھائے۔ صبح ناشتہ کرتے ہی کہیں نکل جاتے، شام کو واپسی، مہندی والے دن بھی وہ صبح کے نکلے۔ شام تک نہیں لوٹے تھے، اُدھر دادی، ربیکا کا خیال کر کے مہندی سے خاصی دیر پہلے وہاں پہنچ

https://reading.com

بھی نہیں تھا، تیاری کا اچھا خاصا وقت آسانی سے مل گیا۔ اس وقت سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ربیکا نے میک اپ، جیولری کی کوئی چیز نہیں تھی جو خود پر لادی نہ ہو اور پھر لڑکیوں کا من پسند مشغلہ، ایک جگہ پر چار چار سیلفیاں لینے کا، سدرہ، دادی، خالہ کے ساتھ تصویریں بنانے کے بعد وہ باہر والے احاطے میں آگئی، گھنے درختوں میں چمکتی سفید لائٹنگ کے سامنے منہ کے مختلف پوز بناتے پل بھر کے لیے وہ چونک سی گئی تھی۔ اسکرین میں اس کے دیدہ زیب عکس سے کچھ فاصلے پر ہی ایک اور عکس بھی دکھائی دے رہا تھا۔

''سینڈل والا۔'' ربیکا نے منہ میں بدبداتے گردن گھما کر پیچھے دیکھا تھا، بسیم کسی سے مخاطب تھا۔

''راستے میں فون سننے کی تمہیں پتا نہیں کون سی بیماری ہے۔۔ اندر آ کر سن لو۔''

بسیم نے بولتے بولتے چہرا سامنے کیا۔ ربیکا ہی کی طرح وہ بھی چونک سا گیا تھا، یہ پل بھر کا چونکنا، صرف نگاہوں تک محدود نہیں تھا، بلکہ دل کے گھنٹہ گھر کی رکیں پھاڑتی گھنٹیاں، انہیں چار اطراف محسوس ہوئی تھیں۔ کہتے ہیں محبت الہام ہوتی ہے، بلا جواز پنپتی ہے اور بے سبب پھیلتی ہے، لیکن یہاں تو اس کے پنپنے اور پھیلنے کا سبب وہ خونی رشتے تھے، جواب تک صرف اپنی ہی رگوں کو گرماتے رہے، لیکن اس لمحے ان کی تپش رخساروں پر بھی نمایاں ہوئی جس میں ربیکا کے رخسار بلش آن سے زیادہ خون کی حدت سے چمکے تھے۔

''آپ!''

ندا فون بند کرتے ہوئے گیٹ سے آگے بڑھی حیرت سے پوچھ رہی تھی۔ ربیکا بھی اچھی خاصی کنفیوز تھی۔ ''ہاں..... وہ میں..... یہ سدرہ، میری کزن۔ لیکن آپ یہاں، مطلب۔''

''ریلی۔'' ندا کہتے ہوئے اس سے لپٹ۔

''چلو پھر اندر ذرا اپنے اپنے تعلق کا تعارف تو ہو جائے۔'' ندا اس کا ہاتھ تھامے اندر کی جانب بڑھی، بسیم کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اسے یہ اچانک ہوا کیا ہے، یہ دنیا کی کوئی پہلی یا آخری لڑکی تو تھی نہیں جو اس کی حسیات پر حاوی ہوئی تھی۔ آفس میں بے شمار لڑکیاں آتی جاتیں اور پھر کئی گھنٹے ساتھ کام کرتی تھیں، نہ وہ دل پھینک تھا نہ ہی بدنظر لیکن اس تمام فنکشن میں میرون چمک دار میکسی میں ملبوس ربیکا سفید لائٹنگ سے زیادہ دل میں کہیں اندر تک چمک اٹھی تھی۔ نظر انداز کرنے کے باوجود نگاہ بھٹک بھٹک کر اس کی جانب اٹھتی اور جب یہ واضح ہو گیا وہ تایا صدیق کی بچ جانے والی اکلوتی اولاد ہے۔ بھٹکتے دل میں کہیں سناٹا سا اتر آیا تھا۔ دادی پتا چلتے ہی اپنے مخصوص انداز میں واری صدقے گئی تھیں، بہت محبت سے ملیں مگر اس سینڈل کو نہیں بھولی تھیں۔ سب کو پہلی ملاقات کا ذکر تفصیلاً سنایا۔ آسیہ بھی بناوٹی خلوص سے ہی ملیں، ندا کے دانت اندر نہیں جا رہے تھے۔ ربیکا کا ہاتھ تھامے ایسے بیٹھی تھی جیسے کوئی قیمتی سرمایہ ہاتھ لگ گیا ہو۔ بہن تو قسمت میں لکھی نہیں تھی، مگر پلی پلائی، پیاری بھولی سی کزن یوں سر راہ مل گئی۔ ربیکا بھی خوش تھی البتہ بسیم صرف چپ تھا، کچھ دیر پہلے والی نگاہ کی چمک اب اس دیے کی مانند تھی، جو تیز ہوا کے جھونکے سے بجھا ہو اور دھواں نہ اگلنے پر خاموش احتجاج سے مر رہا ہو۔

☆☆☆

مہندی کا ہنگامہ تھمتے ہی سب اپنے اپنے ٹھکانوں پر لوٹ گئے تھے، گرم شال لپیٹے بسیم کچھ دیر چہل قدمی کرنے کے بعد گیٹ کے پاس بنی پتھر کی راہ داری کے ایک جانب زمین پر ہی ٹک گیا ایسے، جیسے کسی سوچ میں گم ہو۔ ربیکا نے اسے کمرے کی کھڑکی سے وہاں بیٹھے دیکھا، پھر ایک نظر اپنے قریب لیٹی دادی، خالہ اور ندا کو جو بے خبر سوئی خراٹوں کی موسیقی میں اپنی تھکاوٹ اتار رہی تھیں۔ چادر اپنے گرد لپیٹے دبے پاؤں وہ

باہر آ گئی۔ رات کا سناٹا، نیم تاریک لان، حشرات کی آوازیں، باہر چشموں کے پانی سے بھیگ کر آتی تازہ سبزے کی خوشبو رات کے سناٹے کو سحر بخش رہی تھی، گہری سوچ میں ڈوبا بسیم یک دم پیچھے سے ربیکا کے ”ہائے۔“ کہنے پر چونکا۔ وہ بولا تو کچھ بھی نہیں سوالیہ انداز میں اسے دیکھے گیا۔

”وہ میں پانی بنا رہی۔ نہیں نہیں چائے۔ قہوہ۔ ہاں قہوہ بنا رہی تھی۔ پئیں گے آپ؟“

”وہ کیا چیز بن رہی ہوگی، جس کے بارے میں آپ خود کنفیوزڈ ہیں۔“

طنز آ گئی اس کی بات پر شرمندہ ہونے کے بجائے اس نے پوری ڈھٹائی سے کندھے اُچکاتے ہوئے کہا۔ ”اکچوئلی میں نے بنائی نہیں، بنانے جا رہی تھی۔ اگر آپ پینا چاہیں تو۔“

”نہیں۔ سوری میں آدھی رات کو اٹھ اٹھ کر کچن میں جھانکنے کا شوقین نہیں۔“

ربیکا تو سنتے ہی سر سے پاؤں تک جھلس گئی، دانت آپس میں کچکچائے۔ سرخ پڑتی پتلی سی ناک ہلکی سی پھولی۔ ”آپ کا کیا مطلب ہے میں چوہیا ہوں، جو رات کو اٹھ کر کچن میں پھدکتی پھروں۔ کھڑکی سے آپ پر نگاہ پڑ گئی، تو یہ دیکھنے آ گئی کہ چوکیدار سردی سے مر تو نہیں گیا، چائے دے آؤں۔ آخر شادی کا گھر ہے، کوئی ڈاکہ شاکہ نہ پڑ جائے۔ ہونہہ، جھانکنے کے شوقین۔“

اس کے تپے تپے انداز میں رخ پھیرنے پر بسیم کے ہونٹ مسکان میں پھیلے، ربیکا جانے لگی تو اس نے آواز دے کر ہلکا سا مسکرا دیا۔

”ایکسکیوز می۔ بات تو سنیں، آپ تو خفا ہوگئیں۔“

”میں اپنوں سے خفا ہوتی ہوں، ہر ایرے غیرے سے نہیں۔ آپ سمجھتے کیا ہیں خود کو؟“

”آپ کا چچازاد۔“

وہ پھر سے مڑ گئی۔ بسیم زمین سے اٹھ کر اس کے مقابل کھڑا ہو گیا۔

”ایک بات پوچھنا تھی آپ سے؟“

”اب یہ مت پوچھیے گا، آپ اتنے عرصہ کہاں، کیوں کیسے نہیں ملیں۔ کیوں کہ ہم دونوں بہت اچھی طرح جان چکے ہیں۔ ہمارے والدین کے درمیان ناراضی تھی، لیکن ہم آج پہلی بار ایک دوسرے کو دیکھنے کا شرف حاصل کر چکے ہیں۔“

”پہلی بار تو نہ کہیں، دو بار پہلے بھی مل چکے ہیں۔“

”جی جی۔ بحیثیت کزن تو آج ہی تعارف ہوا ہے۔ خیر کیا کہنا تھا آپ کو، جلدی کہیں، فالتو وقت نہیں ہے میرے پاس۔“

اس کا جھنجلایا انداز خاصا پُرلطف لگا تھا۔ لحہ کے توقف سے بسیم نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں، جیسے سچ جاننا چاہتا ہو۔

”تایا ابو کی ڈیتھ کے بعد آپ نے ہمارے گھر آنے کے بجائے خالہ کے، بلکہ خالو کے گھر کو فوقیت دی۔ حالانکہ خالو کے گھر سے چچا کا گھر زیادہ محفوظ پناہ گاہ نہیں تھا۔“

سنتے ہی ربیکا کے چہرے کا سارا بھولپن اور شوخ لکیریں رات کی سیاہی میں کہیں دور تک پھیل کر مٹ گئیں، جب بولی تو لہجے میں علاقے کی ٹھنڈ کا بسیرا تھا۔

”گھروں میں داخل ہونے کے لیے، دروازے اور راستے کا ہونا بہت ضروری ہوتا ہے۔ بنا راستے، دروازے کے کسی گھر میں کوئی داخل نہیں ہو سکتا ہے۔“

”میں سمجھا نہیں؟“

”اتنی تو مشکل بات نہیں کی میں نے۔ اونچی دیواروں کے گھر میں داخل ہونے کا ایک ہی طریقہ ہے، چھت سے چھلانگ لگائی جائے، نہ پکڑے جاؤ تو ٹانگ ٹوٹتی ہے، پکڑے گئے تو عزت۔ مجھے اپنی ٹانگیں اور عزت دونوں بہت عزیز ہیں مسٹر بسیم، باقی آپ سمجھدار ہیں۔“

وہ کہہ کر رکی نہیں بلکہ تیزی سے اندر کی جانب

بڑھ گئی۔ بسیم وہیں کھڑا رہ گیا۔ لفظ "اونچی دیواروں کا گھر۔" اس نے کئی بار منہ ہی منہ میں اجنبیت سے دہرایا۔

☆☆☆

کسی بات کی کھال نکالتے بسیم کو شاکرہ نے پہلی بار دیکھا تھا، اس کی تو شروع دن کی عادت تھی، خاموشی سے بیٹھا سنتا رہتا، ماضی کی جن کڑوی کسیلی باتوں سے حال یا آنے والے وقت کا کوئی تعلق بنتا محسوس نہ ہو۔ ان کو تو بالکل بھی نہیں کریدتا تھا، لیکن جب سے سدرہ کی شادی سے آیا تھا اس نے کوئی دس بار اعظم سے ایک ہی بات پوچھی تھی۔

"آخر قطع تعلقی کا کوئی سالڈ ریزن تو ہو۔ ایک ہی شہر میں وہ برسوں سے رہ رہی ہے، اور ہم صورتوں سے واقف نہیں۔"

"یار مجھے نہیں علم، وہ یہاں اپنی خالہ کے گھر ہوتی ہے، مجھے تو یہی پتا تھا اس کے پاس نانی آگئی ہے، ورنہ قطع تعلقی کیسی، میں جا کر مل آتا۔"

اعظم کا کھسیانا لہجہ اسے مزید چبھا

"کیوں نہیں علم، کیوں جا کر پتا نہیں کیا۔ آپ کے مرحوم بھائی کی اولاد ہے وہ، خون ہے آپ کا، عزت ہے آپ کے خاندان کی، پھر آپ لاعلم کیسے رہے۔ اور اب سے پہلے تو آپ نے کبھی ذکر نہیں کیا۔ صدیق تایا کی کوئی بیٹی بھی تھی، کہاں ہے کہاں نہیں۔ ابو اپنے خاندان کے بچے کو کوئی کیسے بھول سکتا ہے، اور پھر لڑکی۔۔۔ حد ہے آپ کی لاعلمی کی۔"

"ہزار بار تمہیں بتایا تو ہے تمہاری تائی کو ہمارا ملنا جلنا پسند نہیں تھا، اپنے میکے والے جو وہاں بسانے تھے۔ پھر تمہاری پھوپھیوں سے پتا چلتا رہتا تھا، ہر بات تو تمہیں بتانے کی نہیں ہوتی۔"

"امی ہر بات نہ سہی، لیکن اپنے فرسٹ ریلیشنز کی تو آگہی ہونی چاہیے۔ کیوں ابو؟"

اعظم ہمیشہ کی طرح آج بھی چپ تھے۔ شاکرہ تلملا کر رہ گئیں۔

"باپ سے ایسے پوچھ رہے ہو جیسے تم باپ لگے ہو۔" بیٹے کو ڈپٹنے والے انداز میں کہہ کر اب میاں پر برسیں۔

"اسی لیے تمہارے خاندان میں انہیں اکیلا نہیں بھیجتی۔ ایک ہی بار گئے ہیں۔ دونوں بچے، میرا دماغ کھا گئے۔ تایا کی بیٹی نہ ہوگئی، کشمیر کا بارڈر ہی بن گیا، یہاں کیوں تو وہاں کیوں۔"

شاکرہ کی اس قدر کوفت پر بسیم تاسف ہی کر سکتا تھا۔

"میرا خیال ہے، پچیس سال ہو گئے آپ کی شادی کو، ابھی بھی ابو کا خاندان آپ کا نہیں بنا۔ حالانکہ اسی خاندان میں آپ کے اپنے دو بچے بھی شامل ہیں۔"

بسیم کہہ کر رکا نہیں اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ حیرت سے شاکرہ کا منہ کھلا، شروع سے مرنجا مرنج اعظم بھی بیٹے کے انداز پر چونک سے گئے۔

☆☆☆

اس بات کو کئی دن ہو چکے تھے، لیکن بسیم کے اندر لگی گرہ "اونچی دیواروں کے گھر۔" کسی طور کھل نہ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا ربیکا نے یہ بات آخر کہی کیوں، پانچ سال پہلے تایا صدیق کی ڈیتھ ہوئی تھی اور تب ربیکا پندرہ سال کی تھی، اتنی چھوٹی عمر میں مزاج کا اتنا اندازہ کوئی کیسے لگا سکتا ہے۔ ندا تو جلد ہی ماں سے ڈر کر سوچوں کا موضوع بدل چکی تھی لیکن بسیم وہیں اٹکا تھا۔ اس کے بدلے انداز شاکرہ سے کسی طور نہ چھپے تھے، اسی لیے اس کی سوچوں کا محور بدلنے کے لیے انہوں نے بسیم کے لیے رشتے دیکھنے تیز کر دیے، اس روز بھی وہ کہیں رشتہ دیکھ کر آئی تھیں اور بیٹھ کر لڑکی اور اس کے خاندان کی تفصیل دل جمعی سے بتا رہی تھیں۔ بسیم ساری بات سن کر صرف یہ کہہ کر اٹھ گیا۔

"اس بات کی کیا شیوریٹی ہے، کل وہ یہاں آ کر، میرے خاندان کو اپنا خاندان بھی سمجھے گی؟"

اعظم کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرایا۔ شاکرہ البتہ غصے میں لال پیلی ہو گئیں۔

ہے مجھ سے، ساس نندوں کی طرح طعنے دے رہا ہے۔ان کی پرورش میں، کیسی کیسی قربانیاں دیں ہم نے، ساری حقیقت بتاؤ اسے، کیا کیا تھا اس کے تایا نے۔"

"تم خواہ مخواہ اپنا بی پی ہائی کر رہی ہو۔ میں سمجھاؤں گا اسے۔"

"ہاں آپ نے سمجھالیا اور وہ سمجھ گیا۔" اعظم سر جھٹک کر اخبار میں گم ہوگئے۔ پاس بیٹھی ندا جو خاموش تماشائی بنی تھی۔ شامت کی ماری نے اٹھ کر پانی کا گلاس ماں کو پیش کیا اور شاکرہ بجائے پانی پینے کے اسے گھورنے لگیں۔

"تم جو اس وقت معصوم بنی بیٹھی ہو نا، سب سمجھتی ہوں، ہر وقت بھائی کے کان میں جو کھسر پھسر چلتی رہتی، خبردار جو اس لڑکی کا آئندہ نام بھی لیا۔"

عین اسی وقت بسیم کہیں جانے کے لیے کمرے سے نکلا تھا۔ ماں کا انداز اندر تک چبھ گیا۔

"کیوں امی، کیوں ربیکا کا نام نہ لیں۔۔وہ اس خاندان کی لڑکی ہے، بالکل ندا کی طرح، اگر باپ زندہ نہیں ہے تو اسے باپ کے بھائی کے پاس ہونا چاہیے نا کہ، ایکس وائے زی کے گھر۔"

"ہاں۔انہی کے لیے سب گھر بنے ہیں، اُسے ہی گھر میں ہونا چاہیے، ماں کو تنبو لگا کر باہر بٹھا دو۔"

شاکرہ کی برداشت جواب دے گئی وہ سامنے سے ہٹ گئیں۔ بسیم نے اپنے غصے کو قابو کرنے کے لیے نچلا ہونٹ اتنی سختی سے کاٹا کہ خون کے قطرے نکل آئے تھے۔

☆☆☆

دادی نے محسوس کیا ربیکا اب پہلے والی ربیکا نہیں رہی تھی۔ اس کے چہرے سے ہر وقت کی شرارت، انداز میں شوخی کسی سوچ میں گم سی ہوگئی تھی۔ وہی ربیکا لاؤنج میں بیٹھی دادی سے اتنی بلند آواز میں بات کرتی تھی کہ کچن میں کام کرتی آسیہ کو

اور اس کی جو سارا دن چھیڑ چھاڑ چلتی تھی وہ الگ، مگر اب یونی سے آتے ہی کتابوں میں سر گھسائے خاموش بیٹھ جاتی ہے یا کمبل لپیٹے لیٹ جاتی۔ حالانکہ کئی بار نفیسہ نے جان بوجھ کر صرف اسے تنگ کرنے کے لیے، آنے بہانے اٹھایا۔ مقام حیرت تھا ربیکا جو دس پکارنے پر بھی کسمسا کر ہلتی تھی پہلی پر سیدھی ہو جاتی۔

"جی دادی۔کوئی کام ہے؟"

"ہاں یہ میرے بستر کی چادر جھاڑ کر صحیح کردو، بہت شکنیں پڑ رہی ہیں۔"

وہ جھٹ سے اٹھی اور چادر جھاڑ کر بچھا دی۔ دادی کی تحیر بھری نگاہ اس پر ٹکی رہ گئی، کہاں ایک دن میں تیسری بار چادر صحیح کروائی تھی۔ کبھی تین دن میں ایک بار کرنی پڑ جاتی تو صاف کہہ دیتی۔

"دادی چہرے کی شکنوں کی طرح چادر کی شکن سے بھی سمجھوتا کرلیں، اس عمر میں انسان کو شکنوں سے پیار ہو جاتا ہے۔" اور اس وقت اس نے چادر ٹھیک سے جھاڑ کر اس پر تکیہ جمایا اور بہت معصومیت سے پوچھا تھا۔

"دیکھیں، اب ٹھیک ہے دادی۔۔"

"ہاں چادر تو ٹھیک ہے۔" نفیسہ نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا تھا "لیکن میری بچی ٹھیک نہیں لگ رہی۔ بتاؤ کیا بات ہے۔۔۔"

"کیسی بات، کچھ بھی نہیں، میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔ کیوں آپ روز ایسے پوچھتی ہیں؟"

دادی اس کے چہرے کو ایسے دیکھ رہی تھیں، جیسے طالب علم امتحان کے دنوں میں کتاب کو دیکھتا ہے۔

"کیا سمجھتی ہو، میں تمہیں جانتی نہیں، اتنی عمر ہے میری، اولاد کا چہرا پڑھ کر دل کا حال جان جاتی ہوں، اور تمہیں تو اولاد سے بڑھ کر میں نے چاہا ہے۔"

"اچھا۔" اس نے ان کے گلے میں بازو

ڈالتے پیار سے پوچھا۔ ''پھر بتائیں کیا لکھا ہے میرے چہرے پر۔''

''یہی کہ اب تم میری سہیلی نہیں پوتی بن گئی ہو، کوئی بات ہے جو مجھ سے چھپا رہی ہو۔'' ربیکا ہنسنے لگی۔

''یوں بے تکا ہنسنے سے اگر دکھ چھپ جاتے، تو دنیا اب تک پاگل خانے میں بدلی ہوتی۔ بتاؤ کیا بات ہے، کیا کھٹک رہا ہے۔''

اب ربیکا انہیں کیا بتاتی اس نے اپنے چہرے کے زاویوں سے۔ انہیں شک نہیں ہونے دیا تھا۔ فی الوقت امتحانوں کی ٹینشن کہہ کر ٹال دیا۔

☆☆☆

اسے تو خود بھی معلوم نہیں تھا اسے ہو کیا گیا ہے، شادی سے تو واپس آگئے تھے لیکن لگتا تھا دل وہیں کہیں بہتے چشموں میں پھسلا کہیں دور نہ بہتا نکل گیا تھا۔ چچا اعظم یا ان کی فیملی کے بارے میں کبھی کچھ نہ اچھا سنا تھا، نہ کبھی جاننے کا شوق ہوا۔ یہاں تک کہ ابا کے جنازے میں ـــــ آئے اور باہر کے باہر ہی چلتے بنے۔ تب بھی خواہش نہیں ہوئی باپ کے بھائی کو دیکھا جائے۔ بسیم کو پہلے بھی دو بار دیکھ چکی تھی۔ لیکن اب جو اتنے قریب سے دیکھا اور تعلق کا پتا چلا۔ ذہن اس کی آنکھوں اور آواز میں اٹک سا گیا تھا، دونوں چیزیں بالکل صدیق پر تھیں، یا خون کی کشش تھی۔ اس نے کئی بار آسیہ سے باتوں باتوں میں تذکرہ کیا تو چچا اعظم کے نام پر ان کے ماتھے کی تیوری دیکھ کر مزید کریدنے کی کوشش نہیں کی۔ اتنا تو پتا ہی تھا مکان کا کوئی جھگڑا تھا۔ دادی پہلے تو اعظم چچا کی شخصیت سے بہت مرعوب لگتی تھیں لیکن شادی سے واپسی پر ان کے خیالات بدل سے گئے تھے۔

جب ان سب کا آپس میں تعارف ہوا، خوش گوار حیرانی تو ہوئی سو ہوئی، ندا نے یہ بتاتے ہوئے۔ ''ابو امی بھی کل آرہے ہیں، تم سے مل کر کتنے خوش ہوں گے وہ۔'' فوراً ماں کے نمبر پر فون بھی ملا دیا۔ وہ بے تحاشا خوشی سے ماں کو ربیکا کے متعلق تفصیل بتا رہی تھی، لیکن بات کرتے کرتے اس کا چہرا بجھ گیا۔

''کیا مطلب ہے اب آپ لوگ نہیں آرہے۔ لیکن کیوں۔ اچھا ٹھیک ہے۔''

کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ دادی اسی کو دیکھ رہی تھیں پوچھنے پر کچھ خاص نہیں بتایا اس نے، لیکن ایک جانب ہو کر بسیم کو بتاتے ہوئے، بہر حال دادی نے سن ہی لیا۔

''امی کہہ رہی تھیں، ربیکا سے زیادہ فری ہونے کی ضرورت نہیں ہے، اور شادی سے فارغ ہوتے ہی جلد گھر پہنچو۔''

''تم نے پوچھا نہیں کیوں۔''

''سب باتیں فون پر ہی پوچھ لیتی، تاکہ وہاں سے ہی جوتا ماریں، بہت غصے میں لگ رہی تھیں۔ گھر جا کر پوچھ لیں گے۔''

''جو باتیں ہمیں اتنے سال پتا نہیں چلیں، اب پتا چل جائیں گی، میں خود ربیکا سے پوچھ لیتا ہوں۔''

''کیا ضرورت ہے تماشہ لگانے کی، امی نے منع کیا ہے تو ٹھیک ہے، بس۔''

بسیم اسے گھور کر رہ گیا، دادی بھی پیچھے ہو گئیں اور عین اسی وقت دل بھی اعظم اور شاکرہ سے ہمیشہ کے لیے دور ہو گیا۔ ایسی بھی کیا انا پرستی' ذرا سی بات پر تعلق ہی توڑ لو۔ دادی نے بھی مزید انہیں منہ نہیں لگایا تھا۔ نہ ہی واپسی پر ربیکا کے بار بار کے ذکر کو توجہ دی، لیکن ربیکا کے اندر کھد بد لگ گئی تھی۔ عمران خالو کا سر کھانے کے بعد صرف اتنا ہی پتا چلا تھا۔

''میرے بچے کن باتوں میں خود کو الجھا رہی ہو، تمہارے ابا اور چچا کا صرف جائیداد کی تقسیم پر معمولی جھگڑا تھا، لیکن بات جھگڑے کی نہیں ہوتی بیٹا، یہ ہمیشہ معمولی معمولی اختلاف پر ہی ہوتا ہے، لیکن اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی انا کی چپ اُسے اتنا گہرا کر دیتی ہے، جو ہر تعلق، ہر رشتہ ہڑپ

کر جاتا ہے۔"

بھلے آسیہ کی اپنی اولاد نہیں تھی لیکن ربیکا کا شادی کی تصاویر بلاوجہ گھنٹوں کے حساب سے دیکھنا، اعظم کی فیملی خاص کر بسیم کے ذکر پر اس کے چہرے اور آنکھوں کی الوہی سی چمک انہیں جھانکنے کے لیے بہت تھی اور پھر جس طرح سے وہ قطع تعلقی کے بارے میں اتاؤلی ہوئی ایک ایک سے پوچھ رہی تھی۔ وہ اس کی کیفیت سمجھ رہی تھیں، اس سے پہلے کہ وہ سوچوں میں مزید آگے بھٹکتی۔ انہوں نے اسے سمجھانا ضروری سمجھا۔

"ہوسکتا ہے میرا وہم ہو ربیکا، لیکن ماں کی جگہ ہونے کے ناتے، تمہیں سمجھانا ضروری سمجھتی ہوں۔"

ربیکا نے چونک کر دیکھا اندر کا چور لہجے میں جھلک گیا۔ "کیسا وہم۔ خالہ؟"

"یہی کہ اگر تم بسیم کے بارے میں کچھ سوچ رہی ہو، تو سوچوں کا رخ یہاں سے ہی موڑ لو، تمہاری چچی نے آج تک فرخندہ باجی کو اپنے آگے کچھ نہیں سمجھا اور پھر پراپرٹی والے جھگڑے پر جس طرح ہر رشتہ دار، محلے میں انہیں بدنام کیا۔ ان سے آگے کیا امید رکھی جاسکتی ہے۔" ربیکا کھسیانی ہو کر اپنے ہونٹ چبانے لگی تھی۔ "دیکھو، یہ مت سمجھنا، میں تمہیں تمہارے اپنوں کے خلاف کر رہی ہوں، لیکن بیٹا جس کام کے انجام کا پتا ہو، اس کی ابتدا کرنی ہی نہیں چاہیے۔"

"ایم سوری خالہ۔" وہ مزید کھسیا گئی۔

"تمہیں شرمندہ ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ اگر تم میرے پاس رہی ہو تو بیٹا اچھے برے کا بتانا میرا فرض ہے، تمہاری تائی کا باجی کے ساتھ بغض کی وجہ سے میرا دل ابھی تک میلا ہے۔ اس لیے میں نہیں چاہتی ان کے ساتھ مزید کوئی تعلق بنایا جائے۔"

خالہ کے حتمی انداز پر اس کے دل میں جو بھی ہلچل مچی تھی، لیکن نگاہ اٹھا کر وہ ایسے مسکرائی جیسے خالہ کسی بہت بڑی غلط فہمی کا شکار ہیں۔

"آپ نے کیسے اندازہ لگالیا، کہ میرے دل میں بسیم کے لیے کچھ ہے، مجھے کیوں اس میں دلچسپی ہونے لگی، شکل دیکھی ہے اس کی، اجڑے درخت جیسی، آپ بھی ناں خالہ۔"

اپنی آواز کا کھوکھلا پن اسے اندر تک چیر رہا تھا، آنسو اور لہجے کی نمی کمال طریقے سے ضبط کر رکھی تھی، آسیہ کے مسکرا کر اٹھنے اور گال تھپتھپا کر باہر چلے جانے کے بعد یہ اندازہ لگانا مشکل تھا۔ وہ ہنس رہی ہے یا رو رہی ہے۔ موتی آنکھوں کے اندرونی کونے پر چمکے لیکن انگلیوں کی بے رحم پوروں نے سختی سے دبا کر ان کا گلا وہاں ہی گھونٹ دیا۔ ایک بات وہ پورے دھیان سے دہرا رہی تھی جیسے خود کو اچھی طرح سے یقین دلا رہی ہو۔

"میں کیوں اس کے بارے میں سوچوں گی، میرا بھلا کیا لگتا ہے، بسیم۔ میرا کوئی تعلق ہے ہی نہیں، میں نہیں سوچ رہی اسے، ایسے ہی خوامخواہ۔"

آنکھیں بھیگ رہی تھیں، دل کا لہجہ بے ربط ہونے سے جبڑے بھاری ہونے لگے، کچھ چیزیں دبا کر بھی نہیں دبتیں۔ جیسے آنسو، ایک کونے میں دبائے، تو حلق میں گرنے لگے، بالآخر رخسار پر پھسل ہی گئے، وہ اپنے رخسار پونچھ کر سوتی بن گئی۔

☆☆☆

بسیم کا معمول بدلنے کا نام نہیں لے رہا تھا، عین اس کے گھر جانے کے وقت یونی کی سڑک کے ایک جانب گاڑی لیے کھڑا ہو جاتا، اندر تو ملاقات مشکل تھی، اس نے روڈ کو ٹھکانہ بنالیا، کتنی بار ربیکا نے یہاں آنے سے اسے منع کیا تھا، ایک دن تو باقاعدہ الجھ پڑی۔

"پلیز۔ کتنی بار آپ سے کہا ہے، یہاں ایسے مت کھڑے ہوا کریں، مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔"

"آپ کا کیا خیال ہے، مجھے اچھا لگتا ہے۔"

اس نے سیاہ عینک اتار کر اپنی جیب میں لگائی اور جما جما کر بولا۔ "اور مجھے یہ بھی اچھا نہیں لگتا، میری ذمہ داری تنہا سڑک پر چلے اور پہلے سے بھری بسوں میں

ڑی ہو کر، گھر تک پہنچے، جب کہ اسی راستے پر میں
اپنی گاڑی میں سفر کر رہا ہوں۔"

"اس ذمہ داری کا احساس پانچ سال پہلے کہاں تھا؟" ربیکا کچھ تلخ ہو گئی تھی

"پانچ سال پہلے علم نہیں تھا۔ اب ہے تو احساس کا ثبوت دینے کے لیے آتا ہوں۔ چلیں آئیں۔"

"مسٹر بسیم آپ کو بہت اچھی طرح اندازہ ہو گیا ہو گا، میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی، پھر۔ روز روز آنا، بلاوجہ کی ضد۔"

دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے، جیسے وہ قائل ہونے نہیں قائل کرنے کے لیے پیدا ہوئے ہوں۔ لہجے خود بخود ٹھوس اور قطعی ہوتے جا رہے تھے۔

"میرا تواتر سے آنا اس بات کا یقین ہے ایک دن آپ مان جائیں گی۔ کیوں کہ ہمارے درمیان کوئی ناخوشگوار پہلو نہیں ہے اور اگر ہے تو ہم دونوں اس سے لاعلم ہیں۔"

ربیکا نے کوفت بھری سانس کھینچتے ہوئے دوسری جانب رخ پھیر لیا۔ جیسے وہ اب جھنجلاہٹ کا شکار ہو رہی ہو، لیکن وہ اپنی بات کہے گیا۔

"مجھے خود بھی اندازہ نہیں ہے یہ خون کی کشش ہے یا صرف دل کی من مانی، لیکن اس وقت یہاں سے گزرتے میری گاڑی کے ٹائر خود بخود رک جاتے ہیں۔ ضد مت کیا کریں۔"

"یہ ضد نہیں ہے۔ میری درخواست ہے، ہم ایک دوسرے کے لیے انجان اور بے ضرر رہے ہیں، یونہی رہیں تو زیادہ بہتر ہو گا۔"

"لیکن کیوں؟" وہ سراپا احتجاج تھا۔

"کیوں کا تو مجھے بھی نہیں پتا، کہ ایسی کون سی قتل و غارت ہو گئی تھی، کہ بندہ اپنے خاندان سے متعارف بھی نہ ہو۔ سو پلیز اب مت آیئے گا، خیال کریں میرا، میں ایک لڑکی ہوں۔"

ربیکا کہہ کر تیز تیز قدموں سے آگے بڑھی، بسیم پیچھے سے کہہ رہا تھا۔

"لیکن میں اس کیوں کا پتا لگا کر رہوں گا، سن لیا، ربیکا بی بی نہیں بلکہ لڑکی صاحبہ!"

اس نے چلتے چلتے پلٹ کر دیکھا، بسیم اپنی عینک آنکھوں پر دوبارہ لگاتا اسے گھور رہا تھا۔ وہ متاسفانہ اسے دیکھتی آگے بڑھ گئی، اس نے پتا لگایا تھا یا نہیں، البتہ اس دن کے بعد وہ دوبارہ اس سے ٹکرایا نہیں تھا۔ جس کی ربیکا کو کچھ تشویش بھی تھی، لیکن ذکر کرتی بھی تو کس سے، خالہ کو یقین دلانے کے لیے خواب پر بھی پہرے بٹھا دیے تھے۔ دادی کے سامنے بناوٹی چہرا لیے پھرتی۔ بس آئینہ تھا جو مسکراہٹ میں چھپا درد جانتا تھا، محبت ہو تو جاتی ہے لیکن اس کا اقرار وہ بھی ایک لڑکی کے لیے بے حد مشکل امر ہے۔ ایک طرف ماں باپ کی تربیت پر حرف آنے کا ڈر، دوسرا محبوب کے دھوکے کا۔ اسی خوف کے درمیان وہ محبت نامی اقرار سے اندر ہی اندر سہی جا رہی تھی۔

☆☆☆

وہ آفس سے کچھ دیر پہلے ہی آ کر بیٹھا تھا، شاکرہ پھر سے دیکھ کر آنے والے رشتے کی پوری تفصیل سنانے لگیں۔ انداز سے لگ رہا تھا، لڑکی اتنی پسند آئی ہے، کہ کل ہی بارات لے جائیں گی، بسیم چڑ کر بولا۔

"ربیکا میں کیا برائی ہے؟"

"کیا یہ برائی کم ہے، وہ تمہاری ماں کو ناپسند ہے۔"

"امی! کسی کو ناپسند کرنے کی کوئی وجہ ہوتی ہے؟" وہ بدمزا ہوا تھا۔

"تم بچے نہیں ہو جو سمجھ نہ سکو، اس کے باپ کی وجہ سے ہم نے دھکے کھائے ہیں، کرائیوں پر رلے ہیں اور وہ تمہارے باپ کے حصے پر عیاشی کرتے رہے، تمہارے تایا نے اپنی کمائی پر سارا سسرال پالا ہے، بھائی کو اس کا اصل حق تک نہیں دیا۔"

"تو ابو لیتے ناں، اس وقت لیتے، لڑ جھگڑ کر

طنزیہ لہجہ، ریکا اچھی خاصی حیران ہوئی تھی "جی میں ریکا ہی بات کر رہی ہوں۔۔ آپ کون؟"

"تمہاری چچی۔ پہچانا۔"

سن کرنا صرف اس کی آنکھیں کھلی تھیں، سانس بھی رک کر آئی تھی۔ یہ تو بھی سان گمان میں بھی نہیں تھا یوں اچانک وہ بھی کال بھی کر سکتی ہیں۔ یہ نمبر اس نے بسیم کو کیا، ندا کو بھی نہیں دیا تھا نہ اس نے مانگا، اور نمبر لینا شاکرہ کے لیے کون سا مشکل کام تھا۔ بسیم کا دن بہ دن بڑھتا خاموش رویہ دیکھ کر شاکرہ نے یہی نتیجہ نکالا ایک بار خود ہی اس مسئلے کو دیکھ لیں۔ انہوں نے پہلے سدرہ کو کال کی، اس سے ریکا کا نمبر لیا تھا۔

"چچی جان پہچانتی تو تب، جب پہلے کبھی آپ کی آواز سنی ہوتی۔۔"

ریکا کے معصومیت بھرے لہجے پر وہ چمک کر بولیں۔ "تو اب کان کھول کر سن لو، خدا کے واسطے میرے بیٹے کا پیچھا چھوڑ دو، جو کچھ ہمارا تھا، وہ پہلے ہی تمہارے ابا ہتھیا چکے ہیں، بیٹا بچا ہے، مہربانی کر کے اسے بچا رہنے دو۔"

دو ٹوک بات کر کے فون تو بند ہو گیا تھا لیکن ریکا کے اندر شرارے سے بھر گئے تھے۔ اسے لگا گرم لپٹیں اس کے کانوں سے ہی نہیں بلکہ سارے بدن سے نکل رہی ہیں۔ محبت ڈراتی ہے، خوف کرتی ہے، لیکن اپنی ذات کی تذلیل ناپسندیدہ لوگوں سے کروانی ہے۔ یہ اسے آج پتا چلا تھا۔ اس کا شدت سے دل کیا ابھی اسی وقت بسیم سے ملے، لیکن کیسے اور کہاں، وہ تو راستوں میں ملنے والا شخص تھا۔ کس کس راستے پر تلاش کرتی۔

اتنے عرصے میں پہلی بار اسے احساس ہوا، کم از کم اس کا نمبر کوئی کانٹیکٹ کا ذریعہ تو پاس ہونا چاہیے تھا۔ اس کا نمبر حاصل کرنے کے لیے وہ پوری حسیات لڑا رہی تھی کہ اچانک سدرہ کی کال آ گئی۔ اپنے سسرال کے قصے سرسری سے سنانے کے بعد کال کرنے کی اصل وجہ بھی یہی بتائی۔

لیے، کیس کر دیتے، اب تو تایا دنیا میں نہیں رہے اب کس بات کا جھگڑا۔"

شاکرہ نے اسے نخوت سے گھورا تھا "کیس کرتے یا تمہارے کھانے پڑھانے کا انتظام کرتے، تنخواہ ہی کتنی تھی ان کی، کمیٹیاں ڈال ڈال کر سر چھپانے کا یہ ٹھکانہ بنایا، جس پر آج تم اچھل رہے ہو، اب اس میں بھی میں اسی کی بیٹی لا کر بسا لوں۔ نہیں۔ ہرگز نہیں، میری ایک ہی بہو آنی ہے، وہ بھی ان کی لے آؤں جنہوں نے ساری زندگی ہمیں جلا کر مارا۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔" کہتے ہوئے وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "ریکا آپ کو ناپسند ہے، باقی لڑکیاں مجھے۔ جیسے زندگی گزر رہی ہے، اسے ایسے ہی گزرنے دیں، بلاوجہ لوگوں کے گھر تانک جھانک نہ کریں۔"

بسیم کہہ کر سامنے سے ہٹ گیا۔ دروازے میں کھڑے اعظم اس کے قطعی انداز کو دیکھتے رہ گئے، شاکرہ کا بس نہیں چل رہا تھا اپنے بال نوچ لیں یا سامنے کھڑے اعظم کے۔ اگر بال نوچنے سے کوئی حل نکل آتا یقیناً وہ نوچ ہی لیتیں لیکن اپنے نہیں بلکہ ریکا کے جس کا جادو بیٹے کے سر چڑھ کر بول رہا تھا۔

☆☆☆

بہت کوشش اور سوچ سمجھ کر وہ بالآخر اسے بھلانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ لاسٹ سمسٹر سر پر تھا، وہ صحن میں لیپ ٹاپ لیے بیٹھی پریزنٹیشن تیار کرنے لگی۔ تب ہی اس کا موبائل پوری تھرتھراہٹ سے چمکا، ایک اجنبی نمبر سے کال آئی تھی، اجنبی نمبر دیکھ کر ہی کوفت ہوتی تھی، اس نے ایک دو بار نگاہ ڈال کر بجتے موبائل کو نظر انداز کر دیا، لیکن فون کرنے والا بہت ہی ڈھیٹ تھا، بیل کا دورانیہ ختم ہوتے ہی دوبارہ ملا لیا جاتا، اس نے لیپ ٹاپ ایک جانب رکھ کر موبائل اٹھا لیا۔

"جی فرمایئے، کیا کام ہے۔"

"مودبانہ گزارش ہے، ملکہ عالیہ ریکا سے بات کروا دو۔"

خاتون کی بھاری سی آواز وہ بھی جما جما کر

https://reading

''یار کل تمہاری پھپی نے تمہارا نمبر لیا تھا۔ سچ میں امی تو بہت خوش ہوئیں، برسوں کی ناراضی دور ہونے کا سبب میری شادی بنی۔''

''کیا کہہ کر مانگا تھا نمبر؟'' ناراضی کی دوری تو ربیکا خوب جان چکی تھی۔ اس لیے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔

''کیا کہنا تھا، کہہ رہی تھیں صدیق انکل خواب میں آئے ہیں، بیٹی کی جانب سے بہت پریشان ہیں۔''

''اچھا۔ آنسو میں بھیگا ایک قہقہہ ابھرا۔ ''ہاں ان کی بیٹی بگڑ رہی ہے ناں، اسے سدھارنے کو اب خوابوں کے سہارے استعمال ہوں گے۔ خیر تم مجھے، ان کے بیٹے بسیم کا نمبر ٹیکسٹ کرو، ابو مجھے بھی خواب میں آئے تھے، اس کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے۔''

اس نے نمبر تو ربیکا کو ٹیکسٹ کر دیا تھا، لیکن اسے خاصی حیرت ہوئی تھی۔ وہ مزید اس معاملے پر سوچتی اگر اپنے سسرالی بکھیڑے نہ ہوتے۔

☆☆☆

ربیکا لاؤنج میں داخل ہوئی تو سیاس بہو دونوں بیٹھی آہستہ آواز میں کوئی بات کر رہی تھیں۔ عام طور پر جب کسی رشتے پر دونوں کا اتفاق ہو جاتا تو وہ ایسے ہی کھسر پھسر کرتی تھیں۔ دونوں کی فکر ایک ہی ہوتی۔ ''جانے ربیکا مانے گی یا نہیں۔'' اب ماننے نہ ماننے کا وقت گزر چکا تھا، اس نے قریب آ کر فوراً ہی کہہ دیا۔

''جس رشتے پر آپ دونوں بات کر رہی ہیں ناں، مجھے یہ رشتہ قبول ہے۔ بلکہ میرا سمسٹر بھی ختم ہونے والا ہے۔ مناسب ڈیٹ دیکھ کر فارغ ہوں اس کام سے۔''

دونوں کو حیران کر کے وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ آسیہ کو تو بہت سے اندازے تھے، لیکن دادی نے اپنے شک کو حتمی شکل دینے کی کھوج خود لگائی تھی وہ آرام سے انھیں اور اس کے ـــــ کمرے میں آ گئیں۔

''جانتی بھی ہو ہم کس کے رشتے کا ذکر کر رہی تھیں؟'' اس نے سوالیہ نگاہ اٹھائی۔ ''ماسی اپنے چھوٹے بیٹے کا رشتہ ڈھونڈ رہی ہے، کہو تو کر دوں ہاں؟ کیا ہوا اگر آنکھیں چھوٹی بڑی ہیں، مگر دیکھتا تو پورا ہے۔''

دادی کا خیال تھا اب وہ اپنے مخصوص انداز میں لوٹے گی اور گھور کر دیکھے گی لیکن اس پر تو فرماں برداری کا بھوت سوار ہو گیا تھا۔ بہت آرام سے کہہ دیا۔ ''آدھا بھی دکھائی دیتا ہو تو بھی ہاں کر دیں، اس دنیا میں اکثر لوگوں کو آدھے مناظر ہی دکھائی دیتے ہیں۔''

نفیسہ جہاں دیدہ خاتون تھیں اب بھی نہ سمجھتیں۔ رات ہی عمران نے بتایا۔ ''اعظم ـــــ تین چار بار آفس آ چکے ہیں۔''

''پہلے تو دیکھ کر رخ پھیر لیتا تھا، اب کیوں آ رہا ہے، تم نے پوچھا نہیں کیا کام ہے، کوئی وجہ تو ہو گی۔''

''نہیں بات تو کوئی خاص نہیں بس ادھر اُدھر کی، یار ربیکا کا پوچھ لیتے ہیں کیا کر رہی ہے، کہیں رشتہ وغیرہ دیکھا۔ مجھے حیرت ہے پانچ سالوں میں تو کبھی خیال آیا نہیں۔ اب یہ اچانک ایک مہینے میں چار دفعہ۔''

''شادی پر بچے ملے تھے ناں کیا پتا انہوں نے کچھ بتایا ہو۔'' تب تک تو نفیسہ کا یہی خیال تھا لیکن اب ربیکا کے مخصوص وقت میں بدلتے رویے کی ساری کڑیاں ملائیں۔ سب واضح ہو گیا، اگر اب وہ غلطی پر نہیں تو اندر ہی اندر خوشی بھی ہو رہی تھی۔ انہیں تو سینڈل والا پہلی نظر میں ہی بہت اچھا لگا تھا اور خفگیوں کا کیا ہے، ملو تو مٹ ہی جاتی ہیں۔

☆☆☆

اس کے اعلان پر شاکرہ حیرت سے کھڑی ہو گئیں۔ ''سب کچھ ٹھیک ٹھاک تو چل رہا تھا یہ یک دم کمپنی میرے ہی بیٹے کو کیوں کینیڈا بھیج رہی ہے۔'' اعظم بھی سن کر پریشان سے ہو گئے تھے۔

’’نہیں نہیں۔ بسیم تم باس کو صاف انکار کردو، میں اپنے بچے کو باہر نہیں بھیج سکتی، پتا نہیں کیسا ماحول ہو، آج کل ویسے ہی پاکستانیوں پر سختی آئی ہوئی ہے۔‘‘

’’امی! ماحول انسان کے اندر ہوتا ہے، آپ فکر نہیں کریں اور ویسے بھی اتنا اچھا پیکج ہے، میں نے خود اس آفر کے لیے اپلائی کیا تھا۔‘‘

جب ربیکا نے فون پر اسے صاف اور کھری کھری سنائیں، کہ وہ کوئی ماورائی مخلوق نہیں ہے جس کو پانے کے لیے میں اپنی نظروں میں گر جاؤں اور اس کے والدین کی نیندیں حرام کردوں۔ اس لیے بہتر ہے اپنے اپنے راستے پر چلیں جیسے پہلے چلتے آئے تھے۔ اس کے تلخ انداز پر بسیم نے بارہا وجہ پوچھی لیکن ربیکا نے کچھ نہیں بتایا، صرف اتنا کہا۔

’’جس ماں سے سسرال نے سب کچھ چھین لیا ہو، یہ کہاں کی انسانیت ہے کہ بیٹا بھی بھینٹ چڑھا دیں۔ بہتر ہوگا اپنی ماں کی سنیں۔‘‘

ربیکا نے کہہ کر فون بند کردیا۔ بسیم اپنے لب بھینچ کر رہ گیا تھا، تب ہی کمپنی میں باہر کی آئی آفرز کے لیے اس نے اپلائی کردیا۔ اس سب بھولنے کے لیے اس منظر سے نکل جانا ہی اس کے لیے بہتر حل تھا اور اب اس حل پر بھی ماں ہی کو سب سے زیادہ اعتراض ہو رہا تھا۔ بسیم کو ایسے دیکھ رہی تھیں جیسے دنیا سے جا رہا ہو، پھر بے بسی اور حمایت طلب نگاہ اعظم پر ڈالی، وہ خود اس اچانک فیصلے پر حیران ہوئے بیٹھے تھے۔

’’کیوں؟‘‘ اعظم تحیر سے بولے۔ ’’یہاں کیا کمی ہے۔ تمہاری ماں تمہارے لیے رشتے دیکھ رہی ہے اور تم کینیڈا جانے کا پروگرام بنا رہے ہو، وہاں سے تو سالوں واپسی نہیں ہوتی۔‘‘

’’شادی اب اتنا بھی ضروری کام نہیں ہے بندہ اچھا روزگار ٹھکرا دے۔ بہت سے لوگ ہیں، بغیر شادی کے پرسکون زندگی گزار رہے ہیں۔‘‘

’’بسیم۔‘‘ شاکرہ کے دل پر ہاتھ پڑا تھا۔

’’خفا کیوں ہو رہی ہیں۔ جو مجھے پسند ہے وہ آپ کو شدید ناپسند اور آپ کی ناپسندیدہ لڑکی کو کم از کم میں اپنی زندگی میں شامل نہیں کرسکتا۔ آپ ندا کے فرض سے فارغ ہوں، پلیز میرے لیے مت سوچا کریں۔‘‘

شاکرہ اٹھ کر اس کے برابر کھڑی ہوگئیں اور پیار سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ’’تم خود کو میرا فرض نہیں سمجھتے کیا۔‘‘

’’امی اب ہر فرض تو ادا نہیں ہوتا، کچھ قضا بھی تو ہو جاتے ہیں۔‘‘

شاکرہ سنتے ہی شکست خوردہ انداز میں آنکھیں بند کرتی دھپ سے صوفے پر بیٹھ گئیں۔ ’’یعنی تم نے فیصلہ کرلیا ہے ماں کو قضا داروں کی لائن میں کھڑا رکھنے کا۔‘‘ بسیم کچھ نہیں بولا خاموش کھڑا رہا۔ وہ اعظم کو دیکھتے بہت دکھ سے کہہ رہی تھیں۔ ’’انسان کسی سے نہیں ہارتا اعظم! نصیب سے بھی جنگ کر کے جیت ہی جاتا ہے لیکن اولاد واقعی ہرا دیتی ہے۔‘‘

☆☆☆

بنا بحث و تکرار کے شاکرہ نے اپنی ہار تسلیم کرہی لی تھی۔ جس کا ثبوت دینے کو وہ عمران کے ڈرائنگ روم میں میاں اور بچوں کے ساتھ مٹھائی لے کر بیٹھی تھیں۔ دلوں میں آئی دوری کچھ کھسیاہٹ کے بعد بات چیت کرنے سے بہت حد تک مٹتی محسوس ہو رہی تھی۔ نفیسہ کسی شخص کو اس کی غلطی کا احساس نہ کروادیں یہ تو ممکن نہیں تھا، چائے کے آخری گھونٹ پیتے بہت اطمینان سے اعظم کو دیکھتے ہوئے بولی تھیں۔

’’اللہ کے بنائے رشتے، ہمیشہ انسان کی بنائی چیزوں کی چاہت میں ٹوٹتے ہیں۔‘‘ اعظم نے بھنویں اچکا کر دیکھا تھا۔

’’غلط تھوڑا کہہ رہی ہوں، اگر صدیق اپنی بات پر اڑ گیا تھا، تم کون سا صحیح تھے، ہر کام اپنے وقت اور طریقے پر ہو جانا چاہیے۔‘‘ شاکرہ کے ماتھے پر ابھرتی لکیریں آسیہ کو کوفت میں مبتلا کر رہی تھیں۔ اچھی بھلی معافی تلافی ہوگئی۔ امی کون سا قصہ لے کر بیٹھ گئیں۔

عمران کو بسیم بہت پسند آیا تھا، پھر ربیکا کا اپنوں میں

https://reading.urduleran.net

جانا، اس سے بہتر کیا فیصلہ ہو سکتا تھا، امی کی وجہ سے بنتی بات نہ بگڑے، انہوں نے بھی نگاہوں سے ماں کو چپ رہنے کا اشارہ کیا، لیکن وہ ایسے اشارے کبھی نہ سمجھیں۔ جہاں دوسرے کو سمجھانا ہو۔ عمران کو دیکھتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔

''صحیح تو کہہ رہی ہوں یہ زمین تو ہے ہی فتنہ، اس کے معاملے کو جتنا لٹکاؤ، اتنا فتور اگاتا ہے۔ دیکھ لو، وہ بے جان گھر اپنی جگہ صحیح سلامت ہے، رشتے ٹوٹے، بھائی چھوٹے۔'' کہہ کر وہ وہاں سے اٹھیں اور اپنے کمرے سے ایک فائل اٹھا کر لے آئیں۔ سب ہی حیرت سے اس فائل کو دیکھ رہے تھے ''یہ ہے گھر کی فرد (رجسٹری)۔ گھر کرائے پر دیتے ہوئے یہ میں نے سنبھال کر رکھ لی تھی۔''

فائل انہوں نے اعظم کی جانب بڑھائی انہوں نے ہاتھ آگے نہیں بڑھایا ''یہ آپ ربیکا کو دیں، مجھے اب اس میں کوئی دلچسپی نہیں رہی۔''

نفیسہ کو حیرانی ہوئی اور طنزیہ انداز میں ہنس بھی دیں۔ ''مال کو اس جیب میں رکھو یا اس میں، قمیص تو تمہاری ہی استعمال ہوگی، ربیکا تمہارے اکلوتے بیٹے کی دلہن بننے جا رہی ہے۔''

ان کی بات سب کے چہروں پر دبی سی مسکان لے آئی۔ بولتے ہوئے فائل پھر سنبھالنے کے لیے اٹھیں ''اچھا ہے، ربیکا کے پاس ہوگی، پاؤں تو مضبوط ہوگا میری بچی کا۔''

☆☆☆

اسلام آباد کی سرمئی شام میں وہ چھت پر تنہا ٹہل رہی تھی، ہوا اتنی پاگل نہیں ہوئی تھی کہ بال اڑاتی، ہاں دلفریب جھونکے چہرے کی مسکراہٹ کو سکون بخش رہے تھے۔ چچا چچی کو سلام کرنے کے بعد وہ اوپر آ گئی تھی دل عجیب سے مخمصے میں پھنسا تھا۔ فیصلے کا حق اس نے تب ہی دادی کو دے دیا جب آسیہ نے کچھ دن پہلے پھر سے بتایا ''تمہارے چچا بار بار بسیم کے رشتے پر اصرار کر رہے ہیں۔ عمران کی سمجھ میں نہیں آ رہا کیا فیصلہ کریں، لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے، اگر یہ گھر کی رنجش نہ ہوتی تو صدیق بھائی کو اپنے بھائی سے بہت پیار تھا۔''

ربیکا بنا مسکرائے صاف گوئی سے کہہ گئی ''پہلی بات خوش ہونے کے لیے اب ابو تو دنیا میں نہیں ہیں۔ دوسری بات، اس گھر میں آنے کے بعد میرے ہر فیصلے کا اختیار نفیسہ دادی کو ہے، وہ جو مناسب سمجھیں کر دیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

''بڑی چالاکو ہو۔'' آسیہ نے اس کے گال پر پیار سے چٹکی بھری۔ ''جانتی ہو ناں وہ تمہارے دل کی بات سے پہلے ہی باخبر رہتی ہیں۔ خیر بسیم ہے بھی بہت اچھا۔''

اب وہ اسی اچھے کو سوچ رہی تھی کہ وہ دبے پاؤں چھت پر اپنی اچھائی کا ثبوت دینے آ گیا اور پیچھے سے ڈرانے کے انداز میں ''ہائے'' کہا، مگر وہ ذرا نہیں اچھلی، نہ مڑ کر دیکھا، وجہ یہ بھی تھی وہ ٹیرس سے اسے سیڑھیاں چڑھتے دیکھ چکی تھی۔

''بہت ڈھیٹ ہو، ذرا نہیں ڈریں۔''

''خیر سے اپنے باپ، چچا پر گئی ہوں۔'' وہ ادا سے مڑی بسیم نے گھر کا۔

''آج اپنے چوکیدار کو چائے نہیں پلائی، بے چارہ کب سے انتظار میں سوکھ رہا ہے۔''

''جی نہیں۔'' وہ اپنی سابقہ جون میں منہ بگاڑ کر بولی۔ ''چائے محبت کے جوش کھا کر ابل چکی ہے، خالی پتیلی کچن میں رکھی ہے، چاہیے تو بتا دو۔''

بسیم نے محبت سے اس کے ہاتھ پکڑ لیے اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''ایسے تو نہ کہو۔ رات کے تین بجے ملنے والی چائے کی دعوت ہی یہاں تک کھینچ کر لائی ہے، اپنوں کو اپنوں کے پاس۔''

اپنوں کو اپنوں کے پاس کہتے اس کے لہجے کی صداقت اور دیکھنے کا انداز سارے ماحول پر فسوں پھیلا گیا، ربیکا نے وہاں سے ہٹ جانے میں ہی عافیت جانی تھی۔ اس سے پہلے کہ دادی تلاش میں اوپر آئیں اور سوئی گھما کر سارا سحر توڑیں۔

چاند گلی کی اپسرائیں

منشا محسن علی

مایوں کے زرد رنگوں میں رنگی بلقیساں نے گہرے دکھ سے ان دونوں کو دیکھا تھا۔ بالوچر ساڑھیوں میں ملبوس، کمر سے آبشار کی طرح گرتے گھنے سیاہ بال، موٹی آنکھیں جو کاجل کے ڈوروں سے سجی ہوئی تھیں۔ نازک پاؤں گھسہ میں مقید تھے۔ وہ دونوں جو وقار، تمکنت اور رکھ رکھاؤ کی اعلیٰ مثال تھیں۔

وہ چاند گلی کی اپسرائیں تھیں۔ بلقیساں جان دیتی تھی ان دونوں پر اور محلے والے جان لینے کے درپے نظر آتے تھے۔ ابھی بھی وہ لفظ..... وہ کاٹ ساری فضا کو زہر زہر کر رہی تھی، بس وہ بلقیساں کی خاطر خود کو نیلا ہونے سے بچائے ہوئی تھیں۔

''تم دونوں حکیم قدوس کی لڑکیاں ہو ناں..... تمہارے باپ نے آخری وقتوں میں کلمہ پڑھا تھا سارے محلے میں ایک وہی ہندو تھا..... خبر نہیں آخری وقتوں میں کیسے عقل پا گیا اور کلمہ پڑھ گیا..... ارے ہم تو شروع سے، نسلوں سے کلمہ پڑھتے آرہے ہیں۔''

فریدہ خالہ محلے کی پھپھے کٹنی مشہور تھیں، لفظوں میں ہمہ وقت زہر رکھتی تھیں..... آفرین نے دل کو چار ٹوٹے ہوتے دیکھا تھا۔ آنکھوں میں کچھ ٹوٹ گیا۔ مایوں کی ساری زردی اس کے چہرے پر لپٹی ہوئی تھی۔ بڑی مشکل سے وہ زمین کو پیروں تلے قابو کیے ہوئی تھی۔

''خالہ..... اللہ کے واسطے چپ رہیں..... مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔''

''آئے ہائے..... ارے تو میں نے کون سی غلط بات کر دی ہے۔ تم لوگ شروع سے ہندو ہی تو تھے، اب جا کر کہیں نئے نئے مسلمان ہوئے ہو۔''

بلقیساں نے دور سے اپنے دونوں سپاہیوں کو پسپا ہوتے دیکھا تھا..... ابٹن سے مہکی دلہن، مہندی سے پور پور سجی..... انہیں اکیلا کیسے چھوڑ سکتی تھی۔ وہ ان کے ساتھ آن کھڑی ہوئی تھی۔

''خالہ! انسان اور رب کے رشتے، تعلق میں دخل اندازی نہیں کرتے، اپنا ایمان کھوٹا ہو جاتا ہے۔ آپ نے اپنے ایمان کو کھوٹا کر لیا ہے۔ کلمہ حق کی توفیق وہی دیتا ہے ہمارے۔ تمہارے کام نہیں ہیں۔ یہ کہ حسد، بغض اور تکبر میں پکڑ کر کسی کو محروم کر لیا جائے۔''

یہ کہہ کر وہ ان دونوں کے ہاتھ تھامتی اپنے پاس لے آئی تھی۔ دونوں کو اپنے دائیں بائیں بٹھا لیا۔ وہ دونوں حصار میں تھیں۔

چاند چھتوں سے گزرتا، کودتا پھاندتا آسمان کے وسط میں آ گیا اور دیوانہ وار انہیں تکنے لگا۔ بالوچر ساڑھیوں میں ملبوس..... وہ آفرین اور تمکین.....

☆☆☆

لائبریری میں بلا کا سناٹا تھا، بے چاری گونگی کتابیں الماریوں میں بند تھیں۔ انہیں سننے والا کوئی تھا ہی نہیں۔ اونچے ستونوں پر کھڑی وہ شان دار چھت، کتابوں کے ڈھیر، ماہنامے، ہلکی ہلکی اٹھتی

https://reading.edu.bh

گرد۔ کونے میں رکھا پانی کا کولر، جس کی ٹونٹی سے پانی قطرہ قطرہ ٹپک رہا تھا۔ وہ کاؤنٹر پر نیم غنودگی کے عالم میں پڑا تھا۔ جب ہلکی سی آہٹ پر اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ سامنے دیکھا تو اس کی آنکھیں پوری کی پوری کھل گئیں۔ سلک کی لمبی قمیص اور چوڑی دار پائجامے میں ملبوس وہ لڑکی شاید راستہ بھٹک گئی تھی۔

''کیا آپ بابل دنیوا کی کوئی خوبصورت جادوگرنی ہیں؟''

غازی کے سوال پر آفرین کے چہرے پر غصہ ابھرا۔ الماریوں میں بند کتابیں سر اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگیں..... وہ ایسی تھی کہ اسے بار بار دیکھا جاتا۔

''آپ کا دماغ درست ہے.....؟'' وہ گڑبڑایا۔ ساری غنودگی بھک سے اڑی تھی۔

''ناں نہیں..... ہاں''

آفرین کو جی بھر کے تاؤ آیا تھا۔

''آپ مجھے اپنے حواسوں میں نہیں لگ رہے؟''

کتابوں کا غبار بیٹھنے لگا تھا۔

''میں معذرت چاہتا ہوں..... آپ بتائیں کیا کام ہے؟'' اب جا کر کہیں اس کے حواس ٹھکانے پر آئے تھے۔

حمید سچ ہی کہتا تھا کہ اس کا مالک سر پھرا انسان ہے۔ آج تک حمید نے اس کے متعلق ساری بری بری باتیں ہی مشہور کی تھیں..... اب تو گویا وہ سر پھرا ہی تھا۔

''الطاف فاطمہ کی چلتا مسافر چاہیے تھی۔''

غازی کے چہرے پر اداسی چھا گئی تھی۔ وہ کتاب تو پہلے ہی کوئی ایشو کروا چکا تھا..... آفرین کی سوالیہ نظریں ابھی بھی اس کے چہرے پر جمی تھیں'' وہ ناول تو پہلے ہی ایشو ہو چکا ہے۔'' آفرین کے پیروں میں عجیب سی تھکن اتر آئی تھی کچھ بھی تو پڑھنے کو نہیں تھا۔ راتیں اب ایسے تو نہیں گزرتی تھیں۔

''خدیجہ مستور کا آنگن ہوگا؟'' ان گھور سیاہ آنکھوں میں اک نیا شعلہ لپکا تھا۔ غازی کو اپنا آپ جانے کیوں بے بس سا لگا تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

''معذرت.....''

آفرین کا جی چاہا تھا اپنا شولڈر بیگ اس کے سر پر دے مارے۔

''آپ کو یہ لائبریری بند کر دینی چاہیے ہر کوئی آپ کی معذرت سننے نہیں آتا یہاں.....''

وہ باوقار اور سوبر سی اپسرا غصے میں واپس مڑنے لگی تھی۔

''میں شرمندہ بھی تو ہوں۔'' سارے جہان کی بے چارگی غازی کے چہرے پر جم گئی تھی۔ افسوس صد افسوس۔

''شرمندگی کا اچار بہت اچھا بنتا ہے۔ بنا لیجیے گا۔ کھانے کے ساتھ ساتھ ایک ایک پھانک لے لیا کریں۔''

وہ محلے بھر کی قدیم ترین لائبریری تھی جس میں رام لعل کے افسانوں سے لے کر، رضیہ بٹ کے ناولوں اور بیگم ریاض الدین کے سفرنامے تک میسر تھے۔ بچوں کے لیے عمرو عیار اور چلوسک ملوسک کی کتابیں بھی میسر تھیں۔ یوں سمجھیں وہ لائبریری غازی کا خاندانی ورثہ تھی جسے وہ بمشکل سنبھالے ہوا تھا۔ درمیانے قد، مضبوط جسم اور تیکھے نین نقش والا ایک خوبرو لڑکا تھا۔

وہ شروع سے ہی کاؤنٹر کے پار بیٹھا ہوا نظر آتا تھا۔ اب اس نے بجلی والی کیتلی خرید لی تھی جس میں چائے بنا بنا کر وہ سارا سارا دن میسگزین سامنے پھیلائے پڑھتا اور چائے کے دھوئیں چھوڑتا ہوا نظر آتا تھا۔ حمید سولہ سال کا شریر لڑکا تھا۔ جو اس کا مددگار تھا۔ مددگار ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اور بھی بہت کچھ تھا۔ جیسے کہ مکار، عیار، اور غدار..... طویل پھٹوں والی الماریوں تک رسائی کے لیے لمبی لکڑی کی سیڑھی استعمال کی جاتی تھی جس پر چڑھ کر اونچائی سے

https://reading.pakistanipoint.com

کتابیں اتارنا حمید کو زہر لگا کرتا تھا کیونکہ وہ بیسویں بار اس خاندانی ورثے میں ملی سیڑھی سے زمین بوس ہو چکا تھا اور بال بال بچا تھا۔ وہ دسویں کا طالب علم تھا اور غازی کا شاگرد خاص ہونے کا اعزاز بھی اسے حاصل تھا۔

"یہ فیضا غورث بچپن میں ہی طاعون کی وبا سے مر کیوں نہیں گیا؟" اس کی زندگی کی ساری پریشانیاں جیسے فیضا غورث پر آ کر تمام ہو جاتی تھیں۔

کبھی کبھی تو غازی کو اس پر رشک آتا تھا۔

"تمہاری زندگی میں صرف ایک مسئلہ ہے اور بس..... تم کتنی سکون کی نیند سوتے ہو گے۔" وہ کتابوں کی جھاڑ پونچھ روک کر اسے دیکھتا تھا۔

"تو آپ نہیں سوتے کیا؟" چائے کی بھاپ فضا میں ٹھہر جاتی تھی۔

"ویسی نیند نہیں سوتا جیسی تم سوتے ہو۔" حمید نے صافہ کندھے پر ڈال لیا تھا۔

"آپ بھی کبھی کبھی سمجھ سے باہر ہونے لگتے ہو۔" وہ دھیرے دھیرے سکون پا رہا تھا جیسے۔

"ہونہہ..... اونہو..... جب زندگی برتو گے ناں تو تب ہی سمجھو گے۔"

☆☆☆

نمکین ساڑھی کے دھاگے ادھیڑتی خود کسی ادھیڑ بن میں گرفتار تھی۔ وہ کبھی کبھی بہت بڑی باتوں کو نظر انداز کر دیتی تھی اور کبھی تو چھوٹی سے چھوٹی بات بھی اسے بے چین کر جاتی تھی۔ جیسی وہ اس کیفیت میں تھی اپنی حالت سے غافل تھی..... آفرین گل قد کے مرتبان کھولے بیٹھی تھی۔ گلابوں کی مہک فضا میں تیر رہی تھی۔ میٹھے گلاب بھی نمکین کا دھیان نہیں جیت پائے تھے۔

"بہت پہلے میں بہت خوش ہوتی تھی کہ اللہ ایک ہے اور وہی ایک سب ہی کا ہے۔ ساری دنیا کا۔ ہمارے سارے محلے کا۔ اگر وہ کسی ایک کا ہوتا تو کس کا ہوتا۔ مگر دیکھو وہ ایک ہو کر سب ہی کا ہو گیا۔ مگر اس کی مخلوق کو ایک ہونا کبھی آیا ہی نہیں۔ اللہ سے تعلق کی دیر سویر ہونے پر بھی اب سوال اٹھائے جاتے ہیں۔ اس کے وجود سے ایسا اضطراب چمٹ گیا تھا کہ جسے چاہ کر بھی آفرین ختم نہیں کر سکتی تھی۔

"تم بھی کیسی کیسی باتیں لے کر بیٹھ جاتی ہو نمکو! ہم نے محلے والوں، زمانے کو تو منہ نہیں دکھانا ہوتا ہے نا، جس کو دکھانا ہے وہ ہم سے بالکل راضی ہے۔ اردگرد والوں کی پرواہ نہیں کرنی ہم نے۔"

وہ دونوں جڑواں تھیں۔ شکل وصورت، عادت واطوار میں بھی یکسر ایک دوسرے سے مختلف مگر پھر بھی وہ دونوں ایک دوسرے کا سایہ تھیں۔ ایسا سایہ جس کا ساتھ روشنی اور اندھیرے میں کبھی بھی جدا نہ ہوا تھا۔ زندگی کے ڈھب پر وہ بے مثال کردار تھیں۔ حکیم ابا جب زندہ تھے اور ہدایت سے آراستہ ہوئے تھے تو خوش ہو کر کہا کرتے تھے۔

"موسیٰ کے گھر موسیٰ نہیں پیدا ہوتے اور فرعون کے گھر فرعون پیدا نہیں ہوتے۔"

جامع مسجد میں پانچ وقت کے نمازی بن گئے تھے..... چاند گلی نے اس دن اس بوڑھے شخص کو دھاڑیں مار مار کر روتے دیکھا تھا جب وہ گھر کے کونوں سے بتوں کو نکال کر دریا برد کرنے جا رہے تھے۔

"ہائے..... میں نے اپنا آپ برباد کر لیا۔ میں

نے اپنی اگلی زندگی جہنم کرلی۔"

مولوی فتح صاحب انہیں کلمہ پڑھاتے ہنستے رہے تھے۔

"جھلے..... تو نے آخرت سنوار لی اور اگلی آنے والی نسلوں پر احسان کیا۔ اگر کی مہک اور تلسی والے گھر سے اس دن کے بعد سے قرآن پاک کی تلاوت شروع ہوگئی تھی وہ دونوں اپنے اپنے نورانی قاعدے سینوں سے لگائے۔ بار بار چوتھی مولوی جی کی بیگم عرف بے بو کے پاس جاتی تھیں۔ اس نورانی محفل میں انہیں سب سے پہلے قبول کرنے والی بلقیس عرف بلقیساں ہی تھی۔

"ہائے..... آفرین..... اب تم لوگ روز سبق لینے آیا کرو گی ناں؟" وہ دونوں خوشی خوشی اثبات میں سر ہلانے لگی تھیں۔ بلقیساں نے ان کے نئے نکور قاعدوں کو بغور دیکھا تھا۔

"تم لوگوں کے نئے قاعدے کون لایا؟ تمکین نے فخر سے سر اٹھایا تھا۔

"حکیم ابا لائے ہیں۔" بلقیساں نے للچائی ہوئی نظروں سے نورانی قاعدوں کو دیکھا تھا۔

"اچھا..... کبھی کبھی میں بھی ان سے پڑھ لیا کروں؟"

آفرین فرشی دریوں پر بکھرے چاول چننے میں مصروف تھی۔ اپنا قاعدہ اسے تھما دیا تھا۔

"تم یہ پکا پکا اپنے پاس رکھ لو۔ میں تم سے یہ کبھی بھی واپس نہیں لوں گی..... میں اور تمکو ایک قاعدے سے اکٹھے پڑھ لیں گے۔"

حالانکہ تمکین نے اس آفر کا کافی برا مانا تھا مگر پھر بھی جیسے تیسے دل کو راضی کر ہی لیا تھا..... وہ ان کی دوستی کی ابتدا تھی۔ ہر دوستی کی ابتدا ہمیشہ خوش گوار اور ناقابل فراموش ہوتی ہے۔ ان کی دوستی بھی اسی قسم کی تھی۔ بے بو نے ان تینوں کو سب سے آگے بڑھتے دیکھا تھا۔ وہ تینوں پوری جماعت میں سب سے الگ تھلگ سی نظر آتی تھیں۔ چٹی اوڑھنیوں میں ملبوس عود کی مہک میں مہکی ہوئی اور اپنے پاروں کو غلافوں میں ڈھانپتے ہوئے سبق کے بعد اگر کوئی پھٹا ہوا مقدس ورق نظر آ بھی جاتا تو لپک لپک کر اٹھاتی تھیں۔ بار بار چومتیں۔ پلکوں سے لگا کر بے بو کی خدمت میں حاضر ہو جاتی تھیں اور بے بو چاندنگی کی عود میں مہکی اپسراؤں کو دیکھ کر دم بخود ہو جاتی تھیں۔ کبھی دل بھر آتا تو انہیں قریب کر کے خود میں سمیٹ لیتی تھیں۔

"میرا سوہنا مالک..... تو جسے چاہتا ہے روشنی عطا کر دیتا ہے۔"

☆☆☆

فجر سے ذرا پہلے جب ساری کائنات آنکھیں موندے سو رہی تھی۔ مرغ بانگ دینے کے لیے انگڑائیاں لے رہے ہوتے تو حکیم ابا، مولوی جی کی خدمت میں سبق کے لیے حاضر ہو جاتے تھے۔ مولوی فتح کو بڑھاپے کی طرف گامزن اپنا وہ شاگرد بڑا عزیز تھا۔ سبق کے بعد وہ بغور حکیم ابا کا چہرہ دیکھتے رہتے تھے سوچ کی گتھیاں اور گنجلک ہو جاتی تھیں کہ سلجھتی ہی نہیں تھیں۔ کبھی کبھی لاکھوں دیگوں کی خیرات بھی کام نہیں آتی اور کبھی..... وہ بڑے سوال و جواب کرتے تھے حکیم ابا سے۔

"حکیم.....! کیسے تیرا دل بدل گیا یار.....؟"

حکیم کی شرمیلی ہنسی نے سارے راگوں کو مات دے دی تھی۔ نورانی قاعدے کو آنکھوں سے لگاتے وہ جیسے انسان آنسو چھلکا بیٹھے تھے۔

"مولوی جی! کبھی کبھی ہزار بار بھی کنڈی کھڑکاتے رہو..... در نہیں کھلتا اور کبھی بغیر کنڈی کھڑکائے در آپوں آپ کھل جاتا ہے۔ میت (مسجد) کی دیوار کے ساتھ ہی تو اپنا دواخانہ ہے..... ہر صبح ہر شام آوازیں پڑتی ہیں..... دن میں پانچ بار اذان کی آواز..... اور تلاوت..... غیر شعوری طور پر جانے کیسے اذان کے الفاظ میرے منہ پر چڑھ گئے۔ ادھر اذان شروع ہوئی اور ادھر میں بھی شروع ہو گیا۔"

صفوں کی سیدھ میں نیند میں ڈوبتی چڑیاں اترتی آ گئیں۔ چڑیوں کو بڑا شوق ہوتا ہے قصے اور کہانیاں

سننے کا۔ حکیم ابا کے چہرے پر رقت اور نور ایک ساتھ نظر آ رہا تھا۔" وہ ایک طوفانی شام تھی۔ کب آسمان سرخ ہوا اور کب ساری سرخی آسمان کا رنگ کھا گئی۔ مجھے تو تب خبر ہوئی جب شیشوں میں پڑے سارے محلول آپوں آپ سرخ ہو گئے۔ شیشوں میں بند رنگوں نے عجب پراسراریت طاری کر دی تھی۔ کب ہوا نیم اور کیکر کی جڑیں اکھاڑ کر لے گئی اور برق نے کچھ درختوں کو آن کی آن میں خاکستر کر ڈالا۔ میں وحشت زدہ ہو کر رہ گیا میری دکان کا چھپر آندھیوں نے اڑا کر رکھ دیا۔ اور کب شیشوں کی سرخی زمین کھا گئیں۔ میں لرزتا کانپتا مسجد کی دیوار سے اندر اتر گیا۔ وہاں خاموشی تھی۔ خاموشی امان ہوتی ہے سکون ہوتی ہے۔ میرا سارا اضطراب اور وحشت دھیرے دھیرے کم ہو گئی۔ تند و تیز ہوا سیٹیاں بجاتی ہوئی درخت اکھاڑتی رہی۔ وہ وقت اذان کا وقت تھا۔ اور تب میں نے خود کو بولتے سنا۔ میرے لب و لہجے اور آواز پر میرا قابو نہ رہا۔"

چڑیوں کے پنکھ کھڑے ہو گئے اور غنودگی بھری آنکھیں کھل گئیں۔ کچھ فاختائیں تنکے اٹھانے آ گئیں۔ وہ حکیم کو لرزتے کانپتے دیکھ کر اپنی چونچوں میں دبے تنکے گرا بیٹھی تھیں...... وہ بھید بھری شام جیسے سارے منظر نامے پر چھا گئی تھی۔ مولوی فتح اس شام کے سارے سراغ پا گئے تھے...... وہ گھٹنوں تک آتا پانی...... وہ جل تھل گلیاں راستے بند کیے گئے تھے۔ درختوں کے جڑوں سمیت لاشے۔ اور وہ شام...... وہ آواز...... وقت چاندگلی کی جڑوں میں جیسے ٹھہر گیا تھا۔

"حی علی الصلوٰۃ...... (آؤ نماز کی طرف)...... حی علی الفلاح (آؤ کامیابی کی طرف)۔"

اذان حیرت نہیں تھی...... مؤذن حیرت تھا......

تندوروں کی راکھ اڑی...... جو جہاں تھا وہیں جم گیا تھا۔ قدموں کی دوڑتی آوازیں، مسجد کا پھاٹک لوگوں کے ہجوم سے بھر چکا تھا۔ بھانت بھانت کی آوازیں تھیں۔

"ایک ہندو حکیم کیسے اذان دے سکتا ہے۔ ایک مسلمان تو کبھی مندر کی گھنٹیاں نہیں بجاتا...... تو پھر ایک ہندو کیسے......؟"

حکیم ابا مسجد کے وسط میں کھڑے تھے...... اوپر برس برس کر تھک چکا آسمان...... نیچے سیراب ہوتی زمین...... اور پھاٹک پر غصے میں بھڑکتے۔ گیلی لکڑی کی طرح سلگتے لوگ۔ حکیم ابا کو ان کے ہاتھوں میں تھمی لاٹھیاں خوف میں مبتلا نہیں کر پائی تھیں۔ وہ سب انہیں اللہ کے گھر سے نہیں نکال سکتے تھے۔ مولوی فتح آگے بڑھے تھے اور ہاتھ کے اشارے سے سارے ہجوم کو واپس پلٹنے کا اشارہ کیا تھا۔

"سارے امن سے واپس پلٹ جاؤ۔ یہ حکیم اور اس کے اللہ کا معاملہ ہے۔"

اور یہیں پر آ کر ہاتھوں سے لاٹھیاں گر پڑیں۔ زبانیں تالو سے چپک کر رہ گئیں۔

حکیم ابا گھر لوٹے تو وہ ایک اجنبی انسان تھے۔ سیتا سامنے سامان باندھے کھڑی تھیں۔ تانگہ دروازے پر تھا۔ سیتا نے غصے سے حکیم ابا کو دیکھ کر قدم باہر کی طرف بڑھائے تھے۔

"حکیم صاحب! آپ مسجد میں ڈیرا لگا لیں۔ مجھے آزادی کا پروانہ بھیج دیجیے گا۔"

وہ چلی گئیں۔ وہ گم صم سے کھڑے کے کھڑے رہ گئے وہ دونوں سر جوڑے سیڑھیوں کے آخری سرے پر بیٹھی تھیں۔ وہ دونوں جڑواں بہنیں...... ان کی اولاد، آفرین اور تمکین......

☆☆☆

غازی ہمیشہ کی طرح چائے پیتا اخبار جہاں سامنے رکھے "کالا جادو" پڑھنے میں غرق تھا۔ حمید تاریخی کتابوں کے ڈھیر کو شمار کرتا بار بار گنتی بھول کر بے بسی سے غازی کو دیکھتا تھا۔

"جانے کب ختم ہوگا یہ کالا جادو۔ لگتا ہے ایم اے راحت صاحب خود بھی بہت بڑے جادوگر ہوں گے۔"

وہ تو سیما غزل کی "کال بیل" پڑھ کر ہی خوف زدہ

ہو گیا تھا اب بس کبھی کبھار لطیفے اور بچوں کی کہانیاں پڑھ کر اپنے "ذوق مطالعہ" کو تسکین دیتا رہتا تھا۔ کبھی کبھار کوئی ادیب لائبریری کا رخ کر لیتا تو حمید بڑے غور خوض سے انہیں دیکھتا تھا۔

بڑی عمر کے لوگ، ماتھے پر شکنیں، ناک کی پھننگ پر جمے ہوئے نظر کے چشمے، اردو کے بھاری بھاری الفاظ کا استعمال، حمید کی ننھی سی جان ان کے بوجھ تلے دبنے لگتی تھی غازی ہر آنے والے مہمان کے لیے خود چائے بناتا تھا اور ایک دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ انہیں پیش کرتا تھا۔ حمید کی جان جل جل جاتی تھی۔

"میرے لیے تو پتھر ہو جاتے ہیں۔ اور دوسرے ــــ کے لیے تو جیسے لہجے میں شہد گھول لیتے ہیں۔ ہونہہ۔"

حمید اکثر ان فریم چڑھے شیشوں والے ادیبوں سے مذاکرات کرتا رہتا تھا۔

"آپ لوگ اتنی موٹی موٹی کتابیں لکھتے ہیں تھکتے نہیں ہیں؟"

سگریٹ کا دھواں چھت کی طرف پرواز کرنے لگتا تھا۔

"تھک جاتے ہیں...... اکتا جاتے ہیں۔ پھر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں محنت میں جت جاتے ہیں۔"

"کیوں؟"

جھریوں بھرے چہروں پر امید کا دیا پھڑ پھڑانے لگتا تھا۔

"ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں اپنے مرنے کے بعد ...... ادیب مر جاتے ہیں مگر انہیں ان کی تخلیق زندہ رکھتی ہے کبھی بھی مرنے نہیں دیتی۔" حمید تھوڑا قریب ہو جاتا ہے سرگوشی کا سا انداز...... معنی خیز سا لہجہ۔

"آپ کو تو بہت لوگ خط لکھتے ہوں گے؟"

غازی کی گھوری کو ایسے موقع پر وہ چٹکیوں میں اڑا دیتا تھا۔

"جی لکھتے ہیں۔"

"رومانوی خط......؟" ادھر وہ ادیبانہ سی ادق ہلسی ہنس دیتے تھے۔

"ہر طرح کے خطوط...... رومانوی...... خوف ناک......"

"خوف ناک؟"

"ہاں جی...... اب ہر ایک کو تو ہمارا لکھا متاثر نہیں کر پاتا ناں...... ہم راتیں جاگ جاگ کر لکھتے ہیں اور پڑھنے والا چند لمحوں میں پڑھ کر اچھا ہے۔ بہت اچھا ہے۔ برا ہے۔ بہت برا ہے جیسے الفاظ کہہ کر ہماری تحریر کو سائیڈ پر کر دیتا ہے۔ اور بس۔"

راتوں کی تھکن جیسے چہرے سے ہویدا تھی...... پڑھنے والوں کی صدیوں سے منتظر کتابیں سرد آہیں بھر کر رہ گئیں۔

"ادیب بوڑھے ہوتے ہیں سارے ایسا کیوں؟ بزرگی ان کے چہرے کا نور بن گئی اور حمید کا سوال لائبریری کی بازگشت۔

"ادیب تو پیدائشی بوڑھے ہوتے ہیں۔ عرق ریز...... گیانی...... اور محنتی...... عام آدمی بچپنے سے بڑھاپے کی طرف جاتا ہے مگر ادیب بڑھاپے سے بڑھاپے کی طرف جاتا ہے۔"

چائے کی پیالیوں کا شور تھمتا۔ حمید چہرے کو ہتھیلیوں میں ٹکائے گم صم سا بیٹھا رہ جاتا تھا۔ غازی کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔

"ان انٹرویوز سے ہٹ کر اپنے حساب کی طرف توجہ دو تو بہتر ہو گا۔"

"آپ ایک انتہائی ظالم اور سخت گیر استاد ہیں۔"

"اور تم دنیا جہان کے نکمے اور ہڈ حرام شاگرد ہو۔"

"آپ کو میری قدر نہیں۔"

"دن بدن تمہاری زبان لمبی ہوتی جارہی ہے۔"

وہ ہونہہ ہونہہ کرتا رہے پھر منہ بناتا سیڑھی لگاتا۔ ابن صفی کے ناولوں کی ترتیب میں لگ جاتا تھا۔ سارے میں پھیلی کتابوں کی مخصوص مہک، دیمک کا نامحسوس سا شور...... گرد و غبار...... غازی نے سر اٹھایا تھا۔

"وہ پھر تو نہیں آئی تھیں ناں......؟" شاگرد

https://readingpaketoian.net

خاص بمشکل سیڑھی پر ٹنگا ہوا تھا۔

"وہ کون...... کس کا پوچھ رہے ہیں؟" غازی کی نظروں کے سامنے وہ اپسرا آن ٹھہری تھی۔

"وہی چلتا مسافر والی۔"

"وہ جو تین دنوں سے مسلسل آرہی ہیں اور آپ سے لڑ کر جاتی ہیں؟" غازی مسکرایا تھا۔

"ہاں...... ہاں وہی۔"

تمکین سخت غصے میں تھی اور اس نے قاسم کو خوب کھری کھری سنائی تھیں۔

☆☆☆

تمہاری اماں کون ہوتی ہیں کسی کے بھی ثواب گناہ، جنہم اور دوزخ کا فیصلہ کرنے والی۔ ہر کسی کے اپنے اعمال ہی اپنے کام آتے ہیں اور آج ایک بات تم لکھوا لو مجھ سے۔" وہ منمنا رہا تھا۔

"کون سی بات؟"

"یہی کہ خالہ فریدہ مجھے جنتی نہیں لگتیں۔ وہ پکا جہنم میں جائیں گی۔"

قاسم کا لٹھے کی طرح سفید ہوتا چہرہ ایک ہی پل میں جیسے اتر گیا تھا۔

"تمکو...... !وہ میری اماں ہیں۔" وہ طنز سے ہنسی تھی۔

"پڑی ناں دل پر چوٹ؟ لگا ناں دل کو دھچکا؟...... یہاں صرف ہم ہیں وہاں پوری بارات کھڑی تھی جب تمہاری اماں سب کے سامنے ہمارے ہندو ہونے اور تمہارے مسلمان ہونے کا دعویٰ کر رہی تھیں۔ قاسم ایسے بڑے بول بندے کا ایمان کھا جاتے ہیں۔" وہ رندھی ہوئی آواز قاسم کا دل چیر رہی تھی۔

"میں معافی مانگتا ہوں اماں کی طرف سے۔"

"جس کا جرم ہو اسے ہی سزا ضروری ہے۔ تم ایسے مت کرو۔"

وہ دونوں برگد والی حویلی کے طویل صحن میں کھڑے تھے جہاں پیپل کے بوڑھے چھتنار درخت تھے جو صدیوں سے وہیں اپنی جگہ ایستادہ تھے۔ ہوا پیپل کے پتوں میں سے سیٹیاں بجاتے ہوئے گزرتی تھی۔ قاسم کو وقت اور حالات نے عجیب منجدھار میں لا کھڑا کیا تھا۔ ایک تو اماں کو بھی دوسروں کے ذاتی معاملات میں دخل اندازی کا بہت شوق تھا۔

وہ انہیں ہر بار ٹوکتا تھا مگر ان پر اثر نہیں ہوتا تھا۔ وہ ان سے بحث میں جانے کتنی ہی چائے کی پیالیاں توڑ چکا تھا۔ دیواریں اب چائے کے زرد رنگوں سے رنگی جا چکی تھیں۔

"اماں آپ کو کبھی بھی دوسروں کے معاملوں میں دخل اندازی نہیں کرنی چاہیے۔"

"ارے بھئی میں تو جہاں بھی برائی ہوتے دیکھوں گی لازمی بولوں گی۔" اماں پر تو مانو ذرا بھی اس کی باتوں کا اثر نہ ہوتا تھا اور وہ بے چارا سر پکڑ بیٹھ جاتا تھا۔

"اماں...... اماں...... آج کل کا دور اپنا دامن بچا کر کانٹوں سے بچنے کا ہے۔ جو جیسا بھی ہے جہاں بھی ہے اسے رہنے دیں بس۔"

"ناں...... یہ تو مجھے کیوں آج اتنی باتیں سنائے جا رہا ہے کل سے...... میں تمہاری ماں ہوں۔ سمجھے۔" حقہ ماں نے پرے پھینک دیا تھا۔ حقے کی نے دو ٹکڑوں میں بٹ کر پرے جا گری تھی۔ "سب جانتی ہوں آج کل تیرے دل میں کیا چل رہا ہے۔ سب پتا ہے مجھے، جو تو آج کل برگد والی حویلی میں اس چنڈال سے ملاقاتیں کر رہا ہے۔"

اس وقت اگر وہ اماں سے کی گئی ساری گفتگو تمکین کے گوش گزار کر دیتا تو آج اس کے دنیا سے جوانی میں اٹھ جانے کے قوی امکانات تھے۔

"پیاری تمکین...... بس کبھی کبھی اماں واقعی زیادتی کر جاتی ہیں مگر وہ دل کی بری نہیں ہیں۔"

"آج کل کون ہتھیلی پر دل رکھے پھرتا ہے قاسم، اور مجھے سینوں میں دھڑکتے دلوں کو پڑھنا نہیں آتا۔"

تمکین کا سیدھا اور سپاٹ انداز قاسم سے برداشت نہیں ہو سکا تھا۔

"تمکین مہربانی کرو۔ بھول جاؤ۔"

"بھولنا آسان نہیں ہوتا قاسم! ایسی باتیں کبھی

بھی یادوں کے خانوں سے نہیں نکلتیں۔" ہوا نے پیپل کے پتوں کو اڑانا شروع کر دیا تھا۔

"میں معافی مانگتا ہوں۔"

"رہنے دو۔ تم معافیاں مانگتے بہت برے لگتے ہو۔" حمگین کے منہ بنانے پر وہ ذرا سکون سے ہنس دیا تھا۔

☆☆☆

لیمن گراس سڑک کر پیتے غازی کو اسے دیکھ کر اچھو لگ گیا تھا۔ وہ مطمئن انداز میں لمبے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑی تھی۔ وہی شاہانہ اطوار، تمکنت اور غرور۔

"چلتا مسافر آ گئی ہے۔" غازی نے سرور بھرے لہجے میں آفرین کو مطلع کیا تھا، جس کے چہرے پر ابھرنے والی طنزیہ مسکراہٹ نے غازی پر گھڑوں پانی انڈیل دیا تھا۔

"ٹرین سے آئی ہے یا بس سے؟"

حمید کے کھی کھی کرتے دانتوں کو توڑنے کی خواہش شدت سے غازی کے دل میں ابھری تھی۔ اس نے کتاب کاؤنٹر پر رکھی تھی۔ آفرین نے کتاب تھام کر طمانیت کے احساس کو گہرا اور گہرا ہوتا پایا تھا۔

"لیمن گراس پئیں گی؟" شیشے کے پیالوں میں ہلکی زرد چائے سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ آفرین کتاب کو بڑے سے بیگ میں ڈالتی ٹھٹک گئی تھی۔

"آپ ہر آنے والے کو لیمن گراس پیش کرتے ہیں؟"

"ناں..... نہیں....." وہ گڑبڑا گیا تھا۔

"تو پھر لڑکیوں کو؟"

"ہرگز نہیں۔" وہ اچھا خاصا برا مان رہا تھا۔ کتابیں جھاڑتا حمید، غازی کی حالت دیکھ کر اپنے دانت اندر نہیں کر پا رہا تھا۔ (آج فیثا غورث کا مسئلہ نہ آیا تو اسے پکا مرغا بنا کر رہوں گا) غازی کے دکھے دل سے صدا ابھری تھی۔

"صرف اور صرف آپ کے لیے یہ آفر ہے۔"

"سوری..... مجھے لیمن گراس پسند نہیں ہے۔"

دوپٹی والے جوتوں میں قید وہ نازک پاؤں لائبریری کی سیڑھیاں پار کر گئے تھے اور آنے والے دنوں میں وہ ذائقے بدلتا گیا۔ لیمن گراس، چائے، قہوہ اور آج کافی..... "گھوڑوں کے شہر میں اکیلا آدمی۔" تھامے کھڑی وہ مغرور اپسرا ہنسی تھی۔ الماریوں میں بند کتابیں مسحور ہو گئیں۔ دسترخوان لگائے بیٹھا حمید بھی چونک گیا تھا۔

"تم ہر روز ترتیب بدل کر پوچھتے ہو کبھی لیمن گراس، کبھی قہوہ، کبھی چائے اور کبھی کافی..... تھک نہیں جاتے؟" وہ نٹ کھٹ سا سوال غازی کے دل پر جا لگا تھا۔

"کسی دن آپ انکار نہیں کر پائیں گی۔"

"کیوں؟"

"مجھے لگتا ہے۔"

"اور آپ کو ایسا کیوں لگتا ہے؟"

"مجھے دل پڑھنے آتے ہیں آفرین جی۔" وہ چپ ہو گئی تھی۔ کتابوں کے ہجوم میں گھرا ہوا وہ شخص عام نہیں ہو سکتا تھا۔ حمید نے سر اٹھا کر سوال کیا تھا۔

"آپ کو کیا پسند ہے؟"

وہ سوال غازی کا دل ہو گیا تھا دھڑ دھڑ کرنے لگ گیا۔ وہ ڈپٹ کر چپ کرا یا..... باوقار انداز میں ہنستی وہ غازی کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی تھی۔

"مجھے سبز چائے۔ بہت پسند ہے۔ سبز چائے۔"

مٹھیوں میں بھری خوشبو کتابوں کے ہجوم میں چھوڑتی وہ ہرنی والی چال چلتی ہوئی آگے بڑھ گئی..... غازی کے ہونٹ مسکرا اٹھے تھے۔

وہ سارا دن اس کا شاداں و فرحاں گزرا تھا۔

حمید کو مرغا بنانے کا ارادہ وہ بھول گیا تھا۔ اگلی ٹھنڈی اور سلگی شام میں لائبریری کی چھتوں سے لٹکتے پنکھوں پر جنگلی کبوتر آن بیٹھے۔ کاؤنٹر پر کچھ گلاب پڑے تھے۔ وہ گنگناتا ہوا سبز چائے کی پتیاں کھولتے ہوئے پانی میں ڈال رہا تھا۔ گرم پانی میں چائے کھل گئی۔ اشتہا انگیز چائے کی پتیوں کی مہک سارے میں پھیل گئی تھی۔

https://

آج سے پہلے وہ بھی حمید کو نوں نہیں لگا تھا۔
کاٹن کے اپنے سب سے بہترین سوٹ میں ملبوس وہ کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھا ہمیشہ کی طرح سامنے راستے کی طرف نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ ان آنکھوں میں خوشی اور آس تھی۔

سبز چائے کی شوقین وہ کوہ قاف کی پری ابھی تک نہیں پہنچی تھی۔ ٹھنڈی ہوا کے سرد جھونکے اندر گھس آئے۔ کتابوں کے ورق پھڑپھڑائے...... حمید کتابیں جلد کرنے میں منہمک تھا۔ اونچے شیلف پر رکھے اسٹیریو سے ٹینا ثانی کی آواز میں فیض کی نظم ماحول کی رومانویت کو اور گہرا کر رہی تھی۔ پرفسوں...... خوابناک......!!!

وشت تنہائی میں اے جان جہاں لرزاں ہیں
تیری آواز کے سائے تیرے ہونٹوں کے سراب

کاؤنٹر کے شیشے پر پڑی چلتا مسافر اس مغلیہ شہزادیوں کی سی آن بان والی دوشیزہ کی منتظر پڑی رہی......!!!

غازی کی آنکھوں کا انتظار تھکنے لگا۔ چھت سے لٹکتے پنکھوں سے کبوتر اڑ گئے۔ وہ انتظار کے عادی نہیں تھے۔

''وہ آئے گی ناں حمید؟''

بیسویں بار پوچھے گئے سوال پر سر اٹھا کر اس نے غازی کو دیکھا اور ہر بار کی طرح جواب دے دیا۔

''پتا نہیں۔'' شام اندھیرے ہو رہی تھی۔ گلابوں کی مہک باسی ہو گئی۔ اسٹیریو کیک کا بند ہو گیا۔ کتابیں اداس، غازی کے کاج میں اٹکی۔ ننھی کلی چھوٹ کر گر پڑی۔

''وہ...... نہیں آئی...... خوشی اور آس مردہ پرندے تھے۔ اونچی چھت والی لائبریری رات گئے تک کھلی رہی۔ سبز چائے کی خوشبو پھیلی رہی۔ پتیوں نے رنگ بدل لیا۔!!!

ٹھنڈی رات میں کاؤنٹر کے پار وہ کتابوں کا شیدائی شخص کرداروں کے ہجوم میں تنہا، اکیلا اور اداس بیٹھا رہا گیا۔

......اگر یقیم ہیں ناں......!!!

☆☆☆

سیتا کے جانے کے بعد حکیم نے انہیں بہت محنت اور محبت سے پالا تھا۔ وہ دونوں بھی چھوٹی تھیں۔ پہلے پہل ماں کے لیے روتی تھیں پھر آہستہ آہستہ انہوں نے اپنے باپ کے ساتھ رہنا قبول کر لیا تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں سے روٹیاں بناتے تھے کبھی کبھار انگلیوں کی پوریں جل جاتی تھیں۔

زندگی اتنی آسان نہیں تھی جتنی انہوں نے سمجھ لی تھی...... جب بھی کبھی وہ زندگی سے تھکنے لگتے تھے مولوی فتح کی خدمت میں حاضر ہو جاتے۔

''مولوی صاحب...... میرے لیے دعا کریں کہ مجھے سکون ملے اور میں حالات کا مقابلہ کر سکوں۔'' مولوی فتح صاحب انہیں ہمیشہ تسلی دے کر ہی رخصت کرتے تھے۔

''ارے وہ لوگ بہت خاص ہوتے ہیں جنہیں اللہ اپنے راستے کی طرف لگا لیتا ہے۔ ان کا دل پھیر دیتا ہے اور آزمائش کے بعد انہیں کندن کر دیتا ہے۔ تم بھی ان ہی خاص لوگوں میں سے ہو۔''

''میری بچیاں چھوٹی ہیں ان کی ماں انہیں چھوڑ کر چلی گئی ہے۔''

''ارے تو کیا ہوا...... ان کا باپ تو زندہ ہے ناں۔''

''اور یہیں آ کر ایک نیا جوش، اور ولولہ ان میں زندہ ہو جاتا تھا۔ وہ نئے سرے سے پرعزم ہو گئے تھے۔ پھر آنے والے دنوں میں ان دونوں کو پوری توجہ سے پالنا شروع کر دیا تھا۔

سیتا کسی بھی طرح کی مصالحت پر راضی نہ ہوئی تھیں۔ اسی لیے انہیں طلاق کا پروانہ بھیجا جا چکا تھا۔ وہ دونوں بھی اب ماں کی غیر موجودگی پر سمجھوتہ کرنا سیکھ گئی تھیں...... حکیم ابا ہر شام ان کے کپڑے تار پر دھو کر پھیلا دیتے تھے۔ سالن خود پکاتے تھے کبھی کبھار جل بھی جاتا تھا۔ اور وہ تینوں صحن میں بیٹھے وہ جلا ہوا سالن برے برے منہ بناتے ہوئے کھا لیتے تھے۔

وہ اب بڑی ہو رہی تھیں ساری باتیں رفتہ رفتہ سمجھ رہی تھیں..... وہ انہیں اپنے پاس بٹھا کر کلمہ یاد کروایا کرتے تھے..... وہ سارا وجود ہلا کے کلمہ پڑھتی تھیں۔ جیسے جیسے بڑی ہوتی گئیں انہوں نے چھوٹے چھوٹے کام اپنے ذمے لینے شروع کر دیے تھے۔ کپڑے دھونے سے لے کر آنگن میں جھاڑو دینے تک..... آفرین نے روٹیاں بنانا سیکھا تو تمکین نے مرچ مسالوں کا تناسب سیکھ لیا اور جس دن انہوں نے حکیم ابا کو اپنے ہاتھوں سے کھانا بنا کر پیش کیا تھا وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیئے تھے۔

''میری بیٹیوں..... تمہارا باپ تم سے راضی ہے۔''

☆☆☆

فریدہ کی جان نکل گئی تھی وہ جانے کتنے ہی دنوں سے بخار میں پھنک رہا تھا۔ سارا جسم آگ کی طرح جل رہا تھا۔ بھوکا پیاسا وہ دوائی تک کھانے کو تیار نہ تھا۔ وہ بہت منتیں اور ترلے کر چکی تھیں مگر بے سود..... اکلوتی اولاد کی تکلیف ان سے نہیں سہی جا رہی تھی۔ کچھ دنوں سے جاری وہ بحث بالآخر قاسم کی بیماری پر ختم ہوئی تھی۔

''میں تمکین کے علاوہ کسی سے شادی نہیں کروں گا اور یہی میرا آخری فیصلہ ہے۔'' اک آگ تھی جس نے فریدہ کو راکھ کر دیا تھا۔

''وہ لڑکی..... نہیں..... اس سے تو ہرگز نہیں۔''

''کیا مسئلہ ہے اس میں.....؟''

''اس کا باپ پہلے ہندو تھا۔'' اذیت نے قاسم کو جیسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔

''آپ لوگوں کو ان کے ایمان سے جچ کرتی ہیں، یہ ان کا اور ان کے اللہ کا معاملہ ہے۔ آپ کیوں اگلے کے دل پر ہاتھ ڈالتی ہیں اماں..... انسانوں کو یہ اختیار نہیں ہوتے اماں..... اپنے دل کو بڑا کرنا سیکھیں..... ورنہ سب کھو دیں گی۔''

ان کا اپنا بیٹا انہیں آئینہ دکھا رہا تھا۔ جو چہرہ نظر آ رہا تھا وہ کیا واقعی ان کا تھا۔ ان کے ذہن پر وہ صورت لہرائی تھی۔

صبیح چہرہ۔ کالی کاجل سے بھری آنکھیں، اور ان آنکھوں میں تیرتے آنسو۔ وہ آنکھیں فریدہ کی طرف اٹھی تھیں۔

ان کے دل کو دھکا سا لگا تھا۔ وہ دونوں اکیلی لڑکیاں اور زمانہ تو ان جیسے لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہر قدم پر زہر اگلتے ہوئے لوگ تھے۔ یہ زہر دل مار دیتا تھا اور دل مر جائیں تو؟

فریدہ کا دل لرز کر رہ گیا تھا۔ اگلے جہان پوچھ لیا گیا تو کیا کہیں گی؟ تب کیسے جواز پیش کریں گی وہ؟

دل میں اذیت نے ایسی چٹکی کاٹی تھی کہ برقع اوڑھتی اسی وقت تمکین کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھیں۔

''میں معافی مانگنے آئی ہوں۔'' وہ سیڑھیوں پر کھڑی تھیں اور تمکین باورچی خانے کے دروازے پر، درمیان میں سیڑھیاں تھیں، وہ دونوں آمنے سامنے تھیں۔ کھجور کے پتے کورنگوں میں ڈبوتی آفرین اپنا فن بھول گئی تھی۔

فریدہ خالہ کیوں اور کیسی کیفیت میں آئی تھیں۔ سیڑھیاں چڑھتی وہ تمکین کے سامنے آ ٹھہری تھیں۔ بالشت بھر کا فاصلہ۔

''میں دل کی بری نہیں ہوں تمکین..... لیکن میں زبان کی بہت بری ہوں۔ بہت زیادہ اب زبان نہیں دل لے کر آئی ہوں مجھے معاف کر دو۔''

دونوں ہاتھ جوڑ دیئے گئے..... کھجور کے پتوں میں رنگ جذب ہوتا گیا۔ آفرین دوڑ کر ان کی طرف آئی تھی۔

''ایسے مت کریں خالہ آپ بڑی ہیں۔''

وہ رندھے ہوئے لہجے میں گویا ہوئی تھیں۔ ''بڑا تو وہ ہے آفرین..... جس نے مجھ جیسوں کو بھی چھوٹ دے رکھی ہے۔''

انہوں نے خالہ کو موڑھے پر بٹھا لیا تھا۔

''مجھے کبھی اندازہ نہ ہوا کہ زبان کا چکا اگلے کے دل پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ میں سچ میں تم

گوں سے شرمندہ ہوں۔
"نہیں خالہ...... ایسا مت کہیں۔"
دل کو اضطراب کی کیفیت سے نکال کر ہی انہیں سکون ملا تھا۔ ان کے جانے کے بعد تمکین اس کے پاس آکھڑی ہوئی تھی۔
"آفرین مجھے لگتا ہے جیسے انہیں قاسم نے بھیجا تھا۔ اسی کی وجہ سے آئی تھیں۔"
"وجوہات میں نہیں پڑا کرتے جب خبر ہو کہ ایک شخص شرمندہ ہے۔"
"تو کیا وہ خود آئی تھیں؟" رنگ گھولتی آفرین نے بغور اسے دیکھا تھا۔
"دیکھو تمکو! دلوں کے معاملے اللہ بہتر جانتا ہے یہ ہم انسانوں کے کام نہیں ہیں۔ ان کے دل میں چاہے جو بھی تھا مگر وہ شرمندہ تھیں۔ بس آگے کچھ مت سوچو۔"
تمکین نے بسنتی رنگ میں اپنی انگلی کی پور ڈبو دی تھی۔
"تم کتنی جلدی لوگوں کو معاف کر دیتی ہو۔"
تمکین کے کہنے پر آفرین نے سر اٹھایا تھا۔
"یہ آسان ہوتا ہے آگے بھی یہ چیز آسان کر دیتی ہے ہمارے راستوں کو......"
"مجھے بہت مشکل لگتا ہے آفرین۔"
"مجھے بھی کبھی لگتا تھا پھر آہستہ آہستہ میں نے بھی یہ سیکھ لیا تمکین!" وہ دونوں کھجور کی رنگین چھال کو دھوپ میں رکھنے لگی تھیں۔
دھوپ دیواروں سے نیچے کی طرف سرک آئی تھی۔ وہ اپسرائیں دنیا کے ہر فن میں طاق تھیں۔ سلائی کڑھائی، کھانا پکانا...... ابا کے گزر جانے کے بعد انہوں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔ زمانے کو برداشت کرنا آسان نہیں تھا۔ وہ ایک دوسرے کی راز دار تھیں۔ دیواروں کے طاق سر شام ہی مٹی کے دیے سے روشن ہو جاتے، سرسوں کا تیل ڈالنے کی ذمہ داری تمکین کی تھی اور دیا سلائی سے کپاس کو آگ دکھانے کا کام آفرین کرتی تھی۔

اور پھر اس شام تمکین کی لے دیوں میں سرسوں کا تیل ڈالنا بھول گئی اور آفرین جلتی ہوئی۔ دیا سلائی لے کر کھڑکی میں کھڑی تھی۔ کواڑ دھیرے سے کھلے تھے اور وہ بے موسمی ہوا کی طرح ادھر ادھر دیکھتی اجنبیوں کی طرح اندر آئی تھیں۔
وہی کھلے صحن کا آنگن تھا۔ نیم کا بوڑھا پیڑ ہمیشہ کی طرح اپنی جگہ ایستادہ تھا۔ پودینے کی پتیوں کی مہک، وہی سرخ اینٹوں والی پرانی سیڑھیاں۔ سیتا کا دل زور سے دھڑکا تھا سب کچھ ویسے کا ویسا ہی تھا کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ ان کے لب آہ کی صورت کھل گئے تھے۔
"کاش وہ شام اس گھر میں نہ آئی ہوتی وہ کٹر ہندو فیملی سے تھیں اپنے مذہب کے لیے مر مٹنے والی...... آج آنکھیں آنسو ہو گئیں۔ ہائے وہ ایک عورت بھی تو تھیں...... ایک شوہر اور دو جڑواں بیٹیوں کی ماں...... نیم کے چند خشک پتے ادھر ادھر بکھر گئے۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ سیڑھیوں پر آکھڑی ہوئی تھیں۔
"میں ماں ہوں تمہاری۔" وہ دھیرے سے ہلی تھیں۔ "ہمیں پتا تھا کہ کسی نہ کسی دن آپ ضرور آئیں گی۔"
خون میں ابال اٹھا تھا وہ دونوں سیتا سے لپٹ گئی تھیں۔ کتنی بڑی ہو گئی تھیں۔ شہزادیوں سی آن بان۔ رکھ رکھاؤ۔ ادب آداب۔ ان کی تربیت کس نے کی تھی؟ ان کے باپ نے، یہیں آکر سیتا مار کھا گئی تھیں۔
وہ تو ساری عمر اس زعم میں رہی تھیں کہ ان کا باپ کہاں دو بیٹیوں کی تربیت کر پائے گا۔ مگر......؟؟ چائے پینے کے دوران حسرت سے در و دیوار کو دیکھتی تیز تیز پلکوں کو جھپکتی وہ سوال پوچھ گئیں۔
"تمہارے ابا کے بعد کیسے گزارا ہوتا ہے۔"
"اللہ دینے والا ہے اماں!" سیتا کے دل پر چابک لگا تھا۔
"کچھ ہم سلائی کڑھائی کا کام کر لیتی ہیں۔ گزارا

ہو جاتا ہے۔"

"رات کو اکیلی ہوتی ہو؟" ماں کا دل تھا موم کی طرح پگھلتا جا رہا تھا۔

"بے بو آ جاتی ہیں رات کو....." سیتا سر ہلا کر رہ گئی تھیں۔ وہ دونوں ان کے سامنے ہاتھ باندھ کھڑی تھیں۔ ان کا دل بار بار بھر آ رہا تھا۔

"میرے ساتھ چلو گی اپنے نانا کے گھر.....؟"

سیتا نے ان دونوں کو پتھر کر دیا تھا۔ خاموشی چھا گئی۔ وہ چپ پرچ میں رکھی جانے والی پیالی کے شور سے ٹوٹی تھی۔

"نہیں..... ہم وہاں نہیں جائیں گے۔"

"کیوں؟"

"ہم یہیں ٹھیک ہیں۔ خوش ہیں۔"

"یہاں اکیلے؟"

"اکیلی نہیں ہیں ہم اللہ کافی ہے ہمارے لیے۔"

سیتا کو چپ لگ گئی۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ چائے کی پیالی ابھی بھی آدھی بھری ہوئی تھی۔

"ایک بار پھر سوچ لو تم دونوں۔"

"سوچنے کی ضرورت تو وہاں پڑتی ہے جہاں بے یقینی ہو۔"

"کتنی بڑی بڑی باتیں سیکھ گئی ہو تم دونوں۔"

آفرین ہولے سے ہنسی تھی۔ "اماں..... باتیں تو چھوٹی ہی رہتی ہیں بس انسان بڑے ہو جاتے ہیں۔ انا اور بے یقینی سے اپنے آپ کو اتنا بھاری کر لیتے ہیں کہ باقی سب کچھ انہیں ہلکا لگنے لگتا ہے۔"

وہ سیڑھیاں اتر رہی تھیں۔ وہی سیڑھیاں جن پر وہ قطاروں میں دیوالی کے دیپک جلا کر رکھا کرتی تھیں۔

"تو آپ رک جائیں اماں؟"

حکیم کے لہجے میں چھپی آس نے ان کا دل مسل کر رکھ دیا تھا۔

"میں.....؟" سینے پر انگلی رکھی تھی "میں چاہ کر بھی نہیں رک سکتی حکیم۔ میں ایسی عورت ہوں جس کا وجود جانے کتنے ہی ٹکڑوں میں بٹ چکا ہے۔ دو ٹکڑے یہاں ہیں اور دو ٹکڑے..... بنارس میں منتظر ہیں۔ جانے میں کہاں ہوں؟"

سیتا کی دائیں آنکھ سے باغی آنسو پھسل کر کچی مٹی میں گرا تھا۔ وہ ان کے سامنے جتنی مضبوط بن کر آئی تھیں ویسی نہیں رہی تھیں۔ ساڑھی کے پلوں سے کچھ نوٹ نکال کر انہوں نے حکیم کی مٹھی میں بند کر دیئے تھے اور سرگوشی میں گویا ہوئی تھیں۔

"شیرنی کھا لینا۔" ابوالہول کے بت کھڑے کے کھڑے رہ گئے تھے۔ وہ ہوا کے جھونکے کی طرح دروازہ پار کر گئیں۔

پیچھے آنگن میں سناٹا بین کرتا رہ گیا۔

ان دونوں کو کتنا انتظار تھا کہ وہ آئیں گی تو وہ انہیں روک لیں گی۔ مگر جو عورت یہاں آئی تھی وہ تو زنجیروں میں، بیڑیوں میں جکڑی ہوئی تھی اور یہ گھر تو اس کے لیے بالکل ہی اجنبی تھا۔

"دروازہ بند کر لو تم کو..... اب یہاں کوئی نہیں آئے گا۔"

وہ رات ضبط۔ استقامت اور دہشت کی رات تھی سارے پہر طاق میں لالٹین جلتی رہی۔ کڑوا کسیلا دھواں پھیلتا رہا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ کر سو گئیں..... بے بو جس سے آئیں تو کمرہ دھوئیں سے بھرا ہوا تھا اور سارے روشندان بند تھے۔

وہ تسبیح تھامے یا حی یا قیوم کا ورد کرنے لگ گئی تھیں۔ روشنی کا یہی تو طور ہے کہ جو چاہتا ہے اسے عطا کر دی جاتی ہے اور جو نہیں چاہتا وہ ایڑیاں رگڑ لے تب بھی نہیں ملتی۔ حکیم نے چاہا اور ہدایت مل گئی۔ سیتا نے دل کو قفل لگا لیے روشنی کا رستہ ہی بند ہو گیا اور جب روشنی اور ہوا کے رستے بند کر دیئے جائیں تو یونہی دھوئیں بند ہو جاتے ہیں۔ سانس رکنے لگتے ہیں۔ اور دائیں آنکھ سے آنسو گر کر کچن کی مٹی میں جذب ہوا کرتے ہیں۔

نیم کا بوڑھا پیڑ تماشا دیکھتا رہا..... اور دیواریں چپ تھیں۔

☆☆☆

حمید کے ہاتھ رکے کے رکے ہی رہ گئے تھے۔

سفید لمبی قمیص اور ہمیشہ کی طرح پائجامے میں ملبوس وہ اپسرا اندر آئی تھی۔ آفرین حکیم نے دن گننے کی کوشش کی تھی مگر اسے تو گنتی ہی بھول گئی تھی آج اتنے دنوں بعد بھی وہ اونچی چھت والی لائبریری سبز پتوں والی چائے کی خوشبو سے مہک رہی تھی۔ وہ پاس پڑی کرسی پر ڈھے سی گئی تھی۔

وہ کاؤنٹر کے پار بیٹھا کتنا سنجیدہ لگ رہا تھا۔ آج بھی ہر روز کی طرح حمید بحث کر کے بیٹھا تھا۔

"وہ آئیں گی۔" حمید کی ہنسی کو تاریخ کی کتابوں نے کافی غصے سے دیکھا تھا۔

"وہ نہیں آئیں گی...... پانچ دن ہو گئے ہیں۔" وہ دنوں کو انگلی کی پوروں پر گن رہا تھا۔

ان کی کوئی مجبوری بھی تو ہو سکتی ہے۔ تبھی وہ نہیں آئیں۔"

"محبت میں مجبوریاں ہوتی ہیں مگر پانچ دن کی نہیں ہو سکتیں۔" غازی کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا تھا۔

آج جب وہ سارے یقین ختم کر بیٹھا تھا۔ آنکھیں موندے کرسی سے ٹیک لگائے لٹا پٹا بیٹھا تھا وہ چلی آئی تھی۔ سبز پتیاں کھولتی رہیں۔ رنگ بدلتا گیا رومانویت سے بھرپور کتابیں انگڑائیاں لے کر بیدار ہوئی تھیں۔

غازی نے گہری سانس لی تھی، یہ چائے کی مہک میں کس مہک نے رنگ گھولے تھے۔ جھٹکے سے آنکھیں کھولیں آفرین حکیم سامنے ہی ہاتھوں کی انگلیاں توڑتی مروڑتی بیٹھی ہوئی ملی تھی۔ اپسرا کے چہرے پر شرمندگی سی تھی اور ادھر غازی کا دل دھڑک اٹھا تھا۔

"سبز چائے پئیں گی؟" حمید کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔

"قربت مرگ میں محبت۔" اٹھائے بیٹھی وہ ہلکے سے مسکرائی تھی۔

"سبز چائے مجھے پسند ہے۔" حمید نے دنیا کا برا ترین منہ بنایا تھا۔

"...کب ... کو میں معصوم انسان ہی پچھلے پانچ دنوں سے سبز چائے پی رہا ہوں۔" شیشے کی پیالیوں میں خوشبودار چائے کی مہک بند ہو کر اوپر کو اٹھی تھی۔ چسکیاں لیتے وہ چپ چاپ چائے پیتے رہے۔ ہلکے سروں میں اسٹیریو بجتا رہا۔

"تارڑ صاحب کو پڑھنے کا تجربہ کیسا رہا؟" وہ کتاب کی جلد پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔

"بے مثال سحر طاری کر دیتے ہیں ان کے الفاظ۔"

کتابوں کے شوقین نے شرارت کا سوچا۔ "اور کچھ لوگ بھی۔"

آفرین حکیم مسکراتی بیٹھی رہی۔ وہ لائبریری واحد جگہ تھی جہاں وہ خود کو دنیا جہان کے سارے جھنجٹوں سے غافل پاتی تھی۔ کتابوں کی ورق گردانی ان کا لمس، اسے سب بھلا دیتا تھا۔ قرنوں سے الماریوں میں بند کتابوں کی مہک اسے انگلی پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیتی تھی۔ اب وہ گھونٹ گھونٹ پیتی سامنے بیٹھے شخص کو دیکھ رہی تھی۔ جو شرم سے سرخ ہوتا چائے پیتے ہوئے چپکے چپکے اسے بھی دیکھ لیتا تھا۔

سبز چائے کی پتیوں نے "محبت" کی مہک سے کب گٹھ جوڑ کر لیے ان دونوں کو خبر بھی نہ ہوئی تھی۔ وہ بے خبر اور کتابیں باخبر......!!

☆☆☆

بے بو نے ان دونوں کو پاس بٹھا لیا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح باادب ہو کر ان کے پاس بیٹھ گئی تھیں۔ ابا کے ساتھ ساتھ ان دونوں کی تربیت میں کافی ہاتھ ان کا بھی تو تھا۔ وہ ان دونوں کی قابل استاد تھیں اور وہ دونوں فرماں بردار شاگرد...... دونوں اپنی اپنی خوبیوں میں باکمال...... بے بو نے انہیں اپنی اولاد ہی کی طرح سینا پرونا، کھانا پکانا، ادب آداب سکھائے تھے۔ ہانڈی کے مرچ مسالوں کی مقدار سے لے کر روٹی کی گولائی تک انہوں نے ان ہی سے سیکھی تھی۔ وہ دونوں بہت محنتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ انہیں اپنی اولاد ہی کی طرح عزیز بھی تھیں۔ آج بھی وہ انہیں

اپنی اولاد کی جگہ پر ہی رکھ رہی تھیں۔

"میں تم دونوں کو اپنی اولاد ہی کی طرح عزیز رکھتی ہوں اور یہ بات تجھے بتانے کی ضرورت بھی نہیں۔ میں نے تم دونوں کے لیے جو بھی آج تک کیا ہے اپنی دلی ـــ رضا ہی سے کیا ہے۔ اب تم دونوں جوان ہو چکی ہو اور مولوی صاحب کی سرپرستی میں ہو تو تمہاری آگے کی زندگی کا فیصلہ بھی ہمیں ہی کرنا ہے۔"

آفرین نے بے بو کے ہاتھ تھام لیے اور نم آنکھوں کے ساتھ ان کے ہاتھوں پر بوسہ دیا تھا۔

"جی بے بواماں، ہماری زندگی میں آپ ہی ہیں اور ہمارے سارے فیصلے کرنے کے اختیار آپ لوگوں کے ہی ہیں۔"

چراغ کی گھٹتی بڑھتی لو میں ان دونوں کا احترام بھی روشن تھا۔ احترام کی روشنی سارے جہاں کی روشنیوں پر بھاری ہوتی ہے۔

"فریدہ نے تمکین کے لیے سوال ڈالا ہے۔"

تمکین کا سر اوپر اٹھا تھا۔ دیواروں پر ان کے سائے حرکت کررہے تھے۔

"کیا مطلب بے بواماں؟" آفرین نے بے خیالی میں سوال پوچھا تھا۔

"مطلب وہ اپنے بیٹے قاسم کے لیے تمکین کا ہاتھ مانگ رہی ہیں۔"

چند لمحوں کو خاموشی ٹھہر گئی تھی۔ جو اکثر ایسے ہی موقعوں پر ٹھہر جایا کرتی ہے۔

"میں جانتی ہوں کہ فریدہ نے پچھلے دنوں جو کچھ بھی کیا مگر کل وہ مولوی صاحب کے پاس آئی تو رو رہی تھی اور معافی بھی مانگ رہی تھی اور جس معافی میں آنسوؤں کی نمی شامل ہو۔ وہ سچی معذرت ہوتی ہے۔ آگے تمکین بیٹی کے دل کی جو رضا ہو۔ کوئی بھی زور زبردستی نہیں۔"

تمکین کو وہ یاد آ ہی گیا جو اس کے سامنے ہکلا کر بولتا تھا۔ اکثر لفظ بھول جایا کرتا تھا۔ لہجے میں ایک خاص قسم کی عقیدت سی رکھتا تھا۔ حویلی کے بوڑھے چیپل اس کی سچائی کے گواہ تھے۔ وہ اس گواہی کے بدلے سارے قصور معاف کرسکتی تھی۔ دیواروں پر حرکت کرتے ہوئے سائے تمکین حکیم کے الفاظ سن رہے تھے۔

"بے بواماں...... میں آپ سب کی رضا میں راضی ہوں۔"

☆☆☆

تمکین حکیم، بہاروں کے سارے رنگ چوری کرکے دلہن کے روپ میں واقعی چاند گلی کی اپسرا لگ رہی تھی۔ ساری تقریب میں بتاشے بانٹتی فریدہ چوری چھپے اسے دیکھتی تھیں اور خود ہی شرما سی جاتیں۔ وہ دلہن ایک چراغ تھی اور ساری محفل اس کی روشنی سے روشن تھی۔ اگر جو وہ کسی اور گھر کی زینت بن جاتی تو؟

فریدہ کے دل پر گھونسا سا پڑتا تھا۔ قاسم سے زیادہ تو وہ خود خوشی سے مرنے کو تھیں۔

بیسویں بار وہ تمکین کا جھومر ٹیکا ٹھیک کرنے کے بہانے ماتھا چوم چکی تھیں اور رنگے ہاتھوں پکڑی بھی گئیں مگر بے بو نے ہر بار فریدہ کو مسکرا کر دیکھا تھا۔

"فریدہ تم ہی اپنی بہو کو نظر لگاؤ گی۔" فریدہ کی آنکھوں میں آنسو ٹھہر سے گئے تھے۔ وہ بے بو کے قدموں میں بیٹھ گئی تھیں۔ نکتہ چینی کرنے والی اس عورت کو تقریب کے ہر فرد نے روتے دیکھا تھا۔

"بے بو...... میں تمہارا احسان ساری زندگی نہیں بھولوں گی۔ تم نے ہیرا میری جھولی میں ڈالا ہے۔"

وہ چاند گلی کی اپسرائیں...... وہ عقیدت کی دیویاں...... احترام کی داسیاں...... آفرین حکیم نے انہیں تھام لیا تھا۔

"خالہ اٹھ جائیں بارات تیار کھڑی ہے۔"

وہ سرخ اینٹوں سے بنی سیڑھیاں، وہ بوڑھا صدیوں سے چپ چاپ کھڑا درخت، دیواروں سے لپٹی سبز بیلیں۔ تمکین کے اندر کہیں آنسوؤں کی بارش ہوئی۔ وہ بچپن، لڑکپن، یادیں، سب اسی چوکھٹ تک تھا اور بس......!! وہ دونوں لپٹ کر روتی رہیں۔ ایک ساتھ کی پیدائش...... اکٹھے بڑھو تری اور اب

https://readingpanel.net

جدائی...... صبر ان دونوں پر ختم تھا۔ روتے روتے ایک ساتھ ہنس دی تھیں۔ آفرین حکیم کی سرگوشیاں زرتار لباس میں ملبوس تمکین تک بخوبی پہنچ رہی تھیں۔

"تمکو سب کچھ بھلا دینے کا فن بہت افضل ہوتا ہے۔ ماضی ساتھ ہو تو ہر بار تکلیف ہی دیتا رہتا ہے۔ فریدہ خالہ کو اب بے بو کی جگہ رکھنا...... انسان بہت بار انجانے میں بہت کچھ بول جاتا ہے لفظوں کی پکڑ بہت دکھ دیتی ہے۔ مجھے تم پر یقین ہے کہ تم سب سنبھال لوں گی...... میرا غرور ہمیشہ سلامت رہنے دینا۔"

وہ سرہلاتی آنسو چھپاتی ہوئی دہلیز پار کر گئی تھی۔ وہ گھر ایک تصویر تھا اور تصویر کا ایک کردار جا چکا تھا۔ خالی پن بڑھنے لگا تھا۔ درودیوار اداس اور غمگین تھے۔ مٹی کے دیوں میں سرسوں کا تیل ڈالنے والی چلی گئی۔ جلتی ہوئی دیا سلائی میں کوئی دوسرا چہرہ نظر ہی نہ آتا تھا......!!

زندگی صرف اور صرف سبز چائے کی پتیوں کی مہک بن گئی تھی...... یہ ہمیشہ رہتی اگر......؟؟

☆☆☆

ہمیشہ کا وُنٹر کے پیچھے بیٹھنے والا سامنے آیا تھا۔ آفرین حکیم لڑکھڑائی تھی۔ بس ہلکی سی لڑکھڑاہٹ اور بس...... وہ چھڑی تھامے گم صم سا کھڑا تھا۔ حمید جانے کہاں تھا...... لائبریری کی اونچی چھتوں کے پنکھے گھوم رہے تھے، رومانویت کی کتابوں کے سارے اختتام وہیں آ گئے تھے۔ آفرین کی آنکھوں میں فروری کی دھند چھا گئی تھی۔ وہ ہولے سے لرزتی ہوئی پلٹ گئی۔

کتابوں کا شوقین اداس اور تنہا سادہ شخص پہلی بار زندگی میں پہلی بار اپنی "معذوری" پر رو رہا تھا۔

سبز چائے کی مہک ابھی بھی گھوم رہی تھی۔ الماریوں میں بند وہ بوڑھی کتابیں اپنے مالک کے دکھ پر رو دی تھیں۔ اسٹیریو پر فیض کی "تنہائی" دھیمے سروں میں بج رہی تھی۔

پھر کوئی آیا دل زار! نہیں کوئی نہیں
راہ رو ہوگا، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل گئی رات، بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سوگئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گزار
اجنبی خاک نے دھندلا دیئے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں، بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کرلو
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا

وہ ننگے پاؤں ٹہلتی رہتی تھی...... ساری رات سبز چائے کی پتیوں سے مہکتی رہتی تھی۔ خود کلامی کب عادت بن گئی اسے پتا بھی نہ چلا۔

"آفرین حکیم...... محبت میں مکمل ہونے کی شرط کہاں ہوتی ہے؟ وجود کے معاملے میں کسی کی نہیں چلتی۔"

وہ بے بو کے پاس سوال لے کر آ گئی تھی۔ بے بو اماں کبھی کبھی بہت ہی خوب صورت انداز میں مسکراتی تھیں کہ نظر ہٹانا مشکل لگنے لگتا تھا۔ آفرین حکیم نظریں ہٹانا بھول گئی تھی۔

"آفرین...... ہم انسان کو انسان کی بنائی گئی تخلیق پر بے عزت کر سکتے ہیں۔ برا بھلا بھی کہہ سکتے ہیں مگر اللہ کی تخلیق یعنی انسان کو اس کی معذوری پر برا کہنا ہمارے لیے اچھا نہیں...... اللہ اپنی تخلیق میں بے مثل ہے۔"

☆☆☆

"سبز چائے کی ایک پیالی ملے گی......؟"

بوڑھی کتابوں کو اپنی سماعتوں پر شک گزرا تھا۔ وہ تو چاندنی کی اپسرا کی آواز تھی دلکش۔ دل گداز۔ حمید جو آفرین کے خلاف ایک لمبی تقریر جھاڑ کے مطمئن ہوا بیٹھا تھا اسے جھٹکا سا لگا تھا۔

آج لائبریری میں چائے کی مہک نہیں تھی۔ چائے بنانے والا اداس پژمردہ نڈھال سا بیٹھا تھا۔ تیز تیز پلکیں جھپکیں۔ خواب حقیقت بن کر سامنے تھا۔ وہ "وہی" تھی۔ دھیما دھیما سا مسکراتی۔ نظریں چراتی۔

"مجھے لگا تھا کہ آپ......" الفاظ ادھورے......

جملہ نامکمل تھا۔

"مجھے آپ نے سمجھنے میں غلطی کی۔ میں ایسی نہیں ہوں۔" لہجے میں خفگی سی تھی۔

"حمید کہتا ہے کوئی بھی لڑکی ایک لنگڑے شخص کو پسند نہیں کر سکتی جس کی زندگی صرف اخبار جہاں اور چائے کے گرد گھومتی ہو۔" حمید شرمندگی سے ڈوب مرنے کو تھا۔ کتابوں نے سر اٹھا کر کینہ توز نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ "ہونہہ۔ اونہوہو۔"

"کوئی تو لڑکی ایسی بھی ہو سکتی ہے ناں کہ جو آپ کو چائے اور کتابوں کی وجہ سے پسند کر لے۔" وہ مسکرائی تھی۔ کتابیں اس ساز پر چونکی تھیں وہ جب بھی آتی تھی وہ الماریوں کے شیشوں سے چھپ چھپ کر اسے دیکھتی تھیں۔

"مگر حمید تو......؟" وہ ٹھٹکا۔

"اسے چھوڑیں...... یہ تو جلد فیل شدگان کی فہرست میں درج ہوگا۔"

ساری کتابوں کا بوجھ معصومیت کے شاہکار حمید کے سر پر آ گیا تھا۔ شرمندگی سے گردن جھکالی تھی۔

"میں زیادہ اچھا انسان نہیں ہوں سادہ سا کتابوں کی دنیا میں رہنے والا شخص ہوں۔ میرے لیے زندگی کتاب اور چائے کی پیالی سے بڑھ کر ثابت نہیں ہوئی۔ اپنی معذوری کی وجہ سے میں نے انسانوں کے بجائے کتابوں کو دوست بنالیا ہے۔ کتابیں اچھی دوست ہوتی ہیں۔" آفرین حکیم اس سادہ سے کتابوں سے محبت کرنے والے شخص کو دیکھتی رہ گئی تھی!!

"میں بھی ایک زیادہ اچھی انسان نہیں ہوں۔ میری زندگی بھی کتاب سے شروع ہو کر کتاب پر ختم ہو جاتی ہے۔ اور مجھے کتابوں کے دوست بہت پسند ہیں۔"

محبت کونے کھدروں سے نکل آئی تھی۔ غازی نے ابلتے ہوئے پانی میں چائے کی پتیاں ڈالیں۔!!

"میں ایک مکمل انسان نہیں ہوں۔" وہ شرمندہ نظر آرہا تھا۔ حمید فیثا غورث کے مسئلوں میں الجھا ہوا تھا

وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ وہی شاہانہ تمکنت...... وقار...... اور...... دلکشی......!!!

"میں انسانوں کو ان کے قول و فعل سے جانتی ہوں، جو آپ کا اور آپ کے اللہ کا معاملہ ہے اس میں مجھے کوئی دخل نہیں۔ آپ کو اس پر کوئی شرمندگی نہیں ہونی چاہیے۔"

وہ عنبر کی خوشبو لے کر آئی تھی۔ غازی نے سرشاری کے عالم میں شیشے کی پیالیوں میں چائے انڈیلنی شروع کر دی۔ ہلکا زرد رنگ سارے منظر نامے پر چھا گیا تھا۔ انسان صرف اور صرف اپنے قول فعل سے مکمل ہوتا ہے...... وجود تو مٹی ہوتے ہیں۔ ہڈیاں...... ختم ہو جانے والے......!!!

تاریخ کی کتابوں کے سارے بہادر کرداروں کی بہادری لے کر غازی نے چاندگلی کی اپسرا کو مخاطب کیا تھا......!!!

"میں اماں کو بھیجوں......؟" حمید کا سر اٹھا تھا۔ فیثا غورث کا سارا مسئلہ وہ بھول گیا۔

"کیوں؟" گھونٹ گھونٹ چائے پیتی وہ شرارتی انداز میں گویا ہوئی تھی۔

"میں آپ کو ان ساری کتابوں کا مالک بنانا چاہتا ہوں۔"

کتابوں نے اپنے دوست کے اس خوب صورت اظہار پر خوشی سے ورق پھڑپھڑائے اور خود کو خاموشی میں گم کر لیا۔ آفرین حکیم جاننے لگی...... چائے کی مہک...... کتابوں کی خوشبو...... اور محبت کی آواز......!!!

اس نے آنکھیں اٹھا کر غازی کو دیکھا تھا۔

"میں انتظار کروں گی۔"

ثمین ملک

دھوئیں کا بھنور

''کیا کمال کا میک اپ کرنا آ گیا ہے تمہیں۔'' حریم کا میک اپ دیکھ کر سعدیہ خالہ بہت متاثر ہوئی تھیں۔

''یہ کمال ہے انسٹا گرام کی میک اپ بلاگرز کا جو ایک ایک مرحلے پر ہم جیسی چٹی ان پڑھ لڑکیوں کی رہنمائی کیا کرتی ہیں۔'' حرا نے اپنی قابلیت کو بہت

آسانی سے شیئر کیا ورنہ کوئی بھی لڑکی اسے صرف اور صرف اپنی صلاحیت جتا کر سارا کریڈٹ لے سکتی تھی۔

"ہر وقت موبائل لیے بیٹھی رہتی ہے یہ اور سعدیہ، تم اس کی حوصلہ افزائی نہ کرو۔ اب تو پھر بھی رات کے لیے چار روٹیاں ڈال دیتی ہے پھر تو اس نے ہاتھ ہی نہیں آنا۔" آپا خالدہ نے اپنی چھوٹی بہن کو ٹوکا۔

"کیوں بھئی، حریم تو خیر سے آج وداع ہو رہی ہے۔ کل سے ذمہ داریاں تمہاری منتظر ہیں۔" سعدیہ نے آپا کا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے کہا۔

"خالہ جان! حریم صاحبہ پڑھائی اور جاب کے بعد گھر کو کتنا وقت دیتی رہی ہیں، یہ امی اور آپ خوب جانتی ہیں۔ میری تو چار روٹیاں ہی شمار میں آئیں گی۔" حرا نے تپتے ہوئے جلدی جلدی آنکھوں کا میک اپ مکمل کیا اور واش روم کی لائٹ میں اپنی سیلفی لینے چلی گئی۔

"دیکھ لیا نا، جانے کے لیے نیچے گاڑیاں تیار ہیں۔ دلہن تجی بیٹھی ہے۔ اس لڑکی کو بجائے گھر کے کام سنبھالنے کے اپنی تصویریں لینے کی پڑی ہوئی ہے۔"

"آپا! اسے سیلفی لینا کہتے ہیں۔"

"ہاں تو کیا میں جانتی نہیں...... دن میں دس بار تو میرے ارد گرد گھوما کرتی تھیں۔ یہ دونوں موبائل اٹھائے، ذرا مسکرا دیں، ذرا ایکشن تو کریں۔ اب چلو بڑی بی! ہال میں سب سے آخر میں پہنچنا ہے کیا؟" امی نے پُرزور الفاظ میں کہا۔

دلہن بنی حریم کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "بارات ابھی گھر سے روانہ نہیں ہوئی ہے؟"

"لو دیکھو، یہ ہے آج کا ماڈرن زمانہ...... دلہن کو دولہا جی چلتے وقت میسج تو کریں گے ہی۔" امی اور سعدیہ کے علاوہ حریم کی بھی ہنسی چھوٹ گئی۔ ہونا تو دراصل یہی تھا۔ حریم بھی یہی سوچ رہی تھی کہ گھر ہی میں وہ اپنا موبائل چیک کر سکتی ہے۔ راستے میں یا ہال میں پہنچ کر تو لوگوں کے سامنے ٹیکسٹ نہیں پڑھ سکے گی۔

"وہ جب بھی گھر سے نکلیں، ہمیں تو ان سے پہلے ہی پہنچنا چاہیے۔ بند کر دو یہ موبائل اور رکھو پرس میں۔ چارجر لے لیا ہے حرا! وہ اسے دینا نہ بھول جانا۔ صبح ایس ایم ایس کرے گی تو ناشتے کے لیے چلیں گے ناں۔"

"آپا ناشتے کا آرڈر دے دیا زہرا کو؟"

"تمہارے بھائی صاحب تو راجپوت والوں سے بھی ذکر کر بیٹھے تھے، پورے چالیس افراد کی کیٹرنگ کروائی ہے۔ دیسی اور کانٹی نینٹل دونوں ناشتے ہوں گے۔ زہرا بل دار پراٹھے اور آلو کی ترکاری بنا رہی ہے۔ راجپوت والے تو وہیں ہاتھ کے ہاتھ پکائیں گے۔"

"امی اسے لائیو کوکنگ کرنا کہتے ہیں۔" اب کے حرا چہک کر بولی۔

ادھر لینڈ لائن پر پرنمیر کی کال آ گئی۔ ابو تھے جو ہال پہنچ چکے تھے۔ وہ دولہا کی سلامی کے لفافے اور تحفے یاد دلا رہے تھے۔

"جی رکھ لیا ہے پرس میں...... بس نکل رہے ہیں، لاک کر رہے ہیں گھر کو۔" امی نے انہیں تسلی دی۔

گھر سے ہال تک کا فاصلہ محض پچیس منٹ کا تھا مگر ٹریفک جام تھا۔ جسے پینتالیس منٹ میں عبور کر کے وہ ہال میں پہنچیں تو چچا جان کی فیملی آ چکی تھی اور ابو کے ساتھ دولہا والوں کے لیے نشستوں اور کھانے کی میز کی سیٹنگ دیکھ رہی تھی۔

چچی جان نے ہمیشہ کی طرح والہانہ انداز میں حریم کو خوش آمدید کہا۔ "چشم بدور، اللہ اپنے گھر کی خوشیاں دکھائے۔"

حرا نے حریم کا فرشی غرارہ سنبھالا ہوا تھا فوراً کہا۔ "آمین۔"

"چچی جان! یہ بتائیے میک اپ کیسا ہے؟"

https://reading.pakistan.net

''بیس ہزار کا ہے۔ اچھا کیوں نہیں ہوگا۔''

''نہیں نہیں میرا..... میں نے تو پارلر سے میک اپ نہیں کروایا۔''

''تو گھر پر آنی ہوگی پارلر والی..... جیسمین کو میں نے بھی فون کیا تھا مگر بڑے نخرے تھے بھئی۔ کہتی ہے ولیمے والے روز آجاؤں گی۔''

''وہ تو پانچ بجے ہی چلی گئی تھی۔ میں نے بلو ڈرائے کروایا اور پرسوں فیشل کرنے آئی تھی۔ یہ ڈراما ہے جیسمین بھی۔''

''چلو خیر، تم نے تو اچھا میک اپ کیا ہے۔ خوش رہو۔''

چچی جان امی کی جانب چل دیں کہ انتظامات میں مدد دے سکیں۔

دلہن کو اے سی والے روم میں بٹھا دیا گیا تھا۔ وہاں اس کی سہیلیاں اور کالج کے ساتھی تحائف لا کر رکھتے جا رہے تھے۔ اچھا ہال تھا۔ انتظامیہ نے دولا کر یہاں بنوائے ہوئے تھے کہ اپنا قیمتی سامان یہاں رکھتے جائیں جن کی چابیاں بھی دلہن والوں کو دے رکھی تھیں۔ نکاح دو روز پہلے ہو چکا تھا۔ کہنے والے کہہ رہے تھے کہ یہ پہلی شادی ہے جس میں وقت کی پابندی دیکھی جا رہی ہے۔

دولہا دلہن کو اسٹیج پر بٹھایا گیا تو دولہا کے دوستوں کی بڑی تعداد آس پاس منڈلانے لگی، شوخیاں باتوں میں گھلی جا رہی تھیں اور لہجے سہاگ کے گیت گنگنا رہے تھے۔ اتنے میں رخصتی کا وقت آن پہنچا۔

حریم روایتی دلہنوں کی طرح امی سے لپٹ کر رونے لگی تو دولہا شہروز نے ان دونوں کو دلاسا دیا اور کچھ اس طرح سے بات کی کہ دونوں ماں بیٹیاں مسکرا دیں۔

''میں اسے آپ کے نہیں اپنے گھر کی بیٹی کی طرح رکھوں گا۔ آنٹی ایک رات کی بات ہے پھر ہم ناشتے پر چند گھنٹوں بعد مل رہے ہیں ناں۔'' جاتے جاتے شہروز کی شوخیاں جاری رہیں۔

وہ ایک کو گاڑی بھی خود ڈرائیو کر کے لے گئے اور دلہن پیچھے کے بجائے ان کے ہمراہ آگے فرنٹ سیٹ پر براجمان تھی۔ دیکھنے والے مسکرا رہے تھے کہ یہ انقلابات ہیں کس زمانے کے؟ شاید نئے زمانے کے ہوں گے۔ دولہا دلہن خوش تو گھر والوں کو بیٹھنے بٹھانے پر کیا اعتراض ہوتا۔

ہفتہ بھر بعد وہ دو دن کے لیے میکے آئی تو حرا کے لیے جو رشتہ آیا تھا۔ اس کی خاطر مدارات میں لگی رہی۔

''اس لڑکے کو میں نے کہیں دیکھا ہے۔'' پہلی ہی ملاقات میں وہ انیب کو دیکھ کے سوچوں میں پڑ گئی تھی۔

''آپ کیا کرتے ہیں؟'' اس نے چائے پیش کرتے ہوئے رشتے کے امیدوار سے پوچھا تھا۔

''گاڑیوں کا بزنس بھی ہے اور ایک اسٹیٹ ایجنٹ کے ساتھ شراکت داری میں جائیداد کی خرید و فروخت بھی کرتا ہوں۔''

''غالباً خالد بن ولید روڈ پر شوروم ہوگا؟'' ابو نے گفتگو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں انکل! شہید ملت روڈ کی کراسنگ پر ممتاز علی آٹو کیسل آپ آیئے ناں کسی روز.....'' ایک نے بڑی تابع داری اور مہذب انداز میں اپنا تعارف کرایا۔ ایک دوسرے کے وزیٹنگ کارڈز اور سیل فون نمبرز کا تبادلہ ہوا۔

اگلی ملاقات تک کا وعدہ لے کر یہ فیملی رخصت ہوئی۔

بظاہر تو سب کچھ اچھا ہی لگ رہا تھا۔ انیب نے ایم بی اے کیا تھا جبکہ حرا ابھی بی بی اے ہی کے آخری سیمسٹر میں تھی۔ سعدیہ خالہ کا کہنا تھا کہ یہ فیملی ان کے پڑوس میں زیادہ آتی جاتی ہے اور پڑوسیوں نے ان کے بارے میں بڑی اچھی رائے دی تھی۔ اب امی ابو بھی ان کے ہاں جانا چاہتے تھے۔ حرا کی اپنی کوئی صلاح نہیں تھی نہ ہی وہ اتنی ذہین یا خود مختار تھی کہ اتنا

بڑا فیصلہ اپنے ہاتھوں کر لیتی۔ وہ سیلفی کے پوسچرز بنانے والی نسل کی ایک رکن تھی جو اچھے لباس اور جدید ترین فیشن کے میک اپ تک، اپنی دنیا میں گم رہتی ہے۔ یا پھر یونیورسٹی کے معمولات تک محدود ہوتی ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ نئے ریسٹورنٹس کی ڈشز کا لطف اٹھانی یا سوشل میڈیا پر ہلکی پھلکی تفریح سے آگے اسے کچھ پتا نہیں تھا۔

اس تصویر کی دوسری سمت بڑی بہن حریم نے گائنی میں اسپیشلائزیشن کی تھی، ایم آر سی پی کر کے نامی گرامی گائنا کولوجسٹ کے ذاتی اسپتالوں میں تین چار سال خدمات انجام دی تھیں۔ متعدد سرجریوں اور معصوم بچوں کی پہلی پہلی آوازوں کی دستک اپنے دل کی دھڑکن سے سرگم چھیڑتی ہوئی محسوس کی تھی۔ کئی بار آورنہ ہونے والی ماؤں کی ڈی این سی کے فرائض انجام دیے۔ یہاں اسے دو شفٹوں میں ایمرجنسیز سے نبٹنا ہوتا۔

حریم کے ساتھ دوسری ڈاکٹرز بھی اس مقدس پیشے میں عزت و وقار کے ساتھ اپنی ساکھ برقرار رکھے ہوئے تھیں۔

حریم نے شادی کے بعد مہینے بھر کی چھٹی لی تھی وہ تھائی لینڈ سے لوٹی تو اسے ٹیچنگ کالج سے لیکچرر شپ آفر ہو گئی۔ اب اس کے معمولات تبدیل ہو گئے۔ اسے اب کلینک میں دوپہر کو آنا ہوتا تھا مگر وہ پہلا دن تھا..... یادوں کے سائے موسم گرما کی دوپہروں کی مانند سلگتے ہوئے سے محسوس ہو رہے تھے۔ شہروز کو اس دن گاڑی درکار تھی نہ جانے کون سنگاپور سے آرہا تھا۔ گاڑی تو ایئرپورٹ گئی حریم نے پرائیویٹ ٹیکسی کے لیے بکنگ کرائی اور کلینک جا پہنچی..... اس کے بیٹھنے سے قبل پیرامیڈیکل اسٹاف آ چکا تھا۔ مسز کاظم حسین سینئر نرس سے پریکٹس کے بارے میں بات چیت ہونے لگی۔ وہ حریم کے خاندان سے بھی واقف تھیں۔ حرا کا حال چال پوچھنے لگیں۔

اچانک حریم نے ایس ایم ایس دیکھنے کے لیے سیل فون آن کیا۔ انیب نے اپنی تصویر شیئر کی تھی۔ بے دھیانی میں حریم نے مسز کاظم سے حرا کے رشتے کا تذکرہ کر دیا اور انیب کی تصویر دکھا دی۔ وہ روانی میں انیب کی فیملی کی باتیں کرتی گئی تھی لیکن مسز کاظم کے چہرے کا رنگ بدل گیا جیسے وہ اس بات سے خوش نہ ہوئی ہوں اور فکر مند ہو گئی ہوں۔

حریم ایک لمحے کو چپ ہو گئی۔ چند لمحے سکوت کی نذر ہو گئے۔ مسز کاظم نے دوپٹے سے ماتھے پہ آنے والے پسینے کو پونچھ کر کہا۔

''حریم! میں نے اس لڑکے کو کہیں دیکھا ہے؟ شاید یہیں اس کلینک میں.....''

''ہو سکتا ہے، کبھی کسی کلائنٹ یا پیشنٹ کے ساتھ آئے ہوں۔''

''اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی پیشنٹ کو اپنے ساتھ لائے ہوں۔'' انہوں نے زیر لب کہا مگر ابھی بھی وہ پورے طور پر یقین سے کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھیں۔

شام تک سیاہ بادل آسمان پر چادر تان چکے تھے۔ سورج انسانوں کی وادی سے چہرہ چھپا کے کہیں گم سا ہو گیا تھا۔ پہلے آندھی اور پھر بوندا باندی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

کلینک میں بھی کچھ کم رش نہ تھا۔ ادھر شہروز کے ایس ایم ایس آنے لگے وہ ساحل کنارے چلنے کی فرمائش کر رہے تھے اور حریم بزی ہوں، ابھی نہیں، ایک گھنٹے تک، اسی طرح کے ملے جلے میسجز کر رہی تھی۔

مغرب کی نماز سے کچھ دیر پہلے امی کا فون آیا وہ بہت گلہ کر رہی تھیں کہ ان کی طرف چکر نہیں لگایا۔ وہ اپنی اور شہروز کی مصروفیت کے قصے سناتی رہی۔ ان کی ناراضی ختم کرنے کے لیے وہ بنا مشورے کے رات کے کھانے پر ملنے کا وعدہ کر بیٹھی۔ کچھ تو شہروز پر بھی بھروسہ ہی تھا کہ آدھ پون گھنٹہ دو دریا پہ گزار کر وہ اماں کے گھر لے ہی جائیں گے اور سچ مچ یہی

ہوا......توقع کے عین مطابق بارش کی رِم جھم تو رات گئے تک جاری رہی۔

امی کے گھر مکھنی ہانڈی، افغانی پلاؤ اور پایا کنہ اور میٹھے میں زعفرانی کھیر بنی تھی۔ تازہ پھولوں اور کھانوں کی خوشبوئیں لٹاتے اس گھر میں آج کچھ خاص ہی رونق تھی۔ پتا چلا کہ انیب کے گھر والوں کو دعوت پہ بلایا گیا ہے۔

"اماں! اتنا اہتمام......کیا آپ نے رشتہ قبول کر لیا؟" اس نے کچن میں امی کا ہاتھ بٹاتے ہوئے پوچھا۔

"بیٹا! اس کے ماموں امریکہ سے آئے ہیں وہ ملنے آرہے تھے۔ تمہارے ابا نے کہا، اس ماموں نے انیب کو منہ بولا بیٹا کہہ رکھا ہے تو اس طرح انیب کا یہ خاص رشتہ ہوا ناں......سات ساڑھے سات بجے آنے کا کہہ رہے تھے اب یہ درمیانے وقت میں کیا تواضع کی جاتی۔ ہم نے بھی رشتہ تو کرنا ہی ہے۔ اس لیے کھانے کا اہتمام کرلیا۔ ہانڈی اور افغانی پلاؤ تو زہرا آپا سے بنوائے ہیں کہ اس غریب کو بھی دو پیسوں کا فائدہ ہو جائے اور اپنا کام بھی ہو جائے۔ ورنہ تمہاری چھوٹی بہن کو اتنی فرصت کہاں ایک گھنٹہ لگا دیا چار روٹیاں اور کھیر بنانے میں۔ پتا نہیں سسرال میں جا کے کیا کرے گی۔"

امی کے لہجے میں محبت کی چاشنی کو گھلا ہوا محسوس کیا جاسکتا تھا۔ مائیں اسی طرح سسرال سے ڈرایا کرتی ہیں تاکہ بچیاں آنے والے سخت حالات میں بھی اپنے سگھڑاپے کی دھاک بٹھاسکیں۔

"امی! وہ تو سب ٹھیک ہے مگر تھوڑی چھان بین بھی کرلیں۔ کسی روز بہانے سے ان کی بڑی بہو سے گھر کے حالات اور انیب کے چال چلن کا پوچھا جائے، بالکل غیروں میں اتنا بڑا رسک نہیں لیا جاسکتا۔"

"ہاں تو وقت نکالو ناں......جب کہو گی چلے چلیں گے۔ مجھے بھی اندازہ ہے کہ شروع میں سب اچھے بن کر پیش ـــــ آتے ہیں۔ اندر کی بات گھر کی بڑی بہو ہی بتا سکتی ہے۔ آج دیکھتے ہیں کون کون آتا ہے۔"

کھانے کی میز پر پلیٹوں کے اطراف چمچ اور کانٹے رکھنے اور نیپکنز لگانے میں حرا نے بھی مدد کی۔ بارہ افراد کے لیے میز آراستہ کرنے کے بعد ٹرالی پر بھی اضافی پلیٹیں رکھ دی گئی تھیں تاکہ بوقت ضرورت کچن میں نہ بھاگنا پڑے۔

"یہ میٹس آپ نے اچھے نکالے۔ یہ ناہر اسٹور کی سیل میں سے لائی ہوں گی۔"

"ہاں بیٹا! قسمت سے مل گئے۔ عورتیں تو ٹوٹی پڑ رہی تھیں۔ سمجھو کہ جیسے مفت بٹ رہا ہو۔ حرا کو بھی گھر کی اشیاء خریدنے میں بڑی دلچسپی ہے۔ اللہ کرے کہ اس کا شوق قائم رہے۔"

پونے آٹھ کے قریب انیب کے گھر سے چھ افراد آئے۔ انیب کے والدین، بھائی بھابھی اور ماموں ممانی۔ دونوں کے ہاتھوں میں علیحدہ علیحدہ سوغاتیں بھی تھیں۔ بڑی گرم جوشی کے ساتھ استقبال ہوا پھر رسمی گفتگو ہوتی رہی۔ درمیان میں ٹریفک جام ہوئے، دھرنوں کی سیاست، موسم کی سنگینیوں اور مہنگائی غرضیکہ بہت سی باتوں کے درمیان کھانا پیش کر دیا گیا۔ کھانے کے دوران اسی طرح کی ہلکی پھلکی گفتگو ہوتی رہی۔ خواتین بے تکلفی سے بیڈ روم میں بھی چلی گئیں۔

اسی اثناء میں انیب کے بڑے بھائی منیب کی بیگم کو بہانے سے گیلری میں بلا کر حریم نے موقع ضائع کیے بغیر فوزیہ بھابھی سے پوچھا۔

"آپ کا کیا خیال ہے، انیب کا رشتہ قبول کیا جائے؟ آپ کے ساتھ ساس سسر اور ان کے خاندان کا کیسا رویہ ہے؟"

حریم نے دیکھا کہ فوزیہ بھابھی کی آنکھوں کی چمک ماند پڑنے لگی۔ وہ کچھ دیر توقف کے بعد بولیں۔

"کھلنڈرا پن اور غیر سنجیدگی بہت ہے اس میں، ساس سسر تو ٹھیک ہی ہیں......شروع شروع میں انیب عورتوں کی طرح گھر کے امور میں دلچسپی لیتا تھا......کاروبار کی طرف رجحان ہے، دوست بہت

میرے خیال سے شادی کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ سب تو آج کل کے لڑکے کرتے ہی ہیں۔ وہ زمانہ گیا جب مغرب سے پہلے ہر کوئی گھر میں آ جاتا اور رات کی دوستیاں نہیں رکھی جاتی تھیں۔"

رات کی دوستیوں پر حریم چونکی، وہ کیا باور کرانا چاہتی تھیں۔ "لڑکیوں سے دوستیاں ہیں ان کی؟"

"یہ بھی آج کل کا عام چلن ہے..... لڑکیاں ہی خوش حال اور لائق لڑکوں سے دوستی کرنے میں پہل کرتی ہیں مگر شادی تو ایک ہی سے اور وہ بھی والدین کی مرضی سے ہی کرنا ہوتی ہے۔" فوزیہ بھابھی نے اطمینان سے کہا۔

"آپ کر دیں رشتہ..... حرا اور انیب چاند سورج کی جوڑی ہوگی..... دونوں اچھے رہیں گے۔ حرا سنبھال لے گی۔"

"مثلاً کیا سنبھالنا ہوگا؟" حریم کو ڈر سا لگا۔

"میرا مطلب ہے پھر روٹین بدل جاتی ہے۔ انسان بیوی کو زیادہ ٹائم دیتا ہے۔ وہ میکہ چھوڑ کے آئی ہوتی ہے۔ آہستہ آہستہ نئے ماحول میں دل لگ ہی جاتا ہے۔"

"انیب کیا چاہتے ہیں۔ کیا حرا انہیں اتنی پسند آ گئی کہ وہ شادی کر لیں؟ یا امی ابو کے کہنے پر بادل ناخواستہ چلے آئے۔"

"نہیں..... نہیں۔ پہلے دن یہاں سے جانے کے بعد بہت خوش تھے۔ آپ کی تعریف بھی کی تھی۔ گھر اور گھر کے لوگ سب ہی اچھے لگے۔ آپ آئیے ناں کسی روز..... آپ تو آئیں نہیں۔"

"جی شادی کے فوراً بعد سنگاپور جانا پڑا تھا۔ ایک میڈیکل کانفرنس تھی۔ ہنی مون بھی اسی بہانے ہو گیا اور اچھا ہی ہوا۔ میرا تو پچھلے دس برسوں سے شیڈول بہت ٹائٹ رہتا ہے، جب سے ایم آر سی پی کیا ہے۔ ہفتے میں دو سے تین بار سرجری اور پھر روٹین کی او پی ڈی سب ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ آنا تو ہے..... امی اور شہروز کے ساتھ آؤں گی۔"

طے کرنے سے پہلے دو ایک بار ہمیں ملنا جلنا تو چاہیے۔ آپ چاہیں تو میری امی اور ابو کا فون نمبر لے لیں۔ ان سے بھی پتا چل جائے گا کہ میرے ساتھ سسرال کا کیا رویہ ہے....." فوزیہ بھابھی نے جتنے وثوق سے کہا۔ دل تو چاہتا تھا کہ وہ فوراً ہی نمبر مانگ لے پھر وہ خود ہی گویا ہوئیں۔

"ایسا کرتی ہوں کہ میں آپ کے نمبر پر ایس ایم ایس کر دوں گی۔" فوزیہ بھابھی نے بڑے اعتماد سے بات مکمل کی۔

"بات یہ ہے کہ میرے والد لوگوں کی زبان پر حد درجہ بھروسا کرتے ہیں اور دنیا میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ میری شادی میری خالہ جان نے اپنے جاننے والوں میں طے کرائی تھی اور ہماری منگنی دو برس تک رہی۔ درمیان میں خوشی، غمی کے بڑے مواقع آئے۔ بے وقت ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا بھی رہا۔ بہت دوستی اور وقار کے ساتھ ایک دوسرے سے میل ملاقات جاری رہی۔ شہروز تو مجھ سے یہاں تک کہتے تھے کہ تم بھی گھر آ جایا کرو اور دیکھ لو کہ میرا لائف اسٹائل کیا ہے اور میں ہنس دیتی تھی کہ کہیں ایسا ہم پاکستانیوں میں ہوتا ہے؟ منگنی سے پہلے یا شادی ہونے تک لڑکی سسرال میں قدم کہاں رکھتی ہے۔ لاکھ میں میڈیسن پڑھ رہی تھی، تھی تو متوسط طبقے کی مشرقی لڑکی۔ حرا بھی مزاجاً گھریلو ہی ہے۔"

"اچھا اچھا..... دیکھیے میں نے بھی تو فائن آرٹس پڑھا ہے مگر اب تو لگتا ہے، میرا سارا آرٹ گھر کی چار دیواری تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ میرے شوہر مذہب کہتے ہیں کہ کم از کم چار بچے پیدا کر لو پھر پینٹنگ کی طرف آ جانا، کسی کو کہنے کا موقع نہیں ملے گا کہ آرٹسٹ سے شادی کی تھی۔ اس نے بچے نظر انداز کر دیے۔" فوزیہ بھابھی نے گویا اپنا دل کھول کر سامنے رکھ دیا تھا۔

"اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ روک ٹوک کوئی نہیں ہاں البتہ وہ فیملی لائف کی طرف سے کچھ

تحفظات رکھتے ہیں۔ ... کہ
کو کیریئر اور ناموری کے چکر میں ازدواجی ذمہ داریوں کو پس پشت نہیں ڈالنا چاہیے۔" حریم نے بات مکمل کی۔

"اور بھئی انٹرویو ہو گیا ہے تو فوزیہ گھر چلیں۔" ان کی ساس نے گیلری میں آتے ہوئے کہا وہ دونوں مسکرا دیں۔

"خالدہ! حرا کو تو بلائیں۔" جاتے جاتے انیب کی والدہ مسز محسن نے حرا سے ملنے کی چاہت کی تو حریم کو اچھا لگا۔

حرا جھجکتے ہوئے آئی تو انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ سینے سے لگایا اور ماتھے پہ پیار کی مہر ثبت کر کے کہا۔ "اللہ نصیب اچھے کرے۔ جس گھر جائے راج کرے۔"

حرا بھی مسکرا دی۔ امی اور سعدیہ خالہ بھی اسی طرح ان دونوں بہنوں پر محبت لٹایا کرتی تھیں جب ان کے دل میں ممتا اٹھتی اور یہ ممتا اکثر و بیشتر ہی اٹھا کرتی تھی۔

امی نے آگے لپک کر مسز محسن کے ہاتھ میں اب ٹفن دیا۔ "اچھا، یہ نہ بھولیے گا۔ انیب تو ساتھ آئے نہیں۔ ان کے لیے کھانا لیتی جائیے۔"

وہ نہ نہ کرتی رہیں مگر امی نے انہیں یہ کہہ کر لاجواب کیا کہ آپ کے ہاں سے بھی ان بچیوں کے لیے کھانے آتے رہے۔ مشرق کی یہ چند رسمیں رہتیں اور مہمان نوازی کے چلن اب بھی باقی ہیں انہیں تو ایسے ہی نبھاتے جانا چاہیے۔

رات گئے تک جب شہروز امی ابو سے باتیں کر رہے تھے، وہ دونوں حرا اور حریم کچن سمیٹتے ہوئے آج کے تجربات پر بات چیت کرنے لگیں۔ امی نے کہا کہ وہ استخارہ کریں گی۔

حرا نے بہن سے شیئر کرتے ہوئے کہا۔ "یہ بھی اچھا ہے۔ شہروز کو گاڑی لینے کے بہانے اس مارکیٹ میں بھیجتی ہوں جہاں انیب کا شوروم ہے۔ سب کچھ نہ سہی، بہت کچھ پتا چلے گا کم از کم ریپوٹیشن ہی۔"

عرصہ جاب کر لوں تو میرا کیریئر بن جائے گا۔ شادی کے لیے عمر پڑی ہے۔" حرا نے گلاس دھو کر رکھے۔

"جی نہیں۔ عمر کوئی نہیں پڑی رہتی۔ ایک دفعہ جاب کرنے لگو تو پھر پیسہ کمانے کی دھن ادھر ادھر کچھ نہیں دیکھنے دیتی۔ لڑکیوں کی بروقت شادی ہو جانی چاہیے کیونکہ عورت بہت جلد بوڑھی ہوتی ہے۔"

"کون بوڑھا ہو رہا ہے؟" شہروز کچن تک آئے۔

"کافی بناؤں کیا۔" حریم نے چاہا کہ وہ فرمائش کریں مگر وہ اپنی کہی ہوئی بات کی وضاحت نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"ہاں ضرور مگر آدھی پیالی، بلکہ حریم ارہنے دو، گھر چلتے ہیں۔" شہروز نے اسے گھر چلنے کی آفر کی اور اس نے کہا۔

"جی اچھا...... جیسا آپ کہیں۔"

"حرا بہن کو کھانا پیک کر کے دیا؟" امی نے حریم کو چلتے دیکھا تو حرا سے پوچھا۔

"انہوں نے کہا نہیں...... ویسے باجی! پایا کنا اور پلاؤ تو ضرور لے جائیں...... کل کی چھٹی ہو جائے گی پکانے کی......"

"ویسے تو کل میرا آف لینے کا ارادہ ہے۔ شہروز کی کزنز آئیں گی۔" حریم نے خوش دلی سے کہا اور اسی کمرے میں چلی آئی جہاں شہروز ابو سے باتیں کر رہے تھے۔

★★★

رات گئے واپسی ہوئی اور وہ کافی بنانے کچن میں جانے لگی تو شہروز نے اسے روک دیا۔

"رہنے دو یار......! یہ کوئی وقت ہے۔ اب آرام کرتے ہیں۔ کل پھر تمہیں کچن میں مصروف ہونا ہوگا۔"

"شکریہ، آپ نے احساس کیا مگر میں آپ کے گھر کے کام سے بالکل نہیں تھکتی۔ انجوائے کرتی ہوں۔ کیا سمجھے!"

"آ جاؤ اب بس نیند آ رہی ہے۔" شہروز نے

جمائی لیتے ہوئے کہا۔

''میں ذرا امی ابو کو سلام تو کرلوں..... شام سے نکلی ہوئی ہوں گھر سے..... آپ چلیے۔'' ابو نماز سے فارغ ہوئے تھے۔ امی پیروں پر کوئی کریم لگا رہی تھیں۔ وہ دستک دے کر اندر آگئی اور خیریت پوچھنے لگی۔ دونوں سے ان کے بلڈ پریشر سے متعلق معلومات لیں۔ ان کی دوائیں نکال کر دیں۔

''ابو آپ کو ایک ٹیسٹ کولیسٹرول کا کروانا ہے بتایئے کب کروائیں۔ ویسے کل ہی نہ کروائیں۔''

اس نے دیکھا کہ سسر کے چہرے پر ایک رنگ آیا ایک گیا شاید وہ فاسٹنگ کے خیال سے پریشان ہوگئے تھے۔

''اس اتوار کو نہ کروالیں۔ آپ مغرب کے بعد کھانا کھا لیتے ہیں۔ صبح برنچ تک ہم ٹیسٹ کروا کے لوٹ بھی آئیں گے..... حریم نے اپنا آئیڈیا پیش کیا۔

''جی ہاں اور واپسی پر پوری ترکاری، حلوہ پوری یا گولہ کباب اور پراٹھے کھا کے کولیسٹرول اور بڑھالیں گے۔''

اب کے امی جان نے لقمہ دیا اور وہ تینوں ہنس دیے۔

''چلیے آپ دوا تو کھا لیجیے یہ کیا..... ایک ہی ٹیبلٹ باقی بچی ہے..... امی جی! آپ مجھے صبح ایس ایم ایس ضرور کر دیجیے گا مجھے اسپتال جا کے کچھ ہوش ہی نہیں رہتا..... میں واپسی پر آپ کی دوا لیتی آؤں گی۔'' اس نے جگ سے پانی انڈیل کر سسر کے ہاتھوں میں گلاس تھمایا، وہ بولے۔

''ہم تو تمہارا انتظار ہی کرتے رہتے ہیں آؤ اور ہمیں رات کو دوائیں کھلاؤ۔''

''جی..... جی ابو آج امی کے ہاں کچھ مہمان آگئے تھے ناں، وہ کھانے میں دیر ہوگئی سوری۔'' حریم کو بڑی شرمندگی ہو رہی تھی۔

''آپ بھی ناں حد کرتے ہیں۔ بہو ہے، دوماہ تو ہوئے ہیں بیاہ کو، اب گھومیں پھریں نہیں۔ کیا ہوا اگر دیر ہوگئی تو۔ ہم بھی تو ابھی نماز ہی سے فارغ ہوئے ہیں۔''

''ہاں..... ہاں میرا مطلب یہ نہیں تھا..... جب سے ڈاکٹر بہو آئی ہے۔ ہماری کیئر بڑھ گئی ہے۔ جیتی رہو بیٹا! ہمیں اور کیا چاہیے تھا۔ تاجروں میں نبضیں ٹٹول کر دوا دینے والی ایک عظیم ہستی آگئی ہے۔'' اور ابو نے آگے بڑھ کر حریم کا ماتھا چوم لیا۔

''اچھا یہ بات ہے تو اس بات پر ایک کپ کافی ہوجائے.....؟''

''نہیں نہیں..... اب اس وقت نہیں..... ہم جانتے ہیں کہ تم ہماری خدمت کے لیے چوکس رہتی ہو۔'' ابو نے اس کا احساس کیا۔

''جاؤ بیٹا آرام کرو.....'' ساس نے بھی بڑے دلار سے اسے رخصت کیا۔

آج بڑے اطمینان کی نیند آئی تھی یا شاید جب آدمی تھکا ہوا ہو تو ہی اچھی نیند آتی ہے..... کوئی تو خاص بات تھی۔

☆☆☆

صبح ہوتے ہی اسے اپنے کلینک کی کھڑکی پر چڑیوں کا وہ گھونسلا یاد آگیا۔ سارا دن چڑیاں چوں چوں کرتی رہتیں۔ ادھر اسٹاف اور بیمار خواتین کا شور مچا رہتا اور ادھر چڑیوں کے چہچہانے سے اچھا بھلا ترنم شور کی نذر ہوتا رہتا۔

حریم کو رات کے نہ جانے کس پہر وہ چڑیاں یاد آگئیں جن کے گھونسلے ہٹانے کے لیے جونیئر ڈاکٹرز پریشان ہی کرتی تھی لیکن حریم نے انہیں منع کر دیا تھا۔

''کہ بے گھر ہوجائیں گے ان کے بچے اور وہ خود بھی..... اور یہ کہ ہم تو گودیں آباد رکھنے کی اخلاقی ذمہ داریاں نبھانے پر مامور ہیں ہم کیوں ان چڑیوں کو بے گھری کے عذاب میں مبتلا کریں۔''

اب جب اس کی امی اور ساس سسر اسے دودھوں نہاؤ اور پوتوں پھلو کی دعائیں دیتیں تو اس کا بھی چاہتا کہ ہر اس نئی ماں کی حفاظت کرے جو قدموں تلے جنت آباد رکھنے کے لیے سر توڑ کوشش

کرتی ہے۔

اس طرح تو یہ چڑیاں بھی ذی حس ہوئیں۔ پرندے ہوئے تو کیا تخلیق تو اسی خدا کی ہے جو انسانوں کو بھی بھوک اور بیماری سے بچا کر زندہ رکھنے پر قادر ہے۔ اسی طرح چرند، پرند، چوپائے اور سمندری مخلوق سب کے سب زندہ رہنے کا حق رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر ہو کے کسی کی زندگی کے دن محدود کرنا کم از کم میڈیسن سے وابستہ کسی شخصیت کا کام نہیں ہوسکتا۔ حریم کو امی کی کہی ہوئی بات یاد آگئی کہ چڑیا اور عورت تنکا تنکا پیسہ پیسہ جوڑ کے رہنے کو مکان یا گھونسلا بنایا کرتی ہیں۔

مرد اینٹ، گارا، پتھر، شیشہ، لکڑی اور ماربل کے گورکھ دھندے میں الجھا رہتا ہے اور دونوں ہاتھ مل کر گھر بناتے ہیں اس لیے عورت کو ایثار سے کام لے کر دھوپ لینے کی ہمت رکھنی چاہیے۔ اسی طرح گھروندا مضبوط رشتے میں ڈھلتا ہے۔

وہ سوچنے لگی کہ امی ٹھیک ہی حرا کی شادی میں جلدی کر رہی ہیں۔ شوگر کی مریضہ خود ہیں اور ابو ہارٹ پیشنٹ، بھائی ہمارا کوئی ہے نہیں...... جتنیں تو برسہا برس نکل جائیں اور اگر خدانخواستہ کسی ایک کی بھی آنکھیں بند ہوگئیں دوسرا تنہا رہ کر شاید یہ ذمہ داری ٹھیک سے نبھا نہ سکے۔ انسان کو اللہ توکل بھی رہنا پڑتا ہے۔ بزرگ کہتے آرہے ہیں کہ جوڑے آسمان پر بنتے ہیں۔ زمین پر ہم حقائق کی جانب دوڑ لگاتے لگاتے ہلکان ہوئے جاتے ہیں۔ کبھی بات سمجھ میں آتی ہے اور کبھی نہیں آتی، یوں وقت گزرتا رہتا ہے مگر قدرت کی طرف سے ہر کام کا ایک وقت تو بہر حال طے ہوتا ہے۔ اسی وقت کے لیے تگ و دو کی جاتی ہے۔

☆☆☆

کچھ دن اسی طرح روٹین کے گزر گئے......

انیب کی والدہ سے امی کی فون پر رسمی سی باتیں ہوتی رہیں۔ ایک بار حریم کے ساتھ وہ ان کے گھر بھی ہو آئیں۔ اعلا متوسط گھرانے کی عکاسی کرتا یہ گھر انہیں دور نہ تھا۔ شہروز کا ایک مکان ڈیفنس میں زیر تعمیر ضرور تھا مگر وہاں ان کے شفٹ ہونے کی مرضی نہیں تھی۔ وہ اسے فروخت کرنے یا کرائے پر دینے کی خواہش رکھتے تھے۔

انیب نے قریبی علاقے ہی میں ایک پلاٹ ضرور لے رکھا تھا مگر اسے تعمیر کرنے کا ارادہ نہیں تھا یہاں تک تو معاملات درست ہی چلے آرہے تھے مگر ایسا لگتا تھا جیسے یہ خاندان شادی جلدی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ امی نے باتوں باتوں میں کہا تھا کہ ابھی چار چھ ماہ پہلے تو وہ ایک شادی کر کے فارغ ہوئی ہیں، اب تھوڑا بہت تیاری کا وقت درکار ہوگا لیکن انیب کی امی نے کہا۔

"چلیے، آپ چھ ماہ میں تیاری کر لیجیے۔ ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔ گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ اس کے زیور پیسے روپے پر ہماری نظر نہیں ہے نہ ہوگی۔ ہمیں بیٹی چاہیے جیسے ہماری پہلی بہو متوسط طبقے سے آئی ہے وہ اپنے ذاتی استعمال کی چیزیں ہی لائی تھی۔ ہم تقاضے کرنے والے لوگ نہیں البتہ بیٹی کو ہم نے تنخواہ دار طبقے میں بیاہا تو اسے الیکٹرانک مشینری، زیور، پلاٹ اور موٹر سائیکل دی تھی۔ اب تو ماشاء اللہ سے ان کے ہاں بھی دو دو گاڑیاں آچکیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ پیسہ روپیہ سب قسمت سے ہوجاتا ہے۔ ان چیزوں کے لیے خود کو کیا ہلکان کرنا۔ ماشاء اللہ ہمارے ہر بیڈروم میں اے سی ہے۔ بیڈرومز فریج ہر کمرے میں ہیں۔ دو بڑے فریج کچن میں ہیں۔ کراکری اور کٹلری میں ملائشیا اور سنگاپور سے لے آئی تھی۔ کاسمیٹکس ہم امریکہ سے آن لائن منگوا لیتے ہیں۔ انیب ہر سال دبئی جا کے چھوٹی بڑی چیزیں لے آتا ہے۔ ہمارے پوتے پوتیاں تو چپس بھی دبئی کے کھاتے ہیں۔ ہم لوگ یہاں بھی برانڈڈ کپڑے پہنتے ہیں۔ میں نے تو کبھی سیل کا انتظار نہیں کیا۔ ہر سیزن میں بہو کو دس بارہ جوڑے بنوا کے دیتی ہوں۔ شادی کو ہم بوجھ نہیں سمجھتے، ذمہ داری مانتے ہیں۔ بہو کے میکے

سے کچھ آئے نہ آئے، ادھر دھیان ہی نہیں جاتا۔"

"اچھی بات ہے۔ مہذب لوگ اسی طرح بہو کو بیٹی بنا کے رکھتے ہیں۔"

"اسی طرح میں اپنی بیٹی کے لیے بھی دعا وغیرہ سے شاپنگ کرتی ہوں تاکہ اس کے دل میں محرومی کا احساس نہ جاگے۔ یہاں تو سب کچھ ہوتا ہی رہتا ہے۔ بھئی بیٹیوں کو تو عمر بھر کچھ نہ کچھ دینا ہی پڑتا ہے اور دینا بھی چاہیے کہ سسرال میں اپنی آن بان شان سلامت رہے۔ کوئی انگلی نہ اٹھا سکے کہ کنگلوں کے ہاں سے لڑکی بیاہ لائے، جو پوچھتے بھی نہیں۔"

اسپیکر آن تھا اور حریم انیب کی امی کی ساری باتیں سن رہی تھی۔ اسے ان کی باتوں سے مادیت کا تاثر بھی ملا اور تھوڑے سے تکبر کا بھی مگر شاید وہ سادگی سے اپنا نقطہ نظر بیان کر رہی ہوں، دل نے انہیں مارجن دے دیا۔ دو روز بعد ہفتہ واری تعطیل کے وقت انیب کا فون آیا کہ۔

"آنٹی! ہم سب بیچ پارٹی پر جا رہے ہیں۔ ہم نے Savor سے لانچ بک کرائی ہے آپ سب بھی چلیے۔ موسم اچھا ہے صبح سات بجے نکلیں گے، لانچ ہی پر ناشتہ اور دوپہر کا کھانا ہوگا۔ ریسٹورنٹ والوں کی اپنی لانچ ہے۔ کراچی کا سمندر ذرا آگے گہرائی تک دیکھ کے چار پانچ بجے تک واپس آجائیں گے۔"

اب امی کش و پنج میں پڑ گئیں کہ رشتہ طے ہونے سے پہلے ہی کیوں پکنک جیسی آفر قبول کی جائے اور اس کا کیا مطلب ہے؟ کیا حرا کو بھی دعوت دی جا رہی ہے؟ ہمارے یہاں ایسی کھلی تہذیب نہیں۔ لڑکیاں پردہ نہ بھی کریں تب بھی بار بار سامنے آنا یا پارٹی میں جانا معیوب سمجھا جاتا ہے۔

"کیا امی، ابو اور میں چلے جائیں؟" حریم نے شہروز سے مشورہ کیا۔

"کوئی حرج نہیں..... ابو نہ جا سکیں تو تم چلی چلو۔" شہروز نے حریم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ان کی آنکھوں میں اعتماد کی جوت نظر آتی تھی۔

"جی ہاں، قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا ایک موقع اور مل رہا ہے۔ کوئی دوست، رشتہ دار خاتون ہوں گی تو ان سے علیک سلیک کے دوران نمبر لیا جا سکتا ہے۔ ذرا چھان بین تو کر لیں۔" امی کو بھی یہ بات اچھی لگی۔

اس طرح حریم نے اپنے سسرال سے باقاعدہ اجازت طلب کر کے پکنک کا پروگرام طے کر لیا۔ امی نے کچھ اسنیکس جن میں امپورٹڈ چاکلیٹس، چپس، پاپ کارن وغیرہ شامل تھے، ساتھ رکھ لیے۔ پانی کی چند بوتلیں اور کولڈ ڈرنکس کے ڈبے ان کے علاوہ تھے۔ حریم نے انہیں لدا پھندا جاتے دیکھا تو کہا۔

"یہ کیا امی! آپ نے تو ان کی باتوں کو زیادہ ہی سنجیدگی سے لے لیا۔ ہر چیز امپورٹڈ..... واہ کیا ضرورت تھی۔"

"بیٹا! دیکھنا پڑتا ہے ہر طرف..... ہم بھی کوئی گرے پڑے نہیں۔ جو چیزیں انہوں نے گنوائی ہیں ہم پرکھوں سے استعمال کرتے آ رہے ہیں۔ میں بھی انہیں بتا چکی ہوں کہ تمہارے ابو ملک کی بڑی آئل کمپنی سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ دو ہی ہماری بیٹیاں ہیں کوئی لمبی چوڑی اولاد نہیں..... کراچی میں کوئنز روڈ (لالہ زار) میں تمہارے دادا ایک ہزار گز کی کوٹھی چھوڑ کر مرے تھے، تمہارے چچا اور ایک پھوپھو تمہارے ابو کو ملا کے بس یہی تین بچے تھے۔ کرد ڑوں میں بکی تھی وہ کوٹھی۔ شکر ہے کہ غربت ہم نے بھی نہیں جھیلی..... تمہارے سسرال والے تو..... ہمارے پرانے واقف کار ہیں، وہاں ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتی ہی نہیں۔ مگر یہ ذرا نو دولتیے معلوم ہوتے ہیں۔"

امی نے اپنی بات مکمل کی تو حریم بھی سوچوں میں گم ہو گئی..... کہتے تو لوگ ٹھیک ہی ہیں کہ دیگ کا ایک دانہ چاول چکھ کے پکے یا کچے ہونے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

یہ گھرانہ بھی ان باتوں کی وجہ سے حریم کے لیے الجھن بن رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں انیب کو دیکھتے ہی خیال آتا کہ وہ نا تو اس کی مشابہت رکھنے والوں میں سے کسی سے مل چکی ہے یا پتا نہیں کہاں دیکھا ہے؟

https://reading.cafe

ماہنامہ کرن

مارچ 2019ء کا سالگرہ نمبر شائع ہو گیا ہے

مزے دار ریسپیز اور دلچسپ مضامین کے ساتھ

کرن کتاب

- اداکارہ ''انعم تنویر'' سے شاہین رشید کی ملاقات
- اداکارہ ''رمشا خان'' کہتی ہیں ''میری بھی سنیے''
- اس ماہ ''شازیہ ہاشم'' کے ''مقابل ہے آئینہ''
- ''ہوائیں رخ بدل گئیں'' نگہت عبداللہ کا سلسلے وار ناول
- ''شب نم کی سحر'' رخ چوہدری کا سلسلے وار ناول
- ''ساگر کنارے'' ام طیفور کا مکمل ناول
- ''یار بے وفا'' ندا حسنین کا مکمل ناول
- ''شام رنگ سیاہ'' ایمل رضا کا ناولٹ
- ''روبرو رخ یار'' مصباح علی سید کا ناولٹ،
- ''ابر مہربان'' فرح بخاری کا ناولٹ،
- ''انمول گھڑی'' نادیہ احمد کا ناولٹ،
- نفیسہ سعید، امت العزیز شہزاد اور بشریٰ احمد کے افسانے اور مستقل سلسلے،

ذہن الجھ سا جاتا ... شکلیں ملا کرتی ہیں۔ کوئی بڑی بات نہیں۔

کیاڑی کے ساحل پہ تمام خاندان اکٹھے ہوئے۔ کوئی پچیس افراد تو ہوں گے۔ خواتین کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ مدعوئین نے ایک لانچ جنوبی ساحلی علاقے تک لے جانے کے لیے لی تھی۔ کیاڑی کا ساحل خاصا آلودہ ہو چکا ہے۔ اس جگہ تو مچھلیوں کی بساند بھی خوب تھی اور ہوا کا دباؤ بھی کچھ کم محسوس ہو رہا تھا مگر جوں جوں لانچ جنوبی ساحل تک پہنچی، موسم بھی خوشگوار ہوتا گیا۔ یہاں دور ہی سے دو دریا کی منفرد طرز تعمیر کے شاہکار نظر آنے لگے۔

ریسٹورنٹ میں پہنچ کر بچوں والی خواتین نے واش رومز کا رخ کیا اور انیب نے حریم اور اس کی والدہ کو ریسٹورنٹ کے ایک گوشے میں آرام دہ کرسیوں پر بٹھا دیا۔

''آپ لوگ پوری فیملی کے ساتھ کیوں نہیں آئے...... میں نے بطور خاص آپ کے لیے پکنک ارینج کی تھی۔''

اور امی انہیں بتانے لگیں کہ شہروز کو اپنے والدین کے ساتھ کہیں جانا تھا۔ ابو اور حرا کو بھی گھر پر کچھ کام تھا۔

''آنٹی...... ہم یہاں سے ناشتہ کر کے چلیں گے، آپ کے سامنے مینو کارڈ رکھے ہیں جو پسند کریں، بتا دیں۔'' انیب کے بڑے بھائی منیب بھی وہیں آ گئے اور ان کی بیگم بھی اسی میز پر آ گئیں۔

''آنٹی! تکلف بر طرف...... بتایئے۔ کیا آرڈر کیا جائے......'' بہو نے کارڈ پر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔

''بھئی، ہم تو اپنا پورج کھا کے آئے ہیں، ایک پیالی چائے مل جائے تو بہت ہے......''

''حریم بھئی، آپ تو کچھ لیں یہاں کی پوری ترکاری اور حلوہ شہر بھر سے اچھا ملتا ہے اور اگر کوئی رول کھانا چاہیں تو بھی اچھی خاصی ورائٹی ہے یہ دیکھیئے۔'' وہ انکار کا سوچ رہی تھی مگر ان کی بہو نے

بھاری بوٹی رول اور پوری ترکاری آرڈر کر دی۔

"آپ ڈاکٹر لوگ تو خود بھی پرہیزی کھانے کھاتے ہوں گے۔ آج تو بدپرہیزی کا بھی چلے گا۔"

اس طرح نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں کچھ نہ کچھ چکھنا ہی پڑا۔

Savor والوں کی لانچ تیار ہوئی ادھر مہمانانِ گرامی ناشتے کے شغل سے فارغ ہوئے تو آہستہ آہستہ لانچ میں چلنے لگے۔ حریم کالج کے زمانے میں بھی اس ریسٹورنٹ میں آئی تھی لیکن تب اس نے لانچ میں صرف جا کے ہلکا پھلکا جائزہ لیا تھا اس بڑی لانچ کو منی بحری جہاز کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس کے اندر پورا ایک گھر تعمیر تھا۔ خواتین ایک دوسرے سے واقفیت حاصل کر رہی تھیں۔ جب انہیں حریم کے پروفیشن کا پتا چلا تو سب نے اسے گھیرے میں لے لیا۔ یہ خواتین گائنی کے مسائل پر اس سے بات کرنے لگیں اور حریم کو خوشی ہو رہی تھی کہ اس کی یہ پکنک ایک طرح کے فری کیمپ میں تبدیل ہو گئی تھی۔ وہ ادویات بھی بتا رہی تھی اور احتیاطی تدابیر بھی...... اس نے سوچا اچھا ہی کیا جو آ گئی۔ یہ بھی اپنے انداز کی ایک پریکٹس ہی ہے۔

باتوں باتوں میں ایک نوجوان خاتون نے اس سے انیب کی فیملی کا رشتہ پوچھ لیا۔ پہلے تو اس نے واقف کار ہی قرار دیا پھر رفتہ رفتہ اصل بات بتانے میں بھی ہچکچاہٹ جاتی رہی۔

"اچھا...... یہ تو خوش خبری ہوئی ناں...... اچھا ہے انیب کو بھی گھر جیسی ذمہ داری کا احساس ہوگا ورنہ......" وہ خاتون اچانک چپ سی ہو گئیں۔

"ورنہ...... کیا بہت لاابالی ہیں انیب؟" حریم نے گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھایا۔

"شاید ان کی امی نے ان کی وابستگیوں کے بارے میں نہیں بتایا...... اور بتایا بھی کہاں جاتا ہے...... اچھا ہے، آپ سے ملاقات ہو گئی۔ آپ مجھے بہت سلجھی ہوئی اور بااخلاق خاتون لگیں۔ آپ کے ساتھ دھوکا نہیں ہونا چاہیے...... انیب کا کردار خاصا مشکوک ہے۔ خاندان میں انہیں کوئی بھی رشتہ نہیں دے رہا ورنہ ایک تعلیم یافتہ اور کاروباری خاندان کو رشتوں کی کمی تو ہونی نہیں چاہیے۔"

"آپ کچھ تفصیل بتائیں ویسے ہم نے ابھی "ہاں" نہیں کی ہے۔ میری بہن تو ویسے بھی ابھی زیرِ تعلیم ہے۔"

"میں اسی لیے بتانا چاہتی ہوں کہ انیب لڑکیوں کی دوستی میں بہت آگے جانے کا عادی ہے۔ اس کے دوستوں کا حلقہ بھی غیر اخلاقی سرگرمیوں میں ملوث رہا ہے۔ صحبت ہی سے تو انسان پہچانا جاتا ہے پھر دیدہ دلیری ایسی ہوتی ہے کہ اپنے بچے تک کو قبول کرنے میں تامل برتا جاتا ہے اب میری بات ایک طرف رکھیے۔ نادیہ صغیر نامی ماڈل کو تو آپ نے ٹی وی پر دیکھا ہی ہوگا یہ انیب کا تازہ شکار ہے۔ اس کی امی اور خالہ کو بھی یہاں بلا رکھا ہے اور آپ لوگوں کو بھی اسٹینڈ بائی رکھا ہوا ہے۔ نادیہ کو تو شاید انیب کی بے وفائی کا کچھ گلہ شکوہ نہ ہو مگر آپ لوگ ان کے جھانسے میں آ کر اپنا نقصان نہ کر بیٹھیے گا اور ہاں آپ عثمانیہ اسپتال میں پریکٹس کرتی رہی ہیں ناں! وہاں آپ کی ہیڈ نرس مسز کاظم کیا حیات ہیں ابھی؟"

خاتون نے راز افشا کرتے ہوئے مسز کاظم کا ذکر کیوں کیا تھا۔ اب تو حریم کے ذہن سے غبار دھلتا جا رہا تھا۔

"جی ہاں، وہ تو اب بھی ہمارے اسٹاف کی سینئر ممبر ہیں اور ہمارا ان کا برسوں کا ساتھ ہے۔ اس بات کا ان سے کیا تعلق؟"

"تعلق یہ ہے ڈاکٹر صاحبہ کہ مسز کاظم نے ہی اپنے نچلے اسٹاف کے ساتھ دو بار غیر قانونی اسقاط میں انیب کا ساتھ دیا۔ آپ ان سے پوچھ لیجیے، وہ تو پہچانتی ہوں گی اس شکاری مرد کو۔"

خاتون نے دل کی بھڑاس تو خوب نکالی مگر کیا واقعی مسز کاظم جیسی اصول پرست، وضعدار اور اچھی خاتون ایسا مجرمانہ فعل انجام دے سکتی ہیں؟ وہ سوچوں میں گم ہو گئی...... سمندر کی لہروں میں اس کا دل ڈولتا

کی ریت بن جاتا۔

''آپ مجھ سے پوچھیے کہ میں کیسے جانتی ہوں مسز کاظم کو......''

''مجھے واقعی سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ سب کیسے ہوتا رہا...... ہمارے اسپتال کی بڑی اچھی شہرت رہی ہے۔ ہم کوئی غیر اخلاقی اور مجرمانہ سرگرمی اختیار نہ کرتے ہیں نہ اسٹاف کو اجازت ہے، پھر یہ سب کب اور کیسے ہوگیا۔''

''آپ تو شاید اس وقت ڈاکٹری پڑھ رہی ہوں گی جب مسز کاظم دوپہر کے سناٹے اور میڈیکل اسٹاف کی بریک کے وقت اپنا مذموم کاروبار جاری رکھتی ہوں گی۔ آپ کے یہاں تین سے پانچ بجے تک کا وقفہ تو ہوتا تھا اب پتا نہیں ہوتا ہے یا نہیں؟ ایک خوب صورت سی میری دوست جو شعر و سخن کا ذوق بھی رکھتی تھی اور گھریلو دستکاریوں کو سیکھنے میں بھی خاص دلچسپی رکھتی تھی۔ انیب سے معاملات بڑھا بیٹھی تھی۔ اس کی ڈی این سی بھی مسز کاظم نے کی۔ میری دوست نے شادی کے بعد مجھ سے انیب کا ذکر کیا۔ ہم اچانک ایک ایسی تقریب میں اکٹھے مل گئے جہاں انیب بھی اپنی فیملی کے ساتھ مدعو تھے اور اس نے ایک جھلک دیکھ کر ہی مجھے ماضی کا وہ قصہ سنا دیا، تب تک میں بھی ناواقف تھی کہ میری دوست کس ظالم کے شکنجے میں جکڑی گئی۔''

''اب آپ کی یہ دوست کہاں ہے۔''

''شکر ہے کہ دو سال گزرنے کے بعد شادی ہوئی اور کسی پر یہ راز نہ کھل سکا۔ میں بھی نہ بتاتی کیونکہ گڑے مردے اکھاڑنے سے کیا فائدہ۔ انسان بندہ بشر ہے ایک بار جن تو اسے دیتے ہی بنتی ہے لیکن نادیہ صغیر کا قصہ سن کر مجھ سے رہا نہیں گیا اب آپ جو اور جیسا چاہیں فیصلہ کرلیں۔''

اور وہ خاتون مہمانوں کی بھیڑ میں اپنی راہ ہولیں حریم کو ایسا لگا سمندر پر گہرا سکوت طاری ہوگیا ہے۔ شام گئے وہ گھر لوٹی تو بجائے تازہ دم ہونے سے کچھ نہیں کہا۔ وہ معاملے کی چھان بین چاہتی تھی۔

اگلے روز مسز کاظم، ان کے اسٹاف کی دو سینئر ممبرز اور ڈاکٹروں کی میٹنگ بلائی گئی۔ اس سے پہلے کہ کوئی ایکشن لیا جاتا مسز کاظم حریم کے پاؤں چھو رہی تھیں۔

''آپ کو نہیں پتا، سنگل مدر بچے کیسے پالتی ہے؟ بچوں کی پرورش پر کتنا سرمایہ اٹھتا ہے۔ تنہا عورت گھر کے چولہے چوکی سے، گھر گرہستی اور تعلیم کے اخراجات تک جائز طریقے سے کیسے پورے کرسکتی ہے آپ کو اندازہ ہی نہیں۔ اس لیے میں نے یہ غلط قدم اٹھایا مگر میں نادم ہوں۔ مجھ سے بہت بڑی بھول ہوئی اور قدرت نے مجھے اس کی سزا بھی دی۔''

وہ اپنی صفائی پیش کررہی تھیں مگر وہ بھول گئی تھیں کہ اخلاقی گراوٹ اور مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث لوگ کبھی دودھ کے دھلے نہیں ہوسکتے۔ روحوں کو مارنے کچلنے والے انسانیت کے مسیحا نہیں ہوسکتے اور مسز کاظم جیسے بدکاری کا حصہ بننے والے لوگ عمر کی لاٹھی گھسیٹتے جاتے ہیں اور ان کی سزا بھی ختم نہیں ہوتی تب سے آج تک کوئی بھی ڈاکٹر ان سے بات نہیں کرتی اور جنہیں یہ قصہ معلوم نہ تھا وہ انہیں درد کا درماں تصور کیے جاتے تھے بس اتنا ہوا کہ حریم کے گھر والوں کے ذہن سے دھند چھٹ چکی تھی۔

☆

مونا شاہ

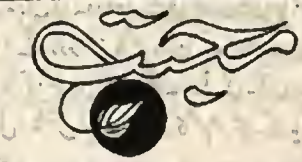

محبت

"ہائے ہائے...... یہ کم بخت محبت بھی نا۔ کچھ بھی پلے نہیں چھوڑتی۔ عقل کو تو گوشت کا ٹکڑا تاڑتے ندیدے کوّے کی طرح لے اڑتی ہے۔"

"آنکھوں کے آگے جاڑے کی صبح میں پڑتی دھند کی چادر تان دیتی ہے۔"

"نہ کچھ دکھائی ---- دیتا ہے، نہ سجھائی۔ اندھا باؤلا بنا چھوڑتی ہے اچھے بھلے سیانے انسان کو۔"

پیتل کے لوٹے میں وضو کے لیے پانی بھرتی اختری بیگم مسلسل بڑبڑا رہی تھیں۔

برآمدے کے کونے میں بچھے پلنگ پر لیٹی پروین نے تلملا کر کروٹ بدلی تو پہلو میں لیٹے بچے نے بانسری بجانا شروع کر دی۔ جھلا کر اسے دودھ پلاتے ہوئے اس نے آنکھوں میں در آنے والے آنسوؤں کو حلق میں انڈیلا اور خود بھی اپنی ماں کی طرح بڑبڑ کرنے لگی۔

"اے ہے کاہے کو اپنا جی جلاوے ہے۔ کم بخت کیسا بے حس آدمی ہے، اپنی سگی اولاد کی شکل نہ دیکھنے آیا۔ کوئی ضرورت نہیں ہے ایسے انسان کے لیے خود کو ہلکان کرنے کی۔"

چادر کے پلو سے منہ پونچھتے ہوئے اختری بیگم نے بیٹی کو ڈپٹا تو وہ پھپک کر رونے لگی۔

"اماں! جی بچا ہی کہاں ہے اب، جل بھن کے کوئلہ ہو گیا ہے۔" نمکین آنسو پیتے ہوئے پروین نے دکھ سے کہا۔

"میری ہی مت ماری گئی تھی جو چوڑوں میں بیاہ دیا اپنی اکلوتی اولاد کو مگر میں بھی کیا کرتی اس وقت تو میری اولاد ہی میری جان کو آ رہی تھی۔ ہائے برا ہو اس محبت کا، نگوڑی ماری کیسے جونک کی طرح میری بیٹی سے چمٹ گئی تھی۔"

وہ ہمیشہ کی طرح محبت کو کوسنے لگیں تو پروین نے جھٹ آنسو پونچھے۔

"اماں! جھونک دے چولہے میں اس محبت کو، مر کھپ گئی ہے منحوس...... نہ میرا جی رہا ہے نہ محبت، نہ ذکر کیا کر میرے سامنے اس کا۔"

"کیوں نہ ذکر کروں اس کا، سارے کھڈے کھودے ہوئے اسی کے ہیں۔ اس وقت تو تو نے میرا چلو بھر پانی پینا بھی حرام کیا ہوا تھا۔ شمشاد سے شادی رچانے کے لیے آپے سے باہر ہو رہی تھی۔ نہ تجھے محبت ہوتی نہ مجھے یہ دن دیکھنے پڑتے۔" پروین نے غصہ سے ماں کی جانب دیکھا جو اس سے دہرا غصہ لیے دھونکنی کی مانند چلتا سانس بحال کر رہی تھی۔

"اپنا وضو خراب نہ کر، نماز پڑھ لے جا کر۔" مزید کچھ کہنے کا ارادہ ملتوی کرتی وہ دیوار کی طرف منہ کر کے لیٹ گئی۔

اختری بیگم نے نیلی چادر میں لپٹی اس کی پشت کو گھورا اور چٹائی والا مصلیٰ چوکی پر ڈال کر نماز کی نیت باندھ لی۔

☆☆☆

خستہ چٹائی والا پردہ اٹھا کر ارشد نے جوں ہی برآمدے میں قدم دھرا، پروین نے جھٹ سے اوڑھنی کو پھیلا کر خود کو ڈھانپ لیا۔

"یہ دوائیاں ہیں منے کی، طبیعت کیسی ہے اب اس کی؟" دوائیوں کا نیلا شاپر پکڑ کر سرہانے دھرتے ہوئے پروین نے تشکر سے بھائی کو دیکھا۔

"کچھ ٹھیک ہے اب، ذرا سا شہد چٹایا تھا کھانسی دب گئی ہے اب۔"

"چلو، اللہ بہتر کرے گا۔" سر ہلا کر چند نوٹ بہن کی مٹھی میں دباتے ہوئے ارشد نے کہا۔

پروین نے احتجاجاً کچھ کہنا چاہا تو وہ نفی میں سر ہلا کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر برآمدے سے باہر نکل گیا۔

اختری بھی کلثوم کی زبان درازی سے خوب واقفیت رکھتی تھیں اور کم و بیش۔ اپنی بیٹی بھی اسی خصوصیت سے مالا مال تھی۔ اس لیے خوب روڑے اٹکائے، دھمکیوں اور مار کٹائی کے بعد بھی پروین کو اپنی جگہ جسے دیکھ کر نکاح کر کے جان چھڑائی مگر کیا پتا تھا جان چھڑائی نہیں، عذاب میں پھنسائی ہے۔

روایتی خانہ جنگی میں گھر کا سکون تلپٹ ہو کر رہ گیا۔ اختری کے پڑھائے گئے سمجھداری کے سارے اسباق پروین نے چولہے میں جھونک دیے۔ ساس، بہو اپنی اپنی تلوار ایسی زبان لے کر جب منہ ماری کرتیں تو گھر کا سکون خون میں لت پت ہو کر ایک کونے میں پڑا سسکیاں بھرتا۔

تنگ آ کر شمشاد نے پروین کو تھپڑوں سے سینکنا شروع کر دیا تھا۔ ماں کو تو کچھ کہہ نہیں سکتا تھا، اس لیے اپنا طیش بیوی پر نکالتا۔ گھر کے حالات دیکھ کر محبت نے بھاگ کر پناہ لی۔ یوں محبت کو فرار ہوتے دیکھ کر پروین نے خوب واویلا مچایا۔ چیخ چیخ کر شمشاد کو متوجہ کیا کہ وہ محبت کے پیچھے بھاگ کر اسے دھر لے مگر وہ ڈھیٹ بنا بیٹھا رہا۔ دونوں میاں بیوی کو ایک دوسرے سے متنفر ہوتا دیکھ کر کلثوم کے کلیجے میں برف کی سل گر گئی۔

اسی بدامنی میں جب پروین کو قدموں تلے جنت کی نوید ملی تو زبان کی تیز طراری کہیں دبک کر سو گئی مگر شمشاد نہ سدھرا۔ رزق میں کمی، زیادتی تو اللہ کی دین ہے لیکن شمشاد بے حد ناشکرا ثابت ہوا کڑا وقت آن پڑا تو بے حد درشت ہو گیا۔

نوٹ اور نسی کے پلو میں باندھتے ہوئے وہ ٹسس ٹسس کر کے رونے لگی، کچھ آنسو بھائی کی محبت میں گر رہے تھے اور کچھ ناخوش گوار ازدواجی زندگی کے دکھ میں برس رہے تھے۔

☆☆☆

کچھ عرصہ پہلے اختری بیگم کے چچا کی بیٹی پرلے محلے میں اپنے جنجال پورہ کے ساتھ قیام پذیر ہوئی تھی۔ گھر کے حصے بخرے ہوئے تو سب بھائیوں نے اپنی اپنی رقم لے کر بال بچوں سمیت دوسرے شہر کی راہ لی کہ قصبے ایسے شہر میں سہولیات کا فقدان تھا۔ جان چھڑا کر نئے شہر کی طرف نکل پڑے مگر کلثوم بی بی نے ایسی دفا نبھائی اپنے شہر سے کہ کہیں رہ گئی۔ سستے داموں مکان خرید کر وہ اپنے پانچ بیٹوں سمیت اپنے تئیں عیش کرنے لگی۔ چار بیاہی بیٹیوں نے تو بہتیرا زور لگایا کہ اماں اس کھڈے سے نکل کر نئی جگہ پہ رہے مگر اماں کو کھڈے سے ایسی والہانہ محبت تھی کہ کھڈے سے نکل کھڈے میں جا بسی۔ برقعہ اٹھائے گھر گھر گھومتی وہ ایسی مشہور ہوئی کہ ہر دوسرے گھر میں اس کی زبان دانی کے چرچے ہونے لگے۔ اعلا اخلاق کی آڑ میں گھروں کی ٹوہ لینا اس کا من پسند مشغلہ تھا۔ اپنی زبان کی شیرینی کے سبب وہ ہر دل عزیز خالہ بن گئی۔

اختری سے تو اس کی بچپن سے ہی گاڑھی چھنتی تھی۔ آدھا دن اختری کے گھر اور آدھا دن محلے میں گزار کر وہ رات کو ہی اپنے گھر کی راہ لیتی۔ ایسے میں پروین کا آنا جانا کلثوم کے بڑے بیٹے شمشاد کو بھا گیا اور ایسا بھایا کہ دن رات اس کا ذکر کلثوم بی بی کو طیش دلا گیا۔ ماں بیٹے میں خوب پاک بھارت والی جنگیں ہوئیں اور بالآخر شمشاد نے جنگ فتح کر لی۔

اختری سے لاکھ محبت سہی مگر اس کی اکلوتی بیٹی اپنے روپ سمیت اسے ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔

بیٹا چھن جانے کے خوف میں اس کا ارادہ کسی کم صورت و کم عقل کو بہو بنانے کا تھا مگر صورت و عقل میں یکتا پروین میں بیٹے کی جان ایسی اٹکی کہ وہ چاہ کر بھی

اس کا یہ نیا روپ پروین کے حلق میں ہڈی کی مانند اٹک گیا۔ کہاں وہ رسیلا لہجہ، محبت کی گرم جوشی اور کہاں یہ کڑوا لہجہ اور بے زاری کے مظاہرے۔

وہ صحیح معنوں میں بدظن ہوگئی۔ کلثوم کے لیے یہ صورت حال خاصی دلچسپ اور فرحت افزا تھی۔ بڑے طریقے سے بیٹے کے دماغ میں بہو کے خلاف فتور بھر کے وہ اب روز تماش بین بن کر لطف اٹھاتی تھی۔

بلاوجہ کی مار پیٹ پروین نہ برداشت کرسکی اور گھر واپس چلی آئی۔ دونوں گھروں کے تعلقات میں کشیدگی در آئی۔ زچگی کے ایام میں اختری منتظر ہی رہیں کہ شاید وہاں سے کوئی آجائے یا خیر خبر لے لے مگر نہ کوئی آیا نہ خیریت دریافت کی۔ فون کر کے اختری نے کلثوم سے بات کی تو وہ طرح دے گئی۔ شمشاد کا نمبر ملا کر جو خرچا اور خیریت نہ پوچھنے کا شکوہ کیا تو اس نے بھی لگا سا جواب دے کر فون بند کردیا۔

"خالہ! میری طرف سے صاف جواب ہے ہمارے پاس کوئی پیسے نہیں ہیں، فضول کے آپریشن میں خرچ کرنے کو۔" ایسی بے حسی پر ان کا جی تو بہت دکھا مگر کیا کرتیں، بول بال کے چپ کر گئیں۔

"بدبخت کہیں کا، یوں منہ توڑ کے جواب دیا ہے جیسے اولاد پڑوسیوں کی ہو۔"

فون بند کرانہوں نے اپنے چھوٹے بیٹے سے بات کی، بڑا تو اس قابل تھا ہی نہیں کہ پانچ روپے بھی ماں کو دے دے۔ وہ تو اوپر والے کمرے میں بیوی بچوں کے ساتھ جا کر ایسا بسا تھا کہ نیچے والوں کی ذات کو مکمل نظر انداز کر گیا تھا۔

زچگی کا سارا خرچا چھوٹے بھائی نے اٹھایا تھا، اب بھی ساری ضروریات وہی بنا کوئی احسان جتائے پوری کر رہا تھا۔ پروین کے سسرال والوں نے تو مڑ کے خبر نہ لی تھی۔

اب دونوں ماں بیٹی کے جی جلتے تھے، اختری تو اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے انہیں کوستی تھی۔

پروین کا کلیجہ جل کے کوئلہ ہوگیا تھا۔ اسے سب سے زیادہ قلق محبت کے ہاتھوں ہزیمت اٹھانے کا تھا۔ بچے کو سینے سے لگائے وہ ہر وقت بل کھائے رہتی تھی۔

"میں ساس کی بھی لن ترانیاں سہہ لیتی اماں! میرے تو بندے نے وفا نہیں کی میرے ساتھ۔" اس کے آزردگی سے کہنے پر اختری کا دل دہل جاتا۔

بیٹی کے یوں بے مول ہوجانے کا ملال انہیں ہر وقت پریشان رکھتا۔ اسی پریشانی اور افسردگی میں اس کا سوا مہینہ مکمل ہوگیا۔

وہ ایک دھندلی سی صبح تھی، جب اختری کے پرامن گھر میں جنگ کا طبل بجا۔

بڑا بیٹا معترض تھا پروین کے گھر بیٹھنے پہ، اس کی زبان سے بیوی کے الفاظ ادا ہو رہے تھے۔ اختری بیگم کو شدید طیش آگیا۔ خوب تو تو میں میں ہوئی۔

"بدبخت! اماں کی خدمت تو کرنے سے رہا، بہن کا دکھ بھی بوجھ لگ رہا ہے۔ ایک دھیلے کی محتاج نہیں ہوں تیری، پھر کاہے کو تکلیف ہے بہن کے گھر بیٹھنے کی۔"

"بیٹیاں گھر بساتی ہی اچھی لگتی ہیں۔" ماں کی بات پہ اس نے گھسا پٹا جملہ بولا تو اندر بیٹھی پروین بھڑک اٹھی۔

"میں کیسے گھر بسا لیتی، جب میرا شوہر ہی زن مرید نہ نکلا آپ کی طرح۔" بہن کی بات پہ اس نے بری طرح تیور اکر اسے گھورا۔

"دیکھ بہنا! نہ یہ تیرا کھا رہی ہے، نہ تیرے در پہ پڑی ہے۔ یہ گھر ابھی میرے نام ہے اور اس میں میری بہنا کا بھی حصہ ہے اس لیے تو جا کر اپنی بیگم کو سمجھا دے کہ میری بیٹی کے گھر آنے پہ دانت نہ کڑکڑائے۔" پروین کو جانے کا اشارہ کرتے اختری بیگم نے دوٹوک بیٹے کو سنائی تو وہ پیر پٹختے ہوئے سیڑھیاں پھلانگ کر۔ اوپر غائب ہوگیا۔

☆☆☆

آم کے درختوں پر بور آنے کا موسم تھا۔ فضا سے خنکی مکمل طور پر ختم ہو چکی تھی۔ اکھڑے فرش پر بانس والی جھاڑو پھیرتے ہوئے وہ بری طرح کوفت میں مبتلا ہو رہی تھی۔

"اے کوئی خیر خبر آئی کلثوم کی طرف سے؟" چند فٹ کی دیوار سے جھانکتے ہوئے ساتھ والے گھر کی پڑوسن نے دریافت کیا۔

پیتل کے لوٹے میں وضو کے لیے پانی بھرتی اختری نے لوٹا زمین پر دھرا اور دیوار کی جانب چلی آئیں۔

"نہ بہن! کیسی خبر، وہ تو جان چھڑا کر بیٹھے ہیں۔ پہلی بات تو وہ آئے ہی نہ تو بہتر ہے۔ دوسری بات اگر آ بھی گئے تو میں تو اپنی بیٹی نہ بھیجوں ان کے ساتھ۔ میری بیٹی کوئی گری پڑی نہیں ہے جب جی چاہا اٹھا لی، جب جی چاہا پھینک دی۔ کم ظرف، کنجوس لوگ۔" جلے دل کے پھپھولے پھوڑتی اختری آزردگی سے بولیں۔

"صحیح کہہ رہی ہو بہن! میں نے سنا ہے کلثوم کا آج ہی ایکسیڈنٹ ہوا ہے، پسلیاں ٹوٹ گئی ہیں بے چاری کی۔" اختری کی تائید کرتے ہوئے اس نے خبر سنا کر کلثوم کے لیے لہجہ میں ہمدردی سموئی۔

"مکافات عمل ہے خالہ! مجھ پر پیسہ لگانے کو ایک دھیلا نہ تھا، اب دیکھتی ہوں کہاں سے آئے گی دولت۔ آخر ماں کے آپریشن پر بھی تو پیسہ لگے گا نا، یہ محض ذمہ داریوں سے فرار تھا ورنہ ایسی بھی بات نہیں کہ ان لوگوں کے پاس پیسہ نہیں ہے۔"

کچرا سمیٹ کر کوڑے دان میں بھرتی پروین چمک کر بولی اور ہاتھ دھو کر کمرے میں چلی آئی۔

اگلے روز سہ پہر کا وقت تھا جب لوہے کا زنگ لگا دروازہ بجا۔ اختری نے گرتے پڑتے کواڑ کھولے تو جہاں کی تہاں رہ گئیں۔

دروازہ کھلا چھوڑے وہ الٹے پیروں اندر پلٹ آئیں۔ شمشاد نے بھاگ کر لجاجت سے اختری کا ہاتھ تھام لیا۔

بچے کے لیے دودھ گرم کرتی پروین نے کچن سے جھانک کر دیکھا اور یک دم حیرت سے پیچھے ہٹ گئی۔

"خالہ! یوں منہ نہ موڑ، بڑی آس لے کر آیا ہوں۔"

صحن سے آتی شناسا آواز پروین کو قطعی غیر شناسا لگ رہی تھی۔ تنفر سے سر جھٹک کر وہ ماچس کی تیلی سے چولہے پر جمے نشان کریدنے لگی۔

ذرا دیر بعد اس نے جھانک کر دیکھا تو صحن خالی نظر آیا۔

"چلا گیا ہوگا ہونہہ، ماں کی خدمتیں کروانے کے لیے میرا خیال آ گیا۔ مفت کی نوکرانی ہاتھ آئی ہوئی تھی، اچھا ہی ہوا جو آ گیا۔ اب اماں نے اسے بتایا ہوگا کہ بیوی کو کیسے مارا پیٹا جاتا ہے۔" خود کلامی کرتے ہوئے دودھ ٹھنڈا کیا اور دودھ فیڈر میں بھرنے لگی۔

"اے پروین! چل اپنا سامان باندھ لے جلدی سے، شمشاد لینے آیا ہے۔ روز روز نہیں آئے گا وہ، یہیں بیٹھی رہی تو اپنا گھر اجاڑ لے گی۔"

کچن میں داخل ہو کر اختری نے پروین سے کہا اور جس عجلت میں آئی تھیں، اسی عجلت میں واپس پلٹ گئیں۔

پروین کے دل کو دھکا سا لگا۔

وہ ماں سے کہنا چاہتی تھی۔

"اماں! تجھے میرے نیل بھول گئے جو پورے جسم کو پھوڑے کی طرح دکھاتے تھے یا ان لوگوں کی بے حسی بھول گئی جس کے سبب تو کہا کرتی تھی میں اپنی بیٹی کو ایسے خود غرض لوگوں کے حوالے نہیں کروں گی۔"

وہ حلق کے بل چیخنا چاہتی تھی۔ لڑنا بھڑنا چاہتی تھی مگر سارے جذبات حلق میں جمع ہو کر اٹک گئے۔

دودھ بھرا فیڈر ہاتھ سے چھوٹا اور فرش پر گر کر پھیل گیا۔ آن کی آن میں مکھیاں جمع ہو گئیں اور اپنے پروں سمیت دودھ میں ڈبکیاں لگا کر جھومنے لگیں۔

☆

دل اور طرح کا ہے دُعا اور طرح کی
اور دل کے دھڑکنے کی صدا اور طرح کی

ہم لوگ ہیں کچھ اور قرینہ ہے ہمارا
ہم تم کو سنائیں گے کتھا اور طرح کی

مٹی نے دکھایا تھا مجھے اور کوئی نقش
پانی سے مگر آئی ندا اور طرح کی

وہ رنگ جو حاصل ہیں تجھے ان کو ملا کر
تصویر کوئی اور بنا اور طرح کی

کچھ لوگ ابھی واقفِ زنداں ہی نہیں ہیں
اس دشت میں آتی ہے ہوا اور طرح کی

اک ہاتھ مرے خون کی جانب جو بڑھا ہے
اس ہاتھ پہ مہکے گی حنا اور طرح کی

اک خواب کے جل جانے کا دُکھ اپنی جگہ پر
اس آنکھ سے تعبیر اُٹھا اور طرح کی

کامی شاہ

ہجر کے دَور میں حالات بدل جاتے ہیں
پھول مرجھاتے ہیں، سب پات بدل جاتے ہیں

تو نے دیکھا ہے کبھی درد کے صحراؤں میں
دُھوپ بڑھنے لگے تب ساتھ بدل جاتے ہیں

ہم پہ وہ وقت ہے اب چاہے خوشی آئے کہ غم
آنکھ نم ہوتی ہے، جذبات بدل جاتے ہیں

میں نے لوگوں کو بھی موسم کا مقلّد پایا
بات ہوتی ہی نہیں ہاتھ بدل جاتے ہیں

تم ابھی آئے ہو، تم بانٹ لو چاہت کے ورق
وقت کے ساتھ خیالات بدل جاتے ہیں

پہلے تھا بھوک کا ڈر، اب ہے ردا خطرے میں
کیا خبر تھی، ہمیں خطرات بدل جاتے ہیں

یہ تو فطرت ہے بُرا ان کو نہ کہنا شاکر
تو نے دیکھا نہیں دن رات بدل جاتے ہیں

عثمان شاکر

بیگانہ وار ایک یگانہ چلا گیا
دیتا صدائیں خانہ بخانہ چلا گیا

کھویا قلم نہ گم ہے کتاب اس کے باوجود
افسوس علم کا وہ خزانہ چلا گیا

تھی زندگی قریب، اسے ڈھونڈتے کہاں
ہر ایک شخص ہو کے، روانہ چلا گیا

لاریب صبح لطف کے لاتی لوازمات
لیکن سرودِ خوابِ شبانہ چلا گیا

چاہے کہیں ہو، رزق ملے گا نصیب کا
طائر کہ جھک کے دام سے دانہ چلا گیا

ہر بات میں تھا ایک قرینہ نہیں رہا
ہر چیز کا تھا ایک ٹھکانہ چلا گیا

شوکت ہمارے ساتھ بڑا حادثہ ہوا
ہم رہ گئے ہمارا زمانہ چلا گیا

شوکت واسطی

ذرا پہلے بتا دینا...!

کہانی ختم ہونے سے ذرا پہلے بتا دینا
میں اپنے سارے جذبوں کو سمیٹوں، ختم کر ڈالوں
یا کوئی جوگ لے کر زندگی کو رائیگاں کر دوں
مجھے یہ بھی بتا دینا
وہ وعدے جو تم نے
میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھ سے کیے تھے
انہیں اب یاد رکھوں میں
یا
اک دھوکا سمجھ کر خاک میں پھینکوں
کہانی ختم ہونے سے ذرا پہلے بتا دینا
مجھے اور کتنا جینا ہے
میرے کردار کی مدت کتنی ہے کہانی میں
بتا دینا!!!

سُباس گُل

اس ماہ کی مسکراہٹیں

افاقہ

ایک شخص کو آنکھوں میں تکلیف کی شکایت تھی۔ وہ ڈاکٹر کے پاس گیا اور کہنے لگا۔

"ڈاکٹر صاحب! مجھے آنکھوں کے سامنے دائرے گھومتے ہوئے نظر آتے ہیں، خدارا کچھ علاج کریں۔"

ڈاکٹر نے آنکھوں کے معائنے کے بعد آنکھوں میں دوا کے چند قطرے ٹپکا کر چند منٹ آرام کرنے کو کہا اور پھر پوچھا۔

"کہو، کچھ افاقہ ہوا؟"

"جی ہاں بہت۔ اب دائرے صاف نظر آنے لگے ہیں۔"

نسخہ

ایک صاحب اپنی گاڑی میں کہیں جا رہے تھے کہ راستے میں انہیں ایک نوجوان تیزی سے بھاگتا ہوا دکھائی دیا۔ ان صاحب نے نوجوان کے پاس کار روک کر اسے اپنی کار میں بیٹھنے کا اشارہ کیا تو نوجوان جب بیٹھ گیا تو ان صاحب نے اس کی منزل پوچھنے کے بعد پوچھا۔

"شاید تم کسی بہت ہی اہم وجہ سے وہاں جلد از جلد پہنچنا چاہتے ہو، اس لیے اتنا تیز دوڑ رہے تھے۔"

نوجوان بولا۔ "جی نہیں، جب بھی لفٹ کی ضرورت ہوتی ہے میں اسی طرح تیز دوڑنے لگتا ہوں یہ ترکیب آج تک بے کار نہیں ہوئی۔"

ناراضی

ایک گلوکار کی بیوی نے اپنے شوہر سے کہا

"پچھلے مہینے تم نے چھوٹے بیٹے کی سالگرہ پر تحفے میں جو طبلہ لا کر دیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ پڑوسیوں کو یہ بات پسند نہیں آئی؟"

"تمہیں اس بات کا اندازہ کیسے ہوا؟" گلوکار نے راگ الاپتے ہوئے رک کر پوچھا۔

"کل میں نے سنا کہ ہمارے پڑوسی ننھے سے کہہ رہے تھے کہ بیٹا، یہ لو چاقو اور ذرا دیکھنے کی کوشش تو کرو کہ طبلے کے اندر کیا ہے؟"

یقین

ایک خاتون اپنے ڈرائنگ روم کی صفائی کر رہی تھیں کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ خاتون نے فوراً جھاڑن پھینکی اور فون کی طرف لپکیں۔ تیسرے چوتھے قدم پر ان کا پاؤں بے ترتیب قالین میں الجھ گیا۔ گرنے سے بچنے کے لیے انہوں نے میز کو تھامنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کوشش میں میز پر رکھا ہوا ٹیلی فون نیچے گر پڑا۔ اسی لمحے خاتون کے کتے نے بھونکنا شروع کر دیا جس کی آواز سن کر ان کا بچہ اٹھ گیا اور بری طرح رونے لگا۔ خاتون نے بامشکل خود کو سنبھالا اور ریسیور کان سے لگا لیا۔ دوسری طرف ان کے شوہر کسی سے کہہ رہے تھے۔

"اب تک کسی نے ہیلو نہیں کہا مگر مجھے یقین ہے کہ نمبر میرے گھر کا ہی مل گیا ہے۔"

گمان

ایک خاتون ایک دن اپنے شوہر سے اپنے بیٹے کے متعلق کہنے لگیں۔ "میرا بچہ بہت ذہین ہے جب یہ چلتا ہے تو ایسے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی بڑا آفیسر چل رہا ہو، ضدی اتنا ہے جیسے مستقبل کا

https://reading.caretofun.net

وزیراعظم ہوگا۔ سمجھ دار اتنا ہے کہ جیسے یہ مستقبل میں وزیراطلاعات ونشریات بنے گا اور ذہین اتنا ہے کہ حزب اختلاف کا قائد بھی بن سکتا ہے۔"

شوہر نے چیختے ہوئے کہا۔

"بس کرو بیگم! مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بڑا ہو کر ہمیں جیل بھجوائے گا۔"

سمجھا دیا ہے

گلی میں ہارون صاحب کی ملاقات تجمل صاحب سے ہوئی تو انہوں نے تجمل صاحب سے کہا۔

"دیکھیے! میں کئی بار آپ سے شکایت کر چکا ہوں کہ آپ کا بیٹا میری نقل اتارتا ہے۔ جس طرح میں کرتا ہوں، اسی طرح کرتا ہے۔ آپ نے اسے سمجھایا نہیں۔"

"ناراض نہ ہوں ہارون صاحب!" تجمل صاحب ملائمت سے بولے۔ "میں نے اسے سمجھا دیا ہے کہ بے وقوفوں جیسی حرکتیں نہ کیا کرے۔"

دل جوئی

ایئرپورٹ کے لاؤنج میں ایک خاتون کو زاروقطار روتے دیکھ کر ایک نوجوان قریب پہنچا اور ہمدردانہ لہجے میں وجہ دریافت کرنے لگا۔

"کچھ عورتیں میرے قریب بیٹھی تھیں، انہوں نے میرے بیٹے کو بدصورت کہہ کر میری دل آزاری کی خاتون نے کہا۔

"آپ ہرگز دل چھوٹا نہ کریں آیئے میں آپ کو چائے پلاتا ہوں۔" نوجوان نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"جب تک ہم چائے پی کر آتے ہیں تب تک اپنے بندر کو یہیں بیٹھا رہنے دیں، میں اسے کیلا لا کر دے دیتا ہوں۔"

مار ڈالا

ایک معروف ڈاکٹر نے ایک انتہائی موٹے شخص کو جلدی جلدی مشورہ دیا۔

"چکنائی اور مٹھائی بند۔ سگار دن میں صرف ایک۔"

سات دن بعد وہ صاحب دوبارہ کلینک آئے تو حلیہ بگڑا ہوا تھا۔ اور خاصے پریشان تھے۔ بے صبری سے بولے۔

"ڈاکٹر صاحب! میں آپ کی منع کی ہوئی چیزوں سے تو مکمل پرہیز کر رہا ہوں لیکن۔"

"لیکن؟" ڈاکٹر صاحب نے پوچھا۔

"لیکن ایک سگار نے مار ڈالا ہے۔ آدھا بھی نہیں پی سکتا۔ کیا کروں کبھی پیا جو نہیں۔" وہ شخص بے چارگی سے بولا۔

راستہ

ایک پاگل کو علاج کے بعد صحت یاب قرار دے کر پاگل خانے سے رخصت کیا جا رہا تھا۔ ڈاکٹر نے پوچھا۔

"باہر کی دنیا میں جا کر اب تمہارا کیا کرنے کا ارادہ ہے۔"

"میرے پاس کئی راستے ہیں۔" سابق پاگل نے متانت سے جواب دیا۔ "ایک تو میں سوچ رہا ہوں پہلے کی طرح ڈاکٹر کے طور پر پریکٹس شروع کر دوں۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ میں اخباری رپورٹر بن جاؤں یا پھر میں سوچ رہا ہوں کہ کیتلی کے طور پر ہی کام کرتا رہوں جیسا کہ میں یہاں کر رہا تھا۔"

شگفتہ جاوید

آپ ﷺ کے بتائے ہوئے سنہری اصول

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سُنا۔

"مومن یقیناً اپنے اخلاق سے وہ درجہ پالیتا ہے جو ایک روزے دار اور شب بیدار شخص کے حصے میں آئے گا۔" (ابوداؤد)

فائدہ،

روزے دار سے مراد وہ شخص ہے جو کثرت سے نفلی روزے رکھتا ہے، اسی طرح قائم سے مراد راتوں کو اٹھ اٹھ کر اللہ کی بکثرت عبادت کرنے والا ہے۔ ان دو عملوں کی پابندی نہایت مشکل ہے۔ لیکن جو ان کا اہتمام کرتے ہیں۔ اس کا اجر و ثواب بھی انہیں اسی حساب سے بے پایاں ملے گا۔ لیکن حسن اخلاق سے آراستہ شخص، جو صرف فرض کی ادائیگی کرتا ہے، مذکورہ نوافل کا اہتمام نہیں کر پاتا، وہ بھی صائم و قائم کے درجے کو پالے گا۔ اس سے حُسن اخلاق کی اہمیت و فضیلت واضح ہے۔

مہمان،

ایک دن امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ رونے لگے۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ آپ کیوں رو رہے ہیں؟"

آپ نے فرمایا۔

"اس لیے رو رہا ہوں کہ سات دن سے کوئی مہمان میرے گھر نہیں آیا ہے۔"

دوست،

ایک شخص کسی دوست کے پاس گیا اور کہا کہ مجھ پر سودرہم قرض ہے۔"

اس دوست نے اس کا قرض ادا کر دیا۔

وہ دوست رخصت ہو گیا تو یہ شخص رونے لگا۔ اس کی بیوی نے کہا۔

"روتے کیوں ہو، یہ روپیہ دے کر رونا تھا تو روپیہ دینا ہی کیا ضرور تھا۔"

اس نے جواب دیا۔ "روپیہ دینے کی وجہ سے نہیں رو رہا ہوں بلکہ اس وجہ سے رو رہا ہوں کہ میں اپنے دوست کے حال سے اس قدر غافل رہا کہ اس کو مجھ سے سوال کرنے کی ضرورت پیش آئی۔"

تکبر،

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انسان کا یہ بڑا گناہ ہے کہ جب اس سے کہا جائے کہ اللہ سے ڈرو۔ تو وہ جواب میں کہے۔

"تم اپنی خبر لو۔"

حسد،

حضرت ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں۔

"میں نے دُنیا کے بارے میں کسی پر حسد نہیں کیا کیونکہ اگر کوئی اہل بہشت میں سے ہے تو اس نعمت کے مقابلے میں جو اس کو جنت میں ملے گی۔ دُنیا بالکل حقیر و ناچیز ہے اور اگر وہ اہل دوزخ سے ہے تو جس وقت وہ آگ میں جلے گا تو اس کو دُنیا کی نعمت سے کیا فائدہ حاصل ہو گا۔

نصیحت کا اثر،

سفیان بن حسین کہتے ہیں۔

"میں نے ایاس بن معاویہ کے پاس ایک شخص کا ذکر برائی کے ساتھ کیا۔ انہوں نے میری طرف دیکھا اور کہا۔

"کیا تم نے روم سے جہاد کیا ہے۔"

https://readingpaRetoran.net

"میں نے کہا "نہیں۔"
انہوں نے کہا۔ "کیا تم نے سندھ اور ہند اور ترک سے جہاد کیا ہے؟"
میں نے کہا۔ "نہیں۔"
انہوں نے کہا۔ "پھر کیا روم۔۔۔ سندھ اور ہند تو تم سے محفوظ رہے اور تمہارا بھائی مسلمان تم سے محفوظ نہ رہ سکا۔"
سفیان بن حسین کہتے ہیں کہ اس کے بعد پھر میں نے اس بات کو نہیں دہرایا۔

اخلاق کی طاقت،

فتح گڑھ (اتر پردیش) کے علاقے میں سکھوا نامی ڈاکو نے سنسنی پھیلا رکھی تھی۔ اس کی لوٹ مار بے پناہ ہوتی جارہی تھی۔ پولیس کے افراد تک کے لیے ممکن نہیں رہا تھا کہ اس کی گولیوں کا نشانہ بننے سے بچ سکیں۔ صدیق حسن صاحب اس زمانے میں فتح گڑھ میں جوائنٹ مجسٹریٹ تھے۔ سکھوا ڈاکو کے خلاف پولیس کی مہم انہی کی ماتحتی میں چلائی گئی۔ مہینوں کی جدوجہد کے بعد سکھوا ڈاکو گرفتار ہوا اور صدیق حسن صاحب نے اس مقدمے کی سماعت کرکے اس کو سزا کا حکم سنایا۔ مگر عین اس زمانے میں جب کہ صدیق حسن صاحب سکھوا ڈاکو کے خلاف مہم کی قیادت کر رہے تھے، سکھوا ڈاکو نے ان کے خلاف کوئی اقدام نہیں کیا۔ گرفتاری کے بعد اس نے بتایا کہ وہ اکثر رات کو صدیق حسن صاحب کے بنگلے پر آتا تھا۔ مگر ان کی شرافت کا خیال کرکے کبھی ان پر گولی نہیں چلائی۔

سید صدیق حسن صاحب کی وہ کیا بات تھی جس کی وجہ سے ایک ڈاکو بھی ان کی تعریف اور عزت کرتا تھا۔ اس کا اندازہ ایک واقعے سے ہوتا ہے جو خود سکھوا ڈاکو نے بتایا۔ اس نے کہا کہ ایک بار پولیس والے اس کو گرفتار کرکے سید صدیق حسن صاحب کے بنگلے پر لائے۔ سردی کا زمانہ تھا۔ سکھوا نے صدیق حسن صاحب سے کہا۔

"جنٹ صاحب! آپ کا سکھوا سردی کھا رہا ہے۔"
یہ سن کر صدیق حسن صاحب فوراً اندر گئے۔ اپنی نئی ریشمی قمیص اور کمبل لائے اور اس کو ڈاکو کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔
"لو اس کو استعمال کرو۔ یہ تمہارے لیے ہے۔"
(17 مئی 1975ء)

دعا کی اہمیت،

ایک آدمی نے ایک بزرگ سے پوچھا۔
"جب ہماری قسمت پہلے سے لکھی ہوئی ہے تو ہمیں دعا مانگنے کی کیا ضرورت ہے؟"
بزرگ نے جواب دیا۔
"ہو سکتا ہے کہ تیری قسمت میں یہی لکھا ہو کہ جب تو مانگے گا تو تجھے ملے گا۔"
مسرت الطاف احمد۔ کراچی

کامیابی،

ریس میں جیتنے والا گھوڑا نہیں جانتا کہ کامیابی کیا ہوتی ہے۔ وہ دوڑتا ہے تو صرف اپنے مالک سے ملنے والی تکلیف کی وجہ سے، تو کبھی تم خود کو تکلیف میں پاؤ تو سمجھ جانا کہ تمہارا مالک اللہ چاہتا ہے کہ جیت تمہاری ہو۔"
اقصیٰ ناصر۔ کراچی

ایک میٹھا بول،

ایک میٹھا بول، کسی ناگوار بات پر ذرا سی چشم پوشی اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دکھ ہو۔"
ماریہ نذیر۔ بھاگٹانوالہ

چپ رہیے،

جو شخص احسان کرتا ہے اسے چپ رہنا چاہیے۔ لیکن جس پر احسان کیا گیا ہے اسے بولنا چاہیے۔"
نادیہ یاسر۔ گوجرہ

اللہ کے قریب،

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔
"وہ اللہ سے بہت قریب ہے جو خوش اخلاق اور دوسروں کا بوجھ اٹھانے والا ہے۔"
نمرہ عاقب۔ گرین سٹی

مفید نتائج،

بندے کا بندے پر احسان کرنا اتنا مشکل نہیں مگر اس کے نتائج بڑے ہی مفید ہوتے ہیں۔ احسان کرنا بڑی شرافت ہے۔

فضہ بلال۔ ڈیفنس کراچی

شیطان کی خوشی،

شیطان اور اس کے چیلے تین باتوں سے خوش ہوتے ہیں۔

1۔ مومن کو قتل کر دیا جائے۔
2۔ کوئی شخص کفر کی حالت میں مر جائے۔
3۔ کسی کے دل میں درویش کی طرف سے خوف ہو۔

نوال افضل گھمن۔ کراچی

گرنے کی خوشی،

حضرت خواجہ ابوبکر بن طاہر الابہری رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔

"کسی دوسرے کے گرنے پر خوشی مت کر، کیا معلوم کل کو تیرے ساتھ کیا ہو گا؟"

فاکہہ سہیل۔ کراچی

اللہ کا انعام،

حاجت مند عزیز و مساکین کا تیرے پاس آنا تجھ پر اللہ کا خاص انعام ہے۔ جتنا ہو سکے ان کی مدد کر۔"

عائشہ۔ گوجرہ

لبیک،

"عاشق مولیٰ وہ ہوتا ہے کہ جب وہ شب کی تاریکی میں اپنے مالک حقیقی سے عاجزی کر رہا ہو تو رب کریم اس کی دعا قبول فرمائے اور اس کی صدا پر لبیک کہے۔"

توکل،

توکل یہ ہے کہ اگر اژدہا کے منہ میں اپنا ہاتھ ڈال دیا جائے اور اژدہا ہاتھوں کو پہنچوں تک نگل لے اس وقت بھی تجھے غیر اللہ سے کوئی اندیشہ نہ ہو۔"

آسیہ جاوید۔ علی پور چٹھہ

اس مرض کی دوا نہیں،

شیخ ابوبکر بن ہوار بطائحی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔

"تیرا لوگوں کو حقیر جاننا اس قدر بڑا مرض ہے کہ جس کی دوا نہیں ہو سکتی۔"

مصباح گل۔ سرگودھا

دانائی،

اپنے دشمن کو ہزار موقع دو کہ وہ تمہارا دوست بن جائے لیکن اپنے دوست کو ایک بھی ایسا موقع نہ دو کہ وہ تمہارا دشمن بن جائے۔

عائشہ۔ گوجرہ

اقوال زریں،

- کم کھانا تمام بیماریوں کا علاج ہے اور شکم سیری بیماری کی جڑ ہے۔ جب معدہ بھر جائے تو قوت فکر کمزور پڑ جاتی ہے اور حکمت اور دانش کی صلاحیتیں گونگی ہو جاتی ہیں۔
- غصہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم دوسروں کی غلطیوں کا بدلہ اپنے آپ سے لے رہے ہیں۔
- سب سے بہتر لقمہ وہ ہوتا ہے جو اپنی محنت سے حاصل کیا جائے۔
- اگر وقت اور حالات ہمیشہ ہمارے ہاتھ میں رہیں تو ہم زندگی سے کچھ نہیں سیکھ سکتے۔

سیدہ نسبت زہرا۔ کھرڈ لنگا

https://reading.caretofan.net

خالد جیلانی

کھلتا کسی پہ کیوں میرے دل کا معاملہ

ثمرہ اقرا ______ کراچی

کبھی اعتبارِ الفت، کبھی ہم سے بدگمانی
تیری یہ بھی مہربانی، تیری وہ بھی مہربانی

مادیہ نذیر ______ بھاگٹانوالہ

ہمارا ان سے تعلق بھی شمس و قمر جیسا ہے
اک رابطہ مسلسل، ایک فاصلہ مسلسل

نادیہ اشرف ______ رائے ونڈ

ذرا جو سمجھ آنے لگی ہے کتابِ حیات
زندگی اکثر نئے ورق پلٹ دیتی ہے

حیرا زبیری اعوان ______ جھنگ صدر

لوگ خوش مزاج کہتے ہیں مجھے
میں نے خود کو اکثر اداس پایا ہے

نوال افضل گھمن ______ گجرات

کسی سے تیرے آنے کی سرگوشی کو سنتے ہی
میں نے کتنے پھول چنے اور اپنی شال میں رکھے

زاہدہ محمد خان ______ شادی وال گجرات

ذرا سی عمر، عداوت کی لمبی فہرستیں
عجیب قرض وراثت میں میرے نام ہوا

شازیہ انمول ہراج ______ تلمبہ

رابطۂ الفت کہوں یا عشق کی معراج کہوں
اپنے سائے پہ بھی تیرا گمان ہوتا ہے

فاطمہ رانی ______ تلمبہ

میں اداس لوگوں کو ہنسا دیتا ہوں
مجھ سے اپنے جیسے لوگ دیکھے نہیں جاتے

حنا سلیم اعوان ______ آخون باندی

درد حد سے بڑھا ہے تو احساس ہوا ہے
دل بجھ کے بھی دل رہتا ہے، پتھر نہیں ہوتا
نہیں ملتیں ہر شخص کو منہ مانگی مرادیں
ہر شخص مقدر کا سکندر نہیں ہوتا

خدیجہ سارنگ ہراج ______ تلمبہ

یقین اس کو آتا نہیں، وضاحت میں نہیں کرتا
زندگی شاید گزر جائے گی انہی امتحانوں میں

ایشال چوہدری ______ نیو مری

وفا کی امید کسی اور کو ہو گی
ہمیں تو یہ دیکھنا ہے تو بے وفا کہاں تک ہے

شکیلہ نثار ______ فاروق آباد

سنبھلنے تم کب لوٹ آؤ
ہم اکثر دروازہ کھلا رکھتے ہیں

عمارہ شفیق ______ اوچ شریف

مسکراہٹ کی روشنی کا سبب
آنسوؤں کے چراغ ہوتے ہیں
جن کے چہرے ہوں چاند کی صورت
ان کے دل میں بھی داغ ہوتے ہیں

حرا ملک ______ دہاڑی

خود یاد نہ کروں تو پوچھتا بھی نہیں
اور ملتا یوں ہے جیسے طلب گار بہت ہے

ثنا ذوالفقار ______ نورے والی رحیم یار خان

کوئی پتھر سا دل لا دو
مجھے دنیا میں جینا ہے

کوثر خالد ______ جڑانوالہ

ہم ایک بار تمہارے دیار سے گزرے
ہزار دشت تمہارے غبار سے گزرے
پل صراط محبت تھی اور اپاہج ہم
مگر ہم اڑ کر اس تیز دھار سے گزرے

شازیہ ہاشم کیلانی ______ قصور

نہ جانے کیا کمی رہ گئی ہمارے اخلاق میں صاحب
دل کو جتنا بھی صاف رکھا اتنا ہی ستایا زمانے نے

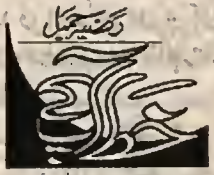

رخسانہ جمیل

خط آپ کے

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع۔37- اردو بازار، کراچی۔
Email: shuaa@khawateendigest.com

شکیلہ نثار، کائنات، رباب، رابعہ فاروق آباد سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

آپ کو میں ایک بات بتادوں کہ آپ کے جوابات مجھے بہت پسند آتے ہیں۔ آپ بہت محبت سے ہر خط کا جواب دیتی ہیں۔ ایک اور بات میں اس ادارے کا شکریہ جتنا ادا کروں کم ہے۔ وہ یہ ہے کہ آپ نے ہمارے پاکستان کو نمرہ احمد، سمیرا حمید، عمیرہ احمد، صائمہ اکرم، عفت سحر، تنزیلہ، آمنہ ریاض، نعیمہ ناز سارہ رضا، مصباح علی سید، فرحت اشتیاق اور اشل جیسے ہیروں سے نوازا ہے۔ مجھے ان سب سے خاص طور پر نمرہ۔ سمیرا اور عمیرہ سے بے حد، بے حساب اور بے تحاشا عقیدت ہے۔ ان کی تحریریں پڑھ کر میں بے اختیار اللہ کو یاد کرنے لگتی ہوں۔ اس ماہ سمیرا حمید کا نام پڑھتے ہی سوچا کہ ساحرہ اپنے سحر میں گم کرنے کے لیے آگئی ہیں۔ اور واقعی ہم طواف عشق پڑھ کر ان کے سحر میں گم ہوگئے کیا کوئی اتنا اچھا بھی لکھ سکتا ہے (سبحان اللہ) نعیمہ ناز بھی اپنی تمام تر صلاحیتوں کے ساتھ حاضر ہیں پہلی قسط ہی جاندار تھی مزہ آیا پڑھ کر۔ اور باقی جونئیر رائٹرز ہیں۔ بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔

شکیلہ، کائنات، رابعہ اور رباب آپ سب دوستوں کا شکریہ...... بلاشبہ ہماری تمام ہی رائٹر بہت اچھا لکھتی ہیں لیکن ان تمام رائٹرز کی کامیابی میں آپ جیسی قارئین کا بھی بہت بڑا حصہ ہے آپ نے ان کی تحریروں کو سمجھا ان کو سراہا۔ ان کی قدر دانی کی۔

آپ کی کہانیاں ابھی پڑھی نہیں۔ قابل اشاعت ہوئیں تو ضرور شائع ہوں گی۔

ریحانہ چوہدری نے مدو کے سے لکھا ہے

اللہ آپ کو سلامت رکھے اور آپ کے ”پرچہ جات“ کو بھی۔ ”ہم کون کسی کے ہوتے ہیں۔ کوئی ہم کو یاد رکھے گا کیوں۔ مگر ہماری مدیرہ صاحبہ نے میری آٹھ سالہ ”سارہ“ کا دل بہت بیدردی سے توڑنے کی کوشش کی ہے۔ اتنی محبت سے اس نے ڈرائنگ بنا کے ”شعاع کا گھر“ بنا کر بھیجا اپنا ذاتی شعر بنا کے آپ کو سلام اور شکریہ ارسال کیا اور پورا مہینہ اتراتی پھری بلکہ دانستہ طور پر تقریباً ہر آئے گئے کے سامنے بڑے سلیقے سے ایک طرز تغافل برتتے ہوئے مجھ سے پوچھنے کی کوشش کہ ماما میرا خط پہنچ چکا ہوگا۔ کون سے مہینے میں میرا خط شعاع میں شائع ہوگا کل بھی پکڑتے ہی ڈائجسٹ میں بڑے اعتماد سے اپنا خط اور نام ڈھونڈنے لگی اور جو مایوسی اس کے چہرے پر پھیلی وہ میں لفظوں میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔ اب یہ بھی آپ کہہ نہیں سکتے کہ خط ملا نہیں یا دیر سے پہنچا۔ اسی لیے تو جنوری کو میں نے خط اپنے گاؤں کے بجائے سیمبریال سے رجسٹری کروایا تھا اور ابھی تک رسید میرے بیگ میں ہے۔

پیاری ریحانہ! آپ کی تمام تر ناراضی اور گلے شکوے سر آنکھوں پر۔ اب آپ کو کیسے یقین دلائیں کہ معصوم سائرہ کی اداسی اور مایوسی ہم نے بھی اپنے دل میں محسوس کی ہے۔ سائرہ کا خط ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ آپ خود سوچیں، اتنی ذہین، پیاری بچی اتنے پیار سے ہمیں خط لکھے تو ہم کیوں نہیں شائع کریں گے۔ اتنے سنگ دل نہیں ہیں ہم۔

آپ نے خط رجسٹری کیا تھا تو ڈاک میں گم ہونا تو ممکن نہیں ہے، ہوسکتا ہے کہ ہمارے آفس میں ڈاک کے ڈھیر میں کہیں گم ہوگیا ہو۔ آپ سائرہ کو ہماری طرف سے پیار کریں اور اس سے کہیں کہ ہمیں دوبارہ وہی خط لکھ کر بھجوائے۔ ہم ضرور شائع کریں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ اور آپ کے بچوں کو سلامت اور خوش وخرم رکھے۔

ایک ضروری بات...... خط ارجنٹ میل سروس سے بھجوائیں۔

اقصیٰ طیب الرحمٰن نے گاؤں مومن ضلع ہری پور سے لکھا ہے

جب بھی دل اداس ہوتا ہے تو سارے ڈائجسٹ نکال کر گھنٹوں بیٹھ کر دیکھتی رہتی ہوں۔ نہ دل بھرتا ہے اور نہ ہی تھکتی ہوں (بقول امی) جہیز سجا کر بیٹھی ہوئی ہے (ہاہاہا)۔

''پیارے نبی کی پیاری باتیں۔'' اور حمد و نعت پرفیکٹ اور شاعری تو ہماری روح کی غذا ہے۔ اس کے بعد ''شہرزاد'' اپنے اختتام کی طرف رواں دواں ہے۔ مریم عزیز کا ''مکمل ناول'' وہ اک شخص۔ سب سے پہلے تو ناموں کا انتخاب بہت زبردست۔ یہ والدین ہی ہوتے ہیں جو اولاد میں فرق پیدا کرتے ہیں۔ ''افسانے'' سارے ہی زبردست تھے۔ ''سنپولن'' حقیقت کے بہت قریب لگا یہ افسانہ اور میں نے خود اپنے سامنے یہ ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ ''خط آپ کے'' میرا فیورٹ سب نے ساگ پر خوب تبصرہ کیا۔ میرے خیال سے ساگ پر پورا ناول ہونا چاہیے تھا۔

آپی ہماری تو فصلوں میں بھی سرسوں کا ساگ اور شلغم لگائے جاتے ہیں۔ ''دستک'' شہر یار منور اور سونیا حسین سے مل کر اچھا لگا۔ ''بندھن'' میں اگر تصویر بھی ساتھ ہوتی تو کیا بات تھی۔

اس کے علاوہ آخر میں ایک بات پوچھنی تھی۔ اکثر لوگوں کو کہتے سنا ہے کہ جب انسان پیدا ہوتا ہے تو اللہ نے پہلے سے ہی اس کی قسمت میں اچھا برا لکھ دیا ہوتا ہے۔ اور کچھ کہتے ہیں کہ انسان اپنی قسمت خود بناتا ہے۔ پلیز تھوڑا سا ضرور اس کے بارے میں بتا دیجیے گا۔ اب اجازت۔

پیاری اقصیٰ! اچھی، بری تقدیر پر ایمان لانا ایمان کا حصہ ہے۔ انسان کی پیدائش سے پہلے اس کی تقدیر لکھ دی جاتی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کوشش نہ کی جائے۔ ہم کو تقدیر کا علم نہیں ہے۔ ہمیں نہیں پتا کہ ہماری تقدیر میں کیا لکھا گیا ہے۔ ہاں ہمیں کوشش کرنے کا حکم ہے۔ عمل کرنے کا حکم ہے، ان تمام احکامات پر جن کا اللہ نے حکم دیا اور جو دین اور دنیا دونوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

واہ بھئی شعاع کو آپ کی امی جہیز کہتی ہیں کسی حد تک یہ بات درست ہی ہے۔ اچھی تربیت سے بڑھ کر جہیز کیا ہوسکتا ہے اور شعاع بہت حد تک اپنی قارئین کی تربیت ہی تو کرتا ہے۔

فرحانہ مہناز گوجرہ سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

سمیرا حمید کا طواف عشق پڑھنے کے بعد قلم رکا نہیں۔ باقی آئندہ دیکھ کر سوچا، سب سے آخر میں پڑھوں گی تو جناب سارا ڈائجسٹ پڑھ لیا اور آج طواف عشق پڑھا تو ایسا لگ رہا ہے کہ ایک مقدس نور کا ہالہ میرے وجود میں اترا ہے۔

سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیسے طواف عشق کی تعریف کروں۔

پیاری فرحانہ! ایک مصنف کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ اس نے جس مقصد اور پیغام کے لیے کہانی لکھی ہے۔ وہ قارئین تک پہنچ جائے اور ان کے دلوں کو چھولے۔ آپ نے سمیرا حمید کی کہانی پڑھ کر خود کو اللہ تعالیٰ کی محبت کے حصار میں محسوس کیا۔ یہ سمیرا حمید کی کامیابی ہے۔

آپ کے بچوں کی کامیابی کے لیے دعاگو ہیں۔

ثنا شارزاق کا خط ہے۔ یہ شہر کا نام لکھنا بھول گئی ہیں

میری بڑی آپی کی شادی بخیر وخوبی سے انجام پاچکی ہے۔ 22 دسمبر کو یہ فریضہ سرانجام دیا گیا۔ وہ مجھ سے تین سال بڑی ہے۔ میری بہترین سہیلی اور ہم راز بھی۔

سمیرا حمید کی ایک اور بہترین تحریر طواف عشق، کمال کردیا سمیرا جی۔ پوری قسط آنکھوں میں آنسو لیے پڑھی۔ دوسری قسط کا بے صبری سے انتظار ہے۔

افسانے بہترین مگر یار دلدار میں اس بار کچھ کمی تھی باقی سلسلے۔ بھی اچھے تھے۔

آخر میں اپنی دونوں تحریروں کے حوالے سے

پوچھنا چاہوں گی۔

پیاری حنا شاہا! بہن کی شادی کی مبارک باد۔ اللہ تعالیٰ آپ کی آپی کو اپنے گھر میں خوش رکھے۔ آمین۔

سمیرا حمید اور دیگر مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔ آپ کی کہانیاں ابھی پڑھی نہیں گئیں۔

امینہ مہر نے جڑانوالہ سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

خط شائع نہیں ہوا۔ دل کے ارمان آنسوؤں میں بہہ گئے۔ ''شام کی حویلی میں'' کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔

''شہر تمنا'' میرے خیال میں ایک اچھا اضافہ ثابت ہوگا۔ ''یار دل دار'' ہمیشہ کی طرح مزے دار تھا۔ ''سنپولن'' اف میرے خدایا ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں؟

''چپ سہیلی'' نے میدان مار لیا۔ ''وہ ایک شخص'' بہت لمبی تھی کہانی پر ٹھیک تھی۔ مطلب اچھی تھی۔

دستک بس آہی گئی سمجھ (مطلب سمجھ نہیں آئی)

''میری زندگی ہے تو'' سوری لیکن بے حد بوگس کہانی تھی۔ حقیقت سے کوسوں دور۔ علم سے مکمل اچھا افسانہ تھا۔

میں رات کے 10:45 پر آپ کو خط لکھ رہی ہوں، ماما سوئی ہوئی ہیں کسی بھی پل اٹھ سکتی ہیں ہے اور مجھے رسالے کھولے دیکھ کر لال پیلی ہو جائیں گی۔

لیں جی ماما جاگ گئیں۔ اے لو بتی گل

پیاری امینہ! آپ یقین کریں کہ ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کے دل کے ارمان آنسوؤں میں بہہ گئے لیکن کیا کریں۔ محدود صفحات میں سارے خط شامل نہیں ہو سکتے۔ دعا کریں کہ پچھلے دور کی طرح ڈالر سو روپے کا ہو جائے تو پرچے کے صفحات میں اضافہ ہو جائے گا۔

پونے گیارہ بجے آپ لائٹ بند کر کے سو جاتی ہیں۔ بہت اچھی عادت ہے۔ رات جلدی سونا اور صبح جلدی اٹھنا۔ کراچی میں تو رات 2 بجے تک دن نکلا ہوتا ہے۔

آسیہ اصغر اور زینب اشرف نے چوٹ دھیراں ضلع منڈی بہاؤالدین سے محفل کو رونق بخشی ہے، لکھتی ہیں۔

ہم دونوں دوستیں ہیں اور 9th کلاس میں پڑھتی ہیں۔ شعاع کے ساتھ ہمارا ساتھ تین سال پرانا ہے۔ جس کہانی نے ہمیں لکھنے پر مجبور کیا، وہ ہے بن یا کبھی فرح بخاری پلیز اس طرح کا کوئی اور منفرد سا ناول لکھیں نا۔ اس بار افسانوں میں ''یار دل دار'' اور آئینہ دل دھل گیا اور باقی سب افسانے بھی اچھے تھے۔

آسیہ! اور زینب! آپ کے گاؤں سے یہ پہلا خط ہے آپ کا خط دیکھ کر ہمیں بہت خوشی ہوئی ہے کہ آپ کے گاؤں میں لڑکیوں کو تعلیم کی سہولت حاصل ہے۔

بہت اچھا خط لکھا ہے آپ نے، لکھائی بھی بہت اچھی ہے۔ آپ کو خط لکھنے کا طریقہ بتانے کی ضرورت نہیں، آئندہ بھی اسی طرح لکھیے گا۔

حمنیٰ اقبال منڈی فیض آباد سے لکھتی ہیں

منڈی فیض آباد شہر تو نہیں چھوٹا سا قصبہ ہے ہمیں شعاع اور خواتین دیر سے ملتے ہیں۔ 15 تاریخ تک اس لیے ہم جلدی پڑھ کر کچھ لکھ نہیں سکتے۔ میری سب سے پیاری دوست فوزیہ ہے۔ پلیز میری طرف سے اسے کہیں کہ پریشان نہ ہو، سب اچھا اچھا ہوگا۔

پیاری حمنیٰ آپ نے ہماری محفل میں شرکت کی ہمیں بہت اچھا لگا۔ آپ کی دوست فوزیہ کو بھی تسلی دے دیتے ہیں۔ فوزیہ! ان شاء اللہ سب — ٹھیک ہو جائے گا پریشان نہ ہو۔ لیکن پیاری بہن یہ محفل پرچے کے بارے میں آپ کی پسند ناپسند جاننے کے لیے سجائی گئی ہے۔ آپ نے پرچے کے بارے میں تو کچھ لکھا ہی نہیں۔

مسرت الطاف احمد نے کراچی سے لکھا ہے

لگاتار چار ماہ کی غیر حاضری کے بعد اب جا کر شامل محفل ہوں۔ لیکن اس دوران بھی شعاع سے رشتہ ویسے ہی جڑا رہا اس دوران میری سسٹر نداد قار اپنے ہزبینڈ کے ساتھ امریکہ سیٹل ہو گئی اس کے جانے کے بعد گھر بہت ہی خالی خالی سا لگنے لگا کیونکہ شادی کے بعد سے ہی وہ ہماری طرف ہی رہنے لگی تھی اس لیے زیادہ سے زیادہ وقت امی کے ساتھ گزارنا۔ ان کی دلجوئی کرنا اور گھر کو بھی دیکھنا، صبح صبح جاب پر جانا پھر اپنے بھانجے محمد راحیل کو پڑھانا جو کہ سب سے مشکل ٹاسک ہے۔

https://reading.caretofun.net

سلسلہ وار ناولز میں نعیمہ ناز کے ناول کی پہلی قسط قابل تعریف تھی سارے ہی کردار زندگی کی اس دوڑ میں ایک دوسرے سے سبقت لینا چاہتے ہیں۔ شامیر کا سلجھا ہوا کردار بہت پسند آیا اس کی طبیعت میں ایک ٹھہراؤ سا تھا بے نیاز اور تجسس سے بھرپور کردار تھا۔ نائلہ کی ہٹ دھرمی اور خودسری کی سب سے بڑی وجہ خود سرمد ہے۔ سرمد جیسے مرد اپنی ڈھیلی طبیعت کی وجہ سے اپنے گھر کے محافظ نہیں بن سکتے ہیں۔ ''شہرزاد'' کی قسط دھماکے دار تھی۔ ''طواف عشق'' آؤٹ اسٹینڈنگ تحریر تھی، موضوع کافی جان دار اور متاثر کن تھا اسٹوری کافی یونیک اور دلچسپی سے بھرپور رہی۔ ''وہ ایک شخص'' اسٹوری قابل تعریف تھی۔ ''میری زندگی ہے تو'' تحریر مزاح سے بھرپور تھی ہر کردار پسند آیا تھوڑا الجھی سا بھی لگا اسٹوری میں لیکن پڑھنے میں مزہ آیا۔

افسانوں میں مائی موسٹ فیورٹ افسانہ ''یار دل دار'' زبردست رہا۔ ''سنپولن'' بھی پڑھ کر اچھا لگا اور باقی کے سلسلے بھی اچھے۔

پیاری مسرت! اتنی مصروف روٹین کے باوجود آپ ہمارے لیے وقت نکالتی ہیں۔ بہت ممنون ہیں۔ خط بہت اچھا اور تبصرہ جامع ہے ہمیشہ کی طرح

حرا سجاد نے میاں چنوں سے شرکت کی ہے۔ لکھتی ہیں

میں ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتی ہوں۔ ہمارے ہاں پوسٹ کرنے کا بہت مسئلہ ہے۔ خط لکھنے کی سب سے اہم وجہ ہے۔ افشین نعیم کا یار دلدار۔ یہ سیریز بہت سپرہٹ ہے۔ اس دفعہ مجھے شاہین بٹ کا ناولٹ بہت انٹرسٹنگ لگا ہے۔ پڑھ کے بہت مزہ آیا۔ لیکن اینڈ بالکل پسند نہیں آیا۔ آئینہ خانے میں میرا موسٹ فیورٹ سلسلہ ہے (تنقید) میرا احمید کا فون نمبر دے دیں۔ علم سے عمل تک (افسانہ) ثمینہ فرحان آپ کی سوچ کو سلام۔ ایمل رضا اور سائرہ رضا، آسیہ رزاقی کہاں غائب ہیں۔ میرا اصل نام ثمرین ہے لیکن میں اپنی بھانجی جو کہ گول مٹول گول گپا مجھے بہت پسند ہے اس کے نام سے خط لکھتی ہوں۔ شہرزاد کو تو بھول ہی گئی۔ کرپٹ سیاست، کرپٹ سیاست دان اور عفت سحر طاہر جی آپ کا انٹرویو پڑھ کے تو آپ سے اور محبت ہوگئی ہے۔ ہم بھی کشمیری بٹ ہیں۔ میرا احمید کا طواف عشق۔ جنت، آمنہ، عزیزہ بہت ہی جان دار اسٹوری ہے۔ ہر بات میں مجھے میرا احمید یاد رہتی ہیں کہ ''جو زمین سے نہیں ہوتا وہ آسمان سے ہوتا ہے۔

پیاری حرا! میرا احمید کا نمبر ہم ان کی اجازت کے بغیر آپ کو نہیں دے سکتے۔ آپ آئندہ خط لکھیں تو اپنا فون نمبر لکھ دیں۔ ہم میرا کو آپ کا نمبر دے دیں گے۔ وہ چاہیں گی تو بات کرلیں گی۔

سب سیاست دان کرپٹ نہیں ہوتے ہیں۔ جس طرح ہر ادارے، ہر شعبہ میں اچھے برے لوگ ہوتے ہیں اسی طرح سیاست دان بھی اچھے برے ہوتے ہیں۔ مت بھولیں پاکستان کو ایٹم بم کا تحفہ دو سیاست دانوں نے ہی دیا ہے۔ جس نے ہمارے ملک کے دفاع کو ناقابل تسخیر بنادیا۔

اقبال بانو...... تلمبہ میاں چنوں سے
شریک محفل ہیں، لکھا ہے

شعاع کی تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ ہی نہیں، اس کا معیار بلند اور بہتر سے بہتر ہو رہا ہے اب تو رائٹرز کے ساتھ ساتھ شعاع کے پڑھنے والوں سے بھی ایک پیارا سا رشتہ قائم ہوگیا ہے۔

میری دوست میری غمگسار میری پھوپھو، میری سہیلی مجھ سے بچھڑ گئیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جن سے میرا 22 سال کا ساتھ تھا جنہوں نے ساس نہیں ماں بن کر میرے ساتھ وقت گزارا۔ انہوں نے مجھے پڑھایا لکھایا دس جماعت تک علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے۔ میں ٹیوشن سینٹر جاتی اور وہ گھر میں میرے بچوں کو سنبھالتی تھیں۔ 25 سال انہوں نے گورنمنٹ اسکول میں جاب کی۔ بہت رکھ رکھاؤ والی تھیں۔ بہت محبت کرنے والی۔ ہم دونوں مل کر شعاع پڑھتی تھیں کوئی ہمسائی ہمارے گھر آتی تو ہنستی تھی کہ دیکھو دونوں رسالہ پڑھ رہی ہیں۔ ماشاء اللہ سے ان کی عمر 78 سال تھی مگر پڑھنے کا جنون ویسا ہی تھا۔

پیاری اقبال! انسان دنیا سے چلا جاتا ہے اس کی نیکیاں، اچھائیاں یاد رہتی ہیں اللہ تعالیٰ آپ کی پھوپھو (ساس) کی مغفرت کرے۔ آمین۔ قارئین سے بھی

درخواست ہے کہ حمیدہ بی بی کے لیے دعائے مغفرت فرمائیں۔

فضہ سونیا بخاری، عاصمہ عباسی بخاری شالامار ٹاؤن سے شریک محفل ہیں۔ لکھا ہے

اس ماہ ''شعاع'' آپ کی کاوشوں کا منہ بولتا ثبوت لگا۔ ''پہلی شعاع'' سے ہم دونوں بہنیں متفق ہیں کہ اگر اپنے ہی ملک میں دہشت گرد کا شبہ لگ جائے تو صد افسوس ہے۔

حمد اور نعت (رحمان خاور) کے الفاظ دل میں اتر رہے تھے، شاہین آپا نے سونیا حسین سے ملاقات کرا کے ہماری خواہش تو بن کہے ہی پوری کردی۔ افسانوں میں سب سے پہلے شازیہ الطاف ہاشمی کا ''دستک'' پڑھا۔ واقعی بیٹیوں کو محدود بھی نہ کریں اور نہ بے جا آزادی دیں۔ افشین نعیم ''یار دل دار'' کے ساتھ ہم سب کی فیورٹ بنی ہوئی ہیں۔ حمیرا نوشین کا ''سنپولن'' بہترین رہا۔ ''مہک'' کو اس کے کیے کی خوب سزا ملی۔ برائی کرنے والا کبھی سکون نہیں پاتا۔ ''وہ اک شخص'' مریم عزیز کو کتنا ''مس'' کیا۔ بہت بہت شکریہ مریم عزیز اور ''شہر تمنا'' نعیمہ ناز آپ کا قلم واقعی کمال ہے۔

ہم دونوں بہنوں کی مارچ میں سالگرہ ہوتی ہے۔ ہمیں مہناز یوسف کا تبصرہ اور بلوچ سسٹرز کا خط کا انداز بھی اچھا لگتا ہے۔ آپی مجھے تو ساگ پراٹھے، گرین ٹی کے ساتھ بہت پسند ہے۔ ساگ میں نے ساری سردیوں میں ''رج'' کے کھایا اور بڑا مزہ آیا (ہاہاہا) میرے سارے اسٹوڈنٹس ساگ ضرور بھجواتے ہیں۔

فضہ اور عاصمہ! آپ دونوں کو سالگرہ کی مبارک باد اور دعائیں۔

ساگ چھوٹا سا افسانہ قائین کو اتنا متاثر کرے گا ہمیں اندازہ نہ تھا۔ دو ماہ گزرنے کے باوجود خطوں میں اس کا ذکر ہے۔ بہرحال یہ تو پتا چل گیا کہ ہمارے ہاں لوگ کھانے پینے میں کتنی دلچسپی رکھتے ہیں۔

عمارہ شریف نے اوچ شریف سے لکھا ہے

اس ماہ کا شعاع ہر ماہ کے شعاع کی طرح اچھا تھا۔ پیارے نبی کی پیاری باتیں بہت سبق آموز تھیں۔ بندھن میں درثمن بلال کو پڑھا، یہ ایک ایسی رائٹر ہیں جنہیں میں نہیں جانتی (صاف بات) دستک میں سونیا اور شہریار کو پڑھ کر اچھا لگا۔ خط آپ کے میرا پسندیدہ سلسلہ ہے۔ لائبہ طارق کے خط نے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دی۔ ناتا جوڑا اچھا سلسلہ ہے۔ شہر تمنا بھی نہیں پڑھا۔ یار دل دار بہترین لیکن اس ماہ ادھوری لگی۔ سنپولن پڑھ کر حیرانی ہوئی۔ ''چپ سکھی'' کہانی سمجھ میں نہ آئی۔ دستک اچھی کہانی تھی۔ طواف عشق اچھی کہانی ہے اگلی قسط کا انتظار ہے۔ شہرزاد کی قسط ابھی باقی ہے۔ اور کہانیاں ابھی پڑھنی ہیں۔ خوب صورت بنیے اچھا سلسلہ ہے۔ بال لمبے کرنے کا ٹوٹکا بتائیں جس سے جلدی سے بال لمبے ہو جائیں۔ موسم کے پکوان۔ موسم جو بھی ہو تر کبیں گوشت کی ہوتی ہیں آئینہ خانے میں بھی اچھا سلسلہ ہے۔ تاریخ کے جھروکے سے پڑھ کر اچھا لگا۔ خط شامل کر دینا ایک بچی دل سے دعا دے گی۔

پیاری عمارہ! آپ کی کہانیاں ابھی پڑھی نہیں گئیں۔ قابل اشاعت ہوئیں تو ضرور شائع ہوں گی۔ اشعار آپ کو مشکل لگتے ہیں۔ ہم خیال رکھیں گے کہ آسان شعر شامل کریں تاکہ آپ سمجھ سکیں۔

لیٹ ملنے کے باوجود بچی کا خط شامل کرلیا ہے۔ اب بچی دعا دینا نہ بھولے۔

کائنات چوہدری نے سیالکوٹ سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

شعاع پڑھتے ابھی صرف کچھ مہینے ہی ہوئے مگر لگتا ہے کہ جیسے میں آپ سب کو صدیوں سے جانتی ہوں جیسے کوئی پرانا رشتہ ہو۔ ہم چاہے ایک دوسرے کو نہ جانتے ہوں نہ پہچانتے ہوں مگر ایک دوسرے کے درد کو محسوس کرسکتے ہیں۔ یہ ہوتا ہے ایک بہن کا کہیں دور دیس میں بیٹھی دوسری بہن کا شعاع کے ذریعے جڑا ہوا رشتہ تو پھر سوچنا کیسا۔ یہ بڑھا دیا میں نے شعاع۔ اس کی قارئین اور مصنفین کی طرف دوستی کا پہلا ہاتھ۔

پیاری کائنات! آپ نے ہماری طرف دوستی اور محبت کا ہاتھ بڑھایا ہے۔ ہم نے اسے نہایت گرم جوشی سے تھام لیا ہے۔ آپ کو شعاع کی محفل میں خوش آمدید

کہتے ہیں۔ ان شاء اللہ یہاں آپ کو دوستی اور محبت کے سچے رشتے ملیں گے۔

آئندہ ہمیں خط لکھیں تو پرچے کے بارے میں اپنی رائے ضرور لکھیے گا۔

سیما ملک......کراچی

ٹائٹل گرل انعم بہت پیاری لگ رہی تھیں۔ ناول میں شہرزاد کی آخری قسط کا بہت ہی زیادہ انتظار ہے۔ شہر تمنا کی پہلی قسط تھی، اچھی لگی۔ ڈائجسٹ کی جان تو یار دلدار ہے (زبردست)۔ مکمل ناول میں طواف عشق کی رائٹر کا نام یہ ہماری سمیرا حمید ہیں یا کوئی اور سمیرا ہیں۔ کہانی اچھی تھی بہت۔ پورا رسالہ بہت بہت اچھا تھا۔

پیاری سیما! طواف عشق آپ کی اور ہماری سمیرا حمید نے لکھی تھی اور وہی یہ کہانی لکھ سکتی ہیں۔ سمیرا احمد نام کی تو کوئی رائٹر ہی نہیں ہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

سحر سحری نے مغل پورہ سے لکھا ہے

شعاع کی کہانیاں واقعی پہلی جیسی نہیں رہی ہیں۔ شعاع، خواتین، کرن ہی خواب نگر ہوا کرتے تھے جہاں، بادل، ساون، تتلیاں پھول محبت کا ذکر ہوا کرتا تھا جنہیں پڑھ کر بندہ ایک الگ ہی جہاں میں پہنچ جاتا تھا پر آج کل کی رائٹرز بالکل بورنگ لکھ رہی ہیں۔ بندہ آگے پریشان ہے ان کی تلخ تحریریں پڑھ کر مزید دماغ خراب ہوجاتا ہے۔ یہ تلخیاں، نفرتیں، سازشیں، خودغرضی لالچ ہمارے اردگرد بھی بہت ہے۔ مجھے تو اس طرح کی کہانیاں بالکل پسند نہیں جس طرح کی مشکل اور بھاری بھرکم آج کل لکھ رہی ہیں۔

پیاری سحر! ہم آپ کی شکایت مصنفین تک پہنچا رہے ہیں لیکن اتنا ضرور کہیں گے کہ شعاع میں زندگی کی کہانیاں شائع ہوتی ہیں۔ محبتوں کی، پھولوں کی، خوشبوؤں کی بھی اور زندگی کی تلخیوں کی بھی

حفصہ اسلم نیازی، دریا خان بھکر سے لکھتی ہیں

یقین جانیں میں کیا پاکستان کی ساری لڑکیاں آپ کے ماہناموں کی دیوانیاں ہیں۔ یہ سب صرف آپ لوگوں کی محنت کا نتیجہ ہے۔ شعاع پڑھنا شروع کیے محض ایک ڈیڑھ سال ہوا ہے مگر ایسی کہانیاں پڑھیں جو یادگار ہونے کے ساتھ ساتھ سبق آموز بھی تھیں۔ اگر میرا خط شائع ہوگیا تو خوشی سے پاگل ہوجاؤں گی۔ اب آپ یہ نہ سوچیے گا کہ لڑکی کو پاگل نہیں کرنا۔ ہمارے شہر میں ایشیا کی سب سے بڑی لکڑی منڈی ہے۔ ہمارے شہر کی سب سے بڑی بات کہ یہاں شعاع کم کو ہی آجاتا ہے (اوہ لیس) خط آپ کے پڑھ کے بہت مزہ آتا ہے۔ تاریخ کے جھروکے، میرے نانا کو بہت پسند ہے۔ ڈائجسٹ لا کے دیتے ہیں تو سب سے پہلے خود پڑھتے ہیں۔ بندھن پڑھ کے مزہ آیا۔ فاطمہ نجیب کی فیملی کھانے کے معاملے میں ہماری فیملی جیسی ہے۔ آخر میں ایک سوال نمرہ احمد انٹرویو کیوں نہیں دیتیں۔

حفصہ اسلم! ہم نے آپ کا خط شائع تو کردیا ہے۔ لیکن اب آپ کے پاگل ہونے کا خدشہ ہمیں ڈرا رہا ہے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ نمرہ احمد کا انٹرویو ہم ضرور لیں گے تھوڑا انتظار کریں۔

اقراء جلبانی گاؤں دریا خان جلبانی سے لکھتی ہیں

جب ڈائجسٹ پڑھتی تھی تو سوچتی تھی کہ میں بھی کبھی یہاں قاری کی حیثیت سے شامل ہو پاؤں گی۔ ہمت کی، پہلی دفعہ خواتین میں خط بھیجا تھا جو شامل ہوا پھر یہ آپ کا ہی پیار اور اعتماد تھا جو وقتاً فوقتاً شامل ہوتی رہی، یہ واحد ادارہ ہے جہاں ہم کہانیوں کے تبصرے کے علاوہ اپنی باتیں اپنے دکھ سکھ شیئر کرتی ہیں۔ حساس لوگوں کا یہ المیہ ہے کہ ہمیں تھوڑی بات بھی پہاڑ جیسی لگتی ہے ثمینہ اکرم کا عزیز فوت ہوا، میں تین دن سو نہ سکی، اسے قرآن پڑھ کے بخشا ایک اور قاری، بہن کا بھائی فوت ہوا مجھے تب بھی بے سکونی دکھ تھا اس تمہید کا مقصد نہ کچھ جتانا ہے نہ امپریس کرنا آج جب ارشاد رانجھانی کا بے دردی سے قتل ہوا تو نیند حرام ہوگئی۔

دیکھتے ہیں اس سرعام ظلم پر کس کا قلم حرکت میں آتا ہے۔ حق ادا کرتا ہے۔

پیاری اقرا! آپ کبھی بھی یہ نہ سوچیے گا کہ ہم آپ کے ساتھ نہیں یا ہمیں آپ کا احساس نہیں۔ جہاں بھی ظلم و زیادتی ہوتی ہے۔ کسی بے گناہ کا خون بہتا ہے۔ ہمارا دل

خون کے آنسو روتا ہے۔ آپ کا دکھ درد بجا لیکن یہ سوچنا کہ یہ کسی مخصوص علاقے یا قومیت کے ساتھ ہے۔ غلط ہے۔ ابھی حال ہی میں ہونے والا سانحہ ساہیوال اس کی مثال ہے۔ کیسے دو ہنستے بستے گھروں کو برباد کردیا گیا۔ بچوں کے سامنے ان کے والدین کو خون میں نہلا دیا گیا اس المناک سانحہ کے ملزمان بھی سامنے نہیں آئے۔ خرابی کسی مخصوص طبقے یا قومیت کی نہیں ہمارے نظام کی ہے۔ جب تک انصاف نہیں ہوگا۔ اس طرح کے واقعات ہوتے رہیں گے۔

رخ فاطمہ علی نے لکھا ہے

عمران خان نے بازار لگانے پر پابندی لگادی۔ اس لیے ابھی اس ماہ کا رسالہ نہیں لاسکی۔ کیونکہ ہمارے علاقے کے بدھ بازار سے میں رسالہ خریدتی تھی۔ یہ کیا آپ نے سائرہ رضا کا انٹرویو دے دیا لیکن تصویر۔؟ اور

ایک اور بات پوچھنی تھی کہ میں نے جو افسانے لکھے ہیں، آپ نے پڑھے ہیں کیا؟ میں نے ایک اور افسانہ لکھا ہے مجھے یقین ہے آپ کو پسند آئے گا کیا بھجواؤں؟

پیاری رخ! یہ پابندی ثاقب نثار نے لگائی تھی جس پر عمران خان نے عمل درآمد کیا ہے۔ ہمیں احساس ہے کہ ہماری بہت سی قارئین کو پرچے کے حصول میں دشواری کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے کیونکہ شہر سے بک اسٹالز بھی ہٹا دیے گئے ہیں۔ جلد کوئی ایسا طریقہ نکالیں گے کہ آپ کو پرچا باآسانی مل سکے۔

سوبارہ سے گل نے لکھا ہے

میں نویں میں تھی جب پہلی دفعہ رسالے میں ایک کہانی پڑھی۔ باقاعدہ شعاع اور خواتین میں نے 2008 کے بعد پڑھنا شروع کیا۔ اور اب پچھلے پانچ سالوں سے صرف شعاع منگواتی ہوں کیونکہ ایک ہی رسالہ افورڈ کرسکتی ہوں۔ کبھی کبھی خواتین کے پرانے رسالے لے لیتی ہوں۔ شعاع سے میں نے بہت سی اچھی باتیں سیکھیں۔ بہت سی کہانیاں سبق آموز ہوتی ہیں، بہت سی کہانیاں مجھے ہنساتی ہیں اور بہت سی رلاتی ہیں۔ میری بہن کہتی ہے کہ تم ناول کو سر پر سوار کرلیتی ہوں یہ کون سی سچی کہانی تھی۔

"شام کی حویلی" رخسانہ جی کا یہ ناول بھی بہت اچھا ہوگا۔ نمرہ جی کے علاوہ میں سمیرا حمید کی بہت بڑی فین ہوں ان کی کہانی یارم اور راہ نور بہت سبق آموز تحریریں تھیں۔ آپ سے پوچھنا تھا باجی کہ میں نمرہ احمد اور سمیرا کو کارڈ یا خط لکھنا چاہتی ہوں تو آپ کے پتے پر بھیجوں تو کیا آپ ان تک پہنچادیں گی؟

پیاری گل! آپ نے شعاع کی محفل میں شرکت کی ہمیں بے حد خوشی ہوئی۔ آپ شعاع کے دوسرے سلسلوں کے لیے بھی لکھیں۔

سمیرا حمید اور نمرہ احمد کے لیے کارڈ ہمیں بھجوادیں ہم ان تک پہنچادیں گے۔

ماہ نور خان بابر لکھتی ہیں

آپی میں سترہ سال کی ہوں اور پری میڈیکل اسٹوڈنٹ ہوں۔ پلیز میری اسٹوری شائع کردیں، کیوں کہ یہ میری خالہ کی زندگی کی کہانی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ لوگ جانیں کہ میرے انکل کے ساتھ کیا ہوا اور کیسے انکل کے جانے کے بعد خالہ سمیت ہم سب کی زندگیاں بدل گئیں۔

پیاری ماہ نور! آپ نے ہمیں ٹائی بھیجی ہے اس کے لیے شکریہ۔ بہت میٹھی اور مزے دار تھی۔

آپ نے جو کہانی لکھی ہے۔ وہ نامکمل ہے۔ ابھی آپ کم عمر ہیں۔ فی الحال اپنی پڑھائی پر توجہ دیں۔ تعلیم مکمل ہونے کے بعد کہانیاں لکھیے گا۔

کراچی سے تسنیم کوثر نے لکھا ہے

سب سے پہلے پہلی شعاع سے ابتدا کی آپ کی طرز تحریر دل کو لگتی ہے۔ بہت جامع اور بھرپور انداز بیاں ہے آپ کا۔ فیصہ ناز کا ناول شہر تمنا اچھا لگا آگے چل کر شاید اور بہتر ہوجائے گا اور مریم عزیز کا ناول وہ اک شخص بہت خوب رہا ویسے مریم عزیز تو ہماری فیورٹ رائٹر ہیں۔ مگر اس ناول میں ثمرہ کے کردار کو نہایت انتہا پسند دکھایا ہے ایک چھوٹی سی بات کہ اسپتال میں ثمرہ تیزاب کسی طرح لے کر گئی۔ کیونکہ وہ تو تھانے سے اسپتال گئی تھی۔

تاریخ کے جھروکوں اور پیارے نبی کی پیاری باتیں تو شعاع کی شان ہیں، باقی تمام سلسلے بھی ٹھیک ٹھاک ہی رہے۔

پیاری تسنیم! آپ کا تبصرہ ہمیشہ کی طرح جامع اور خوب صورت ہے۔ بہت شکریہ۔ مصنفین تک آپ کی تعریف وتنقید پہنچائی جارہی ہے۔

زینب نور نے جہانیاں سے شرکت کی۔ لکھتی ہیں
بھئی سنا ہے کہ آپ کراچی والوں کو موسم سرما بس دور دور سے ہی آنکھیں دکھاتا ہے۔ سردیوں اور سردیوں کی سوغات کے مزے لینے ہوں تو آپ بھی جہانیاں (ملتان) کا چکر لگایئے اور آج تو اولے پڑنے کے بعد ایسی ٹھنڈ ہوگئی ہے کہ لفظ بھی منجمد ہوتے محسوس ہو رہے ہیں۔

ہم نے تو ابھی تک فروری کے شمارے کی جھلک تک بھی نہیں دیکھی اور شاید اب کئی ماہ دیکھنا نصیب نہ ہو۔ وہ کیا ہے ناں...... ہم نے دو رسالے تکیے کے غلاف میں ڈال کر اس چارپائی پر تکیہ رکھ دیا جہاں سے کوئی بھی نہیں اٹھاتا تھا۔ (کیونکہ وہ چارپائی کونے میں پڑی ہوتی ہے) شومئی قسمت ابو اسی چارپائی پر بیٹھے۔ کچھ لکھنے لگے اور لوجی ورق کے نیچے رکھنے کے لیے ابو نے وہی تکیہ اٹھالیا۔ پھر کیا تھا سب سے پہلے امی کی کلاس لگی کہ وہ ہمیں روکتی کیوں نہیں ہیں؟ (رسالوں کے لیے ہم ان سے کتنی ڈانٹ کھاتے ہیں...... کاش ابو ہم سے پوچھتے)

پھر ابو نے ملتان والی آپی کو کال کی اور سختی سے رسالے لانے سے منع کردیا۔ آپی نے باقاعدہ اعلان کردیا ہے کہ ان کی تو سات ضرب سات توبہ جو وہ دوبارہ ہمیں رسالے لادیں۔

جنوری کے شمارے میں اپنی پہلی کاوش "حمد" دیکھ کر بے طرح خوشی ہوئی۔ بھائی نے خوب تعریف کی اور انعام میں سو روپے بھی دیے۔ امی کو بھی اچھی لگی اور حیران ہوئیں کہ یہ واقعی زینب نے لکھی ہے......؟ بس ایک اعتراض تھا ان کو بھی کہ رسالے میں کیوں بھیجی شائع ہونے کے لیے کسی اسلامی کتاب میں بھیج دیتی (اے لوجی)

پیاری زینب! آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ تکیوں میں چھپے ہوئے آپ کے رسالے پکڑے گئے اور آئندہ کے لیے رسالہ ملنے کے امکانات بھی مخدوش ہوگئے۔ لیکن صحیح معنوں میں افسوس اور دکھ آپ کے والد صاحب کے رویے پر ہوا انہیں کم از کم ایک بار رسالہ پڑھ کر تو دیکھنا چاہیے۔ جو کچھ رسالوں میں ہوتا ہے اس سے بڑھ کر ٹی وی پر دکھایا جا رہا ہے بلکہ اب تو سب کے ہاتھوں میں فون تھما دیا گیا ہے، کون سی چیز ہے جو اس میں دستیاب نہیں ہے۔

کراچی میں اولے تو نہیں پڑے لیکن اس بار موسم سرما نے ہفتہ بھر قیام ضرور کیا ہے۔ ہم اسی میں بہت خوش ہیں۔

حرا ملک نے وہاڑی سے لکھا ہے
مجھے یقیناً آپ بھول گئی ہوں گی۔ تقریباً ڈیڑھ سال کے وقفے کے بعد آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ اور آپ سے ایک بات شیئر کروں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میں ایم ایس سی کے پہلے دو سمسٹرز میں فرسٹ پوزیشن ہولڈر رہی ہوں۔

باقی اس ماہ کا شمارہ پڑھا۔ بہت مزہ آیا۔ شام کی حویلی میں بہت ہی زبردست ناول ہے اور باقی کا تمام رسالہ بھی اے ون تھا۔

پیاری حرا! بھولتے تو ہم کسی کو نہیں ہیں۔ ہمیں اپنی باقاعدہ لکھنے والی قارئین کی کمی بہت محسوس ہوتی ہے لیکن اظہار نہیں کرپاتے۔

شان دار کامیابی پر دلی مبارکباد۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مزید کامیابیوں سے نوازے آمین۔

حمیرا زبیری اعوان نے جھنگ صدر سے لکھا ہے
1998 سے پڑھنا شروع کیا۔ پابندی تو نہیں تھی۔ کیونکہ ہمارا گھرانہ علمی وادبی گھرانہ تھا میرے تایا جی سلیم زبیری کے گھر دور دور سے بچے پڑھنے آتے تھے۔ ہماری تربیت بھی ان ہی کے گھر سے ہوئی ہے۔

کیونکہ میرے والد صاحب بلال زبیری ہمارے بچپن میں ہی وفات پا گئے تھے۔ میرے والد نے "تاریخ جھنگ" لکھی اور فرقے مسالک۔ فاران سے کربلا تک۔ تذکرہ اولیائے جھنگ لکھی۔ جھنگ کی لوک کہانیاں۔ سلطان العارفین ہیر رانجھا۔ وارث شاہ پر لکھا۔ نواب وزیر خان نواب سعد اللہ خان اور بے شمار کتابیں لکھیں۔

20 فروری 1976 میری تاریخ پیدائش ہے۔ اور میں نے بہت رسالوں اور اخباروں میں لکھا ہے اسکول کالج کے میگزین میں باقاعدہ لکھا کرتی تھی۔ آپ کے سلسلے تمام اچھے ہیں جب بھی پڑھتی ہوں کئی کئی دن یہی سوچتی رہتی ہوں، میں بھی لکھوں۔ خط لکھنے کی وجہ دعا فاطمہ قریشی اور لائبہ طارق ہیں کہ میں سوچتی رہ گئی اور معصوم بچیوں نے لکھ بھی لیا اور آپ کی بہت مہربانی کہ فوری شائع کردیا۔ مجھے

سب سے پہلے پیارے نبی کی باتیں اور تمام چھوٹے سلسلے اچھے لگتے ہیں اور شامل بھی ہونا چاہتی ہوں۔ اتنے بھاگتے دوڑتے مصروف وقت میں آپ ہر اک لفظ پر توجہ دیتے ہیں۔ بڑے حوصلے کی بات ہے۔ اس وقت کی تمام لکھاری بہنیں بڑا اچھا لکھ رہی ہیں۔ لیکن میرے دور کی بہنوں کی تو کیا ہی بات تھی۔ ایک رسالے کو کئی کئی بار پڑھتی تھی۔

پیاری حمیرا! بیس سال سے شعاع پڑھ رہی ہیں۔ اتنے ڈھیر سارے پرچوں میں لکھا تو شعاع میں کیوں نہیں؟ آپ شعاع کے سلسلوں میں ضرور شرکت کریں ہمیں خوشی ہوگی۔

ایشال چوہدری نیو مری سے شریک محفل ہیں

شعاع کا سرورق بہت زبردست تھا۔ پھر شہزاد پر پہنچے۔ رائٹر جی نے کمال کر دیا۔ بندھن میں درخمن بلال کو دیکھ کر حیرت آمیز خوشی ہوئی ان کے بارے میں جان کر اچھا لگا۔ پلیز ان سے کوئی سلسلے وار ناول لکھوائیں۔ باقی شعاع زیر مطالعہ ہے اور تبصرہ ادھار کیونکہ ننھے ننھے معصوم ہاتھوں سے خط لکھتے ہیں اور آپ اور آپ کی ردی کی ٹوکری اس ''معصومانہ'' محبت کو رجیکٹ کرنے میں دو منٹ نہیں لگاتی۔

پیاری ایشال! صرف ایک ناول پر تبصرہ؟ آئندہ خط ضرور لکھیں اور دیگر کہانیوں کے بارے میں بھی اپنی رائے سے آگاہ کریں۔ ہم آپ کی ''معصومانہ'' محبت کی قدر ضرور کریں گے ان شاء اللہ۔

فرزانہ رفیق مینگل نے کوئٹہ سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

بچپن سے کہانیاں پڑھنے کا شوق تھا۔ تیسری میں تھی تو عمران سیریز، عمرو عیار، ٹارزن وغیرہ پڑھتی تھی۔ میری منگنی بھی اسی وقت چچا کے بیٹے سے ہوئی جب میں تیسری میں تھی۔ میرے بڑے بھائی کا ایک صندوق تھا جس میں رسالے وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ صندوق پر تالا لگا ہوا تھا۔ ایک بار کسی اور چابی سے تالا کھولنے کی کوشش کی مگر تالا تو نہ کھلا مگر بھائی نے پتا نہیں کیسے جان لیا کہ میں نے تالا کھولنے کی کوشش کی ہے۔ پھر خوب ڈانٹ پڑی مگر ایک فائدہ ہوا کہ اس نے سارے رسالے نکال کر مجھے دیے اور وارننگ دی کہ آئندہ اس کے صندوق کو ہاتھ نہ لگاؤں۔ بس جی مجھے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی۔

بعد میں میرے منگیتر صاحب سے ڈائجسٹ کا چسکا لگ گیا جو آج تک نہیں چھوٹا۔ وہ ٹنڈو جام میں پڑھتے تھے۔ جب بھی گھر آتے، میں چپکے سے ان کے ڈائجسٹ چراتی اور پڑھ کے واپس رکھتی۔ اب میری پانچ بیٹیاں ہیں ماشاء اللہ۔ بڑی بیٹی کی چار دن پہلے منگنی ہوئی ہے۔ آپ سب میری بیٹیوں کے اچھے نصیب کی دعا کیجیے گا۔ بہت سی کہانیوں نے خط لکھنے کو اکسایا مگر آج زرقا سکندر کا ساگ پڑھ کر مجھے لگا کہ یہ ہماری کہانی ہے کیونکہ پچھلے سال سردیوں میں میں نے بھی بہت ساگ پکایا اور بچوں نے احتجاج کیا۔

پلیز میرا خط ضرور شائع کرنا کیونکہ میرے شوہر نے بارش اور سردی میں بازار جا کر مجھے لفافے دلائے۔

پیاری فرزانہ! ساگ ایک چھوٹا سا افسانہ تھا۔ لیکن اس نے ہماری بہت سی پرانی قارئین کو جگا دیا۔ جو عرصہ دراز سے شعاع پڑھتی تھیں لیکن کبھی خط لکھنے کی اپنی رائے کا اظہار کرنے کی زحمت نہیں کی تھی۔

ہمیں بے حد خوشی ہے کہ آپ نے ہمیں خط لکھا۔ تیسری جماعت سے جو شعاع سے محبت کا سلسلہ شروع ہوا وہ آج آپ کی بیٹی کی منگنی تک جاری ہے۔ شعاع کی اس سے بڑھ کر قدر افزائی کیا ہو سکتی ہے۔ آپ کے شوہر کا بھی شکریہ جو بچپن سے آپ کو ڈائجسٹ لا کر دے رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کی بیٹیوں کو ڈھیر ساری خوشیاں عطا فرمائے۔ ان کے نصیب اچھے ہوں، آمین۔

سرورق کی شخصیت

ماڈل .... فریحہ اعجاز
میک اپ .... روز بیوٹی پارلر
فوٹوگرافی .... موسیٰ رضا

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پہ ڈراما، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بہ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

سینما کے آئینے میں

واصفہ سہیل

برانڈ

پی ایس ایل فور کا آغاز ہو چکا۔ کرکٹ کے دیوانوں کو ایک مصروفیت مل گئی لیکن پی ایس ایل فور کا گانا کسی کو پسند نہیں آیا (آپس کی بات ہے ہمیں بھی نہیں)۔ یہ خصوصی نغمہ اس مرتبہ فواد خان نے گایا (بھئی اپنے کام میں لگے رہو، دوسروں کے کام میں مداخلت؟)۔ اس سے پہلے پی ایس ایل کے نغمے علی ظفر نے گائے۔ پی ایس ایل تھری کا گیت تو بہت زیادہ مقبول ہوا (سیٹی بجے گی)۔ بے شک فواد خان کسی زمانے میں گلوکاری بھی کرتے تھے لیکن ان کی گلوکاری اتنی اچھی ہوتی تو وہ اداکاری کی طرف کیوں آتے۔

علی ظفر نے اس بارے میں بتایا کہ سیزن فور میں وہ اپنی مصروفیات کی وجہ سے دستیاب نہیں تھے اور یہ بات منتظمین کو وہ بتا بھی چکے تھے۔

علی ظفر کا کہنا تھا کہ پی ایس ایل اب ایک برانڈ ہے اور انہیں خوشی ہے کہ اس میں انہوں نے بھی اپنا کردار ادا کیا۔ تاہم اب وہ سمجھتے ہیں کہ نئے لوگوں کو بھی سامنے آنا چاہیے (نئے......؟ فواد خان؟)۔

علی ظفر کہتے ہیں کہ پاکستان ان کی پہچان ہے اور پی ایس ایل ایک ایسا برانڈ ہے جس کے ساتھ وہ مستقبل میں منسلک رہنا چاہتے ہیں۔

مدد

پاکستان فلم انڈسٹری میں ایک دور ایسا بھی گزرا ہے جب اردو کے ساتھ ساتھ پنجابی فلمیں بھی فلم بینوں میں مقبول ہوا کرتی تھیں۔ پھر ایک ایسا دور آیا کہ پنجابی فلموں کا کلچر گنڈاسا، کلاشنکوف اور بدمعاشی تک محدود ہو گیا۔

اب بہت عرصے بعد کوئی بڑی پاکستانی فلم پنجابی زبان میں ریلیز ہونے جا رہی ہے۔ بلال لاشاری کی "دی لیجنڈ آف مولا جٹ" کی خاص بات

ایمان علی اداکار عاید علی کی صاحب زادی ہیں۔ ایمان علی اپنے جیون ساتھی کے بارے میں مختلف انٹرویوز میں کہہ چکی ہیں کہ وہ شادی کے لیے ایسے شخص کا انتخاب کریں گی جو امیر چاہے نہ ہو مگر اچھا خیال رکھنے والا ہو۔ (ایمان! یہ تو کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ ایمان علی کا خیال تو ہر غریب رکھ سکتا ہے)۔

غصہ

رواں سال کی ایک فلم ریلیز ہوتے ہی تنازعات کا شکار ہوگئی۔ اس فلم میں اہم کردار ادا کرنے والے شمعون عباسی نے پروڈیوسر ڈائریکٹر پر الزامات کی بوچھاڑ کردی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب مجھے یہ بتایا گیا کہ پروڈیوسر اور ڈائریکٹر نیویارک فلم اکیڈمی سے پڑھ کر آئے ہیں تو میں کام کے لیے تیار ہوگیا۔ (آپ پروڈیوسر اور ڈائریکٹر کی ڈگری دیکھ کر کام کرتے ہیں۔ ہم تو سمجھے اسکرپٹ یا پیسے دیکھ کر؟)۔ لیکن اسکرپٹ سن کر میں نے کہا کہ اس پر تو پہلے ہی ایک مشہور فلم بن چکی ہے۔ (اسی لیے تو وہ بنا رہے تھے)۔ آپ کی کہانی میں کچھ بھی نیا نہیں ہے

یہ ہے کہ فلم کی مرکزی ہیروئن ماہرہ خان کے لیے ٹھیٹ پنجابی بولنا مشکل کام تھا۔ تاہم اپنے دوست حمزہ علی عباسی کی مدد سے ماہرہ خان نے اس کی تیاری کی۔ حمزہ عباسی نے نہ صرف ماہرہ کو پنجابی بولنا سکھائی بلکہ ان کا لہجہ بھی درست کرایا۔

ماہرہ خان اپنے پنجابی سیکھنے کے وقت کو یاد کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ ”میں جب سیٹ پر گئی تو ایسا لگتا تھا کہ کوئی فرنچ لڑکی پنجابی بول رہی ہے۔ میں بہت گھبرائی ہوئی تھی مگر حمزہ نے میری بہت مدد کی۔“ ماہرہ نے بتایا کہ حمزہ عباسی اس وقت بھی سیٹ پر موجود ہوتے تھے، جب ان کی اپنی شوٹنگ نہیں ہوتی تھی۔ (دیلے لوگ)۔

فیصلہ

ماڈل و اداکارہ ایمان علی نے اچانک شادی کا فیصلہ کرلیا۔ جس پر ان کے مداح حیران رہ گئے۔ ایمان علی کے ہونے والے شوہر بابر کے بارے میں کہا جارہا ہے کہ وہ نشان حیدر پانے والے میجر عزیز بھٹی شہید کے پوتے ہیں۔ ان کی شادی کی تقریب فروری میں منعقد کی جائے گی۔

https://reading.sureteurdu.net/

تو انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ صرف کچھ مناظر کی مماثلت ہے۔ میں نے شوٹنگ کے دوران بھی ان سے کہا کہ فلم اوریجنل نہیں کاپی ہے تو انہوں نے گارنٹی دی کہ ایسا کچھ نہیں ہے۔

شمعون عباسی کہتے ہیں کہ میں تو سمجھتا ہوں کہ ان لوگوں کی ڈگریوں کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کاپی فلم کو ایوارڈ کس نے دے دیے۔ (کیوں آپ کو نہیں ملا کیا؟)

فلم کی ریلیز سے پہلے ہی مجھے پتا تھا کہ یہ فلم فلاپ ہوگی۔ ہم سب فنکاروں کی محنت کو پروڈیوسر اور ڈائریکٹر نے ضائع کر دیا۔ (تو آپ نے فلم چھوڑی کیوں نہیں؟)۔

واپسی

ہمایوں سعید جو گزشتہ کئی سالوں سے ہیرو ہی ہیں (اپنی فلموں کے)۔ کافی عرصے سے صرف فلمیں بنانے اور فلموں میں اداکاری کرنے میں معروف ہیں۔ تاہم اب جلد ہی وہ ٹی وی کی طرف واپس آرہے ہیں۔ (کیوں اب فلم میں کوئی کردار نہیں مل رہا)۔ ان کا ٹی وی پر آخری ڈراما دل لگی تھا۔ جس میں وہ مہوش حیات کے ساتھ دکھائی دیے تھے۔ (اف ڈراموں میں بھی مہوش اور ہمایوں......)

اب خبر ہے کہ ہمایوں سعید نے اپنے نئے ڈرامے کی شوٹنگ شروع کروادی ہے۔ (کروادی؟ مطلب خود ہی بنارہے ہیں اپنا...... بھئی ڈراما اور کیا)۔ اس ڈرامے کی دلچسپ بات یہ ہے کہ اس میں ہمایوں سعید کا کردار گلیمرس نہیں۔ (اب بھی گلیمر؟)۔ ڈراما خلیل الرحمان قمر نے لکھا ہے۔ ندیم بیگ اس کے ہدایت کار ہیں (وہی جو جوانی پھر نہیں آنی کی سیریز اور میں پنجاب نہیں جاؤں گی سیریز کے بھی ہدایت کار ہیں یعنی......؟)۔ اور ہیروئن (مہوش حیات ہی ہوں گی)۔ عائزہ خان ہیں (ہیں..... اچھا؟)۔

احساس

برصغیر پاک و ہند کے عظیم افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کی زندگی پر بولی وڈ میں بننے والی فلم ''منٹو'' کی خصوصی اسکریننگ کے لیے ان کی بیٹیوں کو نندیتا داس نے خصوصی دعوت دی تھی کہ وہ ممبئی آئیں۔ اس تقریب میں فلم کی کاسٹ سمیت بولی وڈ کے معروف اداکاروں نے شرکت کی۔

اس سلسلے میں منٹو کی بڑی صاحب زادی نصرت جلال کا کہنا ہے کہ ستر سال قبل ان کے والد کی جانب سے ممبئی چھوڑنے کے بعد وہ پہلی بار وہاں گئیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ دونوں ممالک کے درمیان موجود مسائل کی وجہ سے انہیں ویزا حاصل کرنے میں بھی دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔

اپنے والد کے جملوں کو یاد کرتے ہوئے بتایا کہ ممبئی جانے کے بعد انہیں احساس ہوا کہ ان کے والد یہ کیوں کہتے تھے کہ وہ چلتے پھرتے ممبئی میں ہیں۔ حالانکہ منٹو کی بیٹیوں نے اس جگہ کا دورہ نہیں کیا جہاں ان کے والد نے کئی سال گزارے تاہم انہیں ممبئی جاکر احساس ہوا کہ ان کے والد ممبئی کے دیوانے کیوں تھے۔ (ویسے کیوں تھے؟)۔

اِدھر اُدھر سے

☆ آج چار ماہ ہونے کو آئے ہیں، وزیراعظم اور ان کے ساتھی دن میں تین بار ٹی وی پر آتے ہیں اور سیاسی مخالفین کی کردار کشی کرتے ہیں۔ بار بار انہیں ڈاکو، لٹیرے، گناہ گار، ظالم، مجرم، متھہور، مردود ہونے کا طعنہ دیتے ہیں۔ سیاسی اختلاف کو ذاتی کردار کشی کا ذریعہ بناتے ہیں۔ اپنی نیکی، پارسائی، سادگی، شرافت، معصومیت اور اچھائی کے قصے سناتے ہیں اور سننے والوں سے توقع کرتے ہیں کہ وہ ان پر یقین کرلیں۔

(ڈاکٹر ضیاء الدین۔ امت)

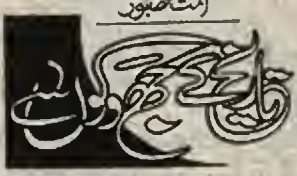

امت صبور

تاریخ کے جھروکوں سے

موت کے وقت

عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور سفر میں تھا کہ سخت بیمار پڑا اور راستہ میں ۱۵۹ھ میں اس کا انتقال ہوگیا۔ آخر وقت میں اس کی زبان پر یہ فقرہ تھا۔ "بادشاہ وہ ہے جو نہ مرے۔"

یزید بن معاویہ کے بعد معاویہ بن یزید کو خلیفہ بنایا گیا۔ بہت تھوڑی مدت میں ۶۴ھ میں ان کا انتقال ہوگیا۔ وفات کے وقت ان سے کہا گیا۔

"اپنے خاندان میں سے کسی کو خلیفہ نامزد کیجیے۔"

اس کے جواب میں انہوں نے کہا۔

"میں نے خلافت سے نہ زندگی میں فائدہ اٹھایا ہے اور نہ مرنے کے بعد اس کا بوجھ اٹھاؤں گا۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ بنوامیہ اس کی شیرینی لیں اور میرے حصہ میں اس کی تلخی آئے۔"

مامون الرشید بڑے جاہ و جلال کا بادشاہ تھا۔ ۲۱۸ھ میں جب وہ مرنے لگا تو آخری جملہ جو اس کی زبان سے نکلا وہ یہ تھا۔

"اے وہ جس کی سلطنت کبھی زائل نہ ہوگی، اس پر رحم کر جس کی سلطنت زائل ہورہی ہے۔ اے وہ جو کبھی نہیں مرے گا، اس پر رحم فرما جو مر رہا ہے۔"

خلیفہ واثق باللہ کی وفات ۲۳۲ھ میں ہوئی۔ جب اس کی موت کا وقت آیا تو اس نے حکم دیا کہ فرش اٹھا دیا جائے۔ جب فرش ہٹا دیا گیا تو اس نے اپنا رخسار زمین پر رکھ دیا اور کہا۔

"اے وہ جس کی بادشاہی لازوال ہے، اس پر رحم کر جس کی بادشاہی ختم ہوگئی۔" یہ کہتے ہی اس کا انتقال ہوگیا۔

خلیفہ معتضد باللہ عباسی کا انتقال ۲۸۹ھ میں ہوا۔ اس کی وفات کا وقت آیا تو اس نے چند عربی شعر پڑھے جن کا مطلب یہ ہے۔

"میں نے بڑے بڑے بہادر مارے، میں نے کوئی دشمن نہ چھوڑا۔ کسی کو بھی میں نے سرکشی پر باقی رہنے نہ دیا۔ میں نے دارالسلطنت کو تمام مخالفوں سے خالی کردیا۔ ان کو پراگندہ کرکے انہیں مشرق و مغرب میں پھیلا دیا لیکن جب میں اپنی عزت و بلندی میں ستاروں تک پہنچ گیا اور تمام مخلوق کی گردنوں میں میری غلامی کا طوق پڑ گیا تو ایسا ہوا کہ موت نے مجھ پر ایک تیر چلایا اور میری آگ کو بجھا دیا۔ دیکھ لو، اب میں جلد ہی اپنے گڑھے میں ڈالا جانے والا ہوں۔"

حجاج بن یوسف نے گورنر بننے کے بعد عراق میں خطبہ دیا۔ "گردنیں اونچی ہورہی ہیں، سروں کی فصل پک چکی ہے اور کٹائی کا وقت آگیا ہے۔ میری نظریں وہ خون دیکھ رہی ہیں جو پگڑیوں اور داڑھیوں کے درمیان بہہ رہا ہے۔"

یزید کے بعد بنوامیہ کی حکومت کو دوبارہ مستحکم کرنے کے لیے اس نے لاکھوں آدمیوں کو قتل کر ڈالا۔ ۵۴ سال کی عمر میں وہ مرض الموت میں مبتلا ہوا تو اس کو بے حد سخت تکلیف تھی۔

ابو منذر یعلی نے لوگوں کی طرف سے اس پر لعنت کرتے ہوئے کہا۔

"تو اس قوم کا فرعون تھا، آج تیرے لیے نہ نجات ہے اور نہ فریاد۔"

حجاج یہ سن کر بری طرح رو پڑا۔ اس نے آسمان کی طرف نظر اٹھائی اور کہا۔

"الٰہی مجھے بخش دے کیونکہ لوگ کہتے ہیں کہ تو مجھے نہیں بخشے گا۔ آہ میری ہلاکت، آہ میری ہلاکت، اگر اس جبار و قہار نے مجھ پر رحم نہ کیا۔"

محل سے کھنڈر

اندلس کے مسلم حکمرانوں میں سلطان عبدالرحمٰن ثالث بہت مشہور ہے۔ وہ ۳۰۰ھ میں تخت سلطنت پر بیٹھا اور ۳۵۰ھ میں بہتر سال کی عمر میں وفات پائی۔ اس کی ایک عیسائی بیوی تھی جس کا نام زہرا تھا۔

سلطان نے اپنی اس بیوی کے نام پر قرطبہ کے کنارے ایک شان دار محل تعمیر کیا اور اس کا نام

https://reading.pakistanipoint.com

الزہراء رکھا۔

چار میل لمبا اور تین میل چوڑا یہ محل اتنا بڑا تھا کہ اس کو قصر الزہراء کے بجائے مدینۃ الزہراء کہنے لگے۔ اس محل کی تعمیر ۳۲۵ھ میں شروع ہوئی اور پچیس سال میں ۳۵۰ھ میں مکمل ہوئی۔ المقری نے اس محل کی جو تفصیلات لکھی ہیں اس کے لحاظ سے یہ محل الف لیلہ کا کوئی طلسماتی شہر معلوم ہوتا ہے۔

اس محل کے بنانے پر دس ہزار معمار، چار ہزار اونٹ اور خچر روزانہ کام کرتے تھے۔ اس میں ۴۳۱۶ برج اور ستون تھے۔ سنگ مرمر اور دوسرے بہت سے قیمتی سامان فرانس، ترکی، یونان، شام اور افریقہ کے ملکوں کے بادشاہوں نے بطور تحفہ دیے تھے۔

اس کی چھتوں میں سونے چاندی کا کام اس کثرت سے کیا گیا تھا کہ دیکھنے والوں کی آنکھ چکتی تھی۔

اس محل کے انتظام اور نگرانی کے لیے ۱۳۷۵۰ ملازم مقرر تھے۔ اس کے علاوہ ۱۳۳۸۲ غلام تھے۔

حرم سرا کے اندر چھ ہزار عورتیں خدمت گزاری کے لیے حاضر رہا کرتی تھیں۔ سارا قصر باغات اور فواروں سے گلزار رہتا تھا۔ یورپ اور دوسرے ملکوں کے سیاح کثرت سے اس کو دیکھنے کے لیے آتے رہتے تھے۔

مگر اس عظیم الشان محل کا انجام کیا ہوا۔ ۲۵ سال میں موجودہ معیار سے ایک کھرب روپیہ سے بھی زیادہ میں بننے والا محل صرف پچاس سال میں ختم ہو گیا۔

اندلس کے مسلم حکمرانوں کے باہمی اختلافات کی وجہ سے عیسائیوں نے ان کے اوپر قابو پا لیا اور ان کو شکست دے کر ان کے نام و نشان تک کو مٹا ڈالا۔ قرطبہ کا الزہرا کھنڈر بنا دیا گیا۔ اس کے بعد اس پر زمانہ کی گرد پڑتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ نظروں سے غائب ہو گیا۔ موجودہ زمانہ میں اس مقام کی کھدائی کی گئی ہے مگر کھدائی کرنے والوں کو وہاں ٹوٹی ہوئی نالیوں کے سوا اور کچھ نہیں ملا۔

آدمی بدل جاتا ہے

عبدالملک بن مروان ایک اموی خلیفہ تھا، خلیفہ بننے سے پہلے عبدالملک کا شمار بڑے فقہا میں ہوتا تھا۔ وہ زیادہ تر مسجد میں رہتا اور عبادت اور دینی مطالعہ میں مشغول رہتا تھا۔ حتیٰ کہ لوگ اس کو حمامۃ المسجد (مسجد کا کبوتر) کہنے لگے تھے۔

۶۵ھ میں جب اس کے باپ مروان بن الحکم کا انتقال ہوا تو اس وقت وہ مسجد میں قرآن پڑھ رہا تھا۔ محل کا آدمی اس کے پاس خبر لے کر گیا اور کہا کہ آج سے آپ امیر المومنین ہیں۔ عبدالملک نے یہ سنا تو فوراً قرآن بند کر کے طاق پر رکھ دیا اور کہا۔

"آج سے میرے اور تمہارے درمیان جدائی ہے۔"

خلافت کے تخت پر بیٹھنے کے بعد عبدالملک بالکل دوسرا انسان بن گیا۔ اب اس کا سارا وقت دنیا کی چیزوں میں گزرنے لگا۔ یہی وہ اموی خلیفہ ہے جس نے حجاج بن یوسف جیسے ظالم کو گورنر بنا کر اس کو لوگوں کے اوپر مسلط کیا۔ اس نے عبداللہ بن زبیر اور مصعب بن زبیر اور دوسرے بے شمار لوگوں کو قتل کرایا۔ اس نے اپنے سیاسی حریفوں کو ختم کرنے کے لیے کعبہ پر منجنیق سے پتھر برسائے، وغیرہ۔

عبدالملک نے ایک روز سعید بن مسیب سے کہا۔

"سعید! اب میرا یہ حال ہے کہ جب میں کوئی نیک کام کرتا ہوں تو میرے دل کو کوئی خوشی نہیں ہوتی اور جب کوئی برائی کرتا ہوں تو اس کا مجھے کوئی رنج نہیں ہوتا۔"

سعید بن مسیب نے جواب دیا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ اب تمہارا دل پوری طرح مر چکا ہے۔"

یہی ہر اس آدمی کا حال ہوتا ہے جو اوپری سطح پر دین دار نظر آتا ہو مگر وہ اپنی پوری ہستی کے ساتھ دین دار نہ بنا ہو۔ ایسے آدمی کو جب کوئی جھٹکا لگتا ہے تو اچانک اس کا ظاہری لبادہ اتر جاتا ہے اور اندر کا واقعی انسان ننگا ہو کر سامنے آ جاتا ہے۔

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

اسپیشل چکن بروسٹ

ضروری اشیاء:۔

چکن	ایک کلو
سرکہ	دو کھانے کے چمچے
کالی مرچ پسی ہوئی	آدھا چائے کا چمچہ
لہسن پسا ہوا	ایک چائے کا چمچہ
مسٹرڈ پیسٹ	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
میدہ	آدھا کپ
مسٹرڈ پسا ہوا	آدھا چائے کا چمچہ
چکن پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
سفید مرچ پسی ہوئی	آدھا چائے کا چمچہ
بیکنگ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
پانی	حسب ضرورت
نمک	حسب ذائقہ
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب:۔

پیالے میں چکن، نمک، سرکہ، کالی مرچ پسی ہوئی، لہسن پسا ہوا اور مسٹرڈ پیسٹ ڈال کر مکس کر کے دو گھنٹے کے لیے میرینیٹ کریں۔

الگ پیالے میں میدہ، نمک، مسٹرڈ پسا ہوا، لہسن پسا ہوا، چکن پاؤڈر، سفید مرچ پسی ہوئی اور بیکنگ پاؤڈر ڈالیں اور مکس کر لیں۔

ایک پیالے میں پانی لیں میرینیٹ کی ہوئی چکن کو میدے کے مکسچر میں رول کریں پھر پانی میں ڈپ ــــ کریں۔ اسی طرح یہ عمل چار سے پانچ دفعہ دہرائیں اور تھوڑی دیر فریج میں رکھیں۔

میرینیٹ کی ہوئی چکن کو میدے کے مکسچر میں رول کریں اور کڑاہی میں تیل درمیانی آنچ پر گرم کر کے چکن ڈال کر آنچ ہلکی کر دیں اور ڈھک کر پکائیں۔ ایک طرف سنہری رنگ آ جائے تو چکن پلٹ دیں، فرائی ہو جائے تو ٹشو پیپر پر نکال لیں۔

سرونگ پلیٹ میں رکھ کر فرائز اور کیچپ کے ساتھ سرو کریں

چکن فرائی ہوئی اسٹک

ضروری اشیاء:۔

چکن (بون لیس)	آدھا کلو
نمک	حسب ذائقہ
زیرہ (کٹا ہوا)	ایک چائے کا چمچہ
لال مرچ (کٹی ہوئی)	ایک چائے کا چمچہ
پودینہ	آدھا چائے کا چمچہ
ہرا دھنیا	آدھا کپ
ہری مرچیں	چار عدد
لہسن، ادرک پسا ہوا	ایک کھانے کا چمچہ
گرم مسالا پسا ہوا	آدھا چائے کا چمچہ
انڈا، بریڈ کرمز	حسب ضرورت
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب:۔

گرائنڈر میں پودینہ، ہرا دھنیا، ہری مرچیں ڈال کر پیس لیں۔ چکن بوٹی کو دھو کر خشک کر لیں۔ بوٹی میں نمک، زیرہ، کٹی لال مرچ، پسا ہوا ہرا مسالا، لہسن، ادرک پسا ہوا اور گرم مسالا پسا ہوا لگا کر ایک گھنٹہ کے لیے رکھ دیں۔ بوٹیوں کو اسٹک میں لگا کر اسٹک کو پہلے انڈے میں ڈپ کریں۔ اس کے بعد بریڈ کرمز لگا ــــ کے دوبارہ انڈے میں ڈپ

https://readingpakistan.net

کر کے بریڈ کرمبز سے کوٹ کر کے گرم تیل میں درمیانی آنچ پر سنہری ہونے تک فرائی کریں۔ تیار ہو جائے تو چٹنی، کیچپ کے ساتھ سرو کریں۔

ویجیٹیبل منچورین

ضروری اشیاء:۔

پھول گوبھی (پھول کاٹ لیں)	ایک عدد
میدہ	چوتھائی کپ
کارن فلور	آدھا کپ
نمک	حسب ذائقہ
چائنیز نمک	آدھا چائے کا چمچہ
سفید مرچ پسی ہوئی	چوتھائی چائے کا چمچہ
ٹماٹو پیوری	آدھا کپ
کیچپ	دو کھانے کے چمچے
چلی سوس	دو کھانے کے چمچے
سویا سوس	دو کھانے کے چمچے
لہسن کے جوئے (باریک چوپ کرلیں)	تین عدد
ہری مرچیں (باریک چوپ کرلیں)	تین عدد
تیل	حسب ضرورت
لال مرچ پسی ہوئی	چوتھائی چائے کا چمچہ
سرکہ	دو کھانے کے چمچے
شہد	دو کھانے کے چمچے
ہری پیاز (چوپ کرلیں)	ایک عدد

ترکیب:۔

ایک پیالے میں میدہ، کارن فلور، نمک، سفید مرچ پسی ہوئی، ایک چٹکی چائنیز نمک اور ٹھنڈا پانی ملا کر گاڑھا آمیزہ تیار کرلیں۔ پھول گوبھی کے پھول اس میں ڈال کر دس سے پندرہ منٹ کے لیے رکھ دیں۔ کڑاہی میں تیل گرم کر کے پھول گوبھی کے پھولوں کو آمیزے سے نکال کر تیل میں ڈالیں اور سنہرا ہونے تک ڈیپ فرائی کریں اس کے بعد نکال کر پلیٹ میں رکھ لیں۔

سوس پین میں دو کھانے کے چمچے تیل گرم کریں۔ اس میں لہسن اور ہری مرچیں ڈال کر تیس سیکنڈ تک فرائی کریں۔ اس کے بعد اس میں کیچپ، چلی سوس، سویا سوس، ٹماٹو پیوری، لال مرچ پسی ہوئی سرکہ، شہد اور باقی بچا ہوا چائنیز نمک ڈال کر تین سے پانچ منٹ تک تیز آنچ پر فرائی کریں۔ اس کے بعد ڈھکن ڈھک کر ہلکی آنچ پر پندرہ سے بیس منٹ تک پکائیں آخر میں فرائی کیے ہوئے پھول گوبھی کے پھول اور ہری پیاز ڈال کر مکس کریں اور سرونگ ڈش میں نکالیں، مزے دار ویجیٹیبل منچورین تیار ہے۔

اندرسے کی مٹھائی

اشیاء:۔

میدہ	ایک پاؤ
چاول کا آٹا	ایک کلو
گھی	آدھا کلو
چینی	آدھا کلو

ترکیب:۔

سب سے پہلے چار گلاس پانی میں چینی ڈال کر اتنا پکائیں کہ شیرا تیار ہو جائے، پھر اس شیرے کو چاول کے آٹے میں اچھی طرح ملا لیں۔ ایک کڑاہی میں ڈال کر اسے چولہے پر رکھیں، درمیانی آنچ پر اسے کچھ دیر پکائیں، مستقل ہلاتی رہیں۔ اس کے بعد اسے اتار کر کچھ دیر بعد اس میں میدہ شامل کر کے اس کی اندرسے کے سائز کی گولیاں بنالیں۔ اب کڑاہی میں گھی گرم کر کے اسے ہلکی آنچ پر تل لیں۔ گولیاں بنا کر اس میں تل بھی لگا سکتی ہیں۔

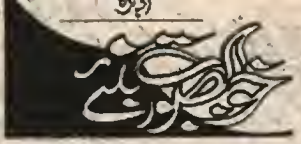

آج کل گھریلو ماسک تیار کرنے کا رجحان فروغ پا رہا ہے۔ بہت سے ماسک پھلوں، سبزیوں، انڈے، دودھ اور وٹامن سے بھی تیار کیے جاتے ہیں۔

انڈے کو ماسک کے طور پر استعمال کرنے کا رجحان اس لیے زیادہ ہے کہ انڈے ہر قسم کی جلد پر لگائے جاسکتے ہیں اور اس کا طریقہ استعمال بھی آسان ہوتا ہے۔ تازہ پھلوں مثلاً اسٹرابری کو کاٹیے یا اسے اچھی طرح مسل کر چہرے پر ملیے، اس طرح کیلے کو بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کیلے میں وٹامن، کیلشیم، فاسفورس اور پوٹاشیم کی مقدار بہت زیادہ ہوتی ہے لہٰذا انہیں استعمال کرنے کا رجحان بھی عام ہے۔ عام طور پر کیلے حساس جلد کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ٹماٹر، پپیتے، دہی، بالائی والا دودھ، شہد کو بھی چہرے کی جلد کی حفاظت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

اسٹرابری ماسک

نرم اور چمک دار جلد کے لیے یہ بہت مفید ثابت ہوتے ہیں۔ مٹھی بھر تازہ پکی ہوئی اسٹرابری لیں۔ ایک کپ میں ڈال کر انہیں اچھی طرح گاڑھا کرلیں پھر اسے چہرے اور گردن پر مل کر سوکھنے دیں۔ بعد میں اسے نیم گرم پانی سے صاف کرلیں۔ اس سے جلد میں تازگی اور شگفتگی پیدا ہوگی۔

ککڑی کا ماسک

ککڑی میں سلفر اور سلی کان کی مقدار زیادہ ہوتی ہے۔ شام کے وقت جلد میں پیدا ہوجانے والی تھکن اور پژمردگی کو دور کرنے کے سلسلے میں یہ بہت مفید ہے۔ ککڑی کے چند ٹکڑے لے کر دو چمچے پاؤڈر ملک اور ایک انڈے کے ساتھ پھینٹ لیں۔ اسے چہرے اور گردن پر اچھی طرح ملیں۔ سوکھنے پر اسے نیم گرم پانی سے دھولیں۔ بعد میں چہرے اور گردن پر ٹھنڈا

کارن ماسک

مکئی میں پروٹین اور چربی کی غیر معمولی مقدار ہوتی ہے۔ اس سے سوکھی جلد میں تروتازگی پیدا کرنے میں غیر معمولی مدد ملتی ہے۔ اس کے استعمال کا طریقہ یہ ہے کہ مکئی کے چند دانے لے کر ان کا جوس نکال لیں۔ جوس میں نکلنے والا سفید مادہ چہرے اور گردن پر لگا کر اسے سوکھنے دیں۔

پائن ایپل ماسک

اس ماسک کا بنیادی مقصد جلد کی اوپری تہ میں موجود ان خلیوں کو ختم کرنا ہے جو جلد کو سانس لینے میں دقت سے دوچار کرتے ہیں۔ ان خلیوں کے دور ہوجانے سے جلد تروتازہ ہوجاتی ہے۔ پاؤ کپ اناس کا جوس لیں۔ یہ جوس مشین کی مدد سے تیار کریں۔ اس کو اچھی طرح مکس کرنے کے بعد باریک ریشمی یا سوتی کپڑے کی پٹی سے جوس کو چہرے پر اچھی طرح ملیں اگر جوس بہت زیادہ اسٹرانگ ہو تو اسے چہرے سے صاف کردیں۔ بصورت دیگر پندرہ منٹ تک چہرے کو یوں ہی رہنے دیں۔

سوکھی خوبانی کا ماسک

یہ ماسک ہر قسم کی جلد کے لیے مفید ہوتا ہے۔ دو عدد خوبانیاں لے کر انہیں رات بھر بھگوئیں۔ اچھی طرح نرم ہوجانے پر ہلکی آنچ پر پکائیں اور پھر چہرے پر لگائیں۔ تقریباً دس منٹ کے بعد چہرا صاف کریں۔

خشک جلد کے لیے ماسک

اگر آپ کے چہرے کی جلد خشک ہے تو اس کے لیے آپ خود ایک عمدہ ماسک تیار کرسکتی ہیں۔ انڈے کی زردی میں چند قطرے سرکہ اور چند قطرے روغن بادام یا مونگ پھلی کے ملائیے۔ زیتون کا تیل بھی ملاسکتی ہیں۔ اس آمیزے کو خوب پھینٹیے۔ اس میں وٹامن ای کا ایک کیپسول بھی توڑ کر ملالیں تو زیادہ مفید ہوگا۔ اس ماسک کے اثرات جلد پر بہت جلد مرتب ہوتے ہیں، پندرہ منٹ بعد چہرے کو ٹھنڈے پانی سے دھولیں۔

☆

FaceFresh
GIVE YOU SKIN
Cleansing
TREATMENT
داغ دھبے اور چھائیوں کا
مکمل خاتمہ
REAL BEAUTY REAL SHINE
FaceFresh
CLEANSER CREAM
FaceFresh
CLEANSER CREAM
facefresh1
face.fresh
www.facefresh.com
Pakistan Standards